اردو شرح

انوار الباری

صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

بسم الله الرحمن الرحيم

انوار البارى
اردو شرح
صحيح البخارى

انوارالباری (جلد۳-۴)

تاریخ اشاعت............... شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
ناشر...........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.......................سلامت اقبال پریس ملتان

جلد ۳-۴

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

(تلمیذ علامہ کشمیری)

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

☎061-540513-519240

فہرست مضامین

انوار الباری ۳

اردو شرح

صحیح البخاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدِّمَة

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مقدمہ انوارالباری کی دوجلدوں کے بعد انوارالباری (شرح بخاری شریف) کی تالیف حق تعالیٰ جل ذکرہ کے بھروسہ پر شروع کر دی گئی اور محض اس کی توفیق وتیسیر سے اس کی پہلی جلد پیش ہے، کسی حدیث کی شرح یا اس پر بحث ونظر کے سلسلہ میں جو کچھ مواد مل سکا، اس کو یکجا کرنے کی سعادت حاصل کی گئی۔ امید ہے کہ ناظرین پسند کریں گے، اور استفادہ کے ساتھ اپنی خصوصی دعوات وتوجہات نیز ضروری اصلاحات سے نوازیں گے۔ تمام مخلصین خصوصاً اہل علم کے مشورے قدر ومنزلت کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

انوارالباری کی تشریحات اور بحث ونظر سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ علماء کرام ومحدثین عظام نے علوم نبوت کی خدمت گذاری میں کیسی کچھ کاوشیں کی ہیں اور اس آخری دور میں ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے وسیع علم ومطالعہ سے جو گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ کس قدر بلند پایہ ہیں، مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ نے جو حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا تھا کہ "صحابہ کا قافلہ جارہا تھا، یہ پیچھے رہ گئے تھے" (یقیناً یہ مختصر جملہ حضرت شاہ صاحب کے علمی وعملی کمالات کا صحیح تعارف ہے اور انوارالباری کے انوری افادات امید ہے کہ اسی اجمال کی امکانی تفصیل ہوں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

انوارالباری پڑھ کر آپ ضرور حیرت کریں گے کہ صدیوں کے بعد ہزاروں میل بلاد اسلامیہ عربیہ سے دور ایک گمنام ہندی قریہ سے ایسا بلند پایہ متبحر، محقق محدث ومفسر جامع معقول ومنقول عالم پیدا ہوا، جس نے تقریباً تیرہ سو سال کے تمام علمی دفاتر کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا، امت محمدیہ کے بڑے اور چھوٹے ایک ایک عالم کی علمی گہرائیوں کے اندازے لگائے، اور خوب لگائے اس نے اپنے علم وعقل کی کسوٹی پر ہر ایک کو پرکھا اور اس کے حق وناحق کو الگ کیا، جس میں اپنے وغیر کا ذرہ برابر فرق نہیں کیا، اس نے جس طرح کھلے دل سے غیروں کے کمالات کا اعتراف کیا، اپنوں کی خامیاں پیش کرنے سے بھی باک نہیں کیا، بلکہ کسی بڑے پر نقد کی ضرورت محسوس کی تو اس کے اظہار واعلان میں بھی تردد نہیں کیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے قبل یا بعد کسی کے درس حدیث کی یہ خصوصیت سامنے نہیں آئی کہ کسی حدیث کی شرح یا بحث ونظر کے وقت متقدمین ومتاخرین کی تحقیقات پر پوری بصیرت کے ساتھ فیصلے کئے گئے ہوں، ہر ایک کی شرح وتحقیق کو قرآن وسنت کے معیار پر رکھ کر خدا لگتی بات کہی گئی ہو۔ آپ نے صحیح بخاری شریف کا درس دیا تو اس شان سے کہ نہ "صحیح" کی شان رفیع نظروں سے گری، نہ امام بخاری کے

خداداد بہترین اوصاف وکمالات اوجھل ہوئے اور ساتھ ہی امام بخاری کی بشری خامیاں اور نقائص بھی پردے میں نہ رہے۔ انوار الباری میں جگہ جگہ امام بخاری کے تراجم ابواب ان کے فقہی نظریات ائمۂ اربعہ کی موافقات ومخالفات پر بے لاگ تبصرے آئیں گے جو علم وتحقیق کی جان ہیں امام بخاریؒ بدء وحی کے بعد سب سے بڑا موضوع کتاب الایمان کا لائے ہیں جس کے تحت بہت سے ابواب اور بہ کثرت احادیث و اقوال جمع کئے۔ علامہ قسطلانی شافعیؒ شارح بخاری شریف نے لکھا کہ امام بخاری کی غرض ان تمام ابواب سے یہی ثابت کرنا ہے کہ اعمال اجزاء ایمان ہیں اور یہ بھی علامہ موصوف نے امام بخاری کے ترجمۃ الباب باب من قال ان الایمان ھوالعمل'' کے تحت لکھا کہ امام بخاری کا مقصد اس قسم کے ابواب سے ان حضرات کا رد کرنا ہے جو عمل کو داخل ماہیت ایمان نہیں کہتے' لیکن امام بخاریؒ نے جو اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کی ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمل کا تعلق ایمان سے جزئیت کا ہے' البتہ صرف ایمان پر عمل کے اطلاق کا جواز نکل سکتا ہے' جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے' کیونکہ اس کو سب ہی مانتے ہیں کہ ایمان بھی تصدیق قلبی ہونے کی حیثیت سے ایک عمل قلب ہے'' (اس لیے اعمال میں اس کا بھی شمار ہوسکتا ہے' حالانکہ نزاع جو کچھ ہے وہ اعمال جوارح میں ہے' عقائد یا اعمال قلب میں نہیں ہے)

غرض امام بخاری نے ایک ایک عمل جوارح کو لے کر باب کا عنوان باندھا کہ یہ بھی ایمان کا جزو ہے وہ بھی ایمان کا جزو' اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے کسی ایسے شخص سے اپنی صحیح میں روایت نہیں کی جو ایمان کو قول وعمل کا مجموعہ مرکب نہ مانتا ہو۔ نیز فرمایا کہ میں ایک ہزار سے زیادہ علماء سے ملا' جو سب ہی ایمان کو قول وعمل کہتے تھے' ظاہر ہے کہ یہ سب تعریضات مرجئہ اہل بدعت سے متعلق نہیں ہوسکتیں بلکہ ان کے چھینٹے ائمہ حنفیہ پر بھی ضرور پڑتے ہیں' اس لیے امام بخاری کے اس قدر شدید رویہ کے مقابلہ میں معمولی مدرسی جوابات سے کام نہیں چل سکتا' اب ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے کس طرح جواب دہی فرمائی اور اس سے ناظرین اندازہ کرلیں گے کہ درس بخاری کا حق حضرت شاہ صاحب' ایسے محقق واسع الاطلاع بحر مواج ہی کا تھا ۔ ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں باختن

آپ نے ارشاد فرمایا (۱) امام بخاریؒ نے فرمایا کہ سلف کا قول ایمان کے بارے میں قول وعمل یزید وینقص تھا' انہوں نے سلف کے قول کو اختصار مخل کے ساتھ پیش کیا' سلف کا پورا قول یہ تھا الایمان یزید بالطاعۃ وینقص بالمعصیۃ امام بخاری نے طاعت ومعصیت کے الفاظ کم کردیے۔ چنانچہ علامہ عینیؒ نے صفحہ ۱۲۶ میں حافظ ابوالقاسم لالکائی کی کتاب شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ سے بھی یہی الفاظ نقل کئے جس کی تفصیل ہم نے صفحہ ۹۷/۱۱ اور صفحہ ۱۲۷/۱۲ انوار الباری میں پیش کی ہے اور علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث کے تحت بھی یہی لکھا کہ ایمان میں طاعت ومعصیت سے زیادتی وکمی کو ابونعیم نے حلیہ میں ذیل ترجمہ امام شافعی نقل کیا ہے۔

نیز فرمایا (۲) امام بخاری کا یہ فرمانا کہ ایک ہزار سے زیادہ علماء سے ملا الخ یہ خود بھی اس نظریہ کی کمزوری ظاہر کرتا ہے کیونکہ ضروریات دین کے بارے میں اس طرح ہزار پانچ سو کے اقوال نقل نہیں ہوا کرتے' نہ ان کے بارے میں سوال ہوا کرتا ہے (وہ تو عوام وخواص سب ہی کو معلوم ہوا کرتے ہیں) عاجز راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بظاہر امام بخاری نے ایک ہزار کے عدد کو اہمیت دی ہے' حالانکہ اس وقت کی اسلامی دنیا لاکھوں علماء سے پٹی پڑی تھی۔ چپہ چپہ پر محدثین کبار بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ایک محدث کے درس میں تیس تیس ہزار اور چالیس چالیس ہزار تلامذہ جمع ہوتے تھے' اور وہ سب اپنے وقت کے متبحر محدث ومفسر ہوتے تھے' کوفہ' بصرہ' مکہ معظمہ' مدینہ منورہ اور ملک شام تو بڑے بڑے علمی مرکز تھے' اس لیے ایک ہزار کی اقل قلیل اقلیت کی کیا اہمیت ہے' پھر بقول حضرت شاہ صاحب ان ایک ہزار کے اقوال بھی صرف ان تک ہی محدود ہیں کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے یہ قول صحابہ وتابعین سے حاصل کیا ہے' یہ تو ایسا ہے کہ جیسے ایک حلقۂ خیال کے لوگ یا ایک استاذ کے سب تلامذہ ایک ہی بات کہا کرتے ہیں' اس سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہے' اس کے علاوہ ہم نے متعدد جگہ انوار الباری میں دوسرے اکابر وائمہ محدثین کے اقوال بھی پیش کئے ہیں' جو ائمۂ حنفیہ کی تائید وموافقت میں ہیں۔ انوار الباری کی پہلی دو جلدوں میں کتاب

الایمان بخاری کی مختلف جہات پر سیر حاصل ابحاث آ گئی ہیں۔ یہ بات حضرت شاہ صاحبؒ کے درسی وغیر درسی ارشادات نیز دوسرے کثیر مطالعہ کی روشنی میں ثابت وواضح ہو چکی ہے' کہ جہاں تک امام بخاری کی صحیح'' کا تعلق ہے وہ نہایت اہم' مستند ترین' ذخیرہ حدیث ہے اور جن احادیث کے رواۃ میں کلام کیا گیا ہے' وہ بھی دوسرے اعلیٰ رواۃ ثقات کے ذریعہ قوی ہو چکی ہیں۔ اس لیے بخاری کی تمام احادیث کو صحیح قوی اور نا قابل تنقید کہنے میں کوئی ادنی تامل نہیں کیا جا سکتا' اس کے بعد صحیح بخاری کے اندر جس قدر حصہ تراجم ابواب کا ہے۔ یا امام بخاری نے جو کچھ اپنی دوسری حدیثی تالیفات میں یا تاریخ ورجال پر لکھا ہے اس پر تنقید میں کوئی مضائقہ نہیں اسی لیے ہم نے بھی امام بخاریؒ کے تذکرہ میں ان کی تالیفات پر مفصل کلام کیا' صحیح بخاری کے تراجم میں امام بخاری کے نظریات کلامی فقہی وغیرہ پر بھی بحث برابر آئے گی' جس طرح کتاب الایمان میں آئی ہے' فقہی مسائل میں حسب تحقیق حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری نے دوسری فقہوں کے مقابلہ میں' فقہ حنفی کی موافقت زیادہ کی ہے' لیکن وہ بعض مشہور مسائل میں شوافع کی موافقت اور حنفیہ کی شدید مخالفت کے سبب نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے' جن مسائل میں امام بخاری نے ائمہ اربعہ سے الگ ہو کر اپنا اجتہاد کیا ہے۔ ان پر بھی خاص طور سے بحث آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے علاوہ ایک اہم گزارش یہ ہے کہ انوار الباری کا مقصد وحید شرح معانی احادیث ہے یہ امر آخر ہے کہ بقول امام عبداللہ ابن مبارکؒ (جن کو خود امام بخاری نے بھی اپنے زمانہ کا سب سے بڑا قرآن وحدیث کا عالم تسلیم کیا ہے) امام اعظم کے تمام فقہی مسائل ان کی ذاتی رائے نہیں ہیں بلکہ وہ سب معانی حدیث کی شرح ہیں اس لئے جتنی تائید مسلک حنفیہ کی آئے گی وہ بھی معانی حدیث کی اصح ترین شرح ہی کہلائے گی اور جہاں کہیں حدیث وقرآن' اجماع یا قیاس صحیح شرعی کی رو سے کسی حنفی مسئلہ میں کمزوری ہوگی وہ ضرور تسلیم کی جائے گی کیونکہ حضرت شاہ صاحب کے درس میں یہی طریقہ استعمال ہوتا تھا' فقہ حنفی کی جس برتری کی طرف امام حدیث عبداللہ بن مبارک نے اشارہ فرمایا اس کی نیک نامی کو معاند مخالفین کے غلط ومسلسل پروپیگنڈے سے اگرچہ کافی نقصان پہنچا ہے مگر پھر بھی بہت سے مخالفین نے اس کی بلندی مرتبت کا اقرار کسی نہ کسی نہج سے ضرور کیا ہے مثلاً حافظ ابن حجر (جنہوں نے اپنی پوری قوت اور قابلیت فقہ حنفی کی مخالفت اور فقہ شافعی کی موافقت میں صرف کی ہے) بہت سے حنفی علماء سے فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے مذہب کو اختیار کروں' کیونکہ تمہارے مذہب کے فروع واصول میں بڑی مطابقت ہے مگر یہاں یہ بات بھی بڑی حیرت واستعجاب کے ساتھ لکھنی ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی اتنی بڑی تحقیق پر صرف اس لئے عمل نہ کیا کہ ابن برہان ظاہری کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری؟ کہا اب تو خیریت ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ناخوش ہیں' میں نے کہا کیوں؟ کیا تمہارے حنفیہ کی طرف میلان کے سبب سے' یہ سارا قصہ خود حافظ نے ہی ''المجمع المؤسس'' میں لکھا ہے' علامہ کوثری نے مجموعہ ذیول تذکرۃ الحفاظ کے حواشی صفحہ ۳۲۸ میں لکھا کہ اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے خصوصاً اس لئے کہ خواب کی وجہ سے حافظ نے ساری علمی تحقیق پر پانی پھیر دیا' اور خواب میں بھی ابن برہان ظاہری جیسے شخص کے کہنے کی وجہ سے جس کے علم و دیانت پر شذرات الذہب وغیرہ میں کافی نقد وجرح کی گئی ہے' ائمہ حنفیہ کے جامع ومستحکم اصول فقہیہ وحدیثیہ اور مطابقت فروع ومسائل پر ہم کسی دوسری فرصت میں سیر حاصل بحث کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ۔

''انوار الباری'' کے مطالعہ سے ناظرین اس امر کا اندازہ بھی بخوبی لگا سکیں گے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے درس حدیث کا معیار کس قدر بلند کر دیا' اور آپ کے محققانہ طرز تدریس کے اثرات دوسرے علوم وفنون پر بھی پڑ رہے تھے' جس سے دار العلوم کی مرکزیت کو صحیح معنی میں چار چاند لگ گئے تھے' مگر نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ بیس سالہ ٹھوس علمی خدمات کے بعد ۴۶ھ میں جب شاہ صاحبؒ نے انتظامی نقائص کی اصلاح چاہی تو وہ درخور اعتناء نہ ہو سکی۔ آپ نے مجبور ہو کر ایک کلمہ حق (مدرسہ وقف ہے ارث نہیں)'' ارشاد فرما کر دار العلوم کی صدر مدرسی سے استعفیٰ دے دیا اور آپ کے ساتھ دوسرے اکابر وافاضل بھی احتجاجاً مستعفی ہو گئے' اس طرح دار العلوم کے آسمان علم سے

بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب اور نجوم رشد وہدایت ٹوٹ کر جدا ہو گئے' اور مادی اقتدار کے مقابلہ میں روحانی اقتدار کو شکست ہوئی' جس کے غیر معمولی نقصانات کی تلافی آج تک نہ ہو سکی' اور اس جیسے تابناک دور علم و اتقاء کے پھر آنے کی بحالات موجودہ کوئی توقع ہے الا ماشاء اللہ حضرت شاہ صاحب اور آپ کے رفقاء نے جن نقائص کی اصلاح سے مایوس ہو کر وہ اقدام کیا تھا' اس کے ۳۷ سال کی طویل مدت میں وہ کتنے بڑھے اور علمی انحطاط کہاں تک پہنچا' اہل علم ونظر سے مخفی نہیں' کاش! اصلاح حال کے لیے کوئی موثر سعی عمل میں آئے۔

جس سے مادر علمی دارالعلوم کا علمی و عالمی وقار بھی مجروح نہ ہو۔ **واللہ الموفق والمیسر لکل عسیر۔**

دورۂ حدیث کا سال ہمارے مدارس عربیہ میں علوم وفنون کی تکمیل کا آخری سال ہوتا ہے اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں تمام علوم وفنون کے مشکل و اہم مباحث پر بھی فیصلہ کن تبصرے ہوتے تھے' اور فن حدیث میں خصوصیت سے رجال' طرق ومتون حدیث مذاہب ائمہ و دیگر محدثین وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث ہوتی تھی' اور حضرت شاہ صاحبؒ نہایت احتیاط وانضباط کے ساتھ دوسروں کے اقوال اور کتابوں کے حوالے ذکر فرماتے تھے۔ اس ہمارے درس کی یہ بھی بڑی خامی ہے کہ اساتذہ بغیر پوری مراجعت وانضباط کے اور اپنی اہم ترین ذمہ داریوں کا لحاظ کئے بغیر دوسروں کی چیزیں نقل کرتے ہیں' خصوصیت سے رجال اور طرق اسانید وغیرہ پر تو ان کی نظر بہت ہی محدود بلکہ ناقص ہے جب کہ فن حدیث میں ان امور کی اہمیت کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی افسوس ہے کہ اس دور کے بعض اساتذۂ حدیث تو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ رجال پر بحث کی ضرورت نہیں اس سے تو پہلے لوگ فارغ ہو چکے ہیں۔ حالانکہ فن رجال کی ضرورت اور ان پر بحث وفحص کی اہمیت قیامت تک باقی رہے گی' بلکہ یہ وقت علماء احناف کے لیے اس علم میں پوری سعی ومحنت ومطالعہ سے مہارت حاصل کرنے کا ہے' عمدۃ القاری' اور شروح طحاوی میں حافظ عینیؒ نے جس قدر رجال پر کلام کیا ہے' اس کا مطالعہ نہایت ضروری ومفید ہے' علامہ قاسم بن قطلو بغا کی تاج التراجم بھی چھپ گئی ہے' اسی طرح تذکرۃ الحفاظ وذیول تذکرۃ الحفاظ مع تالیقات الکوثری وغیرہ کے مطالعہ سے کوئی استاذ حدیث مستغنی نہیں ہو سکتا' واللہ الموفق۔

''مؤلف''

ضروری نوٹ:

یہ جلد کئی بار طبع ہوئی ہے اور سوء اتفاق سے ہر طبع میں اغلاط کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس بار زیادہ وقت صرف کر کے عمدہ تصحیح کر دی گئی ہے اس لیے سابقہ طباعت والے نسخے بھی صحیح کر لیے جائیں۔ (مولف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله وحده والصلوٰة والسلام علیٰ من لا نبی بعده

کتاب الوحی

باب: کیف کان بدء الوحیی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و قول اللہ عزوجل "انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ"

ترجمہ:۔ نبی الانبیاء والامام، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ اور حق تعالیٰ جل ذکرہ کا ارشاد ہے کہ "ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان کے بعد والے انبیاء پر بھیجی تھی۔

تشریح:۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے لکھا کہ اس سے معلوم ہوگیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے اور انبیاء سابقین پر جیسے وحی نازل ہوئی تھی، ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی تو جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے اور جس نے اس کا انکار کیا گویا وہ ان سب کا منکر ہوگیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ شائد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہوگئی، گویا اول حالت محض تعلیمی حالت تھی۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں وہ حالت پوری ہوکر اس قابل ہوگئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے۔ چنانچہ انبیاء اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر اول عذاب حضرت نوح علیہ السلام کی وقت سے شروع ہوا، خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ڈھیل دی جاتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہوچکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا۔ تو اب نافرمانیوں پر عذاب نازل ہوا، اول حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان آیا، اس کے بعد حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام کے زمانے میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے تو آپ کی وحی کو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دے کر اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کردی گئی کہ جو آپؐ پر نازل شدہ وحی کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا۔

اس آیت مبارکہ کے بعد صراطاً مستقیما تک غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وحی کی عظمت وشان کس کس طرح سے بیان کی گئی ہے شاید کسی دوسرے موقع پر اتنی تاکیدات نہ ملیں۔ اس سے امام بخاریؒ کے فہم وتتبع کی شان معلوم ہوتی ہے اس کے بعد چند روایات و آیات ذکر کیں جن سے ظاہر ہوا کہ خدا کے نبی کی نیت اعلیٰ اور خالص، نسبت نہایت ہی عالی، اور اخلاق واعمال کامل ہوتے ہیں، وہ نقص عہد جھوٹ اور دوسری اخلاقی کمزوریوں و برائیوں سے مبرا ہوتے ہیں، حتیٰ کہ مخالفین بھی ان کے صدق، دیانت، عمدگی اخلاق وافعال کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، خدا کے نبی میں اعلیٰ ملکات علم وعمل ودیعت ہوتے ہیں، پھر ان باطنی کمالات کو مجاہدات، ریاضات، خلوت وکثرت عبادات سے جلا دی جاتی ہے تاکہ ان کے پیرو بھی ظاہر و باطن کو اسی طرح مزین کریں۔

وحی اور اس کی عظمت

ہم یہاں حضرت استاذ الاساتذہ شیخ الہندؒ کی تحقیق درج کرتے ہیں۔

وحی لغت عرب میں اشارہ، کتابت، مکتوب، رسالت، الہام، القاء کو کہتے ہیں، اور اصطلاح وعرف میں اس کلام و پیام کا نام ہے جو حضرت رب العزت کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا، واسطہ بلاواسطہ کے تفاوت اور وسائط کے اختلاف سے اس کے اقسام متعدد ہیں مگر کلام الٰہی ہونے میں سب شریک ہیں۔ زید کا کلام بلاواسطہ سنو یا بواسطہ، ہیلوگراف یا کتابت یا پیغام زبانی ہر حال میں اس کو کلام زید کہنا درست ہوگا۔

اصل کلام مضمون ومعنی ہیں، الفاظ وحروف اس کے لیے عنوان ہیں لہٰذا قرآن مجید، احادیث قدسیہ ودیگر احادیث واقوال نبویہ سب کلام الٰہی اور وحی من اللہ ہیں، عوارض خاصہ اور بعض احکام میں تو ان کا باہم امتیاز ہوا اور ضرور ہونا چاہیئے مگر کلام الٰہی ہونے میں کوئی خفا نہیں، چنانچہ جملہ اکابر کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ احادیث رسول علیہ السلام حتیٰ کہ ان کا خواب بھی وحی سمجھا جاتا ہے۔

حضرت رب العزت جل ذکرہ، سے ہم تک اس کا کلام پہنچنے میں دو واسطے ہیں، ایک وحی لانے والا فرشتہ، دوسرے جس پر وحی لے کر آیا یعنی نبی ورسول اور دونوں کی صداقت وعصمت باتفاق اہل عقل ونقل ثابت ہے، کون نہیں جانتا کہ ملائکۃ الرحمان اور انبیاء کرام مقربین بارگاہ الٰہی ہیں؟

وحی الٰہی چونکہ نہایت عظیم المرتبت چیز ہے، اور اس کے نزول کی بھی خاص شان ہوتی ہے، اس لیے جو وحی حضرت رسول اکرم نبی الانبیاء والامم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ چونکہ آپ کے خصوصی فضل وامتیاز اور علو مرتبت وقرب الٰہی کے باعث سب سے اعلیٰ درجہ کی وحی ہے 'امام بخاریؒ نے اس کے خاص حالات وکیفیات کو بیان کرنے کے لیے سب سے پہلے اسی کا باب قائم کیا جس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جملہ اصول وفروع حتیٰ کہ ایمان وعلم کا ماخذ ومنشاء بھی وحی الٰہی ہے اور تمام فروع واصول وہی معتبر ہو سکتے ہیں جن کا ماخذ وحی ہو۔ اور اس کتاب میں بھی جو کچھ مذکور ہوگا، اصول ہوں یا فروع، عبادات ہوں یا معاملات وغیرہ سب کا ماخذ وحی ہوگی۔

غرض دو باتوں کا خیال یہاں ضروری ہے اول یہ کہ لفظ وحی میں جملہ اقسام وحی، وحی متلو قرآن مجید اور غیر متلو (حدیث وغیرہ) داخل ہیں، دوسرے یہ کہ ابتداء وحی سے کوئی خاص ابتداء مقصود نہیں بلکہ عام ہے خواہ بلحاظ زمانہ ہو یا بلحاظ مکان، باعتبار احوال ہو یا بلحاظ اوصاف اسی لیے امام بخاریؒ آیت مذکورہ لائے، جس سے معلوم ہوا کہ مبدء وحی (جہاں سے یہ کلام صادر ہوئے) وہ حق تعالیٰ جل ذکرہ کی برتر ذات ہے اور جن پر ہر زمانے میں اور مختلف حصص عالم میں اس کی وحی آتی رہی، وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مقدس ومطہر ذوات ہیں۔ اسی طرح وحی الٰہی کا سب سے اعلیٰ اور تمام سابقہ وحیوں کا خلاصہ ومجموعہ خاتم النبیین سرور انبیاء ومرسلین سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات پر نازل ہوا اور چونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا تھا اس لیے اس کی ظاہری حفاظت کا وعدہ بھی حق تعالیٰ جل ذکرہٗ نے فرمایا اور اس کے اولین وارث (یعنی حاملین علوم نبوت، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہوئے جو علوم شرعیہ میں کامل اور حق پرستی میں طاق تھے، ان ہی کے ذریعے سے وحی متلو (قرآن مجید) ساری امت کو پہنچا، اور ان ہی سے وحی غیر متلو یعنی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہوئی چنانچہ موجودہ ذخیرہ حدیث ہمیں دس ہزار صحابہ سے پہنچا ہے پھر اس کی صحیح وراثت تابعین، تبع تابعین وغیرہم تک ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی اور قیامت تک حسب ارشاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم **لا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرین ' لا یضر هم من خالفهم حتی یاتی امر الله** (میری امت میں قیامت تک ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی جو دوسروں پر غالب رہے گی اور مخالفین کی مخالفت اس کو کچھ ضرر ونقصان نہ پہنچا سکے گی۔)

نیز حسب ارشاد **و لن تجتمع امتی علی الضلالة** (میری امت گمراہی پر ہرگز جمع نہ ہوگی) علوم نبوت کی حفاظت کا وعدہ ہو چکا حق تعالیٰ کے اس عظیم فضل وانعام پر امت محمدیہ جتنا شکر وسپاس بھی بجالائے کم ہے۔

یہ جماعت جس کے ہمیشہ حق پر رہنے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے وہی ہے جس نے وحی الٰہی کو اپنا ہادی و یاسر اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنا مقتدا و پیشوا بنایا' یہی جماعت اہل حق و اہل سنت کہلانے کی مستحق اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد **ماانا علیه و اصحابی** (جس طریقہ پر میں ہوں اور میرے صحابہ) کا مصداق ہے۔

اس کے برخلاف جن لوگوں نے بوجہ نقصان فہم یا بوجہ غرض وہوا یا بسبب کج فطرتی و کٹ حجتی اپنی رائے وتو ہمات کو امام بنایا' اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کی یا خالص مذہبی و دینی مسائل میں سلف کی آراء کو مہتم کیا' ائمہ دین کو ہدف لعن وطعن کیا' وہ سب طریق حق سے دور ہوگئے اور اختلاف مذموم کے مرتکب ہوئے' جماعت اہل حق کا فرض ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے صراط مستقیم اور حضرات صحابہ وتابعین' ائمہ مجتہدین وعلمائے راسخین اور جملہ صلحائے امت وصدیقین کے طریق قویم سے سرموانحراف کو جائز نہ سمجھے۔ **والله الموفق والميسر لمايحب و يرضى۔**

نوٹ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کے ارشاد **ماانا علیه و اصحابی** میں مسلک حق کی جونشاندہی کی گئی ہے اس کی مکمل علمی وعملی تفسیر سب سے پہلے حضرت امام اعظم اور آپ کے اصحاب شرکاء تدوین فقہ اسلامی نے دنیا کے سامنے پیش کی جس کا اعتراف ابن ندیم نے اس طرح کیا علوم نبوت کا شرق وغرب اور بر و بحر میں پھیلاؤ امام اعظم رحمہ اللہ کی تدوین شریعت کے ذریعہ ہوا۔ اور علامہ محقق شعرانی شافعی میزان میں یوں گلفشاں ہوئے۔

''پہلے گزر چکا کہ جب حق تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرما کر شریعت اسلامیہ کے سرچشمہ سے واقف کیا تو میں نے دیکھا کہ تمام مذاہب فقہیہ اس شریعت حقہ سے مرتبط ہیں' پھر یہ بھی دیکھا کہ ائمہ اربعہ کے تمام مذاہب کی نہریں جاری ہیں اور باقی مذاہب جو مٹ گئے ہیں۔ وہ پتھریاں بن گئی ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ سب سے لمبی نہر امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی ہے اس کے بعد امام مالک رحمہ اللہ کی اس کے بعد امام شافعیؒ کی' اس کے بعد امام احمدؒ کی اور ان سب سے چھوٹی امام داؤد کی جو کہ پانچویں قرن میں ختم ہوگئی اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نہروں کی بڑائی چھوٹائی سے ان مذاہب کے رواج کی مدت مراد ہے' اور چونکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب سب سے پہلے مدون ہو کر رائج ہوا' تو وہی سب سے آخر میں ختم ہوگا' اور یہی اہل کشف کی بھی رائے ہے۔''

1 - حدثنا الحمیدی[1] قال حدثنا سفیان[2] قال حد ثنا یحی بن سعید[3] الا نصاری قال اخبر نی محمد[4] بن ابراهیم التیمی انه سمع علقمة بن وقاص اللیثی یقول سمعت عمر بن الخطاب رضی الله عنه علیٰ المنبر یقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول انما الا عمال بالنیات وانما لا مری ما نویٰ' فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها اوامراة یتزوجها فهجرته الیٰ ما هاجر الیه.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرماتے تھے کہ بلاشبہ تمام اعمال کا تعلق دل کے ارادوں سے ہے اور ہر کسی کو اس کی نیت کے مطابق ہی ثمرہ حاصل ہوتا ہے۔ جس کسی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہوگی تو اس کی ہجرت اسی غرض کے لیے شمار ہوگی۔

تشریح: اعمال ظاہری کی اچھائی برائی کا مدار دل کے اچھے برے ارادوں پر ہے' حتیٰ کہ ہجرت جیسے بڑی سعادت وعبادت بھی بری نیت کے سبب اکارت ہو جاتی ہے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کو اس حدیث سے شروع کیا تا کہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ہر عمل خیر

---

[1] علامہ محدث حمیدی کا مفصل تذکرہ مقدمہ انوارالباری صفحہ ۱/۲۲۵ میں ہو چکا ہے [2] یہ محدث جلیل سفیان بن عیینہ تلمیذ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (دیکھو مقدمہ صفحہ ۱/۲۱۷)
[3] بہت بڑے محدث وفقیہ تابعی ہیں' آپ کثیر الحدیث' ثقہ' حجت وثبت تھے' امام اعظم ابوحنیفہ' امام مالک' امام اوزاعی وغیرہ کبار محدثین نے آپ سے روایت کی ہے (جامع المسانید وتہذیب) [4] مشہور جلیل القدر تابعی ہیں آپ سے بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ نے حدیث کی روایت کی ہے (جامع المسانید صفحہ ۲/۳۵۶)

سے پہلے دل کے ارادے کو صحیح کرنے کا اہتمام کیا جائے' نیت صحیح ہو اور اچھی ہو اور ہر بھلائی و نیکی صرف خدا کی خوشنودی کے لیے ہو اگر ایمان' اسلام' تحصیل علم' تمام اعمال صالحہ' طاعات' عبادات' جہاد' صرف مال' زکوٰۃ و صدقات حج بیت اللہ و ہجرت وغیرہ بھی اخلاص' للّٰہیت اور اچھی نیت سے نہ ہوں بلکہ کسی غرض دنیوی یا ریا و نمود کے لیے ہوں تو ان کی کوئی قدر و قیمت خدا کے یہاں نہیں' اور للّٰہیت و اخلاص کے ساتھ ہر چھوٹی و بڑی نیکی حتیٰ کہ زبان سے کوئی کلمہ خیر کہہ دینا اور راستوں سے کوئی معمولی تکلیف کی چیز ہٹا دینا بھی موجب اجر و ثواب ہے۔

بحث و نظر: امام بخاریؒ نے سب سے پہلی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی' جو احادیث صحاح مجردہ کی جمع و تدوین کا سب سے پہلا اقدام تھا (کیونکہ اس سے پہلے جو ایک سو سے زیادہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے مدون ہوئے تھے۔ ان میں احادیث کے ساتھ آثار صحابہ و فتاویٰ تابعین بھی تھے۔)

اس سے یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمع و روایت احادیث کے خلاف ہرگز نہ تھے' اپنے دور خلافت میں آپ نے صحابہ سے اس بارے میں مشورہ بھی کیا تھا' جس میں تمام صحابہ کی رائے باقاعدہ کتابت و جمع احادیث کی تھی' مگر اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مہم کو صرف اس احتیاط کے پیش نظر ملتوی کر دیا تھا کہ قرآن مجید کے ساتھ احادیث کا اختلاط نہ ہو جائے۔ باقی زبانی روایت احادیث کا سلسلہ دستور آپ کے عہد میں بھی جاری رہا مگر اس میں آپ غایت احتیاط کو پسند کرتے تھے' اسی لیے خود بہت کم روایت کی ہے اور دوسروں پر بھی سختی کرتے تھے' حتیٰ کہ بعض مواقع پر مزید اطمینان کے لیے روایت کرنے والوں سے گواہ بھی طلب کر لیتے تھے۔

سب سے پہلے امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اس لیے درج فرمایا کہ ہر عمل خیر کے لیے تصحیح و تحسین نیت کے لیے ترغیب ہو' اسی طرح دوسرے اکابر محدثین و مؤلفین نے بھی اسی حدیث سے ابتداء کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ محدث عبدالرحمان[1] ابن مہدی نے فرمایا کہ اگر میں کوئی

---

[1] یہ امام مالک' شعبہ' سفیان بن عیینہ' سفیان ثوری وغیرہ کے تلمیذ حدیث اور امام احمد اسحاق و اصحاب صحاح ستہ کے شیوخ میں' ہیں' امام اعظمؒ کے مداحین میں سے ہیں' امام صاحب کو قاضی قضاۃ العلماء کا لقب دیا تھا' بلکہ بعض واسطوں سے ان کے تلامذہ میں بھی داخل ہیں مگر آپ کا میلان بعض مذاہب اہلحدیث اور رائے اہل مدینہ کی طرف تھا' جبکہ آپ کے معاصر محدث کبیر سید الحفاظ رئیس ناقدین رجال یحییٰ بن سعید القطان کا میلان رائے اہل کوفہ کی طرف تھا (ملاحظہ ہو تہذیب صفحہ ۲۷۹)

راقم الحروف کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جو بہت سے مسائل میں فقہ حنفی کی شدت سے مخالفت کی ہے وہ شیخ عبدالرحمٰن ابن مہدی نضر بن شمیل اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کا اثر ہے' نضر بن شمیل' مسائل فقہ حنفی میں مامون الرشید سے بحث کیا کرتے تھے اور مامون جو خود بڑا محدث و فقیہ تھا ان کو لاجواب کر دیا کرتا تھا نیز وہ اسحٰق بن را۔ یہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کتب فقہ حنفی کو دریا میں بہا دیا تھا جس پر خلیفہ مامون نے ان سب کو ملا کر تنبیہ کی تھی (ملاحظہ ہو مقدمہ انوار الباری صفحہ ۹۱) اسی طرح امام بخاریؒ پر جو اثرات امام اعظم رحمہ اللہ کے بارے میں ہیں وہ ان کے شیوخ حمیدی' نعیم خزاعی' اسماعیل بن عرعرہ وغیرہ کے باعث ہیں واللہ اعلم شیخ عبدالرحمٰن بن مہدی اپنے زمانے کے جلیل القدر محدث و فقیہ تھے (۱۹۸ھ میں ان کی وفات ہوئی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

اوپر کے حوالے میں حافظ ابن حجرؒ نے اعتراف کیا کہ امام یحییٰ القطان فقہاء کوفہ کی طرف مائل تھے' امام موصوف کے حالات مقدمہ انوار الباری صفحہ ۲۰۲/۱ میں ذکر ہو چکے ہیں' امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ حدیث و فقہ اور شریک مجلس تدوین فقہ تھے' خلیلی نے آپ کو اپنے زمانے کا امام بلامدافعت کہا اور فرمایا کہ آپ کے ساتھ سارے ائمہ حجت پکڑتے تھے اور مکمل اعتماد کی وجہ سے کہتے تھے کہ جس کو یحییٰ بن القطان نے چھوڑ دیا' ہم بھی اس کو چھوڑ دیں گے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ آپ سے امام احمد' یحییٰ بن معین' علی مدینی اور ہمارے تمام ائمہ نے علم حاصل کیا' ابن منجویہ نے آپ کو علم و حفظ وغیرہ کے اعتبار سے سادات اہل زمانہ سے کہا اور یہ کہ آپ ہی نے اہل عراق کے لیے رسم حدیث کے راستے ہموار کئے' ثقات کی تلاش اور ترک ضعفاء کا بڑا اہتمام کیا' عجلی نے ثقہ فی الحدیث' حافظ ابوزرعہ نے ثقات حفاظ میں شمار کیا' حافظ ابو حاتم نے حافظ حجت کہا' امام نسائی نے ثقہ ثبت مرضی کہا' امام یحییٰ بن معین نے آپ کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے اوپر کا درجہ دیا' حافظ ابن خزیمہ نے بغداد سے امام اہل زمانہ کا لفظ نقل کیا' صالح بن احمد نے اپنے والد سے نقل کیا کہ یحییٰ القطان' عبدالرحمٰن بن مہدی اور وکیع وغیرہ سب سے زیادہ اثبت ہیں' علی بن المدینی و شیخ امام بخاری کا قول ہے کہ میں نے یحییٰ القطان سے زیادہ اثبت کسی کو نہیں دیکھا (یعنی روایت حدیث میں پوری احتیاط کرنے والا) ابراہیم بن محمد تیمی نے فرمایا کہ یحییٰ القطان سے زیادہ رجال حدیث کا جاننے والا میں نے نہیں دیکھا' عبداللہ احمد کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد امام احمد کو سنا کہ وہ یحییٰ القطان سے احادیث روایت کرتے تھے' پھر فرماتے کہ میں نے ان جیسا کوئی بھی نہیں دیکھا میں نے کہا کہ ہشیم بھی نہیں؟ فرمایا کہ ہشیم بس شیخ وقت ہیں' میں نے کہا کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کتاب ابواب میں تصنیف کرتا تو اس کے ہر باب کو **انما الا عمال بالنیات** سے شروع کرتا' اور جو شخص تصنیف کا ارادہ کرے اس کو اسی حدیث سے شروع کرنا چاہیے۔

بعض ائمہ حدیث نے اس حدیث کو اسلام کا ایک تہائی قرار دیا ہے اور بعض نے چوتھائی اور سب نے ہی اس کی عظمت وقدر کا بیان کیا ہے یہ حدیث مسند امام اعظم میں بھی بہ لفظہ "**الاعمال بالنیات**" امام صاحب سے روایت کی گئی ہے اس حدیث کا شان ورود طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ ایک شخص نے ام قیس کو پیغام نکاح بھیجا اس نے انکار کر دیا اور ہجرت کی شرط لگائی تو اس شخص نے ہجرت کی اور نکاح کر لیا اسی لئے ہم نے اس کا نام مہاجر ام قیس رکھ دیا تھا۔

ہمارے شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ جس طرح آیات قرآنی کے شان نزول بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے' احادیث کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) عبد الرحمٰن بن مہدی؟ فرمایا یحییٰ القطان جیسا کوئی نہیں دیکھا گیا' امام احمد کا قول یہ بھی ہے کہ بصرہ میں یحییٰ القطان پر تثبت کی انتہا تھی' خود عبد الرحمان بن مہدی کا قول ہے کہ یحییٰ القطان سے بہتر حدیث کی طلب وتلاش کرنے والا اور حدیث کو اخذ وضبط کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔

خلیل سے یہاں تک سب اقوال ہم نے تہذیب سے نقل کئے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ اتنا بڑا شخص جو جامع کمالات اور امام فن حدیث ورجال تھا اور جو امام احمد 'علی بن المدینی' اسحٰق بن راہویہ' ابوبکر بن ابی شیبہ (صاحب مصنف مشہور) اور امام فن رجال یحییٰ بن معین وغیرہ کبار ائمہ ومحدثین کا قابل صد فخر استاذ تھا' وہ امام اعظم کے تلمذ حدیث وفقہ پر نازاں اور فقہ حنفی کا متبع تھا اسی طرح امام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کوفی جن کے حالات مقدمہ انوار الباری صفحہ ۱۸۶/۱ میں درج ہوئے اور خود امام بخاریؒ نے تاریخ کبیر صفحہ ۴/۲/۲۷۴ میں ابو خالد الاحمر کا قول ان کے بارے میں نقل کیا کہ آپ حدیث کے اخذ وضبط میں کامل مہارت رکھتے تھے اور حضرت حسنؒ کا قول نقل کیا کہ آپ اہل کوفہ میں سب سے بڑے فقیہ تھے' یہ اور اس زمانے کے سینکڑوں ہزاروں کبار محدثین نے فقہ حنفی پر اعتماد کیا اور سینکڑوں محدثین نے امام صاحب سے احادیث کی روایت بھی کی۔ جس کا بڑا ثبوت جامع المسانید وغیرہ موجود ہیں اس کے باوجود کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ فقہ حنفی احادیث کے خلاف ہے یا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس احادیث کا ذخیرہ نہیں تھا دروغ بے فروغ نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک محترم بزرگ عالم نے ہمیں لکھا کہ غیر مقلدوں کا ایک شرذمہ قلیلہ ہے اس کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں' تہذیب التہذیب کے مندرجہ بالا حوالے کو پھر سے بغور پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ فقہ حنفی کے مقابلہ میں شروع سے ہی' اور بعد کو دوسرے ائمہ مجتہدین کو فقہوں کے مقابلہ میں بھی اہل حدیث کے مذاہب رائج ہو گئے تھے' جن پر حافظ نے تعریض کی ہے' کیونکہ حافظ ابن حجر خود بھی شافعی ہیں۔ پھر درمیانی تاریخ سے گذر کر قریبی دور کے مصری حجازی نجدی وہندی علماء کے رجحانات وحدیثی تالیفات کو بھی سامنے رکھئے اور اس وقت مدینہ طیبہ (زادہا اللہ شرفا) جو سعودی عرب کی سرپرستی میں لکھوکھا روپوں کے سرمایہ سے یونیورسٹی قائم ہوئی ہے اور تمام دنیائے اسلام کے طلباء کو گراں قدر وظائف ماہوار دے کر تعلیم علوم اسلامیہ کے لیے جمع کیا جا رہا ہے اس کے نصاب تعلیم کو دیکھئے' اس کے نتائج پر بھی نظر رکھئے اور وہاں کے اساتذہ کے متعلق بھی معلومات فراہم کیجئے! معلوم ہوا کہ وہاں کے اساتذہ حنفی مذہب کے طلبہ کو حنفیت کا طعنہ دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کو صرف تیرہ یا سترہ حدیثیں یاد تھیں۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا اتنی بڑی عالمی یونیورسٹی کے اساتذہ کو تمام تعصبات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اور اگر وہاں کے اساتذہ کی کڑی نگرانی نہ کی گئی تو اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوں گے۔

ضرورت ہے کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الحدیث دارالعلوم ٹنڈو آلہ یار حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور' حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند' حضرت مولانا محمد شفیع صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی' اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث دارالعلوم جامع مسجد نیوٹاؤن کراچی ایسے حضرات کو بھی مدینہ یونیورسٹی کے مشیران میں شامل کیا جائے۔ تاکہ وہاں کی علمی مرکزیت کے شایان شان علوم نبوت کے صحیح خدمت ہو سکے۔

ہمارے علم میں نجد وحجاز کے بھی چند ایسے علماء محققین حنبلی وغیر حنبلی ہیں جن کو یونیورسٹی کی انتظامیہ میں رکھنے سے اس کا صحیح علمی وقار واعتماد قائم ہو سکتا ہے' یہ سطور لکھی جا چکیں تھیں کہ ایک مشہور علمی ادارے کے مدیر محترم کا خط ڈاک سے ملا جو اسی سال حج وزیارت حرمین سے مشرف ہو کر آئے ہیں انہوں نے مدینہ یونیورسٹی کے متعلق لکھا کہ اس سے ہم لوگوں کو بہتر توقعات قائم نہیں کرنی چاہئیں' نجدیوں کا بڑا مقصد اس کی تاسیس سے نجدیت کو پھیلانا اور دوسری سیاسی مصالح کا حصول معلوم ہوتا ہے ہمارا اندازہ یہی ہے۔ واللعلم عند اللہ

کچھ اس قسم کے تاثرات دوسرے لوگوں کے بھی ہیں' خدا کرے اپنے اس عظیم تر روحانی ودینی مرکز کے بارے میں اس قسم کے تاثرات بہتر توقعات وخوشتر نتائج سے بدل جائیں اور وہاں کے ارباب حل وعقد اس عالمی اسلامی ادارے کو تمام سیاسی مصالح اور ہر قسم کے تعصبات سے بلند تر رکھنے کا تہیہ کر لیں۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

شان ورود کا بھی اگر اہتمام ہوتا تو نہایت مفید ہوتا اور کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر لکھدی جائے تو بڑا نفع ہو علامہ ابن دقیق العید کا قول ہے کہ سواء ابوحفص عکبری کے کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

امام بخاریؒ حدیث مذکور "الاعمال بالنیات" کو اپنی صحیح میں سات جگہ لائے ہیں، پہلی تو یہی ہے، دوسری صفحہ ۱۳ میں "باب ماجاء ان الاعمال بالنیة والحسبة ولکل امری مانوی" کے الفاظ سے لائے ہیں، پھر فرمایا کہ اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ وغیرہ سب داخل ہو گئے، مطلب یہ کہ اعمال خیر کا اجر وثواب جب ہی حاصل ہوگا کہ ارادہ طلب ثواب کا ہو، اگر نیت فاسد ہے یا طلب ثواب کا ارادہ نہیں تو وہ عمل ثواب سے خالی ہوگا۔

تیسری کتاب العتق میں لائے چوتھی باب الہجر میں پانچویں نکاح میں، چھٹی تذور کے بیان میں، ساتویں کتاب الحیل میں، کسی جگہ ان کا مقصد صحت اعمال کا مدار نیت پر بتلانا ہے اور کہیں ثواب اعمال کو نیت پر موقوف بتلانا ہے جس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک حدیث کا مفہوم عام ہے جو دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث مذکور سے صرف صحت اعمال کی تخصیص جیسا کہ شوافع کرتے ہیں درست نہیں جس طرح ثواب اعمال کی تخصیص مناسب نہیں جو بعض فقہا احناف نے کی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان ہر دو شخصیات سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا مفصل تذکرہ فرما کر بتلایا کہ فقہا حنفیہ کو سب سے زیادہ وضو کے بارے میں مطعون کیا گیا ہے، حالانکہ ان کی فقہی پوزیشن اس مسئلہ میں بھی بہت قوی ہے، جس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱- حدیث مذکور عبادات میں وارد ہوئی ہے نہ کہ قربات وطاعات میں اور اس امر کو حنفیہ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وضو بغیر نیت کے عبادات کے درجہ میں نہیں آئے گی نہ اس پر ثواب عبادت کا ملے گا لیکن یہ کہ وہ مفتاح صلوٰۃ بھی نہ بن سکے گی اس سے حدیث مذکور بالکل ساکت ہے (چنانچہ امام بخاریؒ نے بھی جہاں مفصل احکام وضو نماز وغیرہ کا ذکر کیا ہے، وہاں حدیث سے مراد ثواب اعمال ہی لیا ہے صحت اعمال نہیں۔

شیخ زکریا انصاریؒ نے تفصیل سے بتلایا ہے کہ عبادت میں نیت کے ساتھ اس ذات کی معرفت حاصل ہونا بھی ضروری ہے جس کا تقرب اس عبادت سے مقصود ہے قربت میں نیت ضروری نہیں، صرف معرفت مذکور ضروری ہے جیسے تلاوت قرآن مجید اطاعت میں کوئی شرط نہیں (صرف اس کا عمل خیر ہونا کافی ہے) جیسے ان امور کا غور وفکر اور مطالعہ جن سے اسلام قبول کرنے کی رہنمائی حاصل ہو۔

۲- تمام مسائل دین پر ایک اجمالی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کی ترکیب پانچ چیزوں سے ہے عبادات، عقوبات، معاملات، اعتقادات، اخلاق، فقہی کتابوں میں صرف پہلی تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے، عبادات مقصودہ میں بالاتفاق سب کے نزدیک نیت شرط صحت ہے، معاملات کا اطلاق پانچ چیزوں پر ہوتا ہے، مناکحات، معاوضات مالیہ، خصومات ترکات، امانات، ان سب میں کسی کی یہاں بھی نیت شرط نہیں ہے، عقوبات کی بھی پانچ اقسام ہیں، حدودۃ، حد قذف، حد زنا، حد سرقہ اور قصاص ان میں بھی کسی نے نیت کو شرط قرار نہیں دیا۔ (حد شرب خمر کا ذکر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اس کا اجرا ذمیوں پر نہیں ہوتا)۔

پس اگر وسائل کے بارے میں حنفیہ پر طعن کیا جاتا ہے کہ حدیث مذکور کے خلاف کرتے ہیں تو معاملات وعقوبات میں تو دوسرے بھی مخالفت حدیث کے مرتکب ٹھہریں گے، اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟

۳- بہت سے وسائل میں حنفیہ کے یہاں بھی نیت شرط صحت ہے، جیسے تیمم، نبیذ سے وضو، وغیرہ حالانکہ مشہور ومعروف محدث فقیہ شام حضرت امام اوزاعیؒ (امام اوزاعی کا تذکرہ مقدمہ انوارالباری حصہ اول کے صفحہ پر ہو چکا ہے)

اور حافظ حدیث حسن بن صالح بن حیؒ[1] تیمم میں بھی نیت کو شرط صحت نہیں مانتے تھے (عینی) اس طرح پر دونوں ائمہ حدیث ہمارے امام اعظمؒ سے بھی نیت کو شرط صحت نہ ماننے میں آگے بڑھے ہوئے ہیں' پھر صرف فقہاء احناف کو مطعون کرنا کیا انصاف ہے؟

وضو اور تیمم میں وجہ فرق ہمارے یہاں یہ ہے کہ پانی میں بالطبع و بالذات پاک کرنے کا وصف موجود ہے کیونکہ قرآن مجید میں تصریح ہے **وانزلنا من السماء ماء طهورا** ہم نے پانی کو پاک کرنے والا اتارا ہے' لہٰذا نیت کی ضرورت نہیں لیکن مٹی اور زمین میں یہ وصف ذاتی نہیں ہے حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کے خصوصی اکرام اور دفع حرج کے لئے پانی نہ ملنے کے وقت اس کو پاک کرنے کا وصف عطا فرما دیا ہے اس لئے اس میں نیت کی ضرورت ہوگی اور یہ ایسا ہی ہے جیسے شوافع نے جمع بین الصلوتین میں جمع تقدیم اور جمع تاخیر کی نیت کو ضروری قرار دیا ہے۔

وضو بالنبیذ میں نیت حنفیہ کے نزدیک اس لئے ضروری ہے کہ وہ ماء مطلق و مقید کے بین بین ایک صورت ہے اگرچہ طاہر و طہور ہے' جس طرح حقیقت قاصرہ کو حقیقت مطلقہ و مجاز کے درمیان ایک درجہ دیا گیا ہے اور اس کو مجاز سے اوپر اور حقیقت مطلقہ سے نیچے مانا گیا ہے' حاصل یہ کہ ہمارے یہاں وسائل میں بھی فی الجملہ نیت کی شرط موجود ہے لہٰذا جن لوگوں نے مبنیٰ اختلاف وسائل و مقاصد کو سمجھا ہے انہوں نے نقل مذاہب میں غلطی کی ہے۔

۴- اگر زیادہ دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماء مطلق سے وضو میں بھی حنفیہ کے یہاں نیت کا لحاظ موجود ہے کیونکہ نیت سے مراد اگر زبان سے نیت کرنا ہے تو وہ کسی کے یہاں بھی لازمی و ضروری نہیں ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ اور بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنے کا ثبوت نہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے' نہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اور نہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے' اور اگر اس سے مراد وہ دل کا ارادہ ہے جو ہر فعل اختیاری سے پہلے ہوا ہی کرتا ہے تو اس میں ہم اور دوسرے مخالفت کرنے والے برابر ہیں یعنی ہم بھی اس سے منکر نہیں ہیں ظاہر ہے کہ نماز سے پہلے نیت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ نماز پڑھنے والے کے دل میں اس امر کا شعور ہو کہ میں کون سی نماز پڑھ رہا ہوں تو کیا کوئی حنفی المسلک ایسا ہوگا جس کو وضو کرتے وقت اس امر کا شعور نہ ہو کہ میں نماز کے لئے فرض طہارت ادا کر رہا ہوں غرض نیت صرف ایک امر قلبی ہے جو تمام اختیاری افعال میں ہوا کرتی ہے۔

---

[1] مشہور حافظ حدیث' فقیہ عابد' زاہد تھے۔ حافظ ابوزرعہ' حافظ ابو حاتم' امام نسائی وغیرہ نے ثقہ کہا' سید الحفاظ امام یحییٰ القطان نے فرمایا کہ سفیان ثوری ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اسی طرح دوسرے کچھ حضرات نے بھی ان پر نقد کیا ہے مثلاً کہا کہ وہ امت میں تلوار چلانے کو پسند کرتے تھے۔ (یہ بعینہ وہی اعتراض ہے جو امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ قرأۃ خلف الامام میں امام اعظمؒ پر کیا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۱۹) حافظ ابن حجرؒ نے یہاں اس اعتراض کو دفع کیا اور کہا کہ بیشک حافظ حسن بن حی ائمہ جور کے خلاف خروج بالسیف کو جائز سمجھتے تھے اور یہی سلف کا قدیم مسلک بھی تھا۔ لیکن جب سیاسی حالات کی نزاکت حد سے بڑھ گئی تو اس رائے کو ترک کرنا پڑا' لہٰذا اس جیسی رائے کی وجہ سے کسی ایسے شخص پر جرح کرنا صحیح نہیں' جس کی عدالت ثابت ہو چکی ہو اور وہ حفظ' اتقان اور ورع تام میں مشہور ہو چکا ہو' پھر یہ بھی ہے کہ باوجود اپنی اس رائے کے بھی حسن بن حی نے کسی حکومت کے خلاف خروج کا عملی مظاہرہ نہیں کیا' باقی یہ اعتراض کہ وہ جمعہ کی نماز نہیں پڑھتے تھے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں فاسق کے پیچھے نماز درست نہیں تھی' اس کے بعد حافظ نے کہا کہ حسن بن حی کی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے اور اگر صواب اس کے خلاف بھی ہو تو بہر حال وہ امام مجتہد تھے۔" (تہذیب صفحہ ۲/۲۸۸)

آپ نے دیکھا کہ حافظ نے حسن بن حی کی طرف سے خروج بالسیف اور ترک نماز جمعہ کے اعتراض کو کس خوبی سے دفع کیا۔ مگر یہی اعتراض **رى السيف على الامة** کا امام بخاریؒ نے امام اعظم پر کیا تو حافظ نے ان کی طرف سے اس کا دفاع نہیں کیا' حالانکہ امام صاحب کی پوزیشن حسن بن حی سے زیادہ صاف تھی لیکن حسن موصوف امام صاحب کے مخالفوں میں تھے ان کی ہر طرح نصرت و حمایت اور توثیق و تقویت ضروری سمجھی گئی امام صاحب اور ائمہ احناف کی طرف سے دل صاف نہیں تھا اس لئے وہاں زبان و قلم میں بھی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ واللہ المستعان۔

حافظ کی مذکورہ بالا عبارت میں کئی باتیں بڑے کام کی ہیں امید ہے کہ ناظرین ان کو یاد رکھیں گے ایک ضروری امر یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حسن بن حی موصوف کو اکابر محدثین نے متشیع بھی کہا ہے' جس کی کوئی مدافعت حافظ نے نہیں کی اور آخر میں حافظ نے زکریا بن یحییٰ الساجی کے حوالے سے محدث کبیر شیخ عبداللہ بن داود الخریبی (حنفی) کے بارے میں بھی خلاف شان بات نقل کر دی حالانکہ ساجی روایت میں غیر معتمد اور شیخ المتعصبین تھے۔ (ملاحظہ ہو تانیب الخطیب صفحہ ۱۸)

حسن بن حی کی ولادت ۱۰۰ھ میں اور وفات ۱۶۹ھ میں ہوئی (رحمتہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

اگر نیت میں اس سے زیادہ کسی چیز کو مانا جائے تو اس کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے اس کے بعد اختلافی صورت صرف ایک فرضی شکل بطور فرض منطقیین رہ جاتی ہے کہ ایک شخص اتفاقی طور پر بارش میں بھیگ جائے' جس سے اعضاء وضو بھی دھل جائیں اس صورت میں بظاہر اس کے دل کا ارادہ بھی وضو کا نہیں ہے آیا ایسی صورت میں وہ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں' تو بہتر یہ ہے کہ ایسی اتفاقی نادر صورت کو حدیث کے عام و وسیع اور واضح و بدیہی مطلب کے تحت داخل نہ کیا جائے بلکہ ایک نظری و اجتہادی مسئلہ سمجھا جائے اور اس کے بارے میں ائمہ مجتہدین کے فیصلے کو "مخالفت حدیث[1]" سے مطعون نہ کیا جائے۔

---

[1] یہاں ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے ایک نہایت اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ سب کو تسلیم ہے کہ قرآن وحدیث کی مراد سمجھنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی فقہی واجتہادی صلاحیت کی ضرورت تھی جو خدا کے فضل وکرم سے ہمارے امام اعظمؒ اور دوسرے آپ کے تلامذہ ومستفیدین میں بدرجہ اتم موجود تھی' ان کا زمانہ بھی خیر القرون کا تھا ان کے زمانے میں اکثر احادیث ثنائیات تھیں کہ صرف ایک صحابی اور ایک تابعی کے واسطے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی تھیں اس لئے جھوٹ وغیرہ کا امکان تقریباً نادر تھا اس مبارک دور میں امام الائمہ امام اعظم رحمتہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی میں سینکڑوں کبار محدثین وفقہا کی موجودگی اور چالیس جلیل القدر ائمہ محدثین وفقہا کی تقریباً تیس سال کی شبانہ روز بحث وتمحیص کے بعد ساڑھے بارہ لاکھ فقہی مسائل کی تدوین عمل میں آئی' جو عملی طور سے بھی تمام اسلامی ممالک میں رائج ہوئے اور سلطنت عباسیہ کے طول وعرض میں حکومتی سطح پر بھی نافذ کئے گئے' خلیفہ مامون نے جو اس دور کے بلند پایہ محدثین امام مالک وغیرہ کا شاگرد تھا) ایک موقع پر جب اس کے سامنے اسحاق بن راہویہ' احمد بن زہیر' نضر بن شمیل وغیرہ نے فقہ حنفی کو احادیث کے خلاف بتلایا تھا تو اس نے خود فقہ حنفی کی طرف سے پوری مدافعت کی اور احادیث روایت کر کے ان لوگوں کو لاجواب کر دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم دیکھتے فقہ حنفی احادیث کے خلاف ہے تو ہم خود ہی اس کو اپنے قلمرو میں نافذ نہ کرتے۔

کہنا یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے جو اصول کلیہ مستنبط ہوتے ہیں ان ہی کی روشنی میں فقہ مرتب ہوئی ہے اور جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ احکام تو ایسے ہوتے ہیں جو قرآن وحدیث کی عبارت' دلالت' اشارت واقتضاء سے بدیہی طور پر نکل آتے ہیں' ان کا تعلق براہ راست علوم نبوت سے ہے دوسرے درجہ پر وہ احکام ہیں جن کا تعلق ائمہ مجتہدین کے وظیفہ اجتہاد سے ہے' چنانچہ اعمال کی صحت وبطلان' جواز وکراہت کا فیصلہ اجتہاد سے وابستہ ہے اور جہاں تک نبوت ورسالت کے فیصلوں کی حدود وسیع ہیں وہاں تک مجتہدین کو اپنی رائے واجتہاد کو دخل دینے کا اصلاً کوئی حق نہیں اور نہ ان حضرات نے ایسی غلطی کا ارتکاب کیا' البتہ تدارک اجتہاد مجتہدین کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کے خلاف اس قسم کے مغالطے اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کی طرح بعد کے محدثین وفقہا کو بھی پیش آئے اور آج تک بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

محدث شہیر ابوبکر بن ابی شیبہ نے بھی اسی قسم کا اعتراض کیا تھا' پھر امام بخاریؒ نے بھی صحیح بخاری اور دوسری تالیفات میں اسی غلط فہمی کے باعث تیز کلامی کی پھر ابن حزم آئے' وہ تو اور بھی زیادہ حد سے بڑھ گئے پھر طبقہ اہل حدیث وغیر مقلدین نے تو کوئی کسر ہی اٹھا کر نہ رکھی۔ ہمارے زمانہ میں ایک عالم حدیث مرعاۃ شرح مشکوٰۃ شریف لکھ رہے ہیں جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان کا طریقہ نقد ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۲/۲۰۲ میں باب الوتر کی ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حنفیہ کے لئے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ فرض ونفل کی ہر دو رکعت پر بیٹھنا اور تشہد پڑھنا واجب کہتے ہیں اور انہوں نے اس کے جوابات جن وجوہ سے دیئے ہیں وہ مردود وباطل ہیں' پھر پانچ وجوہ لکھ کر سب کو بزعم خود باطل ومردود قرار دیا پھر لکھا کہ سب وجوہ "حدیث صحیح" کی تحریف' اس کے مقصد کو باطل ٹھہرانے والی' سنت ثابتہ ظاہرہ کا استہزاء اور اس کو ترک کرنے کے حیلے حوالے ہیں اس سے ان لوگوں کا شدت تعصب اور تقلید غیر معصوم میں غلو ظاہر ہے بلکہ ان کو سنت سے بغض وعناد معلوم ہوتا ہے' ہم نے ان مضحکہ خیز توجیہات کو صرف اس لئے عرض کر دیا ہے تاکہ عقل وبصیرت والے عبرت حاصل کریں"۔

یہ تمام تر تبرا اور خصوصیت سے محدثین وفقہا احناف پر سنت سے بغض رکھنے کا گراں ترین التزام وافتراء آپ نے ایک ایسے عالم محقق کی زبان قلم سے سنا جن کے علم وفضل' متانت وسنجیدگی سے راقم الحروف کو بڑی اچھی توقعات تھیں اسی لئے مقدمہ حصہ دوم کے آخر میں ان کا تعاون بھی اچھے ہی الفاظ سے کرایا تھا جس پر بعض اہل علم نے جو ان سے زیادہ قریب ہیں۔ مجھے اس مدح سرائی پر شکوہ بھی لکھا تھا۔ "لو استقبلت من امری ما استدبرت"

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مؤلف موصوف نے شرح مذکور بڑی محنت سے ترتیب دی ہے جو ہر طرح قابل قدر ہے اور بیشتر جگہ احناف کا تذکرہ بھی وقیع الفاظ میں کیا ہے' جس کے ہم شکر گزار ہیں' جس طرح ان کی بے جا عصبیت وتیز لسانی کا شکوہ بھی ضرور ہے۔

محترم مؤلف کے تبرا مذکور پر تفصیلی بحث تو ہم اپنے موقع پر کریں گے' یہاں مختصر طور پر اتنی گزارش ہے کہ نماز کی ہر دو رکعت پر بیٹھنا اور التحیات پڑھنا اول تو یہ صرف حنفیہ کا مسلک نہیں ہے بلکہ حنابلہ' بھی ان دونوں کو واجب کہتے ہیں' ملاحظہ ہو (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ طبع مصر! صفحہ ۱۶۹) بلکہ تشہد اول حنفیہ کے یہاں ایک روایت میں سنت بھی نقل ہوا ہے (فتح الملہم صفحہ ۱۰۰) شوافع قعدۂ اولیٰ وتشہد اول کو سنت اور اخیرین کو فرض کہتے ہیں۔

غرض اول تو جو کچھ تبرا مؤلف نے حنفیہ پر کیا ہے' وہ حنابلہ پر بھی عائد ہو جاتا ہے' دوسرے یہ کہ حنفیہ قعدۂ اولیٰ وتشہد اوّل کو اس لیے واجب کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

۵۔ اگر حدیث کو صرف عبادات کے ساتھ خاص سمجھا جائے' جیسا کہ طرفین کے کلام ونزاع سے معلوم ہوتا ہے اور اس کو صرف ثواب سے متعلق کریں' جیسا کہ ہمارے فقہاء حنفیہ نے کہا تو اس کو ہم مانتے ہیں کہ وضوء بغیر نیت کے عبادت کے درجہ میں نہ آئے گا مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایسا وضو بھی صحت نماز کے لیے کافی ہے کیونکہ اس کا پاک کرنے کا وصف ظاہری وحسی طور سے موجود ونا قابل انکار ہے اور ایسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) درجہ دیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب تم ہر دو رکعت پر بیٹھو تو التحیات پڑھو (یہ روایت نسائی میں اور مسند احمد میں بھی ہے' جس کے تمام رجال سند ثقہ ہیں (دیکھو نیل الاوطار شوکانی صفحہ ۱۶۵' اعلاء السنن صفحہ ۱۲۸) نیز صحیح مسلم باب صفۃ الصلوٰۃ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مفصل حدیث مروی ہے' جس میں انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز مبارک کی پوری تفصیل بیان کی ہے' اس میں یہ بتلایا ہے کہ حضور فرمایا کرتے تھے کہ ہر دو رکعت پر تحیہ ہے (یعنی تشہد) ایک حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تشہد سکھلایا درمیان نماز کے بھی اور آخر میں بھی (مجمع الزوائد ہیثمی صفحہ ۱۴۲' ہیثمی نے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں' بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی تشہد اخیر سے فارغ ہو تو عذاب جہنم سے پناہ مانگے الخ (نصب الرایہ صفحہ ۱/۴۲۲) صحیح بخاری باب سنۃ صفحہ ۱۱۴ میں ابی حمید ساعدی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت صلوٰۃ کا پورا ذکر ہوا ہے' جس میں دو رکعت کا بیٹھنے کا ذکر موجود ہے کہ اس حدیث کو سوائے مسلم کے اور بھی صحاح والوں نے روایت کیا ہے۔

غرض حنفیہ کے سامنے بیسیوں احادیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت صلوٰۃ کی موجود تھیں' جن کی وجہ سے انہوں نے اور حنابلہ نے بھی فیصلہ کیا کہ ہر رکعت پر جلوس وتشہد ہونا چاہئے' وہی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو مسلم میں مروی ہے اور غلطی سے حافظ ابن حجرؒ وصاحب مشکوٰۃ نے اس کو بخاری کی طرف بھی منسوب کر دیا ہے حالانکہ انہوں نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا بلکہ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ امام بخاری چونکہ فصل کے قائل ہیں۔ اس لیے اس کو روایت نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی عادت ہے' جس جانب کو اختیار کرتے ہیں صرف اسی کے موافق احادیث کی روایت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس حدیث مسلم کو علامہ ابن عبدالبر نے معلول قرار دیا ہے' جس کی تفصیل زرقانی نے شرح المواہب میں ذکر کی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ احادیث فصل اثبت اور اکثر طرق سے مروی ہیں (فتح الملہم صفحہ ۲/۲۹۰) نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رات کی نماز کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھ رکعت پڑھتے تھے اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے پھر بیٹھ کر تسبیح وذکر کرتے تھے اس کے بعد پھر دو رکعت پڑھتے تھے (کنز العمال صفحہ ۳/۱۰۸) اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جو آخر کی پانچ رکعات کا ایثار کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان میں صرف آخر میں بیٹھتے تھے وہاں یہی مراد ہوگا کہ تہجد کے نوافل دو دو کر کے درمیان میں جس طرح بیٹھ کر تسبیح کرتے تھے' وہ صورت وتروں کی نماز میں نہ ہوتی تھی (فتح الملہم صفحہ ۲/۲۹۱)

آپ نے دیکھا کہ حنفیہ کے جس مسلک پر مؤلف مرعاۃ اتنے بگڑے وہ پوری طرح احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤید ہے اور انہوں نے خلاف سنت کوئی دوسرا طریقہ ہرگز اختیار نہیں کیا ہے ہر دو رکعت پر بیٹھنا اور تشہد پڑھنا بہت سی احادیث قطعیہ سے ثابت اور ائمہ اربعہ کے یہاں معمول بہا ہے' شافعیہ کے یہاں چونکہ وجوب کا درجہ نہیں ہے اور صرف فرض وسنت دو ہی درجات ہیں اس لیے انہوں نے ان دونوں کو درجہ سنت دیا مالکیہ کے یہاں بھی تقریباً یہی صورت ہے' حنابلہ کا مذہب حنفیہ کے مطابق ہے اور حنابلہ کا عمل بالحدیث غیر مقلدین کے یہاں بھی مسلم ہے'

الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمدؒ کے محشیٰ نے صفحہ ۱/۴ پر لکھا کہ جمہور محدثین کے نزدیک ہر دو تشہد واجب ہیں اور امام احمدؒ اول کو واجب اور دوسرے کو فرض کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ ومالک رحمہا اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء دونوں کو سنت کہتے ہیں' اب جمہور محدثین کے بارے میں مؤلف مرعاۃ کیا فرمائیں گے؟ تشہد اول اور قعود اول کو واجب کہنے والے تو تارکین سنت بلکہ مبغضین سنت تھے' شیخ احمد عبدالرحمان البنا کی تحقیق نے تو سارا الزام خفیہ سے اٹھا کر جمہور محدثین پر رکھ دیا۔

غالباً محدث مبارکپوری کے مطالعہ میں امام احمد یا حنابلہ وجمہور محدثین کا مسلک پوری طرح نہیں آیا اور صرف حنفیہ سامنے آ گئے جن پر تبرا کا ثواب حاصل کرنے میں عجلت سے کام لینا پڑا اور نہ جمہور محدثین یا حنابلہ سے صرف نظر کی جرأت وہ بھی نہ کر سکتے تھے' غرض ایسے مسئلہ میں حنفیہ پر نہ صرف اعتراض کرنا بلکہ ایک عالم کی شان سے اتر کر سخت ترین الفاظ استعمال کرنا' پھر جس حدیث مسلم کی توجیہات پر انہوں نے حنفیہ کو تارکین سنت اور سنت رسول سے بغض رکھنے والے بھی کہہ دیا 'اس کو امام بخاریؒ نے معلول سمجھ کر یا اور کسی وجہ سے روایت نہ کیا' علامہ ابن عبدالبر نے اس کو معلول قرار دیا' دوسری بہت سی احادیث صحیحہ قویہ کی وجہ سے اس کی توجیہ ضروری ٹھیری' پھر آثار صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کی روشنی میں بھی اس پر عمل دشوار' کیونکہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت دفن کیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے ابھی تک وتر نہیں پڑھے وہ وتر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے ہم نے ان کے پیچھے صف باندھ لی' انہوں نے وتر کی تین رکعات پڑھائیں اور صرف آخری رکعت پر سلام پھیرا اس کی سند صحیح ہے (معانی الآثار صفحہ ۱۷۴)

حضرت ابوالزناد سے نقل ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فقہاء کے فیصلہ سے مدینہ طیبہ میں نماز وتر کی تین رکعات مقرر کر دی تھیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا تھا۔ (معانی الآثار صفحہ ۱۷۵) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وضوء پر اجر و ثواب بھی ملے گا جیسا کہ پہلے شیخ الاسلام زکریا انصاری کی تحقیق گذر چکی کہ طاعات و قربات میں نیت ضروری نہیں حالانکہ اجر و ثواب ان پر بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ ثواب کے اعتبار سے وہ بھی عبادات کہلانے کی مستحق ہیں اس کے بعد اگر یہ دعوی کیا جائے کہ صحت نماز کے لیے وضو کا بدرجۂ عبادت ہونا ضروری ہے تو اس کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مستدرک میں یہ بھی ہے کہ یہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا وتر ہے، جس کو اہل مدینہ نے معمول بنایا، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وتر کی تین رکعات دو سلام سے مروی ہیں اس پر حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ ان کے باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ اعلم تھے (اس سے زیادہ تحقیق العرف الشذی صفحہ ۲۱۴ میں ہے)

آپ نے دیکھا کہ وتر تین رکعات ایک سلام سے جو حنفیہ کا مسلک و معمول ہے وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا، اسی کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینہ طیبہ میں رائج کیا، اور وہی حضرت ابن مسعودؓ، ابی بن کعب، ابن عباس، انس، ابوامامہ اور فقہاء سبعہ، نیز حضرت سفیان ثوری اور دوسرے اہل کوفہ کا بھی مذہب ہے محدث جلیل ابن ابی شیبہ نے تو حضرت حسنؒ سے یہ بھی نقل کیا کہ تمام مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وتر تین رکعات ایک سلام سے ہیں (اوجز المسالک صفحہ ۴۳۴/۱) پھر پانچ رکعت والی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ترک یا سنت سے بغض رکھنے کا الزام کس کس کو دیا جائے گا؟ اور ان سب اکابر امت نے کس غیر معصوم کی تقلید میں ایسا غلط راستہ اختیار کیا تھا؟ اپنا تو یہ حال ہے کہ ایک معمولی مسلمان کے متعلق بھی ایسے سخت الفاظ کہنے سے دل ڈرتا ہے مگر علماء اہل حدیث کی جرأت و ہمت کی داد دیجئے کہ وہ اکابر ائمۂ محدثین و فقہاء کے متعلق بھی بے جھجک زبان لعن و طعن دراز کر دیتے ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ جس طرح شیعی فرقہ کے لوگ یزید وغیرہ پر لعن و طعن کرنے کی مشق کرنے کے بعد سب صحابہ اور تبرا تک ترقی کر گئے، کچھ اسی طرح غیر مقلدین کی حنفی عصبیت نے بھی ترقی کے مدارج طے کئے ہیں۔

مؤلف مرعاۃ شرح مشکوٰۃ کی گراں قدر حدیثی خدمت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں اس لیے ہماری دلی تمنا ہے کہ مطبوعہ دو ضخیم جلدوں میں جو اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ یا خلاف شان اہل علم و تحقیق باتیں درج ہوگئی ہیں ان کے بارے میں وہ معذرت کر دیں اور آئندہ جلدوں میں وہ احتیاط کریں۔

واللہ الموفق۔ یہاں تکمیل فائدہ کے لیے اتنا اور لکھنا مناسب ہے کہ علماء اہل حدیث جو اس قدر بڑھ چڑھ کر ائمہ متبوعین اور ان کی فقہ پر بے جا نقد کی جسارت کرتے ہیں، یہ ان کے لیے کسی طرح مفید نہیں بلکہ مضر ہوگی، اس وقت اگر وہ حکومت سعودیہ نجدیہ کے غرہ میں اور دوسرے اسباب و وسائل سے غلط فائدہ اٹھا کر حدود سے تجاوز کریں گے تو اس کے نتائج بہتر نہیں ہوسکتے۔

جو حضرات ان سے پہلے محض تعصب سے جتنا لکھ گئے ہیں اس کی بھی اہل علم میں کوئی وقعت نہیں ہے، ان لوگوں کا تو علم و فضل حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے انہوں نے بھی جہاں محض تعصب سے کام لیا، وہ درجۂ تحقیق سے گر گیا، یاد آیا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحب نے درس بخاری شریف میں بحث وتر میں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر فرمایا، جس کو مسلم میں روایت کیا ہے اور اس میں تصریح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تہجد کے بعد وتر کی تین رکعات پڑھیں، اس حدیث کو حافظ نے فتح الباری صفحہ ۲/۳۳۱ میں ذکر کر کے لکھا کہ اس حدیث کی اسناد میں حصین بن عبدالرحمان ہیں اور ان میں کلام کیا گیا ہے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حصین بخاری کے بھی رواۃ میں سے ہیں، ...... بخاری باب السواک یوم الجمعہ میں ان سے روایت ذکر ہوئی ہے اور وہاں حافظ نے ان پر کچھ کلام نہیں کیا، دوسرے یہ کہ اس حدیث کو روایت کرنے والے حصین کے سواء اور بہت سے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رسالہ وتر میں اس کے چھ متابع ذکر کئے ہیں اس لیے حافظ ابن حجر کا اس حدیث مسلم کو راوی مذکور کے باعث یہ سمجھ کر یا دکھلا کر کہ وہ متفرد ہیں، مرجوح قرار دینا درست نہیں۔

اس کے بعد بطور مزاح کے یہ بھی فرمایا کہ اگر حافظ ابن حجر کا منشاء ایسا ہے کہ وہ اور ان کے ہم مسلک جنت میں جائیں اور حنفیہ نہ جا سکیں تو ایسا نہیں ہوسکتا 'البتہ وہ اور ہم ساتھ جائیں تو ٹھیک ہے' غرض تعصب و تنگ نظری کی بات تو حافظ جیسے جلیل القدر محدث کی بھی نہیں چل سکی، مبارک پوری صاحب اور ان کے ہم مسلک علماء کی کیا چل سکتی ہے، ہاں اس سے برائے چندے دنیا کی سرخروئی، عزت و دولت ضرور مل سکتی ہیں جو آخرت کی ابدی عزت و دولت کے مقابلے میں پر کاہ کے برابر بھی نہیں ہیں، دوسرے یہ باتیں منصب خدمت علم حدیث کے بھی سراسر منافی ہیں **اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ**

یہاں یہ تمام تفصیل صرف اس لیے ذکر کی گئی کہ علماء اہل حدیث کے طرز تحقیق اور محدثین و فقہاء حنفیہؒ کے ساتھ ان کے متعصبانہ وغیرہ منصفانہ برتاؤ سے ناظرین کرام مطلع رہیں۔

غرض فقہ حنفی کو ابتداء میں کچھ لوگوں نے مدارک اجتہاد امام اعظم وغیرہ تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے خلاف سنت سمجھا، کچھ حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ سنت پر قیاس کو ترجیح دی گئی ہے، کچھ لوگ حسد و رشک کا شکار ہو کر مخالفت کر گئے، اس کے بعد کچھ لوگوں پر محض تعصب کا رنگ غالب آ گیا جن کی باقیات صالحات آج بھی موجود ہیں۔

عون المعبود، تحفۃ الاحوذی اور مرعاۃ میں بہت سی جگہ بے جا تشدد، تلبیس، مغالطہ آمیزی اور ناانصافی سے کام لیا گیا ہے، جن کی نشاندہی و جوابدہی انوار الباری میں اپنے مواقع میں ہوتی رہے گی۔

وکم من عائب قولا صحیحا وآفتہ من الفھم السقیم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۶۔اس امر پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ حصول ثواب کے لیے نیت مرتبہ علم میں ہمارے نزدیک کافی ہے، جس میں ذہول وعدم شعور وقتی حارج نہیں اور عرفی نیت بھی اسی قدر ہے، باقی منطقیوں کا علم العلم کا درجہ، جس میں شعور واستحضار نیت بھی ہر وقت ضروری ہے حصول ثواب کے واسطے غیر ضروری ہے، دوسرے لوگ غالباً نیت کو مرتبہ علم العلم میں ضروری سمجھتے ہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کا ذکر یہاں اس لیے کر دیا گیا ہے کہ ائمہ حنفیہ کے مدارک اجتہاد وفہم معانی حدیث کا کچھ نمونہ سامنے آجائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے اجتہادی مسائل میں مختارات حنفیہ پر طعن کرنا موزوں نہیں۔

پس حدیث مذکور تمام اقسام وانواع اعمال کو شامل ہے اس میں نیت وعدم نیت سے تعرض نہیں ہے بلکہ اچھی نیت کے ساتھ اعمال حسنہ کرنے والوں کی مدح اور بری نیت والوں کو تنبیہ مقصود ہے تاکہ وہ اپنے تمام نیک اعمال خالص لوجہ اللہ کریں۔اور ان کو غلط وفاسد ارادوں سے محفوظ رکھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یعنی بہت سے لوگ صحیح بات میں عیب نکالنے والے ملیں گے، حالانکہ سارا عیب خود ان کی کمی عقل وفہم کا ہے

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس زریں اصول کی طرف اشارہ فرمایا کہ وظیفۂ نبوت کلیات واصول مہمہ اور عمومی ہدایات میں جزئیات وفروعی مسائل کا استنباط واستخراج وظیفہ مجتہد ہے، اس لیے کسی کامل الاجتہاد یعنی مجتہد مطلق کے متعلق ایسی کچی بات کہنا کہ اس نے سنت صحیح ثابتہ کی مخالفت یا اس کے صحیح جانشینوں نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھا، بڑی بے محل بات ہے جو اہل علم واصحاب انصاف کی شان سے بہت بعید ہے، درحقیقت تمام مجتہدین علوم نبوت کے صحیح خادم تھے پھر امام اعظمؒ کا درجہ تو تمام مجتہدین میں سے بہت بلند ہے اور ان کی فقہ ہر ہر فقہ پر فائق ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے تیس سال کے شبانہ روز درس و مطالعہ حدیث وتفسیر وغیرہ کے بعد فیصلہ فرمایا تھا کہ بجز ایک دو مسئلوں کے ہم نے تمام فقہ حنفی کو قرآن وحدیث سے مؤید پایا ہے امید ہے کہ انوار الباری کی اشاعت سے یہ حجت تمام ہو جائے گی **وما ذلک علی اللہ بعزیز**۔ائمہ مجتہدین کے کمال علم وفضل، بے نظیر ورع وتقویٰ اور خلوص وللہیت کے پیش نظر ہرگز یہ امر باور نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے محدود منصب اجتہاد سے آگے بڑھ کر حدود منصب نبوت میں کوئی قدم رکھا ہو، جن حضرات نے بھی اس قسم کا سوء ظن ائمہ مجتہدین کے بارے میں کیا ہے، وہ ان کی کھلی غلطی ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے فتنوں کے دروازے کھلے ہیں اور ایک جماعت کو ان لوگوں کے اقوال وآراء کی آڑ میں نئی نئی فتنہ سامانیوں کے لیے مواد ملتا رہتا ہے۔ **واللہ المستعان**۔

امام وکیعؒ (تلمیذ امام اعظم وشیخ اصحاب صحاح ستہ) سے کسی نے کہا تھا کہ امام صاحب نے خطا کی، تو آپ نے برجستہ اس کو جواب دیا تھا کہ امام ابوحنیفہ کیسے خطا کر سکتے ہیں؟ حالانکہ ان کے ساتھ امام ابو یوسف وزفر جیسے علم قیاس واستنباط کے ماہر وفاضل یحییٰ ابن ابی زائدہ حفص بن غیاث، حبان ومندل جیسے حفاظ حدیث، قاسم بن معن جیسے لغت وعربیت کے حاذق اور داؤد طائی، فضیل بن عیاض جیسے زہد وورع کے امام ہیں، کیونکہ امام صاحب اگر کہیں خطا بھی کرتے تو یہ لوگ ان کو صواب کی طرف لوٹا دیتے (انتقاء علامہ ابن عبدالبر وتاریخ خطیب بغدادی)

یہ بھی امام وکیع نے فرمایا تھا کہ لوگوں نے مغالطہ آمیزیاں کر کے ہمیں امام ابوحنیفہ سے چھڑانا چاہا تھا حتیٰ کہ وہ دنیا سے رخصت ہوئے اب تم اسی طرح ہمیں امام زفر سے چھڑانے کی سعی کرتے ہو تاکہ ہم ابن اسید اور ان کے اصحاب کے محتاج ہو جائیں (صفحہ ۳۱۳/مقدمہ انوار الباری)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ میں اعتراف کیا کہ امام صاحب قوانین کلیہ سے جزئیات کا حکم دریافت کرنے کا غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے، فن تخریج، مسائل کی باریکیوں پر اپنی دقیقہ رسی سے پوری طرح حاوی ہو جاتے تھے، فروع کی تخریج پر کامل طور پر توجہ فرماتے تھے، حضرت ابراہیم نخعی اور امام صاحب کے اقوال ومسائل کو اگر مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق اور کتاب الآثار امام محمد کی مرویات سے موازنہ کر کے دیکھو گے تو چند مسائل کے سوا سب میں اتفاق واتحاد پاؤ گے۔(حجۃ اللہ صفحہ ۱۵۱)

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی حالات میں ہم نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام صاحبؒ کے زمانہ کے بڑے بڑے محدثین وفقہاء نے اعتراف کیا تھا کہ امام صاحب ناسخ ومنسوخ احادیث وآثار کے بہت بڑے عالم تھے۔

پھر بھی خود امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی غایت احتیاط تھی کہ یہ بھی فرما گئے جب بھی کوئی حدیث صحیح میرے قول وفیصلہ کے خلاف مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔

مذکورہ بالا احوال وظروف میں حنفیہ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کسی صحیح حدیث غیر منسوخ پر عمل نہ کریں یا اس پر عمل نہ کرنے کے لیے حیلے حوالے تلاش کریں، البتہ جو زریں اصول حدیث انبساط احکام کے سلسلے میں ائمہ حنفیہ نے اپنے پیش نظر رکھے ہیں ان سے پوری واقفیت ہونی ضروری ہے ورنہ ہر الزام والہام کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے ان میں ۱۱۶ اہم اصول علامہ کوثریؒ نے تانیب کے صفحہ ۱۵۲ تا صفحہ ۱۵۴ میں ذکر کر دیے ہیں ان سے واقفیت علماء حنفیہ خصوصاً اساتذہ حدیث کو ضرور ہونی چاہیے تاکہ وہ مخالفوں کی مغالطہ آمیزیوں کا جواب دے سکیں جس طرح ان کے لیے کتب علم رجال کا پورا مطالعہ اور اس فن کے تمام نشیب وفراز پر متیقظانہ نظر رکھنا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں تانیب الخطیب، جواہر مضیہ فوائد بہیہ تقدمہ نصب الرایہ ذیول تذکرۃ الحفاظ ومع تعلیقات الکوثری) کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ **واللہ الموفق والمیسر**

حدیث کا دوسرا جملہ **ولکل امرئ مانویٰ** ہے اس سے مراد غایت وثمرۂ عمل ہے یا بعینہ وہی عمل' حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے دوسری شق کی طرف ہے کیونکہ ہر شخص آخرت میں اپنے عمل کو بعینہ موجود پائے گا۔قرآن مجید میں ہے **ووجدو اما عملو ا حاضراً** (کہ سب لوگ آخرت میں اپنے کئے ہوئے اعمال کو حاضر وموجود پائیں گے) گو جزاء عین عمل ہوگی' پس آگے حدیث کے جملے میں شرط وجزا کے متحد ہونے کا اعتراض بھی ختم ہوجاتا ہے اور تقدیر کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہی دنیا کے نیک اعمال' آخرت میں نعمتوں وراحتوں کی صورت اختیار کرلیں گے جس طرح برے اعمال تکالیف وعذاب کی شکل میں ہوجائیں گے'اس سے زیادہ تفصیل مسئلہ قدر میں آئے گی۔انشاءاللہ تعالیٰ۔

ثواب اعمال کے سلسلہ میں یہ امر بھی لائق ذکر ویاداشت ہے کہ امام غزالیؒ نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر کسی کام میں غرض دنیوی کی نیت غالب ہے تو اس میں کوئی ثواب نہیں ملے گا اور اگر غرض دینی غالب ہے تو بقدر اس کے ہی ثواب ملے گا' اگر دونوں برابر ہیں تب بھی اجر نہیں ملے گا' اگر کسی عبادت کی ابتداء میں نیت خالص تھی' پھر نیت میں اخلاص کے خلاف کوئی چیز آگئی تو ابوجعفر بن جریر طبری نے جمہور سلف سے نقل کیا کہ اعتبار ابتداء کا ہے اور بعد کو جو فساد نیت طاری ہوا' خدا کے فضل واحسان سے امید ہے کہ اس کو بخش دے اور اس کا عمل خیرا کارت نہ ہو' لہٰذا ہر نیک عمل کرنے والے کو چاہیئے کہ خشوع وخضوع لوجہ اللہ کے ساتھ ابتداء میں بھی نیت کی تصحیح کا پورا اہتمام کرے' پھر اس پر استقامت کی بھی پوری سعی کرے' اور خدا کی توفیق ونصرت کی ضرورت سے ہرگز غافل نہ ہو' انسان نہایت ضعیف وکمزور پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے یہ بات لائق صد ہزار شکر ہے کہ کسی نیک عمل کی توفیق حسن نیت واخلاص تام کے ساتھ اس کو حاصل ہوجائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس عالم میں اجسام ظاہر ہیں اور دلوں کے ارادے مستور ہیں' محشر میں صورت برعکس ہوجائے گی' اور تمام لوگ نیتوں کو اجساد کی طرح برملا دیکھیں گے' پس محشر محل ظہور نیات ہوگا' اسی لیے اگر کسی ایک عالم میں ایک ہزار نیتیں ہوں گی تو قیامت کے دن وہ عمل ایک ہزار اعمال کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ **واللہ علیٰ کل شیء قدیر۔**

۲- حدثنا عبداللہ[۱] بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃ ام المومنین رضی اللہ عنھا ان الحارث بن ھشام سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ! کیف یاتیک الوحیی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :۔احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت عنہ ماقال' واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول' قالت عائشۃ رضی اللہ عنھا ولقد رایتہ ینزل علیہ الوحیی فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنہ وان جبینہ لیتفصد عرقا۔

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کبھی تو وہ میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے جو مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے' اس کے آثار ختم ہونے تک میں وحی الٰہی کو پوری طرح محفوظ کرلیتا ہوں' اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے سامنے ہوتا ہے' پھر جو کلمات میں اس سے سنتا ہوں ان کو محفوظ کرلیتا ہوں' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کے وقت دیکھا کہ ختم وحی پر بھی آپ کی اطراف پیشانی مبارک سے پسینہ اس طرح بہتا تھا جیسے فصد لگا کر رگیں کھول دی گئی ہوں۔

تشریح:۔ انبیاء علیہم السلام پر وحی کا نزول بہت سے طریقوں پر ہوتا ہے ان کے خواب بھی وحی ہیں الہامات بھی وحی ہیں خدا کا فرشتہ جو کچھ نبی کے دل میں ڈالتا ہے وہ بھی وحی ہیں، کبھی فرشتہ اپنی اصل صورت میں پیغمبر کے پاس آتا ہے اور خدا کی طرف سے کلام کرتا ہے، وہ بھی وحی۔ ہے، کبھی حق تعالےٰ

[۱] حافظ حدیث' حجہ' ثقہ متفق علیہ' امام مالک' امام لیث بن سعد' اور شیخ عیسیٰ بن یونس کوفی (تلامذہ حدیث امام اعظمؒ) وغیرہ کے تلمیذ حدیث ہیں' امام بخاری' ترمذی' ابوداؤد' نسائی وغیرہ نے آپ سے روایت کی۔ ۲۱۸ھ میں وفات ہوئی رحمہ اللہ تعالےٰ (تہذیب وتذکرۃ الحفاظ)

جل ذکرہ، بلاواسطہ بھی نبی سے بات کرتے ہیں وہ بھی وحی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر، اور حضور اکرم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں کلام فرمایا وغیرہ، اس لیے یہاں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو طریقے نزول وحی کے بیان فرمائے اس سے چونکہ مقصود حصر نہیں ہے بلکہ آپ کے پاس جو خدا کی وحی سینکڑوں مرتبہ آئی ہے، ان میں سے بکثرت نزول وحی کے یہی دو طریقے تھے، ان کو ہی بیان فرمایا۔

گھنٹی کی آواز کی طرح

مقصد یہ ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل بلا انقطاع سنی جاتی ہے اور ہمارے کلام کی طرح اس میں الفاظ وکلمات کے جوڑ توڑ ابتدا وانتہا نہیں ہوتے اسی طرح اس قسم کی وحی بھی اترتی ہے خواہ اس کو فرشتہ کی آواز وحی کہیں یا اس کے پروں کی آواز (اس کو حافظ ابن حجر نے اختیار کیا ہے، یا حق تعالیٰ جل شانہ، کی صورت بلاتشبیہ۔ (اس آخری صورت کو ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ ترجیح دیتے تھے)

اگر اس صورت وحی کو فرشتہ کی آواز وحی قرار دیں گے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کو نقرات ٹیلیگرام سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح ٹیلی گرام کی کٹ کٹ کی مسلسل آواز سے اس کا جاننے والا مطلب سمجھ لیتا ہے، اسی طرح فرشتہ جو پیغام خدا کی طرف سے اس کے نبی کو پہنچا رہا ہے وہ اس کو سمجھ کر محفوظ کر لیتا ہے اور فرشتہ ایسی صورت میں اس نبی کو نظر نہیں آتا اور نہ وہ صورت متعارف کلام کی ہو جائے گی۔ (مشکلات القرآن صفحہ ۲۳۴)

بحث ونظر: ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اس موقعہ پر جو کچھ تحقیق فرمائی ہے وہ چونکہ نہایت اہم ہے اس لیے ہم مختلف یاداشتوں سے جمع کر کے یہاں ذکر کرتے ہیں:۔ آیت قرآنی **وما کان لبشران یکلمه الله الا وحیااو من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشاء' انه علی حکیم** (شوریٰ) کی تفسیر میں فرمایا کہ وحی وکلام خداوندی کی تین صورتیں ہیں' اول یہ کہ نبی وموحی الیہ کے باطن کو مسخر کر کے عالم قدس کی جانب متوجہ کر دیا جائے۔ پھر اس میں خدا کا کلام ووحی ڈالی جائے' اس صورت میں نبی کے جو اس ظاہری کو اس کلام کے سننے میں کچھ دخل نہیں ہوتا' اور نہ اس میں فرشتہ کا توسط ہوتا ہے' اسی لیے اس کو لفظ وحی سے تعبیر فرمایا۔ جس کے معنی خفی اشارہ کے ہیں' اس صورت میں انبیاء علیہم السلام کے الہامات ومنامات وغیرہ داخل ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کسی بندے سے پس پردہ کلام فرمائیں' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں کلام فرمایا[1]۔

---

[1] رہی یہ بحث کہ شب معراج میں کلام کے ساتھ دیدار خداوندی سے بھی مشرف ہوئے یا نہیں؟ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت میں کلام پس پردہ کی قید سے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ کلام کے وقت دیدار بوجہ حجاب نہیں ہوسکتا' مگر حدیث صحیح مسلم کی روشنی میں کہ دیدار خداوندی حجاب نور ہی کے ساتھ ہوسکتا ہے' ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلام ودیدار کا اجتماع بیک وقت بھی ممکن ہے۔ امام احمد نے بھی فرمایا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیدار خداوندی سے مشرف ہوئے' یہ دیکھنا ایسا تھا کہ جیسے ایک محب اپنے عظیم القدر محبوب کو اور غلام اپنے جلیل المرتبت آقا کو دیکھتا ہے کہ رعب جمال وجلال کے باعث نہ پوری طرح نظر بھر کر اس کی طرف دیکھ ہی سکتا ہے اور نہ ایسے قیمتی لحات میں اس کے جمال جہاں آرا کی طرف سے صرف نظر ہی کر سکتا ہے۔

چوری بکوئے دلبر پسا جان مضطر　　که مبادا بار دیگر نه رسی بدیں تمنا

دوسری طرف یہ حال ہے۔

فبد الينظر كيف لاح فلم يطق　　نظر اليه ورده اشجانه

(محبوب کا جمال جہاں آراء سامنے آیا تو بے ساختہ اس طرف نظر اٹھی مگر عاشق کے ہجراں نصیب' غمزدہ دل میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھ سکتا' اسی لیے وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا کہ محبوب کو کیسے اور کس حالت میں دیکھا۔

اشتاقة فاذابدا　　اطرقت من اجلاله

عاشق کہتا ہے کہ میں محبوب کے دیدار کا بے حد مشتاق رہتا ہوں مگر کیا کروں' جب وہ سامنے آتا ہے تو اس کے رعب جلال وجمال (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام خداوندی یا وحی بتوسط ملک آئے' پھر اس کی دوصورتیں ہیں' ایک یہ کہ خدا کا فرشتہ باطن نبی کو مسخر کرے' دوسرے یہ کہ وہ فرشتہ صورت بشر میں ظاہر ہوکر کلام کرے۔

اس تفسیر کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حدیث مذکور میں وراء حجاب والی صورت اور وحی خفی کے علاوہ توسط ملک والی دو کثیر الوقوع صورتوں کا ذکر ہے اور چونکہ حق تعالیٰ کے لیے صوت ثابت ہے' جیسا کہ امام بخاریؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے (ملاحظہ ہو بخاری کا باب خلق افعال العباد) اور میں بھی اسی کو حق سمجھتا ہوں' قید یہ ہے کہ صوت باری۔ اصوات مخلوق سے مشابہ نہیں ہے دوسری بات میرے نزدیک یہ ہے کہ صلصلۃ الجرس جیسی صوت وہ صوت باری تعالیٰ ہی ہے' کیونکہ اس کا ثبوت تین جگہ ملتا ہے' (۱) حضرت ربوبیت سے صدور کے وقت' تلقی (۲) ملک کے وقت اور (۳) جس وقت اس کو نبی تک پہنچاتا ہے پس اس وحی کا مبداء عرش الٰہی کے اوپر سے ہے اور منتہی نبی کریم تک ہے۔ اسی لیے طبرانی کی حدیث میں ہے کہ جب وحی اترتی ہے تو اس سے تمام آسمانوں کے رہنے والوں پر خوف وخشیت الٰہی سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سب سجدہ میں گر جاتے ہیں پھر سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سجدہ سے سر اٹھاتے ہیں اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرماتے ہیں' اس حدیث کی تخریج حافظ ابن حجر نے بھی باب قول اللہ عزوجل ''ولا تنفع الشفاعة'' میں کی ہے۔

پھر یہ بات کہ یہ صورت باری تعالیٰ جس طرح اہل سمٰوات کو پہنچتی ہے' اسی طرح بعینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے یا درمیان میں فرشتہ اس کو لے کر محفوظ کر لیتا ہے اور نبی تک پہنچاتا ہے' جس طرح آج کل آوازوں کو فونوغراف میں محفوظ کر لیا جاتا ہے چونکہ ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں ملی۔ اور حدیث میں بھی اس کی طرف تعرض نہیں کیا گیا' اس لیے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا' تاہم یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ ایک ہی چیز ہے جو وہاں سے چل کر یہاں تک پہنچتی ہے[1] 'اس صورت میں چونکہ فرشتہ کا نزول قلب نبی پر ہوتا ہے' اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) سے مجبور ہوکر اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب عشق مجازی میں یہ کیفیت ہوتی ہے تو عشق حقیقی کا مرتبہ تو اس سے کہیں بلند و برتر ہے' یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کے دیدار کی دنیا میں بحالت بیداری بہت کم نوبت آتی ہے بلکہ سرور کائنات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سواء دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی کوئی نقل نہیں ملتی' البتہ منامی دیدار کے کچھ واقعات دوسروں کے لیے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہوا ہے کہ آپ حق تعالیٰ کے دیدار پرانوار سے اپنی زندگی میں ایک سو بار مشرف ہوئے۔ واللہ اعلم وعلمه اتم واحكم۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب نے اس موقعہ پر درس بخاری شریف میں یہ بھی فرمایا کہ شاید ایسا ہوا ہو کہ سرور کائنات علیہ الف الف تسلیمات وتحیات ابتداء میں ''وحی نبوت'' سے مشرف ہوتے رہے اور آخر میں ''عیانی روایت'' سے بہرہ اندوز ہوئے' جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے کلام کلام سے مشرف ہوئے اس کے بعد رؤیت سے' پھر یہ خدا کے علم میں ہے کہ آپ پر غشی رؤیت سے قبل طاری ہوئی یا روئیت کے بعد' اسی لیے سورہ نجم میں سرور کائنات کے لیے دیدار الٰہی کی تصریح فرمادیا کہ وہ رؤیت دل ونگاہ دونوں سے ہوئی' اور بغیر طغیانی وزیغ ہوئی۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر سورہ نجم کی مکمل تفسیر قابل دید ہے جو علوم وحقائق کا خزینہ ہے' اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم اس کو یہاں ضرور ذکر کرتے۔ (دیکھو مشکلات القرآن صفحہ ۲۴۰ تا صفحہ ۲۶۴)

[1] قرآن مجید کی سورۃ معارج کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تک روح وملائکہ کا عروج ایک دن میں ہوتا ہے' جس کی بڑائی دنیا والوں کے حساب سے پچاس ہزار سال کی ہے' حالانکہ خدا کے فرشتے پل پل کی خبریں وہاں پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور حدیث میں آتا کہ مرنے کی بعد نیک مرد مومن کی روح کو فرشتے خوشبودار ریشمی کپڑوں میں ملبوس کر کے عرش الٰہی کے سامنے لے جاتے ہیں تا کہ خدا کے سامنے سجدہ کرے' تو اتنی عظیم سافت کو روح بھی آن کی آن میں طے کر لیتی ہے اور اس کے بعد واپس ہوکر قبر کے سوال وجواب کے وقت آموجود ہوئی ہے' ان سب حیرت انگیز چیزوں کا عرصہ قبل تک سمجھنا بوجھنا ہماری محدود عقول کے لیے کچھ دشوار تھا۔ مگر اس دور کی مادی ترقیات اور سائنس کی جدید ایجادات نے اس کو سہل کر دیا ہے۔ دیکھئے ہماری بشری مادی ضعیف آواز جو عام حالات میں بمشکل میل دو میل جاسکتی ہے' ریڈیو کی لاسلکی امواج کے ذریعہ ایک منٹ کے کچھ حصے میں ساری دنیا کے لوگوں کو سنائی جاسکتی ہے' پھر روح روحانیت' جن وملائکہ جیسی لطیف چیزوں کا کیا کہنا ہے' اور خداوند تعالیٰ کی صوت وحی اگر اس عظیم مسافت کو طے کر کے آن کی آن میں نبی کے قلب منور تک آجاتے تو اس میں کیا استبعاد رہا؟

اس تفصیل کے بعد وحی الٰہی کی نہ صرف عظمت قلب میں جاگزیں ہوتی ہے بلکہ اس کی عصمت بھی واضح ہو جاتی ہے' اول تو یوں بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نبی بغیر واسطۂ سمع کے کلام خداوندی کو سمجھتا ہے اور دل میں محفوظ کرتا ہے اس لیے صلصلۃ الجرس والی صورت فرشتہ کے بصورت بشر یا اپنی اصلی صورت میں آکر کلام کرنے کی صورت سے الگ ہوگئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس آیت کے تحت صفحہ ۳۰۶/۸ و صفحہ ۳۰۷/۸ میں چند احادیث نقل کی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ والنجم تلاوت فرمائی اور افرأیتم اللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجیٰ' یہ کلمات بھی ادا کرادیے (نعوذ باللہ) جس پر مشرکین بھی سجدہ میں گر گئے اور خوش ہوئے کہ ہمارے خداؤں کا ذکر آپ نے بھلائی سے کیا' پھر اسی کے بارے میں یہ آیت بالا نازل ہوئی۔

پھر حافظؒ نے لکھا کہ یہ احادیث روایتی نقطہ نظر سے اگرچہ ضعیف یا منقطع ہیں' مگر کثرت طرق اس امر کا ثبوت ہے کہ اس قصہ کی کوئی اصلیت ضرور ہے' پھر یہی قصہ طبری کی روایت کردہ دو مرسل احادیث سے بھی ثابت ہے' جن کے رجال صحیحین کی شرط پر ہیں' پھر حافظ نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن العربیؒ نے اپنی حسب عادت بڑی جرأت سے کام لے کر کہہ دیا کہ طبری نے جو روایات اس سلسلہ میں روایت کی ہیں وہ بالکل بے اصل اور باطل ہیں' پھر لکھا کہ ابوبکر بن العربی کا اس طرح منہ بھرا' ادعا قابل رد ہے' اسی طرح عیاض کا یہ قول بھی ہے کہ اس قصہ کی حدیث کی کسی اہل صحت محدث نے تخریج نہیں کی اور نہ کسی ثقہ راوی نے اس کو بے داغ سند متصل سے روایت کیا ہے پھر اس کے ناقلین بھی ضعیف' روایات بھی مضطرب اور اسناد بھی منقطع ہیں' اور اسی طرح عیاض کا یہ قول کہ تابعین و مفسرین میں سے جن حضرات سے یہ قصہ نقل کیا گیا ہے خود انہوں نے بھی اس کو سند کے ساتھ مرفوع نہیں کیا' اور اکثر طرق ان سے اس بارے میں ضعیف اور واہی ہیں' پھر عیاض نے بطرق روایت بھی تردید کی اور کہا کہ اگر ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسی وقت مرتد ہوجاتے' حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔

اس کے بعد حافظ نے لکھا ہے کہ یہ تمام باتیں قواعد واصول کے خلاف ہیں کیونکہ جب طرق روایت کثیر ہوں اور ان کے مخارج متباین ہوں تو یہ اس امر کا ثبوت ضروری کہ اس واقعہ کی اصل ہے اور میں بتلا چکا ہوں کہ ان روایات میں سے تین اسنادیں شرط صحیح پر ہیں' اور وہ مراسیل ہیں جو حجت ہیں۔

پھر حافظ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اس واقعہ کی صحت متعین ہوچکی تو چونکہ ایسا ہونا عصمت وحی وعصمت انبیاء کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کی تاویل بھی کرنی ضروری ہے کیونکہ پیغمبر کی زبان سے قرآن مجید کے کلمات پر ایک حرف کی زیادتی بھی عمداً یا سہواً ناممکن ہے' پھر حافظ نے اس واقعہ کی چند تاویلات ذکر کیں اور ان کی تردید بھی بیان کی جو ابن العربی وحضرت عیاض سے منقول ہے آخر میں حافظ نے ایک توجیہ کو احسن الوجوہ (بہترین توجیہات) قرار دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرمارہے ہوں کہ شیطان نے آیت مذکورہ کے درمیانی سکتوں میں ایک جگہ موقعہ پاکر آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ کلمات کہہ دیے جس کو کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ کلمات بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ادا فرمائے ہیں' حالانکہ ایسا واقع میں نہیں ہوا۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری میں حافظ کی ذکر کردہ اس توجیہ کا ذکر فرما کر فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک یہ بھی ممکن نہیں کہ نبی کے لہجہ وآواز کی نقل شیطان کرسکے' ورنہ اس سے بھی ''عصمت وحی'' پر حرف آتا ہے' ہاں یہ ممکن ہے کہ حاضرین مجلس میں چونکہ مشرکین مکہ بھی تھے' ان میں سے کسی نے اپنی جگہ پر یہ کلمات ادا کیے ہوں جس سے وحی الٰہی اور نبی کی قرأت پر کوئی اثر نہیں پڑتا مشرکین مکہ کی زبان پر تو یہ کلمات خوب چڑھے ہوئے تھے' وہ ان کا ورد کرتے تھے اور طواف میں بھی یہی کلمات کہا کرتے تھے (دیکھو معجم البلدان الیاقوت)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) صوت خداوندی اصوات مخلوقین سے الگ اور ممتاز (لیس کمثلہ شیء) پھر وہ جس شان واہتمام سے عرش الٰہی سے قلب نبی تک آتی ہے وہ دنیا کے حفاظتی نظام کے مقابلہ میں غایت درجہ محفوظ' جبرئیل علیہ السلام تک تو کسی کی دراندازی ممکن ہی نہیں' اور وہاں سے نبی ومرسل خداوندی تک بھی فرشتوں کا زبردست حفاظتی پہرہ' اس لیے وحی الٰہی کا کوئی حرف باہر جاسکے نہ باہر کی کوئی چیز اس کے اندر آسکے۔

غرض حافظ ابن حجرؒ کا حدیث مذکور کو کثرت طرق وغیرہ سے استدال کر کے قابل وثوق قرار دینا صحیح نہیں‘ نہ یہ اصول روایت کے مطابق ہے نہ اصول محدثین پر‘ کیونکہ مراسیل کو حجت ماننے والے بھی صرف ثبوت احکام میں ان کو حجت مانتے ہیں نہ کہ عقائد وایمانیات میں) کیونکہ عقائد وایمانیات کے لیے دلیل مثبت قطعی کا وجود ضروری ہے‘ اخبار آحاد ظنی ہیں جن سے کسی عقیدہ قطعیہ کا ثبوت نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ ان سے کسی عقیدہ ثابتہ کا ابطال ہو اور ظاہر ہے کہ عصمت رسول اور عصمت وحی الٰہی کا عقیدہ تو مدار اسلام و اسلامیات ہے‘ اس کو اخبار احاد سے مخدوش کرنا‘ پھر تاویلات کی تلاش کرنا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے۔

علامہ نوویؒ نے فرمایا کہ جو اخباریوں اور مفسروں نے سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے معبودان مشرکین کی مدح کے کلمات جاری ہونے کے بارے میں روایت کیا ہے وہ قطعاً باطل ہے‘ اس بارے میں نقل صحیح و عقل سلیم کی رو سے کچھ ثابت نہیں ہے۔

علمی فائدہ:۔ اس موقعہ پر ایک دوسرا بھی اہم فائدہ قابل ذکر ہے کہ سورۂ حج میں ایک آیت ہے **وما رسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیته** ہمارے حضرت شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر وہ پسند فرمائی ہے جو حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ‘ سے ''ابریز'' میں منقول ہے کہ ''حق تعالیٰ نے جو نبی ورسول بھی کسی امت کی طرف بھیجا ہے وہ اپنی امت کے ایمان لے آنے کی اُمید و تمنا کیا کرتا تھا مگر شیطان ان لوگوں کے قلب میں وساوس اور شبہات ڈال کر زیغ پیدا کرتا تھا‘ پس جن کے دلوں میں وہ خطرات جم گئے‘ وہ ان کے لئے موجب کفر ہوگئے اور جن پر خدا نے فضل فرمایا ان کے خطرات مٹا دیئے‘ اور اپنی توحید ورسالت کی نشانیاں ان کے قلوب میں مستحکم کردیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وساوس وخطرات تو دونوں فریق کے دل میں ڈالے جاتے ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ جن پر خدا کا فضل ہوتا ہے ان کے قلوب پر ان کا بقا نہیں ہوتا اور جن نا (اہلوں) پر اس کا فضل واحسان نہیں ہوتا‘ ان کے قلوب سے شیطان کے القاء کئے ہوئے وساوس وشبہات دور نہیں ہوتے۔

حسن اتفاق سے اس موقعہ پر حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ کا ذکر خیر آ گیا تو چند کلمات اور بھی لکھے جاتے ہیں‘ یہ بارہویں صدی کے قائلین شریعت وطریقت میں سے تھے اور باوجود امی ہونے کے‘ ان سے نہایت بلند پایہ اور گرانقدر علوم نبوت منقول ہوئے ہیں‘ امت محمدیہ میں ایسے کاملین کا وجود‘ انبیاء ومرسلین کے علوم وکمالات کے علم ویقین کا بڑا ذریعہ ہیں کہ ان کے علمی وعملی کمالات بھی ظاہری تعلیم وتربیت کے بغیر‘ صرف خدائے برتر کے فضل وانعام کا ثمرہ ہوتے ہیں‘ شیخ عبدالعزیز دباغ کو باوجود امی ہونے کے ایسا روشن دل ودماغ عطا ہوا تھا کہ وہ عام احادیث اور احادیث قدسیہ کے درمیان فرق کر لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ان دونوں کے انوار الگ الگ ہیں‘ صحیح احادیث کو موضوع احادیث سے الگ کر دیتے تھے‘ اور فرماتے کہ موضوع میں نور نبوت نہیں ہے‘ بعض مرتبہ صحیح حدیث میں موضوع حدیث کا کچھ حصہ شامل کر کے دریافت کیا گیا تو فوراً فرمایا کہ اتنی صحیح ہے اور اس قدر اس میں موضوع شامل ہے‘ تمام انبیاء علیہم السلام کے حالات مفصل اس طرح بیان فرمایا کرتے تھے کہ جیسے خود ان کے ساتھ زندگی گذاری ہو۔ بہ کثرت مشکلات قرآن وحدیث کو براہ راست سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے رجوع فرما کر شافی جواب مرحمت فرماتے تھے۔

ان کے افادات جلیلہ کا مجموعہ ''ابریز'' کی صورت میں شائع ہو چکا ہے‘ تفسیری حصہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ ان کے تلمیذ ومستفید خاص شیخ احمد مرتب ''ابریز'' نے قصۂ غرانیق کے بارے میں سوال کیا کہ اس میں حضرت عیاض وغیرہ حق پر ہیں جو اس قصہ کے وقوع کا انکار کرتے ہیں‘ یا حافظ ابن حجر جو اس کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر کی پوری بحث نقل کی (جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) تو حضرت شیخ نے جواب میں فرمایا کہ ''حق وصواب ابن العربی اور حضرت عیاض اور ان کے موافقت کرنے والے محدثین کے ساتھ ہے'' غرانیق والا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً وقوع میں نہیں آیا‘ اور مجھے بعض علماء کے کلام پر بڑا تعجب ہوتا ہے جیسے یہی قول حافظ ابن حجر سے صادر ہوا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قصہ

کا ذرا سا حصہ بھی صحیح ہو تو نہ شریعت پر اعتماد قائم رہے گا اور نہ عصمت انبیاء کا حکم باقی رہے گا' اور رسول خدا کی شان ایک عامی انسان کی سی رہ جائے گی کہ آپ اور آپ کے کلام پر شیطان کا تسلط ہوا؛ اور اتنا تسلط ہوا کہ جس بات کے زبان سے نکالنے کا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا اور نہ وہ آپ کو پسند تھی' وہ شیطان نے آپ کی زبان سے نکلوادی۔

اتنی بڑی بات اگر وقوع میں آجاتی تو رسالت پر وثوق کیسے رہتا۔ پھر فرمایا کہ مومن پر واجب ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے' جو دین میں شبہات پیدا کریں' قطعاً منہ پھیر لیں اور ان کو دیوار پر پھینک ماریں (کیونکہ وہ صحت کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت کا وہ عقیدہ رکھیں جو آپ کو شایان ہے' خصوصاً آپ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس سے اوپر کسی مخلوق کا مرتبہ نہیں"۔ (ابریز صفحہ ۱۴۳ اور صفحہ ۱۴۴)

اسی موقعہ پر ابریز میں ایک دوسرا سوال بھی درج ہے کہ میں نے ہاروت و ماروت کے قصہ کی بابت دریافت کیا کہ اس میں بھی حضرت عیاض اور ابن حجر کا ایسا ہی اختلاف ہے' حضرت عیاض انکار کرتے ہیں اور ابن حجر واقعہ بتلاتے ہیں" فرمایا اس میں بھی حق حضرت عیاض کے ساتھ ہے اور قصہ بالکل غلط ہے'۔

یہاں عظمت و عصمت وحی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ احادیث کی صحت و ضعف وغیرہ کے بارے میں حافظ ابن حجر یا اور کسی بڑے محدث کا فیصلہ قطعی حجت نہیں ہے اور اصولی طور پر یہ امر ہر اختلاف کے موقعہ میں نہایت ضروری و اہم ہے کہ دوسرے اکابر محدثین کی تحقیق بھی دریافت کی جائے تا کہ بات اچھی طرح نکھر کر سامنے آجائے' ائمہ احناف اور ان کے مسلک قویم کے خلاف بھی جو کچھ دراز دستیاں ہوئیں وہ زیادہ تر بعض اکابر کے یک طرفہ رجحانات' تعصب مذہبی یا رواۃ کے بے جا نقد و جرح کے باعث ہوئیں اس لیے حدیثی تحقیقات کا معیار ہر تنگ نظری و تعصب سے بالا تر ہونا چاہیے ورنہ وہ "بجائے خدمت حدیث" کے اپنے اپنے رجحانات و نظریات کی خدمت کہلانے کی زیادہ مستحق ہوں گی و اللہ الموفق

دوسری اہم بات یہ ہے کہ باوجود اصول و عقائد مسلم اسلامیہ اور اصول محکمہ قرآن و حدیث اور اصول درایت کے خلاف ہونے کے بھی محض تعدد طرق سے کسی امر کو ثابت کر دینا اصول محدثین پر بھی درست نہیں ہو سکتا' اور امام اعظم کا مسلک اجتہاد اور طریق استخراج احکام اسی لیے زیادہ محکم و مضبوط رہا ہے کہ انہوں نے عہد نبوت و صحابہ کے قریب ترین دور میں...... (اور سب ائمہ مجتہدین سے پہلے اصول و عقائد اسلام پر نظر کی' قرآن و حدیث سے اصولی احکام کا کھوج لگا کر غیر منصوص احکام کے استخراج کے لیے نہایت مستحکم اصول منضبط کئے' احادیث احکام میں سے ناسخ و منسوخ پر کڑی نظر ڈالی (اسی لیے ان کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم احادیث منسوخہ و ناسخہ تسلیم کیا گیا ہے) پھر اسی کے ساتھ آپ کی نظر آثار صحابہ' تعامل صحابہ اور فتاویٰ تابعین پر بھی بڑی گہری تھی۔ آپ اور آپ کے رفقاء تدوین فقہ تک جتنی احادیث پہنچیں' ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک واسطے بہت کم تھے اور بقول علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ وہ سب ثقہ راویوں کے تھے' اس لیے فقہ حنفی کے اصول پر جو احکام کی تخریج ہوئی وہ بعد کے طرق اجتہاد و اصول استنباط نیز طرق محدثین مابعد کے لحاظ سے بہت زیادہ فائق' معتمد اور اسلم تھی۔ و اللہ اعلم و علمہ اتم و احکم

انبیاء علیہم السلام کا سب سے بڑا وصف امتیازی وحی ہے

واضح ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی سب سے بڑی خصوصیت و وصف امتیازی وحی الٰہی ہے جس کا نزول اجلال ہمارے پیغمبر سرور کائنات، فخر موجودات علیہ افضل الصلوٰات والتسلیمات پر سب سے زیادہ اہتمام و شان سے ہوا ہے حتیٰ کہ آپ پر نازل شدہ وحی کا ایک بڑا حصہ وحی متلو قرار پایا، جو قرآن مجید کی شکل میں حرف بحرف محفوظ ہے اور قیام قیامت تک اس کی حفاظت کا وعدہ خود رب العزت جل شانہ، نے فرمایا ہے اس کے بعد احادیث قدسیہ، احادیث متواترہ، احادیث مشہورہ اور پھر اخبار آحاد وغیرہ ہیں۔ یہ سب وحی الٰہی اور علوم نبوت کا گرانقدر ذخیرہ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دور بعثت کی مختصر مدت (بیس سال کہ تین سال فترت وحی کے نکل جاتے ہیں) میں وحی کا نزول ہزار بار ہوا

بعض دفعہ ایک ایک دن میں دس دس بار بھی ہوا ہے جو آپ کی بہت بڑی خصوصیت بن جاتی ہے، کسی جگہ پر یہ بھی نظر سے گذرا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (ارواحنا فداہ) پر چوبیس ہزار بار نزول وحی ہوا ہے۔ جب کہ حضرت آدم علیہ السلام پر دس بار، حضرت نوح علیہ السلام پر پچاس بار، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ۴۸ بار اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دس بار نزول وحی کا ذکر ملتا ہے۔

چونکہ اس دنیا کی ہدایت کے لئے آخری امت "خیر الامم" کے آخری پیغمبر پر کامل ومکمل دین آچکا' اور وحی الٰہی کا باران رحمت کی طرح بہ کثرت نزول ہو کر نعمت الٰہی کی تکمیل ہو چکی نیز خدائے برتر نے ہمیشہ کے لیے دین اسلام کو اپنا محبوب برگزیدہ وپسندیدہ دین قرار دے دیا۔ اس لیے وحی ونبوت بھی ہمیشہ کے ختم ہو چکی، جس کا شاہی اعلان بھی حجۃ الوداع کے موقع پر ہزاروں ہزار صحابہ کے مجمع میں کر دیا گیا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

برکات وانوار نبوت ونزول وحی

حرمین شریفین میں سرور انبیاء ومرسلین سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک کے برکات وانوار' اور وحی الٰہی کے شب وروز نزول سے حق تعالیٰ کی مسلسل وبے پایاں رحمتوں کا جو ایک زریں دور گذرا ہے' اس کی نظیر سے اس دنیا کی پوری تاریخ خالی ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا جس قدر غیر معمولی صدمہ تھا اس سے بھی زیادہ وحی الٰہی کا منقطع ہو جانے کا تھا۔

حضرت انسؓ سے مسلم شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ' نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اُم ایمن کے یہاں چلیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے یہاں جایا کرتے تھے' جب یہ دونوں حضرات ان کے پاس پہنچے تو وہ بے اختیار رو پڑیں' انہوں نے کہا کہ آپ کیوں روتی ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حق تعالیٰ کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عیش وراحت کے سامان ہیں؟ اس کے بعد ام ایمن کا جواب سنئے' کتنے اونچے درجے کی بات کہی ہے فرمایا:۔ میں اس پر نہیں روتی' یہ میں بھی خوب جانتی ہوں کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں کمال درجہ کی راحتیں موجود ہیں' البتہ اس لئے پر روتی ہوں کہ آپ کے بعد آسمان سے نزول وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔"

یہ بات کہہ کر ام ایمن نے ان دونوں حضرات کو بھی خوب خوب رلایا اور وہ بھی ان کے ساتھ روتی رہیں' اس حدیث سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام اور صحابیات صالحات کی مبارک آنکھوں نے کیا کیا دیکھا تھا اور ان کے نورانی قلوب نے کیا کچھ پایا تھا۔ یہ ام ایمن کون تھیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ باندی' جو آپ کو اپنے والد ماجد کے ترکہ میں ملی تھیں اور چونکہ انہوں نے بچپن میں آپ کی خدمت آیا کی طرح انجام دی تھی' اس لیے آپ اُن کا اکرام ماں کی طرح فرماتے تھے' اور اُن کی ملاقات کیلئے بھی گھر پر تشریف لے جایا کرتے تھے مگر آپ نے دیکھا کہ اس باندی صحابیہ کا ایمان کتنا قوی اور معرفت کتنی اونچی تھی اس لیے ان کے ایک جملے نے ایسے دو بڑے جلیل القدر صحابہ کو رونے پر مجبور کر دیا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ وحی ونبوت کا سلسلہ ختم ہو جانے سے یہ لازم نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام یا دوسرے فرشتوں کے نزول کا سلسلہ بھی دنیا سے منقطع ہو گیا' چنانچہ اس امر کی وضاحت حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاوی میں کی ہے۔

ابتداء نبوت ونزول قرآن مجید

حضرت شعبی سے روایت ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی' ابتداء نبوت میں تین سال تک حضرت اسرافیل علیہ السلام آپ

انبیاء علیہم السلام کے خصائص' پھر اس میں سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اخص خصائص کا تذکرہ نہایت اہم موضوع ہے اس پر مستقل تصانیف کی ضرورت ہے' علامہ سیوطی وغیرہ نے اس کی طرف توجہ کی مگر ہماری اردو زبان کی کتب سیرۃ مقدسہ میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے' تاہم ہمارے مخدوم ومحترم حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی دام ظلہم نے اپنی گرانقدر تصنیف "ترجمان السنۃ" جلد سوم میں اس پر نہایت نافع اور مفصل کلام کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ جزاھم اللہ تعالیٰ۔

کے ہمراہ رہے اور کبھی کوئی کلمہ اور کبھی کوئی بات آپ کو بتلاتے رہے اس وقت تک قرآن مجید نہیں اترا تھا' تین سال گذرنے پر آپ کی نبوت کا تعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قائم کر دیا گیا تھا اور بیس سال تک ان کے توسط سے قرآن مجید کا نزول ہوتا رہا دس سال مکہ معظمہ میں اور دس سال مدینہ منورہ میں اس کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ احمد)

نبی کے دل میں فرشتے کا القاء بھی وحی ہے

جس طرح حق تعالےٰ کی طرف سے نبی کے قلب پر کوئی بات القا ہوتی ہے اور اس کو وحی الہامی کہتے ہیں'......اسی الہام کے تحت وہ صورت بھی ہے کہ فرشتہ نظر نہ آئے اور نبی کے قلب پر کسی بات کا القاء کرے چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے لوگو! جو بات بھی تمہیں جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے دور کرنے والی تھی وہ سب تمہیں بتا چکا ہوں اور جتنی باتیں دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کرنے والی تھیں ان سے بھی تمہیں روک چکا ہوں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے میرے قلب میں یہ بات بھی القاء فرمائی ہے کہ کسی جان کو اس وقت تک موت نہ آئے گی جب تک وہ اپنے مقدر کا رزق دنیا میں پورا نہ کرلے۔ دیکھو خدا سے ڈرتے رہو اور طلب رزق میں بھلائی کا راستہ اختیار کرو ایسا نہ ہو کہ رزق پہنچنے میں دیر ہو تو خدا کی نافرمانی کے راستوں سے رزق حاصل کرنے لگو' کیونکہ خدا تعالےٰ کے قبضہ واختیار میں جو کچھ ہے اس کو صرف اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہی کے راستوں سے حاصل کرنا موزوں ہوسکتا ہے (رواہ البیہقی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک منظر

صفوان بن یعلی کا بیان ہے کہ ان کے والد حضرت یعلی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہو تو مجھے بھی اس مبارک منظر کی زیارت کرا دیجئے گا' اس کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں صحابہ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ ایک شخص کے جسم پر خوب خوشبو لگی ہو۔ اور وہ احرام باندھ لے تو اس کے بعد کیا کرے؟ آپ کچھ خاموش ہوئے اور وحی کا نزول شروع ہو گیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے وجود مبارک پر ایک کپڑا ڈھانک دیا اور یعلی کو قریب بلایا' انہوں نے اپنا سر اندر داخل کیا تو دیکھا کہ حضور کا چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا ہے اور وحی کے شدید آثار سے آپ کا دم گھٹا جا رہا ہے' اس کے بعد جب وہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے سائل کو بلا کر بتلایا کہ خوشبو کو تین بار دھو ڈالے اور جبہ اتار دے پھر جس طرح حج ہوتا ہے کرے۔ (بخاری)

مسلم شریف کی حدیث عبادہ میں یہ بھی ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تو اس کی شدت سے آپ کا چہرۂ مبارک متغیر ہو جاتا اور آپ اپنا سر مبارک جھکا لیتے تھے' جس کے ساتھ حضرات صحابہ بھی اپنے سروں کو جھکا لیتے تھے۔

وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف نظر اٹھانا

حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابۂ کرام کی مجلس میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے تھے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے (ابوداؤد)

یہ نظریں اٹھانا وحی کے انتظار میں ہوتا تھا جیسا کہ تحویل قبلہ کے موقع پر بھی آپ کا آسمان کی طرف نظریں اٹھانا قرآن مجید میں مذکور ہے۔

شدۃ وحی کی کیفیت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم سے سوال کیا کہ جب آپ پر وحی اترتی ہے تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ فرمایا پہلے میں گھنٹیوں کی سی آواز سنتا ہوں' پھر اس وقت مجھ پر مکمل سکوت طاری ہو جاتا ہے اور جب کبھی وحی آتی ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میری جان ابھی نکل جائے گی (رواہ احمد)

وحی الٰہی کا ثقل عظمت

بخاری شریف میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ جس وقت کلمہ غیر اولی الضرر نازل ہوا تو میری ران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران سے ملی ہوئی تھی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری ران ٹوٹ کر چور چور ہو جائے گی، جب صرف ایک کلمہ کی وحی کا وزن اس قدر قریب بیٹھنے والے صحابی نے محسوس کیا تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا وزن کتنا معلوم ہوا ہوگا اور اسی سے آپ کے غیر معمولی امتیاز و عظمت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے قرآن مجید کے ہزاراں ہزار کلمات کی وحی عظیم کا بار آپ نے برداشت کیا اور ہزار ہا مرتبہ حق تعالیٰ کی ہم کلامی سے مشرف ہوئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بہ روایت مسلم شریف فرماتے ہیں کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتی تھی تو جب تک وہ تمام نہ ہو لیتی ہم میں سے کسی کی طاقت نہ تھی کہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتی تو اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے تو وحی کے وزن وعظمت کے سبب وہ بھی اپنی گردن نیچے ڈال دیتی تھی اور جب تک وحی ختم نہ ہو جاتی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی تھی۔ پھر حضرت عائشہؓ نے آیت ''انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً'' تلاوت فرمائی (رواہ احمد)

حضرت ابواروی دوسی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے اور وحی آجاتی تو میں نے دیکھا ہے کہ وحی کی عظمت و وزن کے سبب وہ اونٹنی آواز کرتی اور اپنے اگلے پیر اس طرح ادلتی بدلتی کہ مجھے یہ گمان ہوتا کہ اس کے بازو ٹوٹے جاتے ہیں، کبھی بیٹھ جاتی اور کبھی اپنے پیروں پر پورا زور دے کر کھڑی ہوتی اور سنبھلتی تا آنکہ وحی ختم ہو جاتی، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرات موتیوں کی طرح ٹپ ٹپ گرتے ہوتے تھے (خصائص کبریٰ)

یہاں ہم نے وحی الٰہی کی عظمت کا تعارف کرانے کے لیے کسی قدر تفصیل سے کام لیا تا کہ علوم نبوت کی عظمت و سیادت کا سکہ ناظرین انوار الباری کے دلوں میں قائم ہو جائے اور وہ وحی خداوندی (قرآن وحدیث) کے انوار و برکات، فوائد و منافع سے اپنے دامنوں کو مالا مال کرنے کی طرف پوری توجہ صرف کریں۔ وفقھم اللہ وایانا لما یحب و یرضی۔ آمین۔

سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور علمی ترقیات کا دور

حضور اکرم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا معجزہ ''علمی'' یعنی قرآن مجید عطا ہوا ہے جس کی برکت سے ساری دنیا کے لیے علمی ترقیات کے دروازے کھل گئے اور آپ کی امت نے مادی و روحانی علوم و کمالات میں وہ ترقی کی پہلی امتوں میں اس کا ادنیٰ نمونہ بھی نہیں ملتا، گویا دنیا کی زندگی کے تمام ادوار میں سے صرف اس دور کو علمی ترقی کا دور کہنا درست ہو سکتا ہے واضح ہو کہ جس طرح آپ کی امت میں آپ کے متبعین مومنین ہیں کہ ان کو امت اجابت کہتے ہیں، اسی طرح تمام دنیا کے کفار و مشرکین بھی داخل ہیں کہ ان کو امت دعوت کہا جاتا ہے، ان لوگوں نے چونکہ آپ کا لایا ہوا دین اسلام قبول نہیں کیا، اس لیے صرف آپ کی دعوت عامہ کے تحت آپ کی امت کہلانے کے مستحق ہوئے، غرض دنیا کے لوگوں کی موجودہ تمام علمی ترقیات آپ کے علمی کمالات و علمی معجزے کے طفیل وصدقہ میں ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ آج بہ کثرت مسلمانوں میں بھی اس قدر جہالت ہے کہ وہ قرآن وحدیث اور کتب دینیہ کے صحیح علم واحترام سے بے شعور و غافل ہیں۔

قرآن مجید کا ادب واحترام

شاہان اسلام کے حالات میں ایک واقعہ نظر سے گذرا تھا کہ ایک بادشاہ سیر و شکار میں تنہا رہ کر کسی قریہ میں ایک دیہاتی مسلمان کا

مہمان ہوا' شب کو جس دالان میں وہ مقیم ہوا تو دیکھا کہ اس کے ایک طاق میں قرآن مجید رکھا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر اس کی عظمت وجلالت اس کے دل ودماغ پر چھا گئی اور ساری رات ایک گوشے میں بیٹھ کر جاگتے ہوئے صبح کر دی' لیٹا یا سویا صرف اس لئے نہیں کہ قرآن مجید کا ادب اسے مانع رہا' اور یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ اپنے آرام کی وجہ سے اس عظیم المرتبت وحی الٰہی کو کسی دوسرے کمرے میں منتقل کرا دے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اس بادشاہ کو مرنے کے بعد سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے خواب میں دیکھا' پوچھا! خدا نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ بخش دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس رات کا میرا جاگنا اور قرآن مجید کا اس قدر احترام کرنا پسند آ گیا تھا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ قرآن مجید کھول کر تلاوت کا ارادہ فرماتے تو اس کی عظمت کا تصور کر کے بے ہوش ہو جاتے تھے اور زبان پر یہ کلمہ جاری ہو جاتا تھا ''**هذا كلام و بى هذا كلام ربى**'' (یہ کلام میرے رب کا ہے' حضور اکرم فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ساری رات اس آیت کی بار بار تلاوت میں گزاری **ان تعذ بهم فانهم عبادك ' وان تغفرلهم فانك انت العزيز الحكيم**'' (بارالٰہا! ان گناہ گار بندوں کو آپ عذاب دینا چاہیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر مغفرت فرما دیں تو بے شک آپ زبردست حکمت والے ہیں) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ایک رات اس آیت کو بار بار پڑھ کر صبح کر دی ''**وامتازوا اليوم ايها المجرمون**'' (اے مجرمو! آج قیامت کے دن تم ہمارے فرمانبردار بندوں سے الگ ہو جاؤ) حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے حالات میں بھی کہیں دیکھا ہے کہ ایک رات اسی آیت مذکورہ کی تلاوت فرما کر روتے رہے اور صبح کر دی' خدا ہم سب کے قلوب میں اپنے کلام مقدس کی صحیح عظمت' محبت وتعلق پیدا فرمائے آمین شرح احیاء العلوم میں ہے کہ قیامت کے ہولناک دن میں جو لوگ عرش کے سایہ میں ہوں گے ان میں وہ بھی ہوں گے جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے ہیں اور وہ بھی ہوں گے جو بچپن میں قرآن مجید پڑھنا سیکھتے ہیں اور بڑے ہو کر اس کی تلاوت کا اہتمام رکھتے ہیں۔ **اللهم اجعلنا منهم**۔

۳ -حدثنا يحيىٰ[1] بن بكير قال اخبرنا الليث[2] عن عقيل عن ابن شهاب عن عروة بن الزبير عن عائشة ام المومنين رضى الله عنها انها قالت اول ما بدئ رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحى الرويا الصالحة فى النوم فكان لا يرى رؤيا الا جاء ت مثل فلق الصبح ثم حبب اليه الخلاء وكان يخلو بغار حرآء فليتحنث

---

[1] یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر القرشی (مولی ابی زکریا) م ۲۳۱ھ امام نسائی وحافظ ابن معین نے آپ کو ضعیف قرار دیا۔ ابن عدی نے کہا کہ امام لیث بن سعد (تلمیذ حدیث امام اعظم (رحمتہ اللہ علیہ) کے پڑوس میں رہتے تھے اور ان سے روایت میں وہ سب سے زیادہ قوی ہیں اور ان کے پاس امام لیث سے وہ روایات ہیں جو کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں' امام بخاری' مسلم وابن ماجہ نے آپ سے روایت کی' امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر صفحہ ۲۸۵ میں آپ کو شامی لکھا' حالانکہ سب تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق آپ کو مصری لکھا ہے اور امام بخاری کے سوا اور کسی نے بھی شامی نہیں لکھا امام بخاری نے صرف لیث سے سماع کا ذکر کیا اور کسی قسم کا کلام حافظ یحییٰ بن معین وغیرہ کا ذکر نہیں کیا یہاں کتاب خطاء البخاری ابن ابی حاتم میں اس غلطی کا ذکر نہیں ہے۔

حافظ عینیؒ نے اس حدیث کے رجال پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری نے یحییٰ بن بکیر میں باپ کی طرف نسبت ترک کر کے دادا کی طرف جو نسبت کی ہے یہ اصطلاح محدثین میں تدلیس کی ایک صورت ہے' جس طرح امام موصوف نے لیث بن سعد سے دوسری جگہ چند روایات اپنے استاد محمد بن یحییٰ ذہلیؒ کے واسطہ سے ذکر کی ہیں' مگر وہاں بھی ہر جگہ اپنے استاذ موصوف کے نام میں تدلیس کی صورت اختیار کی ہے۔

ہم مقدمۂ انوار الباری حصہ دوم بہ سلسلہ حالات امام بخاریؒ لکھ چکے ہیں کہ امام بخاریؒ کی طرف تدلیس کی نسبت ضرور ہوئی ہے مگر اس کو بسبب جلالت قدر امام موصوف وبوجہ حسن ظن تدلیس معیوب نہیں کہہ سکتے' واللہ اعلم۔

[2] امام موصوف کا مختصر تذکرہ مقدمہ انوار الباری صفحہ ۲۱۳/ ا میں ہو چکا ہے' حافظ عینیؒ نے اس موقع پر ابن خلکان کے حوالہ سے آپ کا مذہب حنفی لکھا ہے امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں آپ کی منقبت پر کچھ نہیں لکھا' حافظ نے تہذیب میں اگرچہ آپ کے اساتذۂ حدیث میں امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر نہیں کیا' تاہم چھ صفحات سے زیادہ میں تذکرہ لکھا اور مناقب کثیرہ ذکر کئے ہیں جو مستقل تذکرۂ حفاظ ومحدثین حنفیہ کی زینت ہونے چاہئیں۔

فیه وهو التعبد اللیآلی ذوات العدد قبل ان ینزع الی اهمه' ویتزودلذلک ثم یرجع الی خدیجة فیتزو د لمثلها حتیٰ جاء ہ الحق وهو فی غار حراء فجآئه الملک فقال اقرا قال قلت ما انا بقاری' قال فاخذنی فغطنی حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرأ ' فقلت ما انا بقاری فا خذنی فغطنی الثانیة حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقراء فقلت ما انا بقاری فا خذنی فغطنی الثالثة ثم ارسلنی فقال اقراباسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق' اقرا وربک الا کرم ' فرجع بها رسول الله صلی الله علیه وسلم یرجف فواده' فدخل علیٰ خدیجة بنت خویلد ' فقال "زملونی زملونی" فزملوه حتیٰ ذهب عنه الروع' فقال لخدیجة و اخبرها الخبر۔"لقد خشیت علیٰ نفسی"فقالت خدیجة کلا والله مایخزیک الله ابدا' انک لتصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق' فانطلقت به خدیجة حتی اتت به ورقة بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ ابن عم خدیجة و کان امر أ تنصر فی الجاهلیة وکان یکتب الکتاب بالعبرانی فیکتب من الانجیل بالعبرانیة ماشاء الله ان یکتب وکان شیخا کبیرا قد عمی' فقالت له ' خدیجة یا ابن عم! اسمع من ابن اخیک فقال له ورقة یا ابن اخی! ماذا تریٰ؟ فاخبره رسول الله صلی الله علیه وسلم خبر مارأیٰ فقال له ورقة" هذا النا موس الذی نزل الله علیٰ موسیٰ 'یا لیتنی فیها جذعاً' یا لیتنی اکون حیاً اذ یخرجک قومک " فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم او مخرجی هم ؟ قال نعم لم یات رجل قط بمثل ما جئت الا عودی وان یدرکنی یومک انصر ک نصرا مؤ ذرا" ثم لم ینشب ورقةان توفی و فتر الوحیٰ' قال ابن شهاب واخبر نی ابو سلمة بن عبد الرحمٰن ان جابربن عبدالله الانصاری قال وهو یحدث عن فترة الوحی فقال فی حدیثه:۔ بینا انا امشی اذ سمعت صوتا من السمآء فرفعت بصری فاذا الملک الذی جاء فی بحرآء جالس علیٰ کرسی بین السماء والا رض فرعبت منه فرجعت فقلت زملونی زملو نی فانزل اللّٰه تعالیٰ۔

یایها المدثر قم فانذر وربک فکبر وثیا بک فطهر والرجز فاهجر فحمی الوحی و تتابع"۔تابعه'عبدالله بن یوسف و ابو صالح و تا بعه هلال بن رواد عن الزهری وقال یونس و معمر بوادره۔

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ابتداء میں اچھے خوابوں سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا' آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے تھے وہ اسی طرح سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا تھا' پھر آپ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی' غار حرا میں خلوت اختیار فرماتے تھے کئی کئی رات ودن مسلسل وہاں رہ کر عبادت گزاری کرتے' جب تک کہ گھر آنے کی رغبت نہ ہوتی' وہاں کے لیے آپ توشہ بھی ساتھ لے جاتے تھے' پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس تشریف لاتے اور اسی طرح چندروز کا توشہ ساتھ لے جاتے تا آنکہ غار حرا میں حق (یعنی وحی الٰہی) کا ظہور ہو اور فرشتہ نے آ کر کہا پڑھیے۔ احضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جواب دیا کہ "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" (کیونکر پڑھ سکتا ہوں؟!) اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی' پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھئے!"میں نے کہا" میں تو پڑھنے والا نہیں" فرشتے نے مجھے دوبارہ بھی دبوچ کر حسب سابق خوب دبایا اور پھر چھوڑ کر کہا کہ "پڑھئے!" میں نے کہا" میں پڑھنے والا تو ہوں نہیں" (کس طرح پڑھوں؟) فرشتے نے تیسری بار مجھے پھر دبوچا دبایا اور کہا اقرأ باسم ربک الذی خلق' خلق الا نسان من علق' اقرأ وربک الا کرم (پڑھیئے اپنے رب کے نام سے جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا' انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا فرمایا' پڑھیئے! آپ کا پروردگار بڑے کرم والا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آیات مذکورہ (کی نعمت غیر مترقبہ) سے اپنے سینے کو معمور و منور فرما کر واپس گھر تشریف لائے اس وقت آپ کا دل (پہلی وحی الٰہی کے رعب وجلال سے) کانپ رہا تھا' حضرت خدیجہؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو' مجھے کمبل اوڑھا دو! انہوں نے کمبل

اڑھادیا، جب سکون کی کیفیت ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کو سارا حال سنایا اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہوگیا ہے انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، خدا کی قسم! وہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اپنی کمائی میں مفلسوں ناداروں کو شریک کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور راہِ حق میں مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرتے ہیں، پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ وہ زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو چکے تھے، اور عبرانی زبان کے کاتب تھے، چنانچہ انجیل کو بھی حسبِ توفیق خداوندی عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، بہت عمر رسیدہ تھے بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا:۔ بھائی اپنے بھتیجے کا حال تو سنیئے! ورقہ نے پوچھا:۔ بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ آپ نے جو دیکھا تھا بیان فرمادیا، ورقہ آپ کے حالات سن کر (بے ساختہ) بول اٹھے کہ ''یہ تو وہی ناموس ہے جس کو حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا۔ کاش! میں تمھارے عہدِ نبوت میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا، جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی''۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا ''ہاں! جو شخص بھی اس طرح کی چیز لے کر آیا جیسی آپ لائے ہیں، لوگوں نے اس سے دشمنی کی ہے، اگر مجھے آپ کی نبوت کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی پوری قوت سے مدد کروں گا''۔

پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا، اور وحی کا سلسلہ بھی کچھ مدت کے لیے بند ہوگیا (راوی حدیث مذکور) ابن شہاب کا قول ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت بیان کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے موقوف ہونے کا حال یوں بیان فرمایا تھا کہ ''میں ایک بار کہیں جارہا تھا، اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے، میں اس منظر سے پھر دہشت زدہ ہوگیا، واپس ہوکر گھر والوں سے کہا کہ مجھے کپڑا اوڑھا دو، مجھے کپڑا اوڑھا دو، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

''**یایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر و ثیابک فطھر والرجز فاھجر**'' (''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھ کھڑا ہو اور لوگوں کو (عذابِ الٰہی سے) ڈرا، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور گندگی سے دور رہ[1]'')

یعنی وحی الٰہی کے بوجھ اور فرشتہ کی ہیبت سے آپ کو اس قدر خوفزدہ اور پریشان نہ ہونا چاہیئے، آپ کا منصب نبوت تو بہت اعلیٰ وارفع

---

[1] عام مفسرین نے اس سے مراد یہ لیا کہ بتوں کی عبادت سے دور رہو اس صورت میں اس آیت کا تعلق نماز سے نہ ہوگا یا یہ مراد ہو کہ بتوں سے بے تعلقی کا معاملہ رکھو، وقت نماز میں بھی اور دوسرے اوقات میں بھی، لیکن ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس آیت میں طہارت جاء نماز کی طرف اشارہ زیادہ راجح ہے، جیسا کہ اس سے پہلے جملے میں طہارت ثیاب کا حکم ہے، پس دونوں جملوں کا تعلق نماز سے رہے گا، پھر اس امر پر تو سب کا اتفاق ہے کہ نماز ابتداء زمانۂ نبوت سے تھی، چنانچہ کتب سیر میں وارد ہے کہ جب اقرأ باسم ربک کا نزول ہوا تو اسی وقت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو و نماز کا طریقہ بھی سکھلایا تھا، پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ صبح و شام کی دو نمازیں جو ابتداء عہد نبوت سے پڑھی گئیں وہ فرض تھیں یا نفل؟ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک ترجیح اس کو تھی کہ نماز کی فرضیت تو ابتداء عہد نبوت ہی سے تھی مگر اس کی صفات و کیفیات بدلتی رہتی تھیں، تا آنکہ شب معراج میں وہ پانچ ہوگئیں اور شب معراج میں پانچ نمازیں فرض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مجموعی عدد مع سابق کے پانچ قرار پایا، لہٰذا آیت **فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب**'' میں کسی تاویل کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ اس میں صرف دو نمازیں ذکر ہوئی ہیں (نماز فجر و عصر) جو پہلے سے فرض تھیں، اس کے بعد ان پر اضافہ ہوا ہے اور اسی لیے بہ طریق ادا فرض وہ پانچ کی فرضیت سے پہلے بھی پڑھی گئیں اور بعد کو بھی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، بخاری میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (طائف سے واپسی میں) فجر کی نماز بطن نخلہ میں پڑھی، جنوں نے آپ کے پیچھے اقتداء کی، آپ نے سورۂ جن پڑھی اور اس میں بلند آواز سے قرأت فرمائی اور یہی طریقہ نماز صبح کا بعد معراج بھی رہا، اس موقع پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ امر بھی بطور نکتہ ولطیفہ ارشاد فرمایا کہ علامہ حلبی نے اپنی سیرت میں ایک جملہ بہت معنی خیز لکھا ہے اور ممکن ہے اس سے ان کا ارادہ حنفیہ کے مسلک کی تائید بھی ہو کہ سب سے پہلے سورۂ اقراء نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ کا نزول بعد کو ہوا ہے تو جب تک اس کا نزول نہیں ہوا تھا اس زمانے کی نمازیں کس طرح درست ہوئیں؟ جب کہ فاتحہ رکن صلوٰۃ ہے کہ بغیر اس کے نماز درست ہی نہیں ہوسکتی، قائلین رکنیت فاتحہ جواب دیں؟

ہے' سب راحت وسکون کو خیر باد کہہ کر خدا کے نافرمان بندوں کو اس کے غصے وعذاب' اور کفر ومعصیت کے بڑے انجام سے ڈرایئے! یہاں پروردگار کی بڑائی بیان کرنے کا حکم بھی اسی لیے دیا گیا کہ اس سے خدا کا خوف دل میں گھر کرتا ہے اور اس کی تعظیم وتقدیس ہی وہ فریضہ ہے' جو تمام اخلاق واعمال کی ادائیگی پر مقدم ہے' چنانچہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد آپ نے دعوت الی اللہ کا فرض پوری اولوالعزمی سے انجام دیا' پھر نماز وغیرہ کا حکم بھی آ گیا' جس کے لیے بدن کپڑوں اور جائے نماز وغیرہ کو گندگی سے پاک رکھنے کے احکام نازل ہوئے۔

اس کے بعد وحی تیزی کے ساتھ پے درپے آنے لگی' اس حدیث کو یحییٰ بن بکیر کے علاوہ لیث بن سعد سے عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح نے بھی روایت کیا ہے' جس کو متابعت تامہ کہتے ہیں اور عقیل کے علاوہ زہری سے ہلال بن رداد نے بھی روایت کیا ہے' جس کو متابعت ناقصہ کہتے ہیں' یونس ومعمر نے فوادہ کی جگہ بوادرہ ذکر کیا ہے۔

علامہ عینی نے شرح بخاری شریف میں اس موقع پر رجال سند' اصول حدیث اور معانی حدیث مذکور پر بڑی اہم علمی ابحاث لکھی ہیں' جو اہل علم خصوصاً طلبۂ حدیث کے لیے نہایت کارآمد ہیں' علامہ ابن ابی جمرہ نے بہجۃ النفوس میں اسی ایک حدیث سے نہایت اہم ونافع ۷۰ فوائد لکھے ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف چند چیزیں لکھی جاتی ہیں:۔

شرح حدیث

اچھے اور سچے خواب نبوت کا ایک جزو ہیں' اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو وحی الٰہی کے ساتھ مشرف کرنے سے قبل سچے خواب دکھائے جاتے ہیں' سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے قبل چھ ماہ تک ایسے خواب دکھلائے گئے اسی طویل مدت میں آپ کو منامات صادقہ کے ذریعہ علوم وحقائق نبوت اور عالم بالا سے پوری مناسبت کرادی گئی' جو بات آپ خواب میں دیکھتے' جلد ہی اس کا ظہور بے کم وکاست ہو جاتا تھا گویا عالم مثال سے آپ کا رابطہ قائم کرادیا گیا' جو عالم غیب سے رابطہ کا مقدمہ ہے کیونکہ جتنی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے ان کا وجود عالم غیب میں ہوتا ہے پھر عالم مثال میں منتقل ہوتی ہیں اس کے بعد عالم شہادت یعنی دنیا میں آتی ہیں' گویا عالم شہادت میں ظاہر ہونے والی چیزوں کا مشاہدہ' قبل ظہور ہی عالم مثال میں کر لیتے تھے۔

عالم مثال

عالم مثال کی چیزوں میں مادہ نہیں ہوتا بلکہ صرف ان کی صورتیں مع طول وعرض کے ہوتی ہیں' جیسے آئینہ میں ایک چیز کی صورت کا مشاہدہ لا مادہ مگر طول وعرض کے ساتھ ہوتا ہے' عالم مثال کو اسی پر قیاس کر لیجئے! بعض حضرات نے جو یہ سمجھا ہے کہ ایک صورت سے دوسری میں تبدیل ہو جانا عالم مثال سے متعلق ہے اور قرآنی آیت فتمثل لھا بشرا سویا کو استشہاد میں پیش کیا تو یہ خیال غلط ہے ایسی صورتوں کا تعلق عالم شہادت ہی سے ہے' یہ مسئلہ تجسد ارواح اور تروح اجساد کا ہے اور اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ہم پھر کسی موقع سے بیان کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ۔

عالم خواب

خواب میں چونکہ ہم مادی علائق سے ایک حد تک منقطع ہو جاتے ہیں' اس لیے ایسی چیزوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶ ماہ تک اس طرح روحانی تربیت فرما کر حق تعالیٰ نے بیداری میں بھی خلوت گزینی آپ کے لیے محبوب بنادی تاکہ ظاہری آنکھوں سے بھی غیبی مشاہدات کا معائنہ میسر ہو۔

انتخاب حراء

مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر غار حراء میں آپ کی خلوت گزینی غالباً اس لیے بھی زیادہ موزوں تر تھی کہ وہاں انبیاء سابقین

اور آپ کے جدامجد عبدالمطلب نے بھی خلوت اختیار فرمائی تھی' دوسرے اس لیے بھی کہ اس غار کا ایک حصہ بیت اللہ کی طرف جھکا ہوا ہے جس سے بیت اللہ پر نظر پڑتی ہے جو خود بھی ایک عبادت ہے' وہاں آپ نے کتنی خلوت گزینی فرمائی' بعض روایات ۴۰ دن کی بھی آتی ہیں مگر وہ زیادہ قوی نہیں ہیں' اس لیے ان سے مروجہ چلہ کشی پر استدلال بھی قوی نہیں اگرچہ اس کی افادیت ظاہر ہے اور اولیاء اللہ کے طریقے پر کسی عبادت کے ادا کرنے میں برکت بھی ہے بشرطیکہ اس کو سنیت کا درجہ نہ دیا جائے۔

دوسرے ایک فرق یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند چند روز کے بعد دولت کدہ پر تشریف لاتے رہتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضروری سامان وتوشہ لے کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس پہنچ جاتی تھیں' مشکوٰۃ شریف باب المناقب میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غار حرا میں تشریف لائے (یہ غالباً عہد نبوت کا واقعہ ہے) اور فرمایا کہ خدیجہ آرہی ہیں ان کو رب العالمین کا سلام کہنا اور جنت میں موتیوں کے گھر کی بشارت سنا دینا۔

عطاء نبوت ونزول وحی

سچے خوابوں کے بعد غار حراء کی خلوت گزینی کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک نہایت عظیم ومبارک دن وہ بھی آپہنچا کہ آپ حق تعالےٰ کی طرف سے خلعت رسالت سے سرفراز ہوئے' خدا کا فرشتہ پہلی وحی لے کر پہنچ گیا' جس سے دنیا کے اس آخری دور کے زریں لمحات کی ابتداء ہوگئی'

اب یہاں انبیاء سابقین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں فرق پر بھی نظر رکھیے' پہلے جتنی وحی آتی رہی' وہ سب وحی غیر متلو کے درجہ کی تھی' جیسے ہمارے یہاں کی احادیث صحیحہ' جن کے معانی ومطالب تو وحی خداوندی ہیں' مگر الفاظ وکلمات اس طرح نہیں اور یہی شان کتب سماویہ انبیاء سابقین کی بھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی وحی نازل ہوئی' اس کے دو حصے ہوگئے۔ ایک وحی متلو' (جو قرآن مجید کی صورت میں ہے کہ اس کے کلمات ومعانی سب خدا کی طرف سے بطریق محفوظ ہم تک پہنچے ہیں' دوسرے وحی غیر متلو (جو احادیث رسول کی صورت میں ہے کہ اس کے معنی خدا کی طرف سے اور کلمات رسول خدا کے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید کی روایت بالمعنی درست نہیں بخلاف حدیث کے کہ اس کی روایت بالمعنی بھی جائز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی تربیت حق تعالےٰ کی خصوصی شان ربوبیت کے تحت ہوئی ہے کیونکہ آپ کو وحی متلو کے سب سے زیادہ عظیم المرتبت درجہ وحی سے نوازنا تھا' جو آپ کے اخص خصوص درجہ نبی الانبیاء اور مرتبہ خاتم النبیین کے شایان شان تھی' مگر اس وحی عظیم کے لیے کتنی بڑی قوت برداشت کی ضرورت تھی' اس کا اندازہ حدیث کے مذکورہ بالا جملوں سے بخوبی ہوسکتا ہے' اس لیے حیرت استعجاب اس امر پر بالکل نہ ہونا چاہیئے کہ آپ ایسے رسول اعظم کو ڈر' خوف' دہشت وگھبراہٹ کی صورت کیوں پیش آئی' بلکہ حیرت اور عظیم حیرت اس پر ہونی چاہیئے کہ اس دنیا کے اندر رہ کر اور باوجود تمام بشری تقاضوں اور کمزوریوں کے بھی' کیونکر ایک بشر نے اس وحی اعظم کے نزول اجلال کا بوجھ برداشت کرلیا' جس کو بتصریح قرآن مجید ہی اگر کسی پہاڑ پر اتار دیا جاتا تو وہ خوف وخشیت خداوندی کے باعث ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتا' یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی کے بعد تین سال کی طویل مدت فترت وحی کی رہی کہ اس میں نزول وحی کا سلسلہ قطعاً بند رہا' اتنی بڑی عظیم نعمت خداوندی کا نزول ہوکر دفعۃً رک جانا اور وہ بھی اتنے طویل عرصہ تک' یہ آپ پر جتنا شاق گزرا' احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے برابر کبھی کوئی دوسرا صدمہ آپ کے قلب منور نے برداشت نہیں کیا' اور اتنے عظیم صدمہ کو تین سال تک صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنا' آپ کے نبی الانبیائی اولوالعزمی کی بہت بڑی خصوصیت قرار پائی ہے درحقیقت خلعت رسالت عطا ہوجانے کے بعد کی سہ سالہ روحانی تربیت نے آپ کی روحانی ترقیات کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا' اسی لیے اس مدت کے گذرنے پر آپ پر نزول وحی کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری ہوگیا' کہ باقی بیس سال کی قلیل مدت میں تقریباً ۲۴ ہزار بار آپ نزول وحی الٰہی سے شرف یاب ہوئے۔

اس موقع پر جو بعض حضرات نے آپ کی خوف دہشت وغیرہ کو عام ضعف انسانی وبشری کے سبب بتلایا' اس کا اظہار بطور سیاست جائز سمجھنا' اس کو ہم آپ کے عظیم مرتبۂ رسالت کے شایان نہیں دیکھتے۔ واللہ اعلم

جن لوگوں نے اس حالت کو تردد فی النبوت سمجھا' وہ تو انبیاء علیہم السلام کے ایمان ویقین کے مدارج عالیہ اور علوم وکمالات نبوت سے بالکل ہی ناواقف ہیں اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا

دبانے کا فائدہ

صاحب ''بہجۃ النفوس'' نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقصد آپ کو اپنے سینہ سے ملا کر دبانے سے یہ تھا کہ آپ کے اندر ایک زبردست قوت نوریہ پیدا ہو جائے، جس سے آپ وحی الٰہی کا تحمل فرما سکیں اور اس قسم کے تصرفات اولیاء اللہ کے یہاں بھی پائے گئے ہیں، ایک بزرگ ولی اللہ کا واقعہ نقل ہوا ہے کہ ان کے پاس چند علماء وقت نے آ کر اعتراض کئے ان بزرگوں نے خود جواب دینا پسند نہ کیا اور ایک عامی جاہل چرواہے کو مجلس میں سے بلا کر اپنے سینہ سے ملایا اور فرمایا کہ تم ان کے اعتراضات کا جواب دو۔ اس نے نہایت اعلیٰ جوابات دیے، پھر ان لوگوں نے مزید اعتراضات کئے تو ان کے بھی جوابات دے کر ان سب اہل علم وفقہا کو ساکت کر دیا۔

پھر ان بزرگ نے اس شخص کو بلا کر دوبارہ سینہ سے ملایا تو پھر ویسا ہی جاہل بن گیا، جیسا تھا، اس پر اس نے عرض کیا کہ جناب والا میں نے سنا ہے خاصان خدا جب کسی کو کچھ عطا کر دیتے ہیں تو اس کو واپس نہیں لیتے، بزرگ نے فرمایا کہ یہ درست ہے جو تم کہتے ہو مگر تمہارا حصہ اس علم میں نہیں ہے، پھر اس کو ایک دوسری نعمت کی بشارت دی جو اس کو حاصل ہوئی۔

صاحب بہجہ نے اس قصہ کو نقل کر کے لکھا کہ جب ایک بشر کے لیے بشر کی ملامست سے یہ اثر ہو سکتا ہے تو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام، کے جسد کی ملامست سے جسد اطہر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا کچھ اثرات نہ پیدا ہوئے ہوں گے، اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت شیخ المشائخ خواجہ باقی باللہ (شیخ ومرشد حضرت مجدد صاحب سرہندیؒ) کا بھی منقول ہے کہ ایک دفعہ آپ کے یہاں چند مہمان آ گئے اور اس وقت ان کی ضیافت کے لیے آپ کے یہاں کچھ موجود نہ تھا۔ آپ کچھ متردد ہوئے کہ پڑوسی نان بائی کو خبر مل گئی جو فوراً ہی ایک سینی میں کھانا لگا کر حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا آپ بہت خوش ہوئے اور اس سے فرمایا کہ جو چاہو مانگ سکتے ہو، نان بائی نے کہا میری خواہش یہ ہے کہ آپ مجھے اپنا جیسا کر دیجئے! خواجہ صاحب نے فرمایا تم اس کو برداشت نہ کر سکو گے، کوئی اور چیز طلب کرو، مگر وہ اپنے مطالبے پر مصر رہا، اس پر خواجہ صاحب اس کو اپنے حجرے میں لے گئے، اور اس پر اتحادی توجہ ڈالی، کچھ دیر کے بعد نکلے تو دونوں کی صورت بالکل ایک سی تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ خواجہ صاحب پر اطمینان وبشاشت کی کیفیت تھی، اور نان بائی پر انتہائی اضطراب گھبراہٹ وپریشانی کا عالم طاری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کیفیت یا حضرت خواجہ صاحب کی نسبت قویہ کو برداشت نہ کر سکا اور دو تین دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر توجہ اتحادی قبول کرنے والا جوہر قابل ہو تو اس کو نہ صرف یہ کہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ وہ کم سے کم وقت میں دوسرے کے کمالات اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جیسا کہ حضرت مجدد صاحب سرہندی قدس سرہ ہی کے بارے میں منقول ہے کہ انہی حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ، کی خدمت میں حضرت مجدد صاحبؒ پہنچے، اور بیعت ہوئے اور چند ہی روز میں آپ قطبیت، فردیت وغیرہ مدارج عالیہ تک ترقی فرمالی اور خود خواجہ صاحب نے آپ کو قرب ونہایت وصول الی اللہ کے مراتب علیہ کی تحصیل وتکمیل کی بشارت سنائی۔ اور فرمادیا کہ شیخ احمد سرہندی ہمارے یہاں آئے، جو کثیر العلم قوی العمل ہیں، چند ہی روز میں ہم نے ان کے بہت سے عجائب وغرائب حالات مشاہدہ کئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آفتاب ہوگا، جس سے سارا جہاں روشن ہوگا۔ ایک روز یوں بھی فرمایا کہ شیخ احمد

سرہندی ایک ایسا سورج ہے جس کے سایہ میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توجہ قبول کرنے والا کبھی توجہ دینے والے سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ جیسا کہ یہاں حضرت خواجہ صاحب نے خود فرمایا کہ حضرت مجدد صاحب کی مثال سورج کی سی ہے، اور ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کے سایہ میں گم ہیں۔

اب اپنے اصل موضوع کی طرف آجائیے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ سرور کائنات، فخر موجودات افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و کملات کی نسبت بھی تمام انبیاء سابقین اور ملائکہ مقربین وغیرہ وغیرہ کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہی ہے، جسے ایک سورج کی نسبت ستاروں سے ہوتی ہے اور ابتدائی حالات میں جبرائیل علیہ السلام کے آپ کو دبا کر روحانی توجہات کے القاء فرمانے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جبرائیل علیہ السلام آپ سے افضل ہیں یا آپ بہ نسبت ان کے علوم و کمالات میں کم درجہ رکھتے ہیں۔ دوسری مثال محض سمجھنے کے لئے ایسی ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کے ارکان دولت و مقربین بارگاہ میں ہوتے ہیں، کچھ ایسے معتمد خاص ہوتے ہیں جو اس کے پیغامات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن اس بادشاہ کا ایک وزیر اعظم ہوتا ہے جو اس کا سب سے بڑا معتمد نائب و خلیفہ ہوتا ہے، وہ اگرچہ بادشاہ کی مجلس کا ہر وقت حاضر باش نہیں ہوتا بلکہ بعض اہم ضرورتوں کے باعث کافی دور دراز مسافت پر بھی رہتا ہے اور وہاں ایک طویل مدت مصالح ملکی کے انتظام و انصرام میں گذار دیتا ہے، لیکن جو اعتماد، تقرب اور درجہ بادشاہ کے یہاں اس کا ہوتا ہے، وہ نہ بادشاہ کے اپنے اہل خاندان میں کسی کا ہوتا ہے، نہ کسی بڑے سے بڑے مقرب درباری کا، نہ دوسرے وزراء و ارکان دولت کا۔ اس لئے کہ بادشاہ کے ملکی مصالح اور ان کے نشیب و فراز کو پہچاننے والا جس قدر وہ ہوتا ہے، دوسرا نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے جب بادشاہ کو کوئی اخص خصوص مشورہ کرنا ہوگا یا کوئی خاص الخاص ہدایت دینی ہوگی تو صرف اسی سے الگ بلا کر مشورہ کرے گا' اور وہ بھی اس احتیاط سے کہ اس وقت کوئی دوسرا اس کا بڑے سے بڑا مقرب و محبوب بھی وہاں آس پاس نہیں جا سکتا' یا اگر اس کا وزیر اعظم کہیں دور ہوگا تو بادشاہ کا خاص درباری مقرب ایلچی اس کا پیغام لے کر جائے گا اور با احتیاط تمام وزیر اعظم کو پہنچا دے گا۔ پھر ظاہر ہے کہ اس پیغام کے پورے مقاصد اور اس کی باریکیوں کو جس قدر بادشاہ کا وزیر اعظم سمجھ سکے گا وہ درمیانی ایلچی بھی نہیں سمجھ سکتا' اس لئے وزیر اعظم پر اس پیغام کو سوچنے سمجھنے اس پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ داریوں کا جس قدر عظیم بوجھ پڑے گا' درمیانی پیغامبر پر اس کا سوواں حصہ بھی نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی گزارش ہے کہ بادشاہ کی حیثیت یا وزیر اعظم کی پوزیشن اپنے دور کے حالات سے نہ قیاس کیجئے' کیونکہ اول تو اس عوامی دور کے بادشاہوں کے وہ پہلے سے اختیارات و ذمہ داریاں نہیں ہیں' پھر وزیر اعظم اور دوسرے وزراء عوام کے رجحانات وغیرہ کے لحاظ سے بنتے ہیں' اسی لیے وہ عوام کے یا اکثریت کے رجحانات کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کی تبدیلیاں بھی جلد جلد عمل میں آتی رہتی ہیں۔ مگر حق تعالےٰ کی شہنشاہیت کے اصول اس سے بالکل جدا ہیں' وہ خود عالم الغیب والسرائر ہے ایک ایک کے دلوں کے بھید سے واقف ہے اس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی' اس کے بھی مقربین بارگاہ میں' دین و دنیا دونوں کے نظام عالم چلانے کے لیے وزراء و نائبین ہیں' جن میں سے سب سے بڑے نائب و خلیفہ ہونے کا طرۂ امتیاز انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوا۔ اس لیے ضروری تھا کہ علمی کمالات میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی علمی و روحانی تربیت کو دنیا کے ظاہری وسائل سے الگ کر کے' اپنے فضل خاص کے تحت رکھا' سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو حق تعالےٰ نے وہ علوم القاء فرمائے' جن کے باعث ان کی برتری و افضلیت تمام ملائکہ اور جن و انس پر مسلم ہوگئی' اور اس کے عملی اعتراف کے طور پر ان کو تعظیمی سجدہ کرایا گیا' پھر ان کے بعد بھی جس قدر انبیاء مبعوث ہوئے' ان سب کی بھی اسی طرح تربیت و تعلیم ہوتی رہی' اور یہ سب انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانہ اور علاقۂ رسالت کے لیے خدا کی طرف سے اس کے وزراء کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان کے بعد تمام نبیوں کے سردار' سب کے علوم و کمالات کے جامع' سب کی شریعتوں کے محافظ' سبھوں کی شرائع سے زیادہ مکمل دین و شریعت کے حامل' فخر موجودات خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے آخری دور میں حق تعالےٰ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے تشریف

لاتے جن کا سب سے بڑا معجزہ بھی علمی معجزہ قرآن مجید ہے جو قیام قیامت تک کامل شریعت مکمل دستور العمل اور نہ منسوخ ہونے والا قانون الٰہی ہے۔

آپ کو وہ علوم وکمالات اور روحانی مدارج حق تعالیٰ نے عطا فرمائے، جو کسی نبی مرسل یا ملک مقرب کو بھی عطا نہیں ہوئے، آپ کے علمی وروحانی فیض سے تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاراں ہزار صحابہ کے قلوب جگمگا اٹھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی اس مرتبہ پر فائز ہو گئے کہ بڑے سے بڑا ولی کامل وہاں تک نہیں پہنچ سکتا' اور بعد وفات بھی آپ کے روحانی فیض سے تمام مومنین کی ارواح طیبہ برابر سیراب ہوتی رہیں اور قیامت تک آپ کا فیض اسی طرح باقی رہے گا' **اللهم انفعنا جميعا بنفحاته الطيبة** و **وفقنا لما تحب و ترضى بمنك وكرمك يا ارحم الراحمين**۔

صاحب بہجہ نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ''**كلا والله لا يحزيك الله**'' الخ فرمانا اس لیے تھا کہ دنیاوی تجربات سے یہ بات مشہور ومعلوم تھی کہ جس شخص کے اخلاق وخصائل اس قسم کے ہوتے ہیں وہ خدا کا محبوب بندہ ہوتا ہے اور اس کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ نیز حدیث میں بھی آتا ہے کہ حسن سلوک کا کردار ذلت ونکبت کی رسوائیوں سے محفوظ کرتا ہے۔ یہاں پانچ خصائل کا ذکر ہوا ہے جو اصول مکارم اخلاق ہیں' دوسری روایت میں تصدق الکلام اور تودی الامانات بھی آیا ہے کہ آپ سچ بولتے ہیں اور امانات کی ادائیگی فرماتے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمانہ کی عادت وتجربات کے مطابق بھی کوئی بات کہنا درست ہے' بشرطیکہ اس سے اوامر ونواہی شرعیہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا ہو۔

اکھتر واں آخری فائدہ صاحب بہجۃ النفوس امام ابن ابی جمرہ نے اس پر لکھا کہ حمی الوحی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقصد ہے آپ نے لکھا ہے کہ ابتداء وحی کے بیان میں قبل رسالت کے خوابوں کے مطابق ظہور واقعات کو طلوع سپیدۂ سحر سے تشبیہ دی گئی تھی لہٰذا جب نزول وحی کا وقت پہنچا تو وہ رسالت کا طلوع شمس تھا اور جس طرح طلوع کے بعد آفتاب کی روشنی وگرمی برابر بڑھتی رہتی ہے آفتاب رسالت نے بھی اپنے ترقی پذیر نور وحرارت سے سارے عالم امکان کو پوری طرح نور وحرارت سے فیضیاب کر دیا تھا۔

پھر اس تشبیہ سے ممکن تھا کہ کوئی سمجھے کہ جس طرح بعد نصف النہار آفتاب سماوی کی حرارت ونور میں کمی آنے لگتی ہے' آفتاب رسالت کے فیض میں بھی کمی ہوگی تو حمی الوحی کے ساتھ وتتابع کا لفظ زیادہ کیا' تا کہ بتلایا جا سکے کہ آفتاب رسالت کا فیضان ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ برابر بڑھتا چڑھتا چلا گیا اور علوم نبوت کی گرمی وحرارت' روشنی وتابنا کی میں کوئی زوال وانحطاط نہ آسکا صفحہ (۱/۲۵)

بحث ونظر: قرآن مجید میں جو ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی ہے اس کے بارے میں آئمۂ محدثین وفقہاء میں یہ بحث رہی ہے کہ وہ ہر سورت کا جز و بھی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ان کے تین مذاہب ہیں' امام مالک وامام اوزاعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ کسی سورت کا جز و نہیں ہے۔ نہ قرآن مجید کی آیت ہے بجز اس کے جو سورۂ نحل کے وسط میں نازل ہوئی ہے (بعض حنفیہ اور بعض اصحاب امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے اور وہ لوگ خود امام احمد سے بھی ایک روایت اسی کی بیان کرتے ہیں) دوسرا بالکل اس کے مقابل امام شافعی کا قول ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ اور دوسری ہر سورت کا جز و ہے' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ بجز سورۂ فاتحہ کے اور سورتوں کا جز و نہیں ہے' تیسرا مذہب اکثر فقہاء ومحدثین احناف' امام احمد ابن مبارک وغیرہ کا ہے کہ وہ قرآن کا جز و ہے جس طرح کہ ہر سورت کے شروع میں مکتوب ہے' مگر وہ کسی سورت کا جز و نہیں ہے۔ بقول حافظ زیلعیؒ کے یہ قول وسط (درمیانی) اور محققین اہل علم کا ہے کیونکہ تمام حدیثی دلائل اور آثار کی روشنی میں یہی فیصلہ بہتر ہے۔

اس کے بعد یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ نماز میں سورت کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے' امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے۔ کہ آہستہ وجہر دونوں طرح سے اس کا پڑھنا نماز میں مکروہ ہے' امام شافعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب وہ سورۂ فاتحہ کا جز و ہے' اس کی قرأت واجب ہے' حنفیہ اور اکثر محدثین کا قول یہ ہے کہ اس کی قرأت مستحب ہے۔

پھر قرأت کے قائلین میں سے امام شافعی اور ان کے بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ جہراً قرأت مسنون ہے' امام ابوحنیفہ' جمہور اہلحدیث ورائے' فقہاء امصار' اور جماعت اصحاب امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ بسم اللہ جہراً پڑھنا مسنون نہیں ہے۔ اسحٰق بن راہویہ' ابن حزم وغیرہ کا قول یہ ہے کہ اختیار ہے کہ آہستہ پڑھ لے یا آواز سے۔ (نصب الرایہ و تحفۃ الاحوذی)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس کے وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ شافعیہ پر اعتراض ہوا ہے کہ اگر بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہوتی تو سورۂ اقراء کے شروع میں بھی نازل ہوتی' اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ بسم اللہ کا مضمون اس سورت کے شروع میں ادا ہو گیا ہے دوسرے یہ کہ جب آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تو اس کے بعد سورہ مذکورہ کا جزو بن گئی ہے' لیکن یہ جواب کمزور ہے کیونکہ بحث متعارف و معہود وصیغۂ بسم اللہ الخ میں ہے اس کے معنی و مطلب میں نہیں ہے۔

حافظ زیلعیؒ نے نصب الرایہ کے مطبوعہ چالیس صفحات میں اس بحث کو نہایت کافی و شافی تفصیل سے لکھا ہے' ہر مذہب کے دلائل ذکر کئے ہیں اور اعتراضات و جوابات بھی لکھ دیئے ہیں' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احناف کا مسلک سب سے زیادہ قوی ہے' اسی لیے علامہ مبارک پوری نے باوجود اپنے تعصب کے اقرار کیا کہ میرے نزدیک نماز میں بسم اللہ کے جہر سے اخفاو اسرار زیادہ بہتر ہے۔ امام ترمذی نے ترک جہر بسم اللہ کا باب قائم کر کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابوبکر' حضرت عمر و عثمان سب کے ساتھ نمازیں پڑھیں میں نے کسی کو نہیں سنا کہ بسم اللہ پڑھتے ہوں' اس حدیث کے رواۃ میں جلیل القدر محدث شہیر امام شعبہ بھی ہیں اور مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے حضرت قتادہ سے پوچھا کہ آپ نے حضرت انسؓ سے اس کو سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! ہم نے ان سے سوال کر کے تحقیق کی تھی' امام اوزاعی محدث شام کی روایت میں ہے کہ حضرت قتادہ نے حضرت انس سے اس طرح روایت کی ہے کہ میں نے ان سب حضرات کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں وہ سب الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے تھے' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہ اول قرأت میں پڑھتے تھے نہ آخر میں بعض قائلین جہر نے کہا ہے کہ ممکن ہے ان سب حضرات نے جہراً پڑھی ہو مگر حضرت انس نے نہ سنا ہو' اس کے بارے میں حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ حدیث انس کو عدم سماع پر محمول کرنا تاویل نہیں بلکہ تحریف کے درجہ میں ہے (فتح الملہم صفحہ ۲/۳۴)

کیونکہ حضرت انسؓ دس سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے پھر ہر سہ خلفاء مذکورین کے ساتھ ۲۵ سال گزارے اتنے عرصہ مدید میں روزانہ کی جہری نمازوں میں یہ سب حضرات جہراً بسم اللہ پڑھتے اور آپ کو خبر نہ ہوتی' یہ قطعاً محال اور دور از عقل بات ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری صفحہ ۲/۱۵۵ میں لکھا کہ حضرت انسؓ کی مختلف روایات جمع کرنے سے تو بظاہر نفی جہر ہی ثابت ہے مگر یہ امر بہت مستبعد ہے کہ حضرت انسؓ اتنی طویل مدت ان حضرات کے ساتھ گزار کر بھی جہراً بسم اللہ پڑھنے کو کسی ایک نماز میں بھی ان سے نہ سنتے' (یعنی سن کر بھول گئے ہوں گے' حضرت انسؓ نے ایک روایت میں خود اعتراف کیا کہ مجھے اس بارے میں یاد نہیں رہا' گویا ایسا ہوا ہوگا کہ زیادہ زمانہ گزرنے کی وجہ سے وہ اس کو بھول گئے ہوں گے پھر یاد پر زور ڈالنے سے جہر فاتحہ تو یاد آیا اور جہر بسم اللہ کا استحضار نہ ہو سکا۔ لہٰذا جس روایت سے جہر بسم اللہ کا ثبوت ہے وہ نفی جہر والی روایت پر مقدم ہوگی (خصوصاً اس لئے بھی کہ حضرت انسؓ والی نفی کی روایات میں بھی مذکورہ بالا استبعاد موجود ہے لہٰذا جہر والی روایت پر عمل متعین ہو گیا۔

یہاں حافظ نے اپنے مسلک شافعیہ کی تائید میں بالکل انوکھا استدلال کیا ہے اول تو حضرت انسؓ کے یاد نہ کرنے کی روایت مرویات صحاح سے کم درجہ کی ہے دوسرے غالب احتمال یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے آخری عمر میں ذہول غالب ہونے کے زمانے میں ایسا فرمایا ہوگا کہ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے اور آخر عمر میں اس طرح اور مسائل میں بھی انہوں نے فرمادیا ہے اور دوسرے حضرات سے بھی ایسا بہ کثرت منقول ہے کہ حدیث بیان کر کے بھول گئے آخر عمر میں حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے یاد نہ رہا' مگر حافظ نے اس کے خلاف نیا طرز استدلال نکالا کہ ایک شخص کچھ

مدت گزرنے کی وجہ سے ایک واقعہ کو بھول جائے اور پھر اس کے بعد کے زمانے میں وہ اس کو یاد کرلے اور اس طرح جزم و یقین کے ساتھ حضرت انسؓ کی طرح روایت بھی کرنے لگے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت انسؓ سے سوال ان کے انکار قرأت جہری کے بعد قرأت سری کے بارے میں ہوا ہو جس پر انہوں نے فرمایا کہ تم مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہو جو مجھے یاد نہیں۔ (چنانچہ علامہ ابن عبدالبر نے "الانصاف" صفحہ ۲۶ میں لکھا کہ میرے نزدیک جس نے حضرت انسؓ سے یاد کی بات کی وہ اس پر مقدم ہے جس نے بھول کے زمانہ میں ان سے سوال کیا (نصب الرایہ صفحہ ۱/۳۳۱)

واضح ہو کہ امام ترمذی نے ترک جہر بسم اللہ کا باب قائم کر کے حدیث یزید بن عبداللہ بن مغفلؓ روایت کی کہ میں نے نماز میں الحمد سے پہلے بسم اللہ پڑھی تو میرے والد نے فرمایا کہ بیٹا! یہ محدث و بدعت ہے اور صحابہ کرام کو سب سے زیادہ مبغوض اسلام میں نئی باتوں کا پیدا کرنا تھا، پھر فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے ساتھ میں نمازیں پڑھی ہیں میں نے کسی کو نہیں سنا کہ بسم اللہ پڑھتے ہوں تم بھی مت پڑھو، الحمد للہ رب العالمین سے پڑھو، امام ترمذی نے لکھا کہ یہ حدیث حسن ہے اور اسی پر اکثر اہل علم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ و علیؓ وغیرہم اور ان کے بعد تابعین کا عمل رہا اور اس کو سفیان ثوری، ابن مبارک، امام احمد، واسحٰق نے اختیار کیا، وہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لی جائے جہر سے نہ پڑھی جائے حافظ زیلعی نے لکھا ہے کہ احادیث جہر کی روایت نہ صحاح میں ہوئی نہ مسانید مشہورہ میں البتہ ان کی روایت حاکم اور دارقطنی نے کی ہے اور حاکم کا تساہل[1] سب جانتے ہیں کہ وہ احادیث ضعیفہ بلکہ موضوعات تک کی تصحیح کر دیتے ہیں۔ دارقطنی نے اپنی کتاب کو احادیث غریبہ، شاذہ اور معللہ سے بھر دیا ہے اور کتنی ہی احادیث ایسی لائے ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔

حافظ زیلعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بخاری باوجود اس کے کہ مذہب حنفی سے شدید تعصب رکھتے ہیں اور اس پر اعتراضات کرنے میں بہت پیش پیش ہیں، ایک حدیث بھی جہر بسم اللہ کی نہیں لائے، اور مسلم میں بھی ایسی کوئی حدیث نہیں ہے، بلکہ دونوں حضرات نے حدیث انسؓ ہی کی روایت کی جو اخفاء بسم اللہ پر دلیل ہے اگر کہا جائے کہ ان دونوں حضرات نے یہ کب التزام کیا ہے کہ ہر صحیح حدیث کو ضرور ذکر کریں گے؟ ممکن ہے کہ اور احادیث صحیحہ کی طرح حدیث جہر بسم اللہ کو بھی ترک کیا ہو، تو ایسی بات کوئی جاہل یا کٹ حجت جھگڑالو ہی کہہ سکتا ہے کیونکہ جہر بسم اللہ کا مسئلہ نہایت مشہور اہم و مشکل مسائل فقہ میں سے ہے، جس پر بڑے بڑے مناظرے ہوتے ہیں، اور تصانیف کا اہم موضوع بحث رہا ہے۔ اور امام بخاری کو حدیث و سنت کے راستہ سے امام ابوحنیفہ پر ہونے والے اعتراضات کی بڑی تلاش و جستجو رہی ہے، وہ اپنی صحیح کے ابتداء ہی میں باب الصلوٰۃ من الایمان کا باب قائم کر کے احادیث روایت کی ہیں اور مقصد امام صاحب پر رد کرنا ہے کیونکہ امام صاحب نے فرمایا ہے اعمال جزو ایمان نہیں ہیں، حالانکہ یہ مسئلہ بہت سے فقہاء کو بھی معلوم نہیں، اور مسئلہ جہر کی شہرت عوام و جہلا تک میں بھی ہے۔ اسی طرح بخاری بہت سی جگہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا و کذا روایت کر کے قال بعض الناس کذا و کذا لکھتے ہیں" جس سے اشارہ امام ابوحنیفہ کی طرف ہوتا ہے اور اس طرز سے امام صاحب پر طنز و تشنیع کر کے یہ دکھلاتے ہیں کہ امام صاحب حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، غرض ان کے پاس کوئی صحیح حدیث جہر بسم اللہ کی ہوتی تو کیوں نہ لاتے، ایسا ناممکن تھا بلکہ محال، اور میں خدائے برتر کے حلف اور پھر خدا کے حلف سے کہتا ہوں کہ اگر امام بخاری کو اپنی شرائط کے مطابق یا اس کے قریب درجہ کی ایک حدیث بھی مل جاتی، تو اپنی صحیح کو ہرگز اس سے خالی نہ چھوڑتے اور کوئی حدیث صحیح ہوتی تو امام مسلم بھی ضرور لاتے پھر امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ نے بھی تو کوئی حدیث جہر بسم اللہ کی روایت نہیں کی حالانکہ ان کی کتابوں میں احادیث سقیمہ اور اسانید ضعیفہ بھی موجود ہیں۔ البتہ نسائی ایک روایت حضرت ابوہریرہ کی لائے ہیں، جس کا ضعف ہم بیان کر چکے ہیں۔ (نصب الرایہ صفحہ ۱/۳۵۵)

دارقطنی نے مصر جا کر بہت سی احادیث جہر بسم اللہ کی جمع کی تھیں لیکن جب ان کو حلف دے کر پوچھا گیا کہ ان میں کوئی صحیح مرفوع بھی ہے تو کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کسی کا ثبوت صحیح و قوی طریق سے نہیں ہے، البتہ صحابہ سے کچھ صحیح ہیں کچھ ضعیف۔

---

[1] حاکم کے تساہلات پر نہایت گرانقدر محدثانہ کلام حافظ زیلعی نے صفحہ ۱/۳۴۶ میں کیا ہے۔ جو مشتغلین علم حدیث کے لیے بہت کارآمد ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے "ہدی" میں لکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی جہر بسم اللہ بھی ثابت ہوا ہے (جو تعلیم وغیرہ کے لیے ہوگا) مگر اخفاء کا ثبوت زیادہ ہے کیونکہ اگر آپ ہمیشہ جہر فرماتے تو خلفاء راشدین اور جمہور صحابہ سے کیونکہ مخفی رہتا۔ یہ بڑی محال بات ہے اور اس کو مجمل الفاظ یا کمزور احادیث سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جو احادیث جہر کے ثبوت میں صحیح ہو سکتی ہیں وہ صریح نہیں ہیں اور جو صریح ہیں، وہ غیر صحیح ہیں۔ (فتح الملہم صفحہ ۲/۳۷)

حافظ ابن حجرؒ نے درایہ میں بھی اس مسئلہ پر کلام کیا ہے اور قائلین جہر کی طرف سے تین استدلال نقل کئے ہیں ایک یہ کہ جہر کی احادیث طرق کثیرہ سے مروی ہیں۔ اور ترک جہر کی صرف حضرت انس و عبداللہ بن مغفلؓ سے مروی ہیں، لہٰذا ترجیح کثرت کو ہونی چاہیئے اس کا جواب یہ ہے کہ ترجیح کثرت کی وجہ سے جب ہوتی ہے کہ مسند صحیح ہو، اور یہاں جہر میں کوئی حدیث مرفوع ثابت نہیں ہو سکی، البتہ بعض صحابہ سے موقوفاً ثبوت ملتا ہے (جیسا کہ اس کا اعتراف خود دارقطنی سے بھی اوپر ذکر ہوا ہے)

دوسرا استدلال یہ ہے کہ احادیث جہر مثبت ہیں، دوسری احادیث نافی ہیں اور مثبت کو نافی پر ترجیح ہے، حافظ کا یہی استدلال اوپر فتح الباری کے حوالہ سے بھی ہم نقل کر آئے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث نفی اگرچہ بظاہر نافی ہیں مگر حقیقتاً وہ مثبت ہیں۔

تیسرا استدلال یہ ہے کہ جس راوی سے ترک جہر مروی ہے، اس سے جہر بھی مروی ہوا ہے، بلکہ حضرت انسؓ سے اس کا انکار بھی منقول ہوا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے آپ سے حفظ کے زمانے میں سنا وہ مقدم ہے اس سے جس نے نسیان کے زمانے میں سنا۔ (فتح الملہم صفحہ ۲/۳۸)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بسم اللہ کے فاتحہ یا ہر سورت کا جزو نہ ہونے اور اس کو نماز میں بلند آواز سے نہ پڑھنے کے بارے میں امام اعظمؒ کا مسلک زیادہ قوی، وسط و معتدل اور مؤید بالا احادیث الصحیحہ و مؤکد بآثار الصحابۃ والتابعین ہے، جس کی مکمل و مدلل محدثانہ بحث نصب الرایہ میں دیکھی جا سکتی ہے اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محدثین احناف کے عمل بالحدیث و اتباع سنت کا طریق انیق بہ نسبت دوسرے حضرات کے کس درجہ فائق اور تعصب و تنگ نظری وغیرہ سے کتنا بعید ہے۔ بحث مذکور کی مناسبت سے آخر میں ہم حضرت تھانوی قدس سرہ کی ایک ضروری مفید علمی تحقیق امداد الفتاویٰ صفحہ ۲/۷۱ سے نقل کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ امام عاصم کے نزدیک ہر دو صورتوں کے درمیان بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں تراویح کے اندر ہر سورت پر بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی، صرف ایک مرتبہ کسی غیر معین سورت کے اول میں پڑھی جاتی ہے، اس صورت میں ختم کلام مجید بہ روایت حفص عن العاصم کس طرح پورا ہوگا۔؟

اس کے جواب میں حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ بسم اللہ کے باب میں ایک مسئلہ قرأت سے متعلق ہے، دوسرا فقہ سے، اول کا حاصل یہ ہے کہ گو بسم اللہ ہر سورت کا جزو نہ ہو، مگر روایۃً اس کا پڑھنا ہر سورت پر منقول ہے، پس اگر کوئی شخص ہر سورت پر نہ پڑھے تو اس کی قرأت اس روایت کے موافق نہ ہوئی، گو کوئی جزو متروک نہ ہوا ہو، جب کہ کم از کم کسی ایک سورت پر پڑھ لے دوسرے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ گو روایۃً ہر سورت پر بسم اللہ منقول ہو لیکن ہر سورت کا جزو نہیں ہے بلکہ جزو مطلق قرآن مجید کا ہے اگر ایک جگہ بھی پڑھ لے گا تو پورا قرآن مجید ختم ہو جائے گا، گو اس روایت کے موافق اس کی قرأت نہ ہو پس امام عاصم اور امام اعظم کے اقوال میں کوئی تخالف نہیں، یہ جب ہے کہ ہر سورت پر بسم اللہ نہ پڑھے اور اگر پڑھ لے تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں، اور امام صاحب کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ امام صاحب بسم اللہ کو ہر سورت پر ضروری نہیں کہتے، یہ نہیں کہ جائز نہیں کہتے، درمختار یا ردمختار میں ہر سورت پر تسمیہ کو حسن کہا ہے۔ رہا ہر جگہ پکار کر پڑھنا، یہ بلاشبہ احناف کے خلاف ہے اور امام عاصم بھی جہر کو ضروری نہیں کہتے صرف تسمیہ کو ضروری کہتے ہیں۔ **واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم۔**

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جہر بسم اللہ روافض و شیعہ کا شعار رہا ہے اور انہوں نے بہت سی احادیث بھی اس کی تائید کے لیے وضع کر کے عوام کو گمراہ کیا تھا، چنانچہ امام سفیان ثوری وغیرہ فرمایا کرتے تھے کہ فرقہ شیعہ کے مقابلہ میں تقدیم ابی بکر و عمرؓ کی طرح ترک جہر بسم اللہ اور مسح علی الخفین اہل سنت کا شعار ہے اور اسی وجہ سے شوافع میں سے بھی بہت سے اکابر ابو علی بن ابی ہریرہ وغیرہ ترک جہر کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا تنقیحات کی روشنی میں یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ رمضان شریف کے ختم تراویح میں ہر سورت کے شروع میں بلند آواز سے بسم

اللہ پڑھنی فقہ حنفی کی رو سے درست نہیں اور روایت عاصم کی رو سے ضروری بھی نہیں' اس لیے آہستہ آواز سے پڑھنی چاہیئے' جس طرح کہ دوسری صدی سے اب تک برابر حناف کا معمول یہ رہا ہے' پھر چونکہ سارے ائمہ مجتہدین بجز امام شافعی کے جہر بسم اللہ کو مسنون نہیں فرماتے بلکہ ایک قول میں امام شافعی بھی بسم اللہ کو بجز فاتحہ کے دوسری سورتوں کا جز نہیں فرماتے' اور وہ ایک فرقۂ باطلہ کا شعار بھی ہے اس لیے ختم تراویح میں جہر بسم اللہ کا رواج دینے سے احتراز کرنا چاہیئے ۔ واللہ الموفق۔

۴-حدثنا موسٰی بن اسمٰعیل قال اخبرناابو عوانة قال حدثنا موسٰی بن ابی عائشة قال حدثنا سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنھما فی قولہ تعالیٰ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعالج من التنزیل شدة وکان مما یحرک شفتیة فقال ابن عباس رضی اللہ عنھما فانا احرکھما لک کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحرکھما وقال سعید انا احرکھما کما رایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما یحرکھما فحرک شفتیہ فانزل اللہ تعالیٰ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرانہ قال جمعہ لک صدرک و تقرأہ فاذا قرا ناہ فا تبع قرانہ قال فاستمع لہ وانصت ثم ان علینا بیا نہ ثم ان علینا ان تقرأہ فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلک اذا اتاہ جبریل استمع فاذا نطلق جبریل قرأہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما قرأہ'

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کلام الٰہی لاتحرک کی تفسیر کے سلسلہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت بہت مشقت برداشت فرمایا کرتے تھے اور آپ اکثر اپنے ہونٹوں کو بھی ہلاتے تھے' ابن عباسؓ نے کہا' میں اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں جس طرح سے آپ ہلاتے تھے' سعید کہتے ہیں' میں اپنے اونٹ ہلاتا ہوں' جس طرح ابن عباس کو ہلاتے ہوئے دیکھا پھر اپنے ہونٹ ہلائے (ابن عباسؓ نے کہا) پھر یہ آیت اتری کہ اے محمد قرآن کو جلد جلد یاد کرنے کے لیے اپنی زبان نہ ہلاؤ' اس کا (آپ کے سینے میں) جمع محفوظ کر دینا اور اس کو پڑھوا دینا ہمارا ذمہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قرآن تمہارے دل میں جما دینا اور جب آپ چاہیں اس کی تلاوت آپ کی زبان مبارک سے کرا دینا ہمارا کام ہے' پھر جب پڑھ لیں تو اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں (اس کا مطلب یہ ہے) کہ تم اس کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہو اس کے بعد مطلب سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے' پھر یقیناً یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کو پڑھو (یعنی تم اس کو محفوظ کر سکو) چنانچہ اس کے بعد جب آپ کے پاس جبریلؑ (وحی لے کر) آتے تو آپ (توجہ سے) سنتے' جب وہ چلے جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (تازہ وحی) کو اسی طرح (بے تکلف) پڑھتے جس طرح جبریلؑ نے پڑھا تھا۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرنے کے خیال سے وحی کو جلدی جلدی دہرانے کی کوشش فرماتے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ قرآن ہمارا کلام ہے جس غرض سے ہم اسے نازل کر رہے ہیں اس کا پورا کرنا ہمارے ذمہ ہے اس لیے اطمینان سے نازل ہونے والی وحی کو سنیئے اس کے محفوظ کرنے کی فکر نہ کیجئے' قرآن کی آیتوں میں خدا نے یہ اعجاز بھی پیدا فرما دیا کہ وہ ایک معصوم بچے تک کو یاد ہو جاتی ہیں' جب کہ دوسری مذہبی کتابیں مختصر ہونے کے باوجود بڑا آدمی بھی یاد نہیں کر سکتا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے کلام عظیم کو قلب انسانی محض ظاہری اسباب کی مدد سے محفوظ نہیں کر سکتا' پھر جس طرح اس کو یاد کرنے کی صلاحیت فخر رسل صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی' آپ کے صدقے میں آپ کی امت کے افراد کو بھی مرحمت ہوئی۔ **واللہ ذو الفضل العظیم**

۵-حدثناعبد ان قال اخبر نا عبد اللہ قال اخبرنا یونس عن الزھری وحدثنا بشربن محمد قال حدثنا عبد اللہ قال اخبرنا یونس و معمر نحوہ عن الزھری اخبرنی عبید اللہ بن عبد اللہ عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس وکان اجود ما یکون فی رمضان حین یلقاہ جبریل و کان یلقاہ

فی کل لیلة من رمضان فید ارسه القران فلرسول الله صلی الله علیه وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلة.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف سخاوت میں تمام انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے اور رمضان میں (دوسرے اوقات کے مقابلہ میں جب جبریلؑ آپ سے ملتے تو آپ کا یہ وصف نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا تھا۔ جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملاقات کرتے اور آپ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے غرض حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی نفع رسانی میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

تشریح: اس حدیث میں ذکر ہے کہ رمضان میں جبریلؑ آپ سے قرآن کا دور کرتے تھے یہ اس لیے کہ قرآن دنیا والوں کے لیے رمضان ہی کے مہینے میں نازل ہونا شروع ہوا۔ اس لحاظ سے رمضان سے قرآن کو بہت بڑی مناسبت ہے گویا یہ نزول وحی کا مہینہ ہے اور اسی کے طفیل یہ نزول رحمت کا مہینہ بن گیا اس حدیث سے بھی حکم ہوتا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں زیادہ سے زیادہ بھلائیاں کرنی چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ صدقہ وخیرات کیا جائے۔

''سخاوت'' مال کی تقسیم کا نام ہے اور ''جود'' کا درجہ اس سے اوپر ہے کہ جو چیز جس کے لیے موزوں ومناسب ہو وہ اس کو دی جائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخاوت مال میں تو بے مثال تھے ہی علوم وکمالات نبوت سے بھی دوسروں کو فیض یاب کرنے میں آپ کی سخاوت وو سعت قلب بے نظیر تھی ظاہر ہے کہ آپ کے روحانی کمالات و مدارج تمام اولین وآخرین سے بڑھے ہوئے تھے آپ کے پاس اتنی بڑی دولت وثروت تھی کہ کبھی کسی کو حاصل نہ ہوئی اور نہ کسی کو آئندہ حاصل ہوگی۔ اس پر آپ کی پوری خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ ان کمالات سے ساری انسانیت مستفید و بہرہ مند ہو۔ چنانچہ آپ کے علوم نبوت وکمالات روحانی کے سب سے پہلے فیض یاب آپ کے صحابۂ کرام ہوئے (اور ان کے کمالات کا درجہ یہ ہوا کہ ادنیٰ صحابی کے درجے کو بڑے سے بڑا ولی نہیں پہنچ سکتا۔

ان صحابۂ کرام کے نفوس قدسیہ کے فیض ظاہر وباطن سے تابعین وائمہ مجتہدین مستفید ہوئے اور اسی طرح یہ سلسلہ ظاہری وباطنی علوم نبوت کا ہمارے زمانہ کے علماء اولیاء وعامۂ مومنین تک پہنچا اور یہ بات بلا خوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ آج اس گئے گزرے دور میں بھی جو ایمان ومعرفت خداوندی کی نعمت ایک معمولی درجے کے مومن کو حاصل ہے وہ دنیا کے بڑے سے بڑے غیر مومن عالم وفلسفی کو بھی حاصل نہیں ہے۔

مال ہاتھ کا میل اور دنیا کی ہر دولت آنی جانی چیز ہے حدیث صحیح میں آتا ہے کہ اگر ساری دنیا کی دولت کی قدر خدا کے یہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ اس دنیا کی پانی جیسی بے قیمت چیز سے بھی کافر وبے دین کو ایک گھونٹ پینے کے لیے نہ دیتا۔ حق تعالیٰ کی مشیت نے فیصلہ کیا کہ ''دنیائے فانی'' کی ہر دولت کا زیادہ سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں (کیونکہ ان کو دولت وراحت کا تمام حصہ پہلے دے دیا گیا اور مسلمانوں کو ثانوی درجے میں دنیا کی دولت وراحت سے فائدہ اٹھانے کا حق کچھ شرائط پر موقوف کر دیا گیا اس کے بعد دوسری ''دنیائے ابدی'' کی ہر دولت وراحت سے مستفید ہونے کا حق پوری طرح مسلمانوں کو ہوگا اور دوسرے اس سے یکسر محروم ہوں گے یہاں مسلمانوں کی اسلامی زندگی یہ ہے کہ وہ اگر دولت کمائے تو جتنی چاہئے کمائے مگر اس کی نیت صحیح ہو اور اسی کے مطابق عمل یہ ہو کہ اپنی ضروریات کے بعد دینی ضروریات ومصالح پر صرف کرے پھر مسلمانوں کی عام وخاص ضروریات ومصالح پر نظر کرے۔ پھر ملکی وملی ضروریات ومصالح اور رفاہ عام نیز ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی راحت رسانی و ضروریات پر صرف کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس کا دولت کمانا اور مال سمیٹنا اور جمع کرنا نظر شارع میں کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

یہ تو اپنی کمائی ہوئی دولت کا حکم ہے۔ اور اگر ایک مسلمان کو ایک بادشاہ ایک وزیر اعظم یا صدر مملکت بننے کا موقع میسر ہو تو اس کے لیے اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ خلفائے راشدین کے اتباع میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات کو بھی نظر انداز کر کے صرف اپنے ملک وملت کے مصالح وضروریات پر ساری دولت کو صرف کر دے۔

چنانچہ مروی ہے کہ بحرین سے ایک لاکھ درہم آئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ مسجد کے ایک گوشہ میں ڈال دیئے جائیں۔ پھر نماز کے بعد سب اسی وقت تقسیم فرما دیئے کسی نے عرض کیا کہ حضور اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ رکھ لیتے؟ فرمایا تم نے پہلے

سے کیوں یاد نہیں دلایا' یہ ان کا دل خوش کرنے کو فرمادیا ورنہ آپ کو کیا چیز یاد نہیں تھی؟!

ایک مرتبہ نماز عصر کے بعد عجلت کے ساتھ حجرۂ شریفہ میں تشریف لے گئے اور سونے کا ایک ٹکرا نکال کر لائے اور مستحقین کو دے دیا' فرمایا کہ رسول خدا کے گھر میں ایسی چیز کا رہنا مناسب نہیں' عادت مبارکہ تھی کہ کبھی کسی سائل و ضرورت مند کو محروم نہ ہونے دیتے تھے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر بہت سے دیہاتی عربوں نے آ کر آپ کو گھیر لیا اور کہا کہ ہمیں مال دیجئے' ہم آپ کا یا آپ کے باپ کا مال نہیں مانگتے بلکہ خدا کا مانگتے ہیں' آپ نے اس بات پر کسی ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا بلکہ برابر سب کو دیتے رہے' مگر اژدھام زیادہ تھا' لوگوں کے ریلے کی وجہ سے آپ پیچھے ہٹتے ہٹتے کیکر کے درختوں میں الجھ گئے' اور چادر مبارک پھنس گئی' آپ نے فرمایا کہ تم مطمئن رہو' اگر ان سب خاردار درختوں کے برابر اونٹ ہوتے تو وہ سب بھی میں تقسیم کر دیتا۔ مجھے تم بخیل یا کم حوصلہ نہ پاؤ گے۔

غرض دنیاوی مال و متاع کی سخاوت تو روحانی و علمی کمالات کے فیضان کے اعتبار سے بہت کم درجہ کی چیز ہے' حق تعالیٰ نے ہی دنیا والوں کو ساری دنیوی نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور قرآن مجید میں فرمایا:۔ **و ما بکم من نعمة فمن اللّٰہ**'' کہ جو کچھ نعمتیں تمہارے پاس ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں ایک جگہ فرمایا کہ ''**و ان تعدوا نعمة الله لا تحصوها**' اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو پورا شمار نہ کر سکو گے لیکن جس نعمت خاصہ پر حق تعالیٰ نے خاص طور پر احسان جتلایا ہے وہ رشد و ہدایت کی نعمت ہے جس کا فیضان انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین' علماء و اولیاء کے ذریعے ہوا فرماتے ہیں:۔'' **لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولا منهم يتلوا عليهم اياته و يزكيهم و يعلمهم الكتاب والحكمة**'' حق تعالیٰ نے ایمان کی نعمت سے سرفراز ہونے والوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان کی ہدایت کے لیے اپنا رسول بھیجا جو خدا کی آیات تلاوت کر کے ان کے قلوب منور کرتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے' یعنی برائیوں سے ان کو پاک کرتا ہے اور علوم کتاب و سنت کے ذریعے ان کے علم و عرفان کی تکمیل فرماتا ہے۔ یہ سب سے بڑا احسان اور جتلانے کے قابل نعمت صرف اس لیے ہے کہ اس کا حصول بغیر اس خاص ذریعہ و وسیلہ کے ناممکن تھا اور اس کے علاوہ دنیا کے تمام علوم و فنون اور مادی ترقیات کے لیے انسانی عقل و فہم بھی کافی ہو سکتی ہے' غرض انبیاء علیہم السلام کے خصوصی فیضان کا تعلق روحانیت سے ہے اور اس بارے میں ان کا جود و کرم بھی بہت اعلیٰ درجے کا ہے' اس لیے سردار انبیاء علیہم السلام کے جود و سخاوت کو خاص طور سے مدح و ثنا کے موقع میں ذکر کیا گیا ہے' رمضان المبارک کے ماہ مقدس کو چونکہ ''نزول وحی'' سے ربط ہے کہ ۱۷ رمضان سے پہلی وحی کا آغاز ہوا اور اسی ماہ کی ہر رات میں حضرت جبریل علیہم السلام' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لا کر آپ کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے' اس لیے آپ کے جود و سخاوت کی شان بھی اس وقت بہت بلند ہو جاتی تھی اور اس کا ذکر خاص اہتمام سے حدیث مذکور میں ہوا ہے اور باب بداء الوحی سے اس حدیث کا تعلق یوں ظاہر ہے کہ پہلے بدوحی کا مکان غار حرا بتلایا تھا تو یہاں سے بدوحی کے زمانہ کی طرف اشارہ ہوا۔ **واللّٰہ اعلم بالصواب**

۶-حدثنا ابو اليمان الحكم بن نافع قال اخبرنا شعيب عن الزهرى قال اخبرنى عبيد اللّٰه بن عبد اللّٰه ابن عتبة بن مسعود ان عبد الله بن عباس اخبره' ان ابا سفيان بن حرب اخبره' ان هرقل ارسل اليه فى ركب من قريش و كانوا تجارا بالشام فى المدة التى كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ما دفيها ابا سفيان و كفار قريش فاتوه و هم بايلياء فدعاهم فى مجلسه و حوله عظماء الروم ثم دعاهم دعا ترجمانه ' فقال ايكم اقرب نسبا بهذا الرجل الذى يزعم انه نبى قال ابو سفيان فقلت انا اقربهم نسباً فقال اذنوه منى و قربوا اصحابه فاجعلوا هم عند ظهره ثم قال لترجمانه قل لهم انى سائل هذا عن هذا الرجل فان كذبنى فكذبوه فوالله لو لا الحياء من ان يا ثروا على كذبا لكذبت عنه ثم كان اول ما سالنى عنه ان قال كيف نسبه فيكم ؟ قلت هو فينا ذو نسب قال فهل

قال هذا القول منکم احد قط قبله ؟ قلت لاقال فهل کان من اٰبائه من ملک؟ قلت لا قال فاشراف الناس اتبعوه ام ضعفاء هم؟ قلت بل ضعفاء هم قال ایزیدون ام ینقصون ؟ قلت بل یزیدون قال فهل یر تداحد منهم سخطةلدینه بعد ان ید خل فیه؟ قلت لا قال فهل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال؟ قلت لا قال فهل یغدر ؟ قلت لا نحن منه فی مدة لا ندری ما هو فاعل فیها قال و لم یمکنی کلمة ادخل فیها شیئا غیر هذه الکلمة قال فهل قا تلتموه؟ قلت نعم قال فکیف کان قتالکم ایاه قلت الحرب بیننا و بینه سجال بنال منا و ننا ل منه قال ماذ ا یا مر کم ؟ قلت یقول اعبد الله وحده و لا تشرکوا به شیئا وا ترکو ا ما یقول ا با ؤکم و یا مر نا بالصلوٰة والصدق والعفاف الصلة فقال للترجمان قل له سألتک عن نسبه فذکرت انه فیکم ذو نسب و کذ لک الرسل تبعث فی نسب قو مها و سالتک هل قال احدمنکم هذا القول فذکرت ان لا قلت لو کان احد قال هذا القول قبله لقلت رجل یتاسی بقول قیل قبله و سأ لتک هل کان من اباء ہ من ملک فذکرت ان لا فقلت فلو کان من ابائه من ملک قلت رجل یطلب ملک ابیه و سالتک هل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال فذکرت ان لا فقد اعرف انه لم یکن لیذر الکتاب علی الناس و یکذب علی الله و سألتک اشراف الناس اتبعوه امضعفاء هم فذکرت ان صنعفأهم اتبعوہ وهم اتباع الرسل وسألتک ایزیدون ام ینقصون فذکرت انهم یزیدون و کذلک امر الا یمان حتی یتم و سالتک ایر تد احد سخطة لدینه بعد ان ید خل فیه فذکرت ان لا و کذلک الایمان حین تخالط بشاشته القلوب و سألک هل یغدر فذکرت ان لا و کذلک الرسل لا تغدرو سالتک بما یا مرکم فذکرت انه یا مرکم ان تعبدوا الله و لا تشرکو به شیئاً و ینها کم عن عبادة الا و ثان و یا مرکم بالصلوٰة والصدق والعفاف فان کان ما تقول حقاً فسیملک مو ضع قدمی ها تین و قد کنت اعلم انه خارج و لم اکن اظن انه منکم فلوا نی اعلم انی اخلص الیه لتجشمت لقائه' لو کنت عند ہ لغسلت عن قدمیه ثم دعا بکتاب رسول الله صلی الله علیه وسلم الذی بعث به مع دحیة الکلبی الی عظیم بصری فد فعه عظیم بصری الی هرقل فقرائه فاذا فیه بسم الله الرحمن الرحیم من محمد عبدالله ورسوله الی هر قل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدیٰ. اما بعد فانی ادعو ک بد عایته الاسلام اسلم تسلم یوتک الله اجر ک مر تین فان تو لیت فان علیک اثم الیر یسین و یاهل الکتاب تعالو الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا الله و لا نشرک به شیئاً و لا یتخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون الله فان تو لو ا فقولوا اشهد و ابانا مسلمون قال ابو سفیان فلما قال ما قال وفرغ من قرائة الکتاب کثر عنده الصخب فارتفعت الا ضوات واخرجنا فقلت لا صحابی حین اخرجنا لقد امر امرابن ابی کبشة انه یخافه ملک بنی الاصفر. فما زلت موقناً انه سیظهر حتیٰ ادخل الله علی الا سلام وکان ابن الناطورصاحب ایلیا ء وهرقل سقفاً علیٰ نصاری الشام یحدث ان هرقل حین قدم ایلیآء اصبح یوماً خبیث النفس فقال بعض بطارقته قداستنکر ناهیئتک قال ابن الناطور وکان هرقل خزآءً ینظر فی النجوم فقال لهم حین سالوه انی رایت اللیلة حین نظرت فی النجوم ملک الختان قدظهر فمن یختتن من هذه الامة قالو الیس یختتن الاالیهود فلایهمنک شانهم واکتب الیٰ مدائن مللک فلیقتلوا من فیهم من الیهود فبینما هم علیٰ امرهم اتی هرقل برجل ارسل به ملک غنسان یخبر عن خبر رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما استخبره هرقل قال اذهبوا فانظروا مختتن هوام لافنظروا الیه فحدثوه انه مختتن وساله عن العرب فقال هم یختتنون فقال هرقل هذا ملک هذه الامة قدظهرثم کتب هرقل الیٰ صاحب له برومیة وکان نظیره فی العلم وسارهرقل الیٰ حمص فلم یرم حمص حتیٰ اتاه کتاب من صاحبه یوافق رای هرقل علیٰ خروج النبی صلی الله علیه وسلم وآنه نبی فاذن

هرقل لظمآء الروم فی دسکرۃ لہ بحمص ثم امر بہا فغلقت ثم اطلع فقال یامعشر الروم ھل لکم فی الفلاح والرشد وان یثبت ملککم فتبایعوا ھذا النبی فحاصو حیصۃ حمرالوحش الی الابواب فوجد وھاقدغلقت فلما رای ھرقل نفرتھم وایس من الایمان قال ردوھم علی وقال الی قلت مقالتی انفاً اختبر بہا شدتکم علیٰ دینکم فقد رایت فسجدوالہ ورضواعنہ فکان ذلک اٰخر شان ھرقل قال ابوعبداللہ رواہ صالح بن کیسان ویونس ومعمر عن الزھری.

ترجمہ: عبداللہ بن عباسؓ نے سفیان بن حرب سے نقل کیا کہ ہرقل نے ان کے پاس قریش کے قافلے میں ایک آدمی بھیجا اس وقت یہ لوگ تجارت کے لیے شام گئے ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور ابوسفیان سے ایک وقتی معاہدہ کیا تھا تو ابوسفیان اور دوسرے لوگ ہرقل کے پاس ایلیا پہنچے جہاں ہرقل نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا تھا اس کے گرد روم کے بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے، ہرقل نے انہیں اور اپنے ترجمان کو بلوایا، پھر ان سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص مدعی رسالت کا قریبی عزیز ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں بول اٹھا کہ میں اس کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں (یہ سن کر) ہرقل نے حکم دیا کہ اس (ابوسفیان) کو میرے قریب لاؤ اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پس پشت بٹھلا دو، پھر اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں ابوسفیان سے اس شخص (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال پوچھتا ہوں، اگر یہ مجھ سے جھوٹ بولے تو تم اس کا جھوٹ ظاہر کر دینا (ابوسفیان کا قول ہے کہ، خدا کی قسم! اگر مجھے غیرت نہ آتی کہ یہ لوگ مجھے جھوٹا کہیں گے تو میں آپ کی نسبت ضرور غلط بدگوئی سے کام لیتا، خیر پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی وہ یہ کہ اس شخص کا خاندان تم لوگوں میں کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ تو بڑے نسب والا ہے، کہنے لگا، اس سے پہلے بھی کسی نے تم لوگوں میں ایسی بات کہی تھی؟ میں نے کہا کہ نہیں، کہنے لگا، اچھا اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا نہیں، پھر اس نے کہا، بڑے لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی یا کمزوروں نے؟ میں نے کہا کمزوروں نے، پھر کہنے لگا کہ اس کے متبعین روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا ان میں زیادتی ہو رہی ہے، کہنے لگا، اچھا اس کے دین کو برا سمجھ کر اس کا کوئی ساتھی پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، اس نے کہا کہ کیا اس کے دعوے (نبوت) سے پہلے تم لوگ اس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے تھے؟ میں نے کہا نہیں، پوچھا کیا وہ عہد شکنی کرتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ البتہ اب ہماری اس سے (صلح کی) ایک مدت ٹھہری ہوئی ہے، معلوم نہیں وہ اس میں کیا کرتا ہے (ابوسفیان کہتے ہیں۔ بس اس بات کے سوا اور کوئی (مغالطہ آمیز) بات اس (گفتگو) میں شامل نہ کر سکا، ہرقل نے کہا کہ کیا تمہاری اس سے لڑائی بھی ہوتی ہے؟ میں نے کہا ہاں! بولا، پھر تمہاری اس کی جنگ کس طرح ہوئی ہے؟ میں نے کہا، لڑائی ڈول کی طرح ہوتی ہے کبھی وہ ہم سے میدان جنگ لے لیتے ہیں اور کبھی ہم ان سے، ہرقل نے پوچھا وہ تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو، اور ہمیں نماز پڑھنے سچ بولنے، پرہیزگاری اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ (یہ سب سن کر) پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہہ دو کہ میں نے تم سے اس کا نسب پوچھا تو تم نے کہا کہ وہ ہم میں عالی نسب ہے اور پیغمبر اپنی قوم میں عالی نسب ہی بھیجے جایا کرتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا کہ دعویٰ (نبوت) کی یہ بات تمہارے اندر اس سے پہلے کسی اور نے بھی کہی تھی، تو تم نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب میں نے (اپنے دل میں) یہ کہا اگر یہ بات اس سے پہلے کسی نے کہی ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ اس شخص نے بھی اس بات کی تقلید کی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی گذرا ہے، تم نے کہا کہ نہیں، تو میں نے (دل میں) کہا کہ ان کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہوگا تو کہہ دوں کہ وہ شخص اس بہانے سے اپنے آباؤ اجداد کا ملک حاصل کرنا چاہتا ہے اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس بات کے کہنے (یعنی پیغمبری کا دعویٰ کرنے سے) پہلے کبھی تم نے اس دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے تم نے کہا کہ نہیں، تو میں نے سمجھ لیا کہ جو شخص آدمیوں کے ساتھ دروغ گوئی سے بچے وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹی بات کہہ سکتا ہے اور میں نے تم سے پوچھا کہ بڑے لوگ اس کے پیرو ہوتے ہیں یا کمزور

آدمی؟ تم نے کہا کہ کمزوروں نے اس کا اتباع کیا تو وہ (اصل) یہی لوگ پیغمبروں کے متبعین ہوتے ہیں اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں تم نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور ایمان کی کیفیت یہ ہی ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ کامل ہو جاتا ہے اور میں نے پوچھا کہ کوئی شخص ناخوش ہو کر اس کے دین سے لوٹ بھی جاتا ہے، تم نے کہا نہیں، تو ایمان کی خاصیت بھی یہ ہی ہے جن کے دلوں میں اس کی حلاوت اتر جاتی ہے تو پھر وہ ان سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتا اور میں نے پوچھا کہ آیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں، تم نے کہا کہ وہ، ہم کو حکم دیتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور تمہیں بتوں کی پرستش سے روکتے ہیں، سچ بولنے اور پرہیزگاری کا حکم دیتے ہیں، لہٰذا اگر یہ باتیں جو تم کہہ رہے ہو سچ ہیں، تو عنقریب وہ اس جگہ کا بھی حاکم ہو جائے گا جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں، مجھے معلوم تھا کہ وہ پیغمبر آنے والا ہے مگر مجھے خیال نہیں تھا کہ وہ تمہارے اندر ہوگا، اگر میں جانتا کہ اس تک پہنچ سکوں گا تو اس سے ملنے کے لیے ہر تکلیف گوارہ کرتا، اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا، پھر ہرقل نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط منگایا جو آپ نے دحیہ کلبی کے ذریعے حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہ ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا، ہرقل نے اس کو پڑھا تو اس میں لکھا تھا یہ اللہ کے نام کے ساتھ جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے، اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے ہرقل شاہ روم کے لیے، اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے، اس کے بعد میں تمہیں دعوت اسلام دیتا ہوں کہ اسلام لے آؤ گے تو دین و دنیا کی سلامتی نصیب ہوگی، اللہ تمہیں دوہرا ثواب دے گا اور اگر تم میری دعوت سے روگردانی کرو گے تو (تمہاری) رعایا کا گناہ بھی تم ہی پر ہوگا اور اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر آ جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب بنائے، پھر اگر وہ اہل کتاب (اس بات سے) منہ پھیر لیں تو (مسلمانو!) تم ان سے کہہ دو کہ (تم مانو یا نہ مانو) ہم تو ایک خدا کے اطاعت گزار ہیں۔

ابوسفیان کہتے ہیں جب ہرقل نے یہ باتیں کہیں اور خط پڑھ کر فارغ ہوا تو اس کے اردگرد بہت شور و غوغا ہوا، بہت سی آوازیں اٹھیں، اور ہمیں باہر نکال دیا گیا تب میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابوکبشہ کے بیٹے کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا۔ (دیکھو تو) اس سے بنی اصغر (روم کا بادشاہ) بھی ڈرتا ہے۔ مجھے اس وقت سے اس بات کا یقین ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب غالب ہو کر رہیں گے۔ حتیٰ کہ اللہ نے مجھے مسلمان کر دیا۔ (راوی کا بیان ہے) کہ ابن ناطور ایلیاء کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا لاٹ پادری بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیاء میں آیا، ایک دن صبح کو پریشان حال اٹھا، اس کے درباریوں نے دریافت کیا کہ آج آپ کی صورت بدلی ہوئی پاتے ہیں (کیا وجہ ہے؟) ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہرقل نجومی تھا، علم نجوم میں مہارت رکھتا تھا، اس نے اپنے ہم نشینوں کے پوچھنے پر بتلایا کہ میں نے آج رات ستاروں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب آ گیا (بتلاؤ؟) اس زمانے میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہود کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا، سو ان کی وجہ سے آپ قطعاً پریشان نہ ہوں، سلطنت کے تمام شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجئے کہ وہاں جتنے یہودی ہوں سب قتل کر دیئے جائیں، وہ لوگ ان ہی باتوں میں مشغول تھے کہ ہرقل کے پاس ایک شخص لایا گیا جسے شاہ غسان نے بھیجا تھا، اس نے رسول اللہ کے حالات بیان کئے جب ہرقل نے سارے حالات ان سے سن لیے تو کہا کہ اس کو لے جاؤ اور دیکھو کہ وہ ختنہ کئے ہوئے ہے یا نہیں؟ انہوں نے اسے دیکھا تو بتلایا کہ وہ ختنہ کیا ہوا ہے، ہرقل نے جب اس شخص سے عرب کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں۔ تب ہرقل نے کہا کہ یہ ہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے بادشاہ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں، پھر اس نے اپنے ایک دوست کو رومیہ لکھا اور وہ علم نجوم میں ہرقل کی ٹکر کا تھا۔ پھر خود ہرقل حمص چلا گیا، ابھی حمص سے نکلا نہیں تھا کہ اس کے دوست کا خط (اس کے جواب میں) آ گیا اس کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بارے میں ہرقل کے موافق تھی کہ محمدؐ (واقعی) پیغمبر ہیں اس کے بعد ہرقل نے روم کے بڑے آدمیوں کو اپنے حمص کے محل میں طلب کیا، اس کے حکم سے محل کے دروازے بند کر لیے گئے پھر اپنے محل سے یوں گویا ہوا۔ "اے روم والو! اگر تم ہدایت و کامرانی کے طلب گار ہو اور اپنی

سلطنت وحکمرانی کی بقاء چاہتے ہو تو پھر اس نبی کی بیعت کرلو۔'' (یہ سنناتھا کہ) وہ لوگ وحشی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے مگر انہیں بند پایا (آخر جب ہرقل نے (اس بات سے) ان کی یہ نفرت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو کہنے لگا کہ ان لوگوں کو پھر میرے پاس لاؤ' جب وہ دوبارہ آئے تو اس نے کہا' میں نے جو بات کہی تھی اس سے تمہاری دینی پختگی کی آزمائش مقصود تھی سو وہ میں نے دیکھ لی (یہ بات سن کر) سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور اس سے خوش ہو گئے' بس یہ ہرقل کا آخری حال ہے' ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو صالح بن کیسان' یونس اور معمر نے بھی زہری سے روایت کیا ہے۔

تشریح: **ترتیب واقعات**: اس حدیث میں کئی واقعات کی طرف اشارہ ہے اور ترتیب واقعات اس طرح صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ہرقل نے اولاً بیت المقدس میں علم نجوم کے ذریعہ معلوم کیا کہ ملک الختان کا غلبہ ہوگا۔ ان ہی ایام میں ملک غسان نے ہرقل کے پاس قاصد بھیجا' جس سے اس کو ملک عرب کے حالات معلوم ہوئے' پھر ہرقل نے رومیہ کے عالم نجوم ضغاطر نامی کے پاس خط بھیج کر اس کی رائے دریافت کی وہاں سے جواب نہیں آیا تھا کہ اسی اثنا میں اس کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی دعوت اسلام کے لیے پہنچ گیا اور آپ کے ذاتی حالات کی تحقیق کے لیے اس نے عربوں کا پتا لگایا' تو بیت المقدس سے قریب ہی ایک مقام غزہ میں حضرت ابوسفیان کی امارت میں تیس شتر سوار تاجران مکہ معظمہ کا قافلہ مقیم تھا' ان سب کو بلا کر ہرقل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دس سوالات کیے' جن کے جوابات حضرت ابوسفیان نے دیئے' اور ہرقل نے متاثر ہو کر اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ جس پر حاضرین دربار نے شور وشغب کیا' اس کے بعد جب ہرقل بیت المقدس سے حمص واپس ہوا اور وہاں اس کو ضغاطر کا جواب بھی ملا تو ملک کے بڑے لوگوں کو اپنے محل میں بلا کر دوبارہ اپنی عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا' مگر ان سب لوگوں نے مخالفت کی' اور اس کے بعد ہرقل کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا۔ **واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔**

ان سب واقعات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ابتدائی اسلامی تاریخ کے چند ورق پڑھیے! جن سے آپ کو اپنی زندگی کے لیے بھی روشنی ملے گی۔ **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر و ذکر اللہ کثیرا۔** (احزاب)

عہد نبوت کا ایک زریں باب

دربار رسالت کی طرف سے شاہان دنیا کو دعوت اسلام حروب روم وفارس کی فتح وشکست کے بار میں قرآن مجید کی پیش گوئی۔

سب سے پہلے آیات قرآنیہ **الم غلبت الروم فی ادنی الارض** کا ترجمہ پھر اس کی تفسیر میں حضرت علامہ عثمانیؒ کا بصیرت افروز تفسیری نوٹ ملاحظہ کیجئے:۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

ترجمہ:۔ الم' رومی قریب والے ملک میں مغلوب وشکست خوردہ ہو گئے ہیں اور وہ شکست کے بعد نو سال کے اندر ہی غالب وفاتح ہو جائیں گے (درحقیقت) پہلے پچھلے سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم واختیار سے ہوتے ہیں' اس (فتح کے) دن مسلمان خدا کی نصرت کی وجہ سے خوش ہوں گے' خدا جس کی چاہے مدد کرتا ہے' وہ بڑے اختیار وقدرت اور رحم وکرم والا ہے' خدا کا وعدہ ہو چکا'' وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا مگر اکثر لوگ صحیح علم سے بے بہرہ ہیں وہ دنیاوی زندگی کی کچھ سطحی باتوں سے واقفیت رکھتے ہیں (جس سے کمانے کھانے اور ظاہر و عارضی ٹیپ ٹاپ کے ڈھنگ اچھے بنالیے ہیں' لیکن (اس زندگی کے بعد شروع ہونے والی) آخرت کی زندگی سے بے خبر ہیں۔

تفسیری نوٹ:''ادنی الارض'' ملتے ہوئے ملک یا پاس والے ملک سے مراد اذرعات وبصریٰ کے درمیان کا خطہ ہے' جو شام کی سرحد پر حجاز سے ملتا ہوا مکہ کے قریب واقع ہے' یا فلسطین مراد ہو' جو رومیوں کے ملک سے نزدیک تھا' یا جزیرہ ابن عمر جو فارس سے زیادہ قریب ہے ان آیات میں قرآن مجید نے ایک عجیب وغریب پیشین گوئی کی جو اس کی صداقت کی عظیم الشان دلیل ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سب سے بڑی دو سلطنتیں فارس وروم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آرہی تھیں' ۶۰۲ء' ۶۱۴ء' کے بعد تک ان کی سخت لڑائیاں رہیں (انسکلو پیڈیا برٹانیکا)

حروب روم وفارس

۵۷۰ء میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء آپ کی بعثت ہوئی، مکہ والوں کو جنگ روم وفارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں، اسی دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لیے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کردی فارس (ایران) کے آتش پرست مجوسی کو مشرکین مکہ اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے، اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں سے قریب تر قرار پاتے تھے، اس لیے جب فارس کے غلبہ کی خبر آتی مشرکین مکہ خوش ہوتے، اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی فال لیتے، خوش آئندہ توقعات باندھتے تھے، اور مسلمانوں کو طبعاً اس سے صدمہ ہوتا کہ عیسائی اہل کتاب آتش پرست مجوسیوں سے مغلوب ہوں، اور اس وقت ان کو مشرکین مکہ کی شماتت کا بھی ہدف بننا پڑتا تھا۔

آخر ۶۱۴ء کے بعد (جب کہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً پینتالیس سال ہوئے اور بعثت کے پانچ سال گزر چکے، خسرو پرویز (کی خسرو ثانی، کے عہد میں فارس نے روم کو ایک نہایت زبردست وفیصلہ کن شکست دی کہ شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے، ہرقل (قیصر روم) کو ایرانی لشکر نے قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کردیا۔ اور رومیوں کا دارالسلطنت بھی خطرہ میں پڑ گیا، بڑے بڑے پادری قتل یا قید ہوگئے، بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایرانی فاتحین لے گئے، قیصر روم کا اقتدار بالکل فنا ہوگیا، اور بظاہر اسباب کوئی صورت روم کے ابھرنے اور فارس کے تسلط سے نکلنے کی باقی نہ رہی۔

فارس کی فتح اور روم کی شکست کے اثرات

یہ حالات دیکھ کر مشرکین مکہ نے خوب خوشیاں منائیں، مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کیا، بڑے بڑے حوصلوں کے ساتھ اپنے سیاسی تفوق کی توقعات قائم کرنے لگے، حتیٰ کہ بعض مشرکین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹادیا ہے، کل ہم بھی تمہیں اسی طرح مٹا ڈالیں گے، اس وقت قرآن مجید نے سلسلۂ اسباب ظاہری کے بالکل خلاف عام اعلان کردیا کہ بیشک اس وقت رومی فارسیوں سے مغلوب ہوگئے ہیں۔ لیکن نو سال کے اندر اندر وہ پھر غالب وفاتح بن جائیں گے حضرت ابوبکر صدیق کو چونکہ وحی الٰہی پر کامل بھروسہ ویقین تھا، انہوں نے بھی بعض مشرکین سے شرط باندھ لی کہ اگر اتنی مدت کے اندر رومی غالب نہ ہوئے تو میں ایک سو اونٹ تم کو دوں گا، ورنہ اسی قدر اونٹ تم سے لوں گا۔ (اس وقت تک ایسی شرط لگانا جائز تھا) یا دارالحرب کی وجہ سے اس کی گنجائش تھی جیسا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے پہلے یہ شرط تین سال کے لیے اور کم مقدار اونٹوں پر ہوئی تھی جب حضرت ابوبکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں بضع کا لفظ ہے، جس کا اطلاق نو تک ہوتا ہے، تو پھر یہ شرط نو سال کے لیے اور ایک سو اونٹ پر ہوئی۔

ادھر یہ معاہدہ ہو رہا تھا، ادھر ہرقل ان تمام مایوس کن وحوصلہ شکن حالات سے قطعاً بے ہراس، اور خدا کی نصرت پر بھروسہ کرکے پوری حوصلہ مندی سے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کی تدابیر میں سرگرم ہوگیا، اس نے منت مانی کہ اگر خدا نے مجھ کو ایران والوں پر فتح دی تو حمص سے پیدل چل کر بیت المقدس پہنچوں گا۔

غلبۂ رُوم وشکست فارس

خدا کی قدرت دیکھو کہ قرآن مجید کی پیش گوئی کے مطابق ٹھیک نو سال کے اندر (یعنی ہجرت کا ایک سال گزرنے پر) عین بدر کے دن جب کہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر نمایاں فتح ونصرت ہونے کی خوشیاں منا رہے تھے۔ یہ خبر سن کر اور زیادہ مسرور ہوئے کہ رومی اہل کتاب کو خدا نے ایران کے مجوسیوں پر غالب کردیا اور مشرکین مکہ کو اپنی شکست کے ساتھ ایران کی بھی ذلت نصیب ہوئی۔

ظاہری اسباب کے بالکل خلاف قرآن مجید کی اس محیر العقول صداقت پیشگوئی کا مشاہدہ کر کے بہت سے لولوں نے اسلام قبول کیا' اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ سے ایک سواونٹ حاصل کئے' جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق صدقہ کر دیے گئے''۔

حضرت عثمانیؒ کے مذکورہ بالا تفسیری نوٹ سے واضح ہوا کہ روم کے غلبہ وفتح کی خبر غزوۂ بدر کے موقعہ پر مل چکی تھی' پھر ۶ھ کی صلح حدیبیہ کے بعد ابو سفیان کا تجارتی قافلہ شام گیا ہے اور بیت المقدس میں ہرقل کے دربار میں جا کر وہ سب گفتگو ہوئی ہے' جو مذکورہ حدیث میں نقل ہوئی' بعض حضرات کی رائے ہے کہ صلح حدیبیہ کے سال ہی میں روم کو فارس کے مقابلہ میں فتح وغلبہ حاصل ہوا ہے' اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ دونوں قول نقل کئے ہیں' مگر ہمارے نزدیک قوی' راجح قول وہی ہے کہ فتح روم کے اہم گوشے غزوۂ بدر ہی کے موقع پر ظاہر ہو چکے تھے' جن کے ساتھ غلبۂ فارس کا سلسلہ ختم ہو کر غلبۂ روم کا آغاز پوری گرم جوشی کے ساتھ ہو چکا تھا' مگر چونکہ پھر فتح ونصرت کا سلسلہ اور قدیم وجدید بلاد وممالک مفتوحہ کے انتظام واستحکام کا کام بعد کے چند سالوں تک ہوتا رہا ہے تو ان سب مہمات سے پوری طرح فارغ ہو کر ہی ہرقل (قیصر روم) کو بیت المقدس حاضری کا موقعہ ملا ہوگا۔

فتوحات اسلامیہ وصلح حدیبیہ

اتنے عرصہ میں غزوۂ بدر' غزوۂ احد' غزوہ خندق وغیرہ میں اسلامی فتوحات داخلیہ کا سلسلہ چلتا رہا اور ۶ھ میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۴۔۱۵ سو صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ اور زیارت کعبہ معظمہ کی نیت سے مکہ معظمہ کا سفر فرمایا' مکہ معظمہ کے قریب پہنچے' ایک منزل ورے مقام حدیبیہ پر سب ٹھہر گئے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہلے مکہ معظمہ بھیجا اور اہل مکہ کو اطلاع دی کہ ہم سب عمرہ کے لیے آ رہے ہیں اور کوئی ارادہ نہیں ہے' کفار مکہ نے حضرت عثمان کو روک لیا' اور یہ خبر کسی طرح مشہور ہوگئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے' اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ببول کے درخت کے نیچے تمام صحابہ سے جہاد پر بیعت لی' جس کو بیت رضوان کہا جاتا ہے (کیونکہ ان تمام بیعت کرنے والے صحابہ سے رضامندی کا اعلان حق تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرما دیا تھا) بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی' بلکہ قریش نے سہیل بن عمرو کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صلح کے لیے بھیجا تھا' چنانچہ دس سال کے لیے باہمی جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو گیا' اس میں ایک شرط کفار کی طرف سے یہ بھی تھی کہ اس سال آپ سب حضرات اسی طرح بغیر عمرہ کے واپس ہوں اور اگلے سال پھر آ کر عمرہ کریں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منظور فرما لیا' معاہدہ کی تحریر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی تھی' اس میں انہوں نے من محمد رسول اللہ لکھا تو اس پر بھی کفار مکہ نے اعتراض کیا کہ اگر ہم رسول مانتے تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی قبول فرما لیا اور اپنے دست مبارک سے اس کو مٹا دیا' پھر من محمد عبداللہ لکھا گیا۔

ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ معظمہ سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ جائے تو اس کو وہاں سے مکہ معظمہ کو واپس کر دیا جائے اور مدینہ طیبہ سے کوئی مکہ معظمہ آئے تو اس کو واپس نہ کیا جائے گا۔

صلح حدیبیہ کے فوائد ونتائج

غرض اس شان سے یہ ناجنگی معاہدہ لکھا گیا۔ جب کہ صحابہ کرام کی ڈیڑھ ہزار سرفروشوں کی جماعت جہاد وموت وعدم فرار پر بیعت کرنے کے بعد نہایت بے تاب تھی کہ آج ایک فیصلہ کن جنگ اور ہو جانی چاہیے اور وہ سب حضرات کسی طرح آمادہ نہ تھے کہ بغیر عمرہ کئے ہوئے مکہ معظمہ سے ایسی گری ہوئی شرطوں پر صلح کر کے واپس لوٹ جائیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ان سب سے بلند تھی، آپ کی نظر خدا کی مشیت، اس کی وحی واشارہ پر تھی وہاں یہ سوال ہی نہیں تھا کہ ظاہری حالات کا تقاضہ کیا ہے اور کیوں ہے، اور آپ کی اسی شان نبوت، اولوالعزمی اور بے نظیر وسعت قلب وحوصلہ مندی کا مظاہرہ ایسے مواقع پر حق تعالیٰ کو کرانا تھا' دوسری طرف حرم کعبہ کی پاسداری تھی کہ اس کی حدود میں جدال وقتال کسی طرح موزوں نہیں اگر اس کی رعایت خدا کا محبوب ترین پیغمبر اور افضل الرسل ہی نہ کرتا تو دوسرا کون کرسکتا تھا اسی کے ساتھ صحابہ کرام کی بے نظیر

اطاعت شعاری کو بھی دیکھئے کہ جوں ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے ہدی کا جانور ذبح فرما کر اور حلق راس سے احرام عمرہ ختم کیا تو تمام صحابہ نے بھی فوراً حلق وقصر کرا کرا پنے اپنے احرام کھول دیئے اور حضور کے فیصلہ سے مطمئن ہو کر مدینہ طیبہ کو الٹے پیروں واپس ہو گئے۔

فتح مبین

راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی جس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو'' فتح مبین'' عطا فرمائی، بعض صحابہ حیرت سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ فتح ہے؟ مطلب یہ کہ غزوہ بدر، احد وخندق وغیرہ میں فیصلہ کن شکستیں دینے والے ڈیڑھ ہزار مجاہدین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت مبارکہ میں اتنا دور دراز کا سفر کر کے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک جاتے ہیں اور قریب پہنچ کر بھی داخلہ حرم سے محروم، عمرہ کے بغیر اور بظاہر نہایت گری ہوئی شرطوں پر معاہدہ کر کے واپس ہو رہے ہیں اور اس کو حق تعالیٰ فتح مبین فرماتے ہیں، یہ کیا معاملہ ہے؟

یہ واقعہ آواخر ۶ ھ کا ہے اور اوائل ۷ ھ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''خیبر'' کو فتح کیا، جو مدینہ کی جانب شمال وشام چار منزل پر یہودیوں کا ایک شہر تھا اور اس حملہ میں کوئی شخص ان صحابہ کے سوا شریک نہ تھا، جو آپ کے ساتھ حدیبیہ میں تھے، پھر ۷ ھ میں آپ نے حسب معاہدہ عمرۃ القضاۃ کے لیے مکہ معظمہ کا سفر فرمایا، اور امن وامان کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ ادا فرمایا۔ اس کے بعد قریش نے نقض عہد کیا اس طرح کہ قریش نے اپنے حلیفوں کا ساتھ دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیفوں پر حملہ کر دیا۔ جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلان فرمایا کہ معاہدہ ختم ہو گیا اور دس ہزار مجاہدین صحابہ کو لے کر ۸ ھ میں مکہ معظمہ کو فتح کر لیا۔

فتح مکہ معظمہ کے حالات

جس رات میں آپ فاتحانہ مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے تھے، ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ اسلامی لشکر کے تجسس حال کے لیے نکلے، اور جہاں لشکر اسلام کا پڑاؤ تھا، اس کے قریب ایک ٹیلہ پر بیٹھ کر حالات کا جائزہ لینے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ارشاد فرمایا کہ ''سب لوگ اپنے چولہے الگ الگ جلائیں۔'' (جس سے دشمن کے جاسوسوں کی نظر میں لشکر اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو، دوسری طرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ ایسے جاسوسوں کی خبر گیری کرتے ہوئے پھر رہے تھے، اور ابوسفیان کو گرفتار کر کے حضور کی خدمت میں لے گئے، نقل ہے کہ آپ نے ابوسفیان کا دامن جھٹک کر ارشاد فرمایا'' کیا تم اب بھی ایمان نہیں لاؤ گے''؟ یہ سن کر ابوسفیان کلمہ پڑھ کر داخل اسلام ہو گئے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو لے کر فلانی گھاٹی پر کھڑے ہو جاؤ، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ سب قبائل کے لوگ حربی ترانے پڑھتے ہوئے، اس گھاٹی سے گزریں، چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

سیاسی تدابیر کے فوائد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی سیاسی تدابیر اس لیے اختیار فرمائیں کہ اہل مکہ مرعوب ہو کر خود ہی ہتھیار ڈال دیں اور مکہ معظمہ کے اندر جلال وقتال کی نوبت نہ آئے، سب سے آخر میں جب مہاجرین کا گروہ اس گھاٹی سے گزرنے لگا، جس میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے، تو آپ نے فرمایا۔ اے ابوسفیان! ہم تمہارا اکرام کرتے ہیں اور اعلان کر دیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا، اس کو امن دیا گیا، جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا، اس کو امن ہے، جو شخص بیت اللہ کے جوار میں پہنچ جائے گا، اس کو امن دیا گیا، جو شخص اپنا ہتھیار رکھ دے گا اس کو بھی ہم نے امن دیا۔

ابوسفیان پر مکارم اخلاق کا اثر

حضرت ابوسفیان جو غزوہ احد وغزوہ خندق میں لشکر کفار کے سپہ سالار اعظم رہے تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کی بدخواہی میں پیش پیش رہا

کرتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس برتاؤ پر سخت حیرت زدہ تھے، اور ان کے دل میں اسلام کی حقانیت وصداقت اترتی جارہی تھی، مگر ان کی بیوی ہندہ ان کے مسلمان ہونے پر سخت برہم ہوئی اور خوب لڑی حتیٰ کہ ان کے منہ پر تھوک بھی دیا، وہ مسلمانوں کی سخت ترین دشمن تھی اور اس قدر سخت دل کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت شفیق چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چباڈالا تھا۔

اسلامی حکومت رحمت عالم تھی

غرض یہاں اس مختصر تاریخ کے ذکر سے یہ دکھلانا تھا کہ بعثت نبوی سے قبل دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کا اقتدار اعلیٰ تھا، بعثت نبوی کی برکات سے پہلے روم کی فتوحات بالکل غیر متوقع طرز پر ہوئیں، جن سے فارس (ایران) کی شہنشاہی، سامراجی واجارہ داری کا خاتمہ ہوا اور آدھی دنیا کو ظلم وقہر سے نجات ملی، پھر روم (اہل کتاب) کے جبر وستم اور استعماری ہتھکنڈوں سے نجات دلائی، باقی آدھی دنیا کو اسلام کے دامن رحمت میں پناہ گزیں کیا گیا۔ اور اسلام نے پوری دنیا کو وہ دستور وقانون دے دیا جس کے مطابق زندگی گذار کر اس جہنم صفت دنیا کو نمونہ جنت بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کمزوروں، غریبوں، ناداروں، اور متواضع ومنکر مزاج لوگوں میں پھیلا، اس نے عدل وانصاف، رواداری ومساوات، رحم وکرم ادب وتہذیب، خداترسی، نصرت مظلوم، اعانت فقیر ومعذور، راست بازی وحق گوئی کی اعلیٰ قدریں سکھائیں، تمام اخلاقی وسیاسی گراوٹوں سے نفرت دلائی، صبر واستقلال، شکر واحسان مندی، ہر بھلائی پر تعاون، ہر برائی کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی، غرض تمام مکارم اخلاق اور حکمت ودانائی کی بات کو اختیار کرنا ایک مسلمان کا شیوہ وشعار قرار دیا۔

اسی لیے اسلام کا ابتدائی دور یعنی بعثت نبوی سے ہجرت نبوی تک کے ۱۳ سال جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے بظاہر سخت ترین دور ابتلاء وپریشانی تھا، وہ ان کی فتح وکامرانی کا زریں باب تھا، جس میں لغزش کے امکانات بہت کم تھے، ہجرت کے بعد جب دنیاوی فتوحات کے دروازے کھلے تھے تو ان کو ہر قدم احتیاط سے اٹھانا پڑا اور پہلے سے زیادہ آزمائش سامنے تھی مگر مکی دور اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تربیت سے مکارم اخلاق واعلیٰ کردار کی بلندیوں کی فتح تھی، تو مدنی دور آپ کے صدقہ میں ان کی فتح مبین قرار پائی۔ **وذلک من فضل اللہ علینا و علی الناس۔**

حدیث ہرقل

اب حدیث ہرقل کی طرف آجائے! ہرقل علم نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا، لکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال علوی ستاروں کا اجتماع ہوا تھا، اور پھر ہر بیس سال پر ہوتا رہا، آخری بار صلح حدیبیہ کے سال میں ہوا، علم نجوم والے کہتے ہیں[۱] کہ اس اجتماع سے عالم میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ **واللہ اعلم** ۔ ہرقل بھی اسی کا قائل تھا، اس نے ایک رات زائچہ کھینچ کر دیکھا تھا کہ ختنہ کرانے والے لوگوں کے بادشاہ کا غلبہ ہوگیا۔ اس کے بارے میں اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عرب کے لوگ ختنہ کراتے ہیں، اور اس سے اس کو غلبۂ ظن ہوگیا کہ وہ بادشاہ عرب ہی کا ہوگا۔ مزید اطمینان کے لیے اپنے دوست ضغاطر کو خط لکھا وہ بھی علم نجوم کا بڑا ماہر تھا، اور اس نے بھی ہرقل کی تائید کی، بلکہ اپنی قوم کو جمع کر کے سمجھایا بھی کہ تم لوگ نبی آخر الزماں پر ایمان لے آؤ وہ سچے نبی ہیں لیکن انہوں نے انکار کیا اور ضغاطر کو قتل کر ڈالا۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک ہرقل کو پہنچا تو بحیثیت نبوت ورسالت آپ کے حالات کی تحقیق ابوسفیان سے کی۔

---

[۱] ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف میں فرمایا کہ نجوم کے اثرات طبعیہ حرارت وبرودت وغیرنا قابل انکار ہیں لیکن جمہور علماء ان کی تاثیرات سعد ونحس کے قائل نہیں۔

ایمان ہرقل

امام بخاری نے حدیث کے آخری جملہ میں اشارہ کیا ہے کہ ہرقل ایمان وتصدیق کی نعمت سے محروم رہا اور جو کچھ اس نے رومیوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا' وہ صرف معرفت کے درجے میں تھا' تصدیق قلبی نہ تھی' جو شرط ایمان ہے۔ اسی لیے اس نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لیے غزوۂ موتہ میں ایک لاکھ فوج بھیجی' اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی برابر مسلمانوں پر حملے کرتا رہا۔

مکاتیب رسالت

کتب سیر وتاریخ میں ہے کہ سرور دو عالم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر وکسریٰ کے علاوہ شاہان حبش مصر' ہندو چین وغیرہ کو بھی دعوت اسلام کے مکاتیب ارسال فرمائے تھے' سب میں آپ نے اپنا نام پہلے لکھا ہے' جس کا اثر دوسرے شاہان دنیا نے تو کچھ نہیں لیا مگر پرویز (شہنشاہ ایران) کو سخت ناگوار ہوا کہ شروع میں میرا نام کیوں نہیں لکھا گیا' اور طیش میں آکر آپ کا گرامی نامہ پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر دیا۔

زوال کسریٰ وعروج حکومت اسلام

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ ''اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے چنانچہ ظاہری اسباب میں یہ صورت ہوئی کہ شیرویہ اپنے باپ پرویز (شہنشاہ ایران) کی بیوی شیریں پر عاشق ہوگیا (جو اس کی سوتیلی ماں تھی) اور جب کسی طرح وہ اس کو رام نہ کر سکا تو باپ کو قتل کر دیا کہ شاید اس کے بعد وہ حاصل ہو سکے۔ نہ معلوم کس وجہ سے خسرو پرویز نے اپنے شاہی دواخانہ کی الماری میں ایک ڈبیہ میں زہر رکھا تھا اور اس کے لیبل پر لکھ دیا تھا کہ یہ دوا قوت باہ کے لیے اکسیر ہے' شیرویہ مالک سلطنت ہوا تو چونکہ انتہائی شہوت پرست تھا' اس کو ایسی ادویہ کی تلاش تھی' اس ڈبیہ کو پا کر بہت خوش ہوا اور زہر کھا کر مر گیا' اس کے بعد اس کی بیٹی بوران تخت نشین ہوئی' مگر وہ عورت ذات اور کم عمر تھی' اس لیے حکومت نہ سنبھال سکی' آخر کار ایران کے تخت وتاج پر مسلمان قابض ہوئے۔ اور اب تک وہ ایک اسلامی سلطنت ہے۔ **حفظها الله و ادامها**۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق کسریٰ کی حکومت اور اس کا خاندان صرف ۱۴ سال کے اندر تباہ ہوگیا۔ **و تلک الایام ندا ولها بین الناس** ۔

حدیث میں ذکر شدہ ہرقل کے دس سوالات ذکر ہوئے' جو مبادیٔ وحی الٰہی اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا بین ثبوت ہیں لہٰذا اس حدیث سے وحی ورسالت کی عصمت وعظمت معلوم ہوئی' امام بخاری کا مقصد بھی یہی ہے اور ان چھ حدیثوں کا بدالوحی کے باب میں ذکر کر کے امام بخاریؒ نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ آگے کتاب میں جتنی باتیں آئیں گی وہ سب وحی کی باتیں ہیں' جو معصوم ومحفوظ اور نہایت عظیم الشان ہیں' اس کے بعد سب سے پہلے کتاب الایمان لائے ہیں کہ وہ اسلامیات کی اولین بنیاد ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الایمان

باب الایمان و قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس وھوقول وفعل ویزید وینقص قال اللہ تعالیٰ لیزدادوا ایماناً مع ایمانھم. وزدناھم ھدیً. ویزیداللہ الذین اھتدواھدی. والذین اھتدوازادھم ھدی واتاھم تقواھم ویزدادالذین اٰمنوا ایماناً وقولہ عزوجل ایکم زادتہ ھذہ ایماناً فاماالذین اٰمنوا فزادتھم ایماناً وقولہ فاخشوھم فزادھم ایماناً وقولہ ومازادھم الا ایماناًوتسلیماً والحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان وکتب عمر بن عبدالعزیز الیٰ عدی بن عدی ان للایمان فرآئض وشرآئع وحدوداًوسنناً فمن استکملھا استکمل الایمان ومن لم یستکملھالم یستکمل الایمان فان اعش فسابینھا لکم حتیٰ تعملوا بھا وان امت فمآ اناعلیٰ صحبتکم بحریص وقال ابراھیم علیہ السلام ولکن لیطمئن قلبی وقال معاذ اجلس بنانؤمن ساعۃ وقال ابن مسعود الیقین الایمان کلہ وقال ابن عمر لایبلغ العبد حقیقت التقویٰ حتیٰ یدع ماحاک فی الصدر وقال مجاھد شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً اوصیناک یامحمد وایاہ دیناً واحدًا وقال ابن عباس شرعۃ ومنھا جاً سبیلا وسنۃً ودعاء کم ایمانکم.

ترجمہ:۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اور اس بات کا بیان کہ اسلام قول بھی ہے اور فعل بھی اور وہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے' اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہ ارشاد فرمایا ہے ترجمہ آیات تا کہ مومنین کے (پہلے) ایمان پر ایمان کی اور زیادتی ہو اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ انہیں مزید ہدایت عطا کرتا ہے اور جو لوگ سیدھی راہ پر ہیں انہیں اللہ نے اور زیادہ ہدایت دے دی اور پرہیزگاری عنایت کی اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کس کے ایمان کو اس سورۃ نے بڑھا دیا (یہ وہ لوگ ہیں) جو ایمان لائے اس سورت نے ان کے یقین میں اضافہ کر دیا (سورہ آل عمران میں ہے) جب انہیں ڈرایا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا' اور (سورہ احزاب میں ہے) ان کے یقین واطاعت ہی میں اضافہ ہوا اور اللہ کے لئے دوستی اور دشمنی ایمان ہی میں ہیں اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن عدی کو لکھا تھا کہ ایمان کے کچھ فرائض کچھ ضابطے کچھ حدیں اور کچھ سنن ہیں (یعنی ایمان کے لوازمات میں کچھ اوامر کچھ نواہی' اور کچھ سنتیں داخل ہیں) پھر جس نے ان چیزوں کی تکمیل کر لی اس نے ایمان کامل کر لیا اور جس نے ان میں کوتاہی کی' اس نے ناکمل رکھا اور اگر میں زندہ رہا تو میں ان سب کو تم سے کھول کر بیان کروں گا تا کہ تم ان پر عمل پیرا ہو سکو' اور اگر میں مر گیا تو (پھر واقعہ یہ ہے کہ) میں تمہاری ہم نشینی کا خواہاں نہیں ہوں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا (سورہ بقرہ میں) لیکن (اس لئے کہ) میرے دل کو اطمینان حاصل ہو اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے (اسود بن ہلال سے) فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھو (تا کہ) کچھ دیر ہم مومن رہیں (یعنی ایمان تازہ کریں)

حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے ''یقین پورا کا پورا ایمان ہے'' اور حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ بندہ اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت نہیں پا سکتا جب تک دل کی کھٹک (یعنی شرک و بدعت کے شبہات) کو دور نہ کردے اور حضرت مجاہدؒ نے اس آیت کی تفسیر میں) کہ تمہارے لئے وہی دین ہے جس کی تعلیم ہم نے نوح کو دی ہے'' کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! ہم نے تمہیں اور نوح کو ایک ہی دین کی تعلیم دی ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے **شرعۃً ومنھاجاً** کا مطلب راستہ اور طریقہ بتلایا ہے اور قرآن کی اس آیت **قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاؤکم** کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ) تمہاری دعا سے مراد تمہارا ایمان ہے۔

تشریح: ''ایمان'' کا لفظ ''امن'' سے مشتق ہے جس کے معنی سکون واطمینان کے ہیں' کسی کی بات پر ایمان لانا بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم اس کو اپنی تکذیب سے مطمئن کردیتے ہیں گویا اس کی امانت و دیانت پر ہمیں پورا وثوق و اعتماد حاصل ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ہماری ان دیکھی چیزوں کے بارے میں بھی کچھ بتلائے' تو ہم اس کے اعتماد پر اس کو مان لیں۔

ایمان شرعی: اسی سے ''ایمان شرعی'' کی اصطلاح حاصل ہوئی کہ ہم خدا کے وجود و وحدانیت کی تصدیق کریں اور خدا کے آخری نبی کی تصدیق کے ساتھ ان سب باتوں کے بھی حق ہونے کا یقین کریں جو آپ کے ذریعہ ہم تک ضروری طور سے پہنچ گئیں۔ ضروری طور سے پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ''دین محمدی'' میں ہونا سب پر روشن و واضح ہو' مثلاً وجود انبیاء' کتب سماوی' ملائکہ جن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین (آخری نبی) ہونا' تقدیر خداوندی' عذاب قبر' قیام قیامت' فرضیت نماز' روزہ' حج و زکوٰۃ' وغیرہ' غرض ایسی تمام چیزوں پر ایمان ضروری ہے جن کا علم ضروری ہم کو حاصل ہو چکا ہے اسی لئے ان کو ''ضروریات دین'' بھی کہا جاتا ہے اور ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار یا تحریفی تاویل اسی طرح کفر ہوگی جس طرح توحید و رسالت کا انکار یا ان میں تحریفی تاویل کفر ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی محققانہ تصنیف ''اکفار الملحدین فی شیئ من ضروریات الدین'' میں ضروریات دین اور ایمان و کفر کی بحث کا حق ادا فرما دیا ہے جس کا مطالعہ ہر عالم دین کے لئے نہایت ضروری ہے۔

حقیقت ایمان

ایمان کی تعریف میں عام طور سے تصدیق کا لفظ آتا ہے جو اصطلاح حکما میں اذعان و یقین کا ہم معنی ہے پھر یہ اختلاف ہوا ہے کہ تصدیق علم و ادراک ہے یا لواحق علم میں سے ہے' تحقیقی بات یہ ہے کہ تصدیق محض علم نہیں ہے (جو اختیاری و غیر اختیاری دونوں کو عام ہے) بلکہ تصدیق لواحق علم سے اور ایک ارادی چیز ہے یعنی جاننا نہیں بلکہ جاننے کے ساتھ مان بھی لینا جیسا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ہے ورنہ فرعون ابولہب' ابو طالب' ہرقل وغیرہ بھی مومن ہوتے' کیونکہ علم کی حد تک ان کو بھی صداقت رسول پر یقین تھا حالانکہ ان سب کے کفر پر امت کا اتفاق ہے۔

غرض تصدیق بمعنی عرفی کافی نہیں' بلکہ ماننا ضروری ہے جس کے لازمی اثرات انقیاد قلبی والتزام طاعت ہیں اور جو عہد و میثاق اطاعت و وفاداری کے ہم معنی ہے' یہ علم تصدیقی ایسی صفت نفس بن جانی چاہئے کہ قلب اور قلب کے ماتحت لسان و جوارح سب ہی سر انقیاد جھکا دیں۔ اس کی تعبیر بعض ضعیف الاسناد روایات اور عبارات سلف میں عقد بالقلب سے بھی منقول ہے کیونکہ دل میں مضبوطی کے ساتھ گرہ باندھنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے اور اسی لئے ایمان کو عقیدہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں اگر زبان و جوارح تصدیق قلبی کی موافقت نہیں کرتے تو اس کو عقدہ و عقیدہ کیونکر کہہ سکتے ہیں؟

ایمان واسلام کا فرق

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ جس طرح ایمان انقیاد باطن کا نام ہے اسی طرح اسلام انقیاد ظاہر سے عبارت ہے۔ سورہ حجرات میں ہے۔

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم.

(کچھ دیہاتی لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ابھی تم ایمان نہیں لائے ہاں یہ کہو کہ اسلام لے آئے، اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں نہیں پہنچا"۔ امام احمدؒ سے ایک مرفوع حدیث بھی تفسیر ابن کثیر میں مروی ہے کہ اسلام علانیہ کھلی ہوئی چیز ہے اور ایمان قلب میں ہے اور مشہور حدیث جبریل میں بھی ایمان کے سوال پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، خدا، ملائکہ، کتب رسل، یوم آخر اور قدر خیر وشر پر ایمان وتصدیق کا ذکر فرمایا، پھر اسلام کے سوال پر شہادت توحید ورسالت اور ادائیگی فرائض اربعہ کا ذکر فرمایا۔

ایمان واعمال کا رابطہ

لہٰذا محققین نے فیصلہ کیا کہ ایمان وعقیدہ دین کی اصل بنیاد ہے اور اعمال جوارح اس کی فروع اور شاخیں ہیں یا ایمان بمنزلہ روح ہے اور اسلام اس کا بدن، یا ایمان حقیقت ہے اور اسلام اس کی صورت یہ ہمارے آئمہ ومحدثین کی تعبیر ہے، دوسرے ائمہ ومحدثین نے اعمال جوارح کو اجزاء مکملہ ایمان کے درجہ میں سمجھا ہے جس سے اعمال کا درجہ کچھ اوپر ہو جاتا ہے اور ایمان کا درجہ کچھ کمتر ہو جاتا ہے" جیسا کہ تکمیل کی تعبیر سے واضح ہے اس لئے ہماری تعبیر زیادہ بہتر صحیح، احوط اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ **واللعلم عنداللہ**۔

ایمان کا درجہ

یہاں سے یہ بات بھی سمجھنی چاہئے کہ دین اسلام میں ایمان کا درجہ اتنا اونچا ہے جس سے خدا کی وحی اور پیغمبر پر اس درجہ وثوق واعتماد ہو کہ اس کی بتائی ہوئی مغیبات اور نظروں سے غائب چیزوں پر بھی ہمیں بے دلیل وحجت یقین واطمینان حاصل ہونا چاہئے اسی لئے مسلمانوں کی بڑی صفت **یومنون بالغیب** قرار پائی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ رسالت کی مکمل تصدیق اور انقیاد باطن حاصل ہو جانے کے بعد دلیل وحجت بازی کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہتا، چنانچہ اشاعرہ اور امام ابومنصورہ ماتریدی نے بھی تصریح کی ہے کہ ایمان اسی بے دلیل انقیاد واطاعت کا نام ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی تحقیق

ایمان کی تشریح ہی کے سلسلہ میں یہاں ایک نہایت قابل قدر اور آب زر سے لکھنے کے قابل تحقیق، ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی ہے جو آب حیات میں پوری تفصیل سے درج ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت قرآنی **النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم** میں ازواج مطہرات کا امہات المومنین والمومنات ہونا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت کی فرع ہے، بلکہ ایک قرات میں **وھواب لھم** بھی وارد ہے، لہٰذا یہ دعوے درست ہوگا کہ ارواح مومنین آپ کی روح مقدس کے آثار ہیں، اس طور سے آپ ابوالمومنین یعنی تمام مومنین کے روحانی باپ ہیں، گویا مومنین کے اجزاء ایمانیہ کا روحانی وجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (ارواحنا فدہ) کی روح معظم کے وجود ایمانی کا فیض ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ومنقبت عظیمہ ہے کہ ہر مومن ومسلم بریں مژدہ گرجاں فشاند رواست۔

حضرت مجدد صاحبؒ کی تحقیق

اس سے اوپر چلئے تو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکاتیب شریفہ میں سرور دو عالم نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات محبوب رب العلمین۔ حقیقۃ الحقائق افضل الخلائق۔ نور الانوار، روح الارواح منبع البرکات ومجمع الکمالات کی شان میں جلوہ گر ملے گی۔ اس سے بھی یہی مستفاد ہوا کہ **اللہ نور السموٰت والارض** کے نور عظیم کا ظل وپرتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور معظم ہے جس سے تمام عالم وعالمیان نے اکتساب نور کیا اور نور ایمان تو روح الانوار ومدار بقاء عالم ہے۔

شیخ دباغ کے ارشادات

اسی کے ساتھ چند ارشادات غوث العارفین حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ قدس سرہ کے بھی "ابریز" سے نقل کئے جاتے ہیں، فرمایا کہ (بقاو وجود کا) مادہ ساری مخلوق کی طرف ذات محمدی سے نور کے ڈوروں میں چلا ہے کہ نور محمدی سے نکل کر انبیاء ملائکہ اور دیگر مخلوقات تک جا پہنچا ہے اور اہل کشف کو اس استفاضہ نور سے عجائب وغرائب کا مشاہدہ ہوتا ہے حق تعالیٰ نے نور ایمان بلکہ ہر نعمت کے نور کو نور محمدی کے ساتھ وابستہ کیا ہے جہاں یہ تعلق عیاذاً باللہ قطع ہوا، فوراً ہی نور ایمان سلب ہوا۔ سامعین میں سے ایک بدنصیب شکی مزاج نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صرف ایمان کی رہبری ہوئی ہے کہ حق کا راستہ دکھادیا، باقی رہا ایمان، سو وہ اللہ کی طرف سے ہے (ذات محمدی کو اس سے کوئی تعلق نہیں) شیخ موصوف نے فرمایا، اچھا اس تعلق کو جو تمہارے نور ایمان اور نور محمدی میں قائم ہے اگر ہم قطع کردیں اور محض راستہ دکھانا جو تم کہہ رہے ہو باقی رہنے دیں تو کیا تم اس پر راضی ہو؟ اس نے کہا ہاں! میں اس پر راضی ہوں، ابھی بات ختم نہ کرنے پایا تھا کہ صلیب کو سجدہ کیا اور اللہ ورسول کا انکار کیا اور اسی پر دم نکل گیا۔

اس ارشاد کی روشنی میں معلوم ہوا کہ قلوب مومنین میں ایمانوں کی مثال چراغوں کی ہے، جو سب چراغ رسالت سے روشن ومستفید ہیں یا اس طرح سمجھو کہ ہر قلب مومن میں نور نبوت کا ایک ایک روحانی برقی قمقمہ روشن ہے جس کے تار حقیقۃ الحقائق نبی الانبیاء نور الانوار صلی اللہ علیہ وسلم کے نور معظم سے وابستہ ہیں اور تمام روحانی انوار وکمالات کا فیضان اسی مرکز انوار سے ہو رہا ہے اگر اس کنکشن یا تعلق میں کسی طرح کی کمی یا خرابی رونما ہوگی تو وہ بڑی محرومی وخسران کا موجب ہوگی۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

حدیث صحیح میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت[1] کے ۷۳ فرقے ہوجائیں گے جن میں سے ۷۲ غلط راستوں پر ہوں گے اور صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا، صحابہ نے عرض کیا وہ کون سا ہوگا فرمایا جو ٹھیک میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گا۔ اس لئے بڑی ہی احتیاط اور علم وفہم صحیح سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارا کنکشن آپ کی سنت واسوہ سے ہٹ کر دوسرے غلط مراکز شرک وبدعت وغیرہ سے نہ جڑ جائے۔ **وما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم، علیہ توکلنا والیہ انبنا۔**

نیز فرمایا کہ ایمان ایک نور ہے جس کی روشنی میں چلنے والے کو راستہ کا نشیب وفراز اور منزل مقصود کا مبداو منتہا سب نظر آرہا ہے اس لئے اس کا ہر قدم دلی اطمینان کے ساتھ اٹھتا اور قلبی سکون کے ساتھ پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کا پورا سفر لطف وبشاشت کا ہے اور اس کی زندگی پر لطف گزرتی ہے جس کو "**ولنحیینہ حیوۃ طیبۃ**" میں بیان فرمایا ہے اس کے برخلاف کفر ایک ظلمت ہے جس کی تاریکی میں چلنے والے کی حالت اندھے کی

---

[1] شرح مواقف کے آخر میں ان سب فرقوں کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں جن میں سے ۸ بڑے فرقوں کے نام ومختصر عقائد درج ذیل ہیں۔

۱- معتزلہ وقدریہ، جن میں اختلاف ہوکر بیس شاخیں ہوگئیں (مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج، مخلد فی النار ہے، قرآن کلام اللہ مخلوق ہے بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے آخرت میں بھی رویت الٰہیہ نہ ہوگی، حسن وقبح عقلی ہے وغیرہ)۔

۲- شیعہ، جن میں اختلاف ہوکر بائیس شاخیں ہوگئیں (ان کے عقائد مشہور خاص وعام ہیں)

۳- خوارج جن میں اختلاف ہوکر سات شاخیں ہوگئیں (مرتکب کبیرہ کافر مخلد فی النار ہے حضرت علی، عثمان واکثر صحابہ کی تکفیر وغیرہ)

۴- مرجئہ جن میں اختلاف ہوکر پانچ شاخیں ہوگئیں (ایمان کے ساتھ کوئی معصیت مضر نہیں، اختیار عبد کے منکر ہیں)

۵- جازیہ، جن میں اختلاف ہوکر تین شاخیں ہوگئیں (خلق افعال میں اہل سنت کے ساتھ، نفی صفات وغیرہ میں معتزلہ کے ساتھ ہیں)

۶- جبریہ، جن میں اختلاف ہوکر چار شاخیں ہوگئیں (بندہ اپنے افعال میں مجبور محض ہے نفی رویت وخلق قرآن میں معتزلہ کے ساتھ ہیں)

۷- مشبہ، جن میں اختلاف ہوکر گیارہ شاخیں ہوگئیں (حق تعالیٰ کو مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے اور اس کے لئے جہت وجسم وغیرہ ثابت کرتے ہیں)

۸- ناجیہ، (اہل سنت والجماعت یا جماعت اہل حق) جو سواد اعظم امت محمدیہ کا ہے۔ وللہ الحمد۔

سی ہے کہ نہ اس کو سرائے کا پتہ ہے نہ منزل مقصود کا' نہ اسے دریا کا علم ہے نہ جنگل کا بہ اقتضائے حرارت غریزیہ انجن کے پہیوں کی طرح چلتا اور بے اختیار چکر کھا رہا ہے اس کے قلب پر ہر وقت تکدر اور وساوس وخطرات کا بوجھ رہتا ہے' جس سے اس کی زندگی باوجود دولت وعیش دنیوی وبال جان بنی رہتی ہے اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا **ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا ونحشره یوم القیامة اعمیٰ**

بخاریؒ کا ترجمۃ الباب

یہاں تک ہم نے بقدر ضرورت ایمان کی تشریح وتوضیح کی۔ اس کے بعد امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب کو سمجھئے امام بخاری چونکہ ایمان کو قول وفعل سے مرکب مانتے ہیں اور اسی لئے اس میں زیادتی وکمی کے بھی قائل ہیں اسی لئے ایسی آیات' احادیث واقوال عنوان باب ہی میں جمع کر دیئے ہیں جن سے یہ دونوں دعوے ثابت ہوسکیں اس کے بعد بڑی تقطیع کے آٹھ صفحات میں بہت سے ابواب اور ان کے جلی عنوانات کے تحت احادیث کی تخریج فرما کر اپنے اسی دعوے کو پختہ کرتے چلے گئے ہیں۔

امام بخاریؒ کی شدت

عنوانات کی یک جہتی شدت اور دلائل کی کثرت سے یہی تاثر ملتا ہے کہ جب یہ سب اعمال ظاہری جزو حقیقت ایمان ہیں تو کسی عمل میں بھی کمی آجانے سے ایمان جاتا رہے گا' جو معتزلہ کا مذہب ہے یا حکم کفر بھی عائد ہو جائے گا' جو خوارج کا مسلک ہے پھر خارج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری ایمان کو قول وفعل کا مجموعہ ماننے پر سخت مصر تھے فرماتے تھے کہ میں نے اپنی صحیح میں کسی ایسے شخص کی روایت نہیں لی جو کہتا ہے کہ ''ایمان قول وعمل سے مرکب نہیں اور اس میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی''۔ حالانکہ امام موصوف نے غالی خوارج تک سے بھی احادیث کی روایات لی ہیں تاہم ہم اس کو امام بخاری کا تشدد ہی سمجھتے ہیں' ورنہ مذہب اعتزال یا مسلک خوارج کے وہ بھی ایسے ہی مخالف تھے جیسے دوسرے تمام اہل سنت والجماعت یہی وجہ ہے کہ خود امام بخاری نے بھی گو یہاں پہلے پارے میں تو عمل کو جزو ایمان دکھلانے پر پورا زور لگایا حتیٰ کہ ایک باب کفر دون کفر کا بھی قائم کیا اور کوئی اعتدال کی صورت نہیں اختیار کی' مگر ۲۷ ویں پارہ میں پہنچ کر ''**باب مایکره من لعن شارب الخمر**'' قائم کیا' جس کا حاصل یہ ہے کہ عقیدہ درست ہو تو کبیرہ گناہوں شرب خمر وغیرہ کے ارتکاب سے بھی ملت سے خارج نہ ہوگا اور اس پر لعنت نہ کرنی چاہئے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں امام بخاری کا اس قدر تشدد بے محل ہے اور اگر احناف سے تکدر یا جذبہ مخالفت کے تحت ہے تو آپ کی جلالت قدر کے بھی خلاف ہے' خصوصاً جب کہ اہل حق کے دونوں مسلک میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے بلکہ بہت سے لوگوں نے تو اس اختلاف کو صرف نزاع لفظی بھی کہا ہے اگرچہ وہ خلاف تحقیق ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی رائے بھی یہ ہے کہ دونوں کے نظریات جدا جدا ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بحث ونظر: ایمان کے بارے میں مختلف مذاہب ونظریات کی تنقیح وتفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت امام اعظمؒ' شیخ ابومنصور ماتریدی' شیخ ابوالحسن اشعری' امام نسفی' محدثین وفقہا احناف اور اکثر متکلمین فرماتے ہیں کہ۔

ایمان بسیط ہے' جس کی حقیقت تصدیق قلبی ہے' تصدیق لسانی (نفاذ احکام اسلامی کے لئے یا بوقت مطالبہ) شرط یا رکن زائد ہے اعمال جوارح خلود نار سے بچنے کے واسطے' نیز ترقی ایمان ودخول اولی جنت کے لئے ضروری ہیں' ان کی حیثیت وہ ہے جو فروع کی اصل کے ساتھ ہوتی ہے' مثل **کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء** اور حدیث شعب ایمان بھی بظاہر اسی طرف مشیر ہے' تصدیق لسانی کو شرط متکلمین نے اور رکن زائد فقہا حنفیہ نے کہا ہے' ملا علی قاری حنفیؒ کا قول ہے کہ عند المطالبہ رکن ہے اجراء احکام کے لئے شرط مسایرہ میں ہے کہ اقرار بالشہادتین کو رکن ایمان قرار دینا زیادہ احوط ہے بہ نسبت شرط ماننے کے' اقرار شہادت اور التزام طاعت کی قید سے

ابوطالب اور ہرقل جیسے لوگوں کا ایمان، ایمان شرعی سے خارج رہا۔

نفس تصدیق کے معنی چونکہ انتفاء شک کے ہیں، اس لئے امام اعظم وغیرہ ایمان کو بسیط اور غیر مرکب کہتے ہیں کیونکہ یہ ایمان کا وہ مخصوص ومحفوظ مرتبہ ہے کہ اس سے گر کر سارے مراتب کفر کے ہیں، اور اس ایمان کا اطلاق بطور کلی متواطی تمام افراد مومنین پر یکساں ہوتا ہے اسی لئے اس ادنیٰ درجہ ایمان میں کمی وزیادتی کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس مرتبہ تصدیق کے بعد جو مراتب کمال ایمان انشراح صدر، خشیت الٰہی وتقویٰ وطہارت کثرت طاعات وعبادات وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں، ان کی کمیت وکیفیت کی کمی وزیادتی ناقابل انکار ہے۔ نفس بساطت ایمان کی وجہ مذکور کے علاوہ[1] دوسری وجہ انکار زیادت ونقصان کی باعتبار مومن بہ کے ہے، پہلے بتایا جاچکا ہے کہ تصدیق جاننا نہیں بلکہ ماننا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی پوری شریعت کو ماننا ایمان ہے جو ادنیٰ واعلیٰ مومن سب کے لئے برابر ہے، جو مطالبہ ایمان کا بڑے سے بڑے پیغمبر صحابی، وولی سے ہے کہ پوری شریعت الٰہیہ کا التزام طاعت کریں، وہی کم سے کم درجہ کے مومن سے بھی ہے، جن آیات قرآنیہ سے ایمان کی زیادتی ثابت کی جاتی ہے، وہ نزول قرآن مجید کے دور کی ہیں کہ اس وقت تدریجی طور سے مومن بہ یا شریعت مصطفویہ کی تکمیل ہورہی تھی۔ تکمیل شریعت کے بعد کمی وزیادتی کا مرحلہ ختم ہوچکا۔ **یایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافہ**۔ اس کے بعد جو فرق مراتب ہوگا وہ خشیت الٰہی، تقویٰ مخالفت ہوائے نفس وغیرہ کے اعتبار سے ہوگا اور یہ فرق اس قدر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب عالیہ کا تو کہنا ہی کیا ہے ایک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کا ایمان اتنا بھاری ہے کہ تمام امت محمدیہ کے ایمانوں سے بھی اس کا وزن زیادہ ہے۔

تارک عمل اور مرتکب کبیرہ مومن فاسق ہے، فسق کے باعث عذاب جہنم کا سزاوار اور ایمان کی وجہ سے دخول جنت کا مستحق اور خلود نار سے محفوظ ہوگا۔

۲۔ ائمہ ثلاثہ، امام بخاری ودیگر محدثین فرماتے ہیں کہ:۔

ایمان مرکب ہے جسکے اجزا تصدیق قلبی، تصدیق لسانی اور اعمال جوارح ہیں لیکن سب اجزاء کی رکنیت یکساں نہیں ہے۔ تصدیق قلبی اصل اصول ہے کہ وہ نہیں تو ایمان منفی محض اور اعمال کا درجہ بمنزلہ واجبات صلوٰۃ ہے۔ ارکان صلوٰۃ کی طرح نہیں گویا اقرار وعمل اجزاء مکملہ ہیں، مقدمہ نہیں اور صرف اعمال کے نہ ہونے سے ایمان کی نفی نہ ہوگی، البتہ تارک عمل اور مرتکب کبیرہ کو مومن فاسق کہیں گے جو ترک عمل وارتکاب کبیرہ کی وجہ سے عذاب نار کا سزاوار، ایمان کی وجہ سے دخول جنت کا مستحق اور خلود نار سے محفوظ ہوگا۔

چونکہ یہ حضرات اعمال کو حقیقت ایمان میں داخل مانتے ہیں، اس لئے باعتبار کمیت کے ایمان میں کمی وزیادتی کے قائل ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ایمان بطور کلی مشکک کے ہے۔

۳...... فرقہ خوارج کے نزدیک ایمان مرکب ہے اور تینوں اجزاء مذکورہ برابر درجہ کے اجزاء مقومہ وارکان ایمان ہیں اس لئے صرف اعمال کا تارک یا مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج اور کافر ہوجاتا ہے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

۴...... فرقہ معتزلہ کے نزدیک بھی ایمان مرکب ہے اور تینوں اجزا ارکان ایمان ہیں، تارک اعمال یا مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے مگر کافر نہیں ہوجاتا، اس کو فاسق کہیں گے اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تفسیر کشاف میں یہی جواب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے پھر یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ نے امام صاحب کے قول **لا یزید ولا ینقص**، کو بدعۃ الالفاظ سے شمار کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحب کے ارشاد کی صحت سے ان کو بھی انکار نہیں البتہ الفاظ سے اختلاف ہے، مگر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں معتزلہ وخوارج کا بڑا زور تھا، اور وہ ترک عمل یا ارتکاب کبیرہ پر ایمان سے خارج اور مخلد فی النار قرار دینے میں سخت تشدد کررہے تھے، اس لیے امام صاحب نے ان کے غلط عقائد کے رد میں پوری شدت سے کام کیا اور ان کے مقابلہ میں اعمال کے خارج از ایمان ہونے پر زور دیا، جس کو حافظ ابن تیمیہ نے بدعۃ الالفاظ سے تعبیر کیا اس کے برخلاف سلف کے دور میں چونکہ مرجئہ کا زور تھا جو صرف تصدیق کو کافی سمجھتے تھے اور اعمال کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس لیے انہوں نے قول وعمل کے نظریہ کو ابھارا اور مرجئہ کی وجہ سے اس کو اہل سنت کا شعار بنالیا۔

۵......فرقہ مرجئہ کا مذہب ہے کہ ایمان بسیط ہے۔ جس کی حقیقت صرف تصدیق قلبی ہے' اقرار لسانی اور اعمال نہ مدار نجات ہیں نہ رکن وشرط' تصدیق قلبی کے بعد کوئی معصیت یا ترک فرض وواجب مضر نہیں۔ نہ ان پر عتاب ہوگا' ایمان میں زیادتی ہوسکتی ہے کمی نہیں' خدا کا علم اور دوسری صفات اس سے الگ اور غیر ہیں۔ خدا کی صورت انسان کی سی ہے' ضروریات دین کا علم اجمالاً کافی ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ حج فرض ہے مگر میں نہیں جانتا کہ کعبہ کہاں ہے اور ہوسکتا ہے کہ علاوہ مکہ معظمہ کے کہیں اور ہو یا کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی مگر میں نہیں جانتا کہ وہ وہی ہیں جو مدینہ طیبہ میں ہیں یا اور کوئی ہیں یا کہے کہ خنزیر حرام ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ یہ بکری ہے یا کوئی دوسرا جانور اس قسم کی باتیں کہنے والے سب مومن ہیں کیونکہ یہ سب تفصیلات حقیقت ایمان میں داخل نہیں ہیں' غسان مرجی اس بات کو مستحکم کرنے اور رواج دینے کے لئے امام اعظمؒ کی طرف بھی نسبت کرتا تھا کہ امام صاحب کی بھی یہی رائے ہے حالانکہ یہ افتراء محض تھا' اس کے علاوہ معتزلہ کا طریقہ تھا کہ جو شخص مسئلہ قدر میں ان کی مخالفت کرتا تھا اس کو مرجی مشہور کرتے تھے' امام اعظم اور آپ کے اصحاب نے تو معتزلہ کی ہر طرح مخالفت کی ہے اور ان کے دلائل کا ضعف آشکارا کیا ہے اس لئے وہ ان کے تنابز بالالقاب سے کیسے بچ سکتے تھے۔

فرقہ مرجئہ میں سے صرف غیلان قدری تھا' باقی سب جبری عقیدہ رکھتے تھے۔

۶......فرقہ جہمیہ کے نزدیک ایمان بسیط ہے' جس کی حقیقت صرف معرفت قلب ہے' تصدیق ضروری نہیں جہمیہ کے اور بھی بہت سے عقائد خراب ہیں۔

۷......کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان بسیط ہے جس کی حقیقت صرف اقرار لسانی ہے بشرطیکہ دل میں انکار نہ ہو' تصدیق قلبی اور اعمال ایمان کے اجزاء نہیں' نہ ان کی ضرورت ہے۔

اہل حق کا اختلاف

امام اعظم و متکلمین وغیرہ کا اختلاف دوسرے ائمہ ومحدثین سے نہ کوئی بڑا اہم اختلاف ہے اور نہ اس کو صرف نزاع لفظی ہی کہنا درست ہے کیونکہ بہرحال انظار کا اختلاف موجود ہے ان کا نظریہ یہ ہے کہ ایمان تینوں اجزا کے مجموعہ کا نام ہے اور ہم اس کو بسیط مانتے ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ تصدیق قلبی تمام مقاصد میں سے بلند مرتبہ اور سب سے بڑی نیکی ہے اور تمام اعمال کی صحت کے لئے بطور شرط و بنیاد ہے لہٰذا اس کا مرتبہ بھی اعمال جوارح کے اعتبار سے الگ اور بہت اونچا ہونا چاہئے پس اعمال کو رکن و جز کی حیثیت دینا ایمان کی حیثیت کو گرانا ہے اور جس طرح کہ ہم اس کو الگ کرکے اور اعمال کے مقابلہ میں بلند مرتبہ قرار دے کر صحیح پوزیشن دیتے ہیں تو وہ بسیط ہی ثابت ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ صلوٰۃ کے بارے میں حنفیہ وشافعیہ کا ہے کہ شافعیہ فرماتے ہیں' نماز پوری حقیقت معہودہ (تحریمہ سے تسلیمہ تک) کا نام ہے جس میں ارکان سنن ومستحبات سب داخل ہیں' پھر بعض اجزاء ان کے نزدیک بھی وہ ہیں جن کے نہ ہونے پر بھی نماز درست ہو جاتی ہے حنفیہ میں سے شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ نماز ارکان کا نام ہے اور باقی اجزا سب مکملات ہیں۔ لہٰذا صرف ارکان میں کمی سے نماز نادرست ہونے کا حکم لگائیں گے یہی صورت ایمان کے بارے میں بھی ہے کہ ایمان کی حقیقت تو صرف تصدیق قلبی ہے اور باقی اجزا اس کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی بات ان آیات قرآنیہ سے بھی مفہوم ہوتی ہے جن میں ایمان کے بعد اعمال کا ذکر الگ کیا ہے کیونکہ اعمال اگر ایمان میں داخل تھے تو ان کو حرف عطف کے ساتھ الگ کیوں ذکر کیا گیا؟ جو مغایرت کو چاہتا ہے' حافظ ابن تیمیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں عطف مغایرت کے لئے نہیں ہے بلکہ اعمال کو اہتمام شان اور استیفاء بیان کے لئے الگ ذکر کیا ہے تاکہ اعمال کی طرف سے غفلت نہ ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ کی یہ توجیہ اگرچہ کسی قدر مضبوط اور ان کی ذہانت کی دلیل ہے مگر آیات قرآنی من

عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ و ھو مومن۔کاوہ کیا جواب دیں گے جس میں ایمان کوبطور قید وشرط ذکر کیا ہے اعمال کے لئے۔

اس کے بعد ہمارے ذمہ اس امر کا جواب ہے کہ بہت سی احادیث میں ایمان کا اطلاق اعمال پر ہوا ہے اور یہی سب سے بڑا استدلال امام بخاری وغیرہ کا ہے اول تو یہ کہ جس طرح کل کا اطلاق جزو پر ہوا کرتا ہے اسی طرح اطلاق مبدا کا بھی اثر پر ہوا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے سمجھا ہے کہ مبدا ایمان اور عمل اس کا اثر ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیں کہ ان احادیث میں صرف پہلا ہی اطلاق متعین ہے تو ظاہر قرآن مجید نے اعمال کو ایمان سے الگ اور مغایر قرار دیا ہے تو یہی بہتر ہوگا کہ قرآن کا اتباع کریں اور حدیث میں تاویل کی جائے اور حقیقت حال بھی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ حقیقت نفس الامری کو تو قرآن مجید سے بتلایا ہے اور حدیث میں امور خارجیہ کا لحاظ ہے جیسا کہ دوسرے معاملات میں بھی یہی صورت ہوئی ہے کہ قرآن مجید حقیقت حال کو بے کم وکاست ادا کرتا ہے اور حدیث میں مصالح کی رعایت کی جاتی ہے۔ حاصل جواب یہ ہے کہ یہاں بھی قرآن مجید نے تو یہی فیصلہ کیا کہ اعمال ایمان کا جزو نہیں ہیں پھر چونکہ اندیشہ تھا کہ لوگ اعمال میں کوتاہی کریں گے اس کو حدیث سے دفع کیا جس میں ایمان کا اطلاق اعمال پر کیا ہے تا کہ اعمال کی اہمیت بھی زیادہ سے زیادہ معلوم ہو قرآن مجید کے عطف اعمال سے جو بالکل مغایرت مفہوم ہوئی تھی اس کی بھی تلافی ہوجائے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ محدثین نے سلف کی تقلید کی ہے کہ وہ ایمان کو قول وعمل کا مجموعہ فرماتے تھے اور احادیث میں بھی ایسا ہی ہے تو امام اعظمؒ وغیرہ نے اگر سلف کی اس تعبیر کو بدل دیا اور یہ کہہ دیا کہ اعمال حقیقت ایمان سے خارج ہیں تو انہوں نے اس تغایر کو قرآن مجید کے اتباع میں لیا ہے اس کی وجہ سے امام صاحب وغیرہ پر طعن کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

غرض جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں سلف کا ارشاد قول وعمل اپنے زمانہ کے مقتضائے حال کے لیے موزوں تھا اور امام اعظمؒ وغیرہ کا ارشاد اپنے وقت کے لیے مناسب تھا۔ ایمان واعمال کے بارے میں اہل حق کے بھی دونوں مسلک پوری وضاحت سے بیان ہو چکے۔ اور دوسرے فرقوں کے مذاہب بھی۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو مرجئی قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔

امام بخاریؒ کا امام صاحب کو مرجی بتلانا

اور امام بخاریؒ نے جو آپ کو مرجی کہا ہے اگر وہ ارجاء سنت کے اعتبار سے ہے تو کوئی عیب نہیں اور اگر ارجاء بدعت کے لحاظ سے ہے تو اس سے زیادہ غلط بات کیا ہوسکتی ہے۔ پھر اگر بڑوں کی طرف کوئی بات غلطی سے منسوب بھی ہوگئی تو اس کا طریقہ یہ رہا ہے کہ محتاط طریقہ پر اتنا کہہ دیا گیا فلاں بات آپ کی طرف منسوب کی گئی یا فلاں امر کے ساتھ آپ کو متہم کیا گیا ہے جیسا کہ کتب رجال میں کسی کے متعلق رمی بالقدر، کسی کے متعلق رمی بالارجاء، کسی کے متعلق ینسب الی الرفض وغیرہ لکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ امام بخاریؒ نے تحقیق کے طور پر لکھ دیا کہ امام صاحب مرجی تھے، امام محمد کو جہمی لکھ دیا، امام ابو یوسف کا ترجمہ یک سطری اپنی تاریخ کبیر کے صفحہ ۳۹۷ میں لکھا تو کیا لکھا کہ "شیبانی سے حدیث سنی، ان کے صاحب ابوحنیفہ تھے، جن کو لوگوں نے چھوڑ دیا"۔ (یعنی روایت کرنے والوں نے ان سے حدیث کی روایت نہیں کی، امام ابو یوسف کے حالات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ کتنے بڑے محدث تھے بہ کثرت محدثین سے خود بھی روایت حدیث کی اور ان سے بھی روایت کرنے والے بہ کثرت ہیں، مگر امام بخاری نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ پھر امام صاحب کا ذکر یہاں بھی ترک روایت کی خوش خبری سنانے کے لیے فرمایا ہے، جب کہ خود امام ابو یوسف نے بھی مستقل حدیثی تصنیف کتاب الآثار میں امام صاحب سے روایات کثیرہ جمع کی ہیں اور وہ کتاب اس وقت شائع شدہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ فالحمد للہ والمنہ۔

دوسرا احتمال لفظ ترکوہ میں یہ ہے کہ امام بخاری خود امام ابو یوسف کو متروک الحدیث بتلا رہے ہیں، تو یہ بھی درست نہیں، جیسا کہ امام ابو یوسف کے حالات میں ان کے حدیثی علم وشغف وثقاہت وغیرہ کا ذکر پوری تفصیل سے ہو چکا ہے، غرض امام اعظم یا امام ابو یوسف میں سے خدا کے فضل و

انعام سے کوئی بھی متروک الحدیث نہیں ہے، نہ امام محمد ہی خدانخواستہ جہمی تھے ان کے بھی صحیح حالات ہم مفصل لکھ آئے ہیں۔ واللہ المستعان۔

طعن ارجاء کے جوابات

طعن ارجاء کے جواب میں شیخ معین سندھی نے بھی دراسات اللبیب میں بڑی تفصیل سے اور بہت اچھا کلام کیا ہے، ہم بھی امام صاحب کے حالات میں کچھ لکھ آئے ہیں، خود فقہ اکبر میں بھی امام صاحب سے ایسی تصریحات ملتی ہیں۔ کہ ان کے بعد ارجاء بدعت سے مہتم کرنا کسی طرح درست نہیں، صفحہ ۱۰ میں ہے کہ ایمان اقرار و تصدیق ہے صفحہ ۱۱ میں اسلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ تسلیم وانقیاد ہے خدا کے اوامر واحکام کا' ایمان بغیر اسلام کے نہیں ہوتا' نہ اسلام بغیر ایمان کے دونوں کا علاقہ ظہر وبطن کا ہے اور دین کا اطلاق ایمان' اسلام اور شرائع کے مجموعہ پر ہوتا ہے'' مناقب مکی صفحہ ۱۴۵ تا ۱۴۸/ اتک جہم بن صفوان اور امام اعظم کا پورا مکالمہ درج ہے جس میں امام صاحب نے قرآن وحدیث کے دلائل سے اس کو ایمان واسلام کی حقیقت سمجھائی' جس کے بعد وہ یہ کہہ کر اٹھا کہ آپ کی باتوں سے میرا دل متاثر ہوا اور میں پھر بھی حاضر ہوں گا' علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ نے بھی الانتقاء میں صفحہ ۱۶۸ پر امام صاحب سے ایمان کے بارے میں وہی باتیں نقل کی ہیں جو تمام اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے' اب اگر وہ ارجاء تھا تو بقول استاذ ابوزہرہ مصری کے صرف امام صاحب کو ارجاء سے مطعون کرنا صحیح نہیں کیونکہ پھر تو سب ہی فقہاء ومحدثین اس کی زد میں آجائیں گے' ہاں کوئی معتزلی ہو تو وہ اس کی زد سے بچ سکے گا۔ دیکھئے ابوزہرہ کی کتاب ابوحنیفہ صفحہ ۱۷۷)

استاذ موصوف نے امام صاحب کے حالات ومناقب میں نئے طرز واسلوب سے نہایت تحقیق وکاوش کے ساتھ کتاب مذکور مرتب کی ہے جس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۵ء ہم نے دیکھا ہے اور کتاب کی قدر وقیمت اس لئے بھی بڑھ گئی کہ تالیف کے زمانہ میں موصوف نے علامہ کوثری سے بھی استفادہ کیا ہے چونکہ امام صاحب کے زمانہ میں بھی معتزلہ نے اپنے خلاف کی وجہ سے اور عنان مرجئ نے اپنی تائید کے لئے امام صاحب کو مرجئ مشہور کیا اس لئے اس وقت کے مشہور محدث عثمان بتی نے امام صاحب کو خط لکھا کہ لوگ آپ کو مرجئ کہتے ہیں اس سے مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جو باتیں وہ آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں کیا ان کی کوئی اصل ہے؟ امام صاحب نے جواب میں ایک طویل خط تحریر فرمایا' جس کی تمہید میں ایمان واسلام' عقیدہ واعمال کے بارے میں کچھ اصولی باتیں تحریر فرمائیں اور آخر میں لکھا کہ ''میرا قول یہ ہے کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہوسکتے جو شخص ایمان کے ساتھ تمام فرائض بجالاتا ہے وہ مومن اور جنتی ہے جو ایمان واعمال کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اس سے ترک ہوجاتے ہیں وہ مسلمان ضرور ہے مگر گناہ گار مسلمان ہے' خدا کو اختیار ہے اس پر عذاب کرے یا معاف کردے''۔

امام صاحب کی تائید دوسرے اکابر سے

یہاں چند اقوال دوسرے حضرات کے بھی فتح الملہم شرح مسلم صفحہ ۱۵۸ سے لکھے جاتے ہیں' جو امام صاحب وغیرہ کی تائید میں ہیں' امام الحرمین شافعیؒ نے فرمایا کہ ایمان میں زیادتی وکمی نہیں ہوتی' کیونکہ وہ تو اس تصدیق کا نام ہے جو مرتبہ جزم ویقین تک پہنچی ہوئی ہو پھر اس میں کمی وزیادتی کیسی؟ ایسی تصدیق والا خواہ طاعات کرے یا ارتکاب معاصی' اس کی تصدیق تو بحالہ ہے' اس میں کیا تغیر ہوا؟ البتہ اگر تصدیق کے ساتھ طاعات کو بھی ایمان کا جزو مان لیں' تب ضرور اس کے ایمان میں بھی طاعات کی کمی وزیادتی سے تغیرات رونما ہوں گے' امام رازی شافعیؒ نے فرمایا کہ جن دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں تفاوت نہیں ہوتا اس سے مراد اصل ایمان ہے اور جن سے تفاوت ثابت ہوتا ہے وہاں کامل ایمان مراد ہے۔

شارح حاجبیہ نے لکھا کہ ایمان کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جو اساس وبنیاد ہے نجات کے لئے' اور اس پر بھی ہوتا ہے جو ایمان کامل اور پوری نجات کا ضامن ہے اور اس بات میں بھی کسی کا خلاف نہیں ہے۔

حضرت شیخ اکبر نے فتوحات میں فرمایا کہ ایمان اصلی جوزیادہ کم نہیں ہوتا' وہ فطرت ہے جس پر خدا نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تھا یعنی خدا کی وحدانیت کی شہادت جس کا عہد و میثاق ہم سب سے لیا گیا تھا پس ہر بچہ اسی میثاق پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کی روح اس جسم خاکی میں محبوس ہو کر اپنے رب کی معرفت کو بھلا دیتی ہے لہٰذا دلائل فطرت میں نظر وفکر کر کے اس معرفت خداوندی وشہادت وحدانیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوئی' اگر اس کو سابق حالت کی طرف لوٹا لیا تو مومن ہے ورنہ کافر جس طرح ایک مسافر گھر سے چلا' اس وقت آسمان صاف تھا اور اس کو سمت قبلہ اور اپنی منزل مقصود اچھی طرح معلوم تھی جب بیابان میں پہنچا تو آسمان پر بادل چھا گئے' اب نہ وہ سمت قبلہ کو پہچانتا ہے' نہ منزل مقصود کی جانب کو' اس لئے نظر واجتہاد سے کام چلائے گا۔

علامہ شعرانی سے تشریح ایمان

علامہ شعرانی شافعی نے فرمایا کہ ''ایمان فطرت'' تو وہی ہے جو آدمی کے ساتھ مرتے وقت ہوتا ہے وہ نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم ہوتا ہے' البتہ اس میں زیادتی وکمی ان احوال کے اعتبار سے کہی جاسکتی ہے جو اس کو مرنے سے پہلے تک کی زندگی میں پیش آتے ہیں''۔

ابن حزم

ابن حزم ظاہری (جو امام صاحب وغیرہ کے سخت مخالفین میں ہیں) اپنی کتاب ''الفصل'' میں لکھتے ہیں کہ کوئی بھی تصدیق خواہ وہ توحید ونبوت کی ہو یا کسی اور امر کی' اس میں زیادتی وکمی ممکن ہی نہیں کیونکہ کسی چیز کی دل سے تصدیق یا اقرار کرنے والا یا تو اس کی تصدیق کرے گا یا تکذیب' یا تردد وشک آئے گا۔ اس کے علاوہ چوتھی صورت نہیں ہے۔ پس یہ تو محال ہے کہ ایک شخص اسی چیز کی تکذیب بھی کرے جس کی تصدیق کر رہا ہے اور یہ بھی محال ہے کہ تصدیق کے باوجود شک بھی کرے' لہٰذا ایک ہی صورت درست ہے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق بے شک وشبہ تصدیق کرے' اسی کے ساتھ یہ بھی جائز نہیں کہ ایک کی تصدیق زیادہ ہو' دوسرے کی تصدیق سے' کیونکہ دونوں میں سے ایک کی تصدیق میں کوئی رخنہ پڑ گیا تو ظاہر ہے کہ اس کی تصدیق میں شک داخل ہو گیا تصدیق تو مصدق بہ کے وجود پر یقین وجزم کا نام ہے اور اس صفت میں کمی وبیشی ہوتی ہی نہیں جزم ویقین میں کمی تو شک ہے جب شک آ گیا تو تصدیق گئی لہٰذا ایمان بھی نہ رہا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس زیادتی ایمان کا ذکر خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ تصدیق واعتقاد میں ہرگز نہیں ہے' بلکہ یقیناً غیر تصدیق میں ہے جو یہاں فقط اعمال ہیں''۔

امام غزالی

امام غزالی شافعیؒ نے فرمایا کہ ''سلف کے قول ''الایمان قول و عمل یزید و ینقص'' سے خود ہی ثابت ہے کہ عمل اجزاء ایمان وارکان سے نہیں ہے' کیونکہ کوئی چیز خود اپنی ذات سے زیادہ نہیں ہوتی' کوئی یہ نہیں کہے گا کہ انسان اپنے سر کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے ہاں! یہ کہتے ہیں کہ اپنی داڑھی' مٹاپے وغیرہ سے زیادہ ہوتا ہے' جس طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز میں رکوع وسجود سے زیادتی ہوتی ہے بلکہ آداب وسنن سے زیادتی ہوتی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ ایمان کا فی ذاتہ ایک وجود ہے پھر وجود کے بعد اس کا حال مختلف ہوتا ہے زیادتی بھی ہوتی ہے کمی بھی''۔ آپ نے دیکھا کہ امام غزالی نے سلف کے قول کو بھی امام صاحب وغیرہ کی تائید میں قرار دیا اور یہ فرما کر قرار دیا کہ سلف شہود عدول ہیں' لہٰذا ان کے قول سے عدول مناسب نہیں' انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ حق ہے مگر اس کو صحیح طور سے سمجھنے کی ضرورت ہے پھر مذکورہ بالا تشریح فرمائی۔

قاضی عیاض

آپ نے فرمایا کہ ''مجرد ایمان جو تصدیق ہے اس کے اجزاء نہیں ہیں اور جو کچھ زیادتی اس میں کہی جاتی ہے وہ اس سے الگ' شئی زائد

عمل صالح ذکر خفی یا کسی عمل قلب (شفقت مسکین، حسن نیت، یا خوف خداوندی وغیرہ) کے سبب ہوتی ہے''۔

نواب صاحب

محترم علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب نے ''انتقاد الترجیح'' میں لکھا کہ ''جمہور محققین'' کا مذہب یہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق قلبی ہے اور زبان سے اقرار کرنا دنیاوی احکام جاری کرنے کی شرط ہے کیونکہ تصدیق قلبی ایک پوشیدہ امر ہے اس کی کوئی علامت ہونی چاہئے پس جو شخص اپنے دل سے تصدیق کرے اور اپنی زبان سے اقرار نہ کرے تو وہ عند اللہ مومن ہے اگرچہ احکام دنیا میں مومن نہیں۔

یہ چند اقوال صرف اس لئے نقل کئے گئے کہ امام صاحبؒ کی اصابت رائے دقت فہم اور اتباع کتاب وسنت کی شان پوری طرح معلوم ہوجائے اور آئندہ بھی آپ دیکھیں گے کہ تمام اختلافی مسائل میں امام صاحب ہی دوسرے ائمہ ومحدثین کے مقابلہ میں روایت ودرایت کی رو سے غالب رہیں گے، ان شاء اللہ۔

امام بخاری اور دوسرے محدثین

لیکن اسی کے ساتھ نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے اور پہلے بھی کچھ لکھ آیا ہوں کہ امام بخاریؒ نے شیخ حمیدی، اسحاق بن راہویہ وغیرہ سے متاثر ہوکر امام صاحب کے بارے میں بے بنیاد باتوں کے الزامات لگائے ہیں جبکہ دوسرے اصحاب صحاح کا رویہ اس قسم کا نہیں ہے، امام مسلم وابن ماجہ تو خاموش ہیں، نہ ان سے مدح منقول ہے نہ مذمت، امام ابوداؤد پوری طرح مداح ہیں، امام ترمذی ونسائی نے امام صاحب سے روایت حدیث بھی کی ہے امام نسائی سے کچھ تضعیف کے الفاظ بھی منقول ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی بات ہے۔

پھر جب وہ امام طحاوی سے ملے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق زیادہ صحیح حالات معلوم کئے تو امام صاحب کی تضعیف سے رجوع فرمالیا، جس کی دلیل یہ ہے کہ امام صاحب سے اپنی صحیح میں روایت بھی کی، جو اصل نسائی میں ہے اس وقت جو نسائی شریف مطبوعہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ امام نسائی کے تلمیذ ابن السنی کا اختصار ہے (کما صرح بہ الذہبی فی کتاب ''النبلاء'') اور صحاح ستہ میں جس کتاب کا شمار ہے وہ بھی اصل کتاب نسائی کی ہے یہ اختصار نہیں ہے (کما صرح بہ الحافظان ابن الملقن والمزی) اور وہی عام اطلاقات محدثین میں بھی مراد ہوتی ہے (ذب الذبابات صفحہ ۲/۷۳۳)

اساتذہ امام بخاری

ان کے علاوہ خود امام بخاریؒ کے تین بڑے اساتذہ وشیوخ امام احمدؒ، امام یحییٰ بن معین اور علی ابن المدینی بھی امام صاحب کی توثیق و مدح فرماتے ہیں، جن کے بارے میں خود امام بخاریؒ نے جزء رفع الیدین میں فرمایا کہ یہ حضرات اپنے زمانے کے بڑے اہل علم تھے۔

امام بخاریؒ کے چھ اعتراض

لیکن پھر بھی امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ میں اپنی تینوں کتب تاریخ (صغیر اوسط وکبیر) اور کتاب ''الضعفاء و المتروکین'' میں آپ کو مرجئ لکھا۔ اور جامع صحیح میں تعریضات سے کام لیا، پھر اپنے دونوں رسالوں جزاء القرات خلف الامام اور جزء رفع الیدین میں تو بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے تیز لسانی تک پہنچ گئے، جو شدت تعصب اور سخت برہمی پر دال ہے مثلاً ایک جگہ اپنے رسالہ جزء القراۃ خلف الامام میں امام صاحب کے بارے میں لکھا کہ ''مدت رضاعت ڈھائی سال قرار دی۔ حالانکہ یہ نص قرآنی حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ کے خلاف ہے اور انہوں نے کہا کہ امام صاحب کے نزدیک خنزیر بری میں کچھ حرج نہیں اور امت میں قتال وخوں ریزی جائز سمجھتے تھے ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگلے پچھلے واقعات کے بارے میں حکم خداوندی مخلوق وحادث ہے پس وہ نماز کو بھی بندوں پر دین (فریضہ) نہیں سمجھتے''۔

ان چھ بڑے اعتراضات میں سے بعض کے بارے میں کچھ حضرات نے حسن تاویل کی گنجائش پیدا کی اور کہا کہ امام بخاریؒ نے ارجاء سے مراد ارجاسنت لیا ہوگا' اور اس کے بعد جو فرمایا کہ محدثین نے امام صاحب کی رائے اور حدیث سے سکوت کیا تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ انہوں نے آپ کی رائے وحدیث پر کوئی جرح نہیں اگر یہ مطلب نہیں لیتے تو امام بخاری پر صریح جھوٹ کا الزام آئے گا۔ کیونکہ اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب سے روایت حدیث کرنے والے اور ان کی رائے پر عمل کرنے والے بڑی کثرت سے محدثین ہیں۔ یہی رائے محدث شہیر محقق بے نظیر حافظ حدیث شیخ محمد ہاشم سندھیؒ کی بھی ہے (ملاحظہ ہو ذب ذبابات الدراسات صفحہ ۲/۳۰۷) مگر محقق عصر علامہ عبدالرشید نعمانی دام فیضہم نے اس غلط فہمی کی تصحیح بھی اسی صفحہ کے حواشی میں فرمادی ہے آپ نے لکھا کہ مصنف کی یہ توجیہ غالباً اس لئے ہے کہ انہوں نے امام بخاری کی اصطلاحات کی طرف توجہ نہیں فرمائی' چنانچہ حافظ ابن کثیر نے ''الباعث الحثیث الی معرفۃ علوم الحدیث'' صفحہ ۲۴ میں لکھا'' کچھ اشخاص کی اصطلاحات پر بھی وقوف ضروری ہے۔ مثلاً بخاری جب کسی کے بارے سکتوا عنہ یا فیہ نظر کہیں تو اس سے ادنی وارداء مرتبہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کیونکہ وہ لطیف عبادت سے جرح کرنا چاہتے ہیں' اس کو اچھی طرح جان لینا چاہئے۔'' حافظ سیوطیؒ نے تدریب الرویٰ صفحہ ۱۲۷ میں لکھا'' بخاری جن لوگوں کو'' متروک الحدیث'' قرار دیتے ہیں ان کیلئے فیہ نظر اور سکتوا عنہ لکھتے ہیں۔''

حافظ حدیث ابن رشید کا قول علامہ زبیدی نے شرح احیاء العلوم صفحہ ۴/۹۴ میں نقل کیا کہ'' بخاری حنفیہ کی بہت زیادہ مخالفت کرنے والے ہیں'' حافظ زیلعی کو مخالفین نے بھی کثیر الانصاف تسلیم کیا ہے اور نہایت نرم خو ہیں مگر انہوں نے بھی جو کچھ نقد امام بخاری کی شدت عصبیت ومخالفت حنفیت کے بارے میں کیا وہ ہم بسم اللہ کی بحث میں نقل کرآئے ہیں۔ حافظ سخاوی نے اپنی کتاب ''الاعلان بالتوبیخ'' صفحہ ۶۵ میں جو کچھ امام بخاری اور دوسرے حضرات کے تعصب ائمہ حنفیہ کے متعلق لکھا وہ ہم مقدمہ کتاب ہذا کے صفحہ ۲/۵۹ میں نقل کر چکے ہیں۔

پھر بقول علامہ نعمانی یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر واقعی امام صاحب ایسی ہی کم مرتبہ تھے کہ لوگوں نے ان کی رائے وحدیث کو کوئی وقعت نہیں دی' تو امام بخاری کو اتنے اہتمام وکاوش کی کیا ضرورت تھی کہ'' جامع صحیح'' میں بھی جگہ جگہ بعض الناس کی طرف تعریض فرمارہے ہیں اور دوسری تصانیف میں بھی' ہاں! ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے اس سے امام بخاری کی بات بھی جھوٹ نہیں بنتی' جس سے محدث سندھی بچنا چاہتے ہیں' وہ یہ کہ امام بخاریؒ نے اپنے بہت سے شیوخ حدیث اور متقدمین ومعاصرین کو دیکھا کہ انہوں نے امام صاحب کی رائے وحدیث پر کوئی جرح نہیں کی تو وہ اپنے نزدیک حق بات کا اظہار ضروری سمجھ رہے ہیں اور بتلا رہے ہیں کہ امام صاحب ان کی تحقیق میں مرجئی ہیں اور دوسرے عیوب مندرجہ بالا بھی ان میں موجود ہیں اس پر بھی ان لوگوں کا سکوت اور عدم جرح' لاعلمی یا کسی اور وجہ سے ہے' چنانچہ ہم امام بخاریؒ کے حالات میں نقل کرآئے ہیں کہ انہوں نے بعض مسائل کی بحث کے ضمن میں یہ بھی فرمادیا کہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے بے علم لوگوں کی تقلید کی اس سے تو وہ اگر عبداللہ بن مبارک ہی کی تقلید کرتے تو اچھا تھا کیونکہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے اور ہم نے وہاں لکھا تھا کہ خود عبداللہ بن مبارک کا اعتراف یہ ہے کہ میں جاہل تھا' جو کچھ علم کی دولت ملی وہ امام صاحب سے ملی' اور لوگوں نے بہت کوشش کی کہ میں امام صاحب تک نہ پہنچوں اور مجھے غلط باتیں سنا کر متاثر کرنا چاہا' مگر خدا کے فضل نے دستگیری کی یہ بھی منقول ہوا کہ جب وہ امام صاحب سے وابستہ ہوگئے تو لوگوں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا اور آپ کے پاس آآ کر امام صاحب کی برائیاں کرتے تھے آپ امام صاحب کی طرف سے برابر مدافعت کرتے اور جب وہ کسی طرح باز نہ آتے تو فرماتے کہ یا تو میرا پیچھا چھوڑ دیا ایسا بڑے علم وفضل تقوی وطہارت کا پیکر مجسم کوئی دوسرا مجھے بتادو۔

غرض اس قسم کے حالات ہم نے کافی لکھے تھے' اور بہت کچھ باقی ہیں' امام صاحب اتنے بڑے تھے کہ بڑے بڑوں سے ان کی سیرت نگاری کا فرض پورا نہ ہوسکا' یہ عاجز کس شمار میں ہے! یہاں تھوڑی سی جوابدہی اور صفائی امام بخاری۔ مذکورہ بالا اعتراضات کی کردی جائے تو مناسب ہے۔

امام بخاریؒ نے ان اتہامات واعتراضات کی کوئی سند نہیں بیان کی' حالانکہ انہوں نے امام صاحب کا زمانہ نہیں پایا' یہ بات ان کی

جلالت قدر کے لیے موزوں نہیں تھی، لیکن تاریخی پس منظر سے واقف جانتے ہیں کہ یہ سب وہی باتیں ہیں جو امام صاحب کے مخالفین نے چلائی تھیں، اور خطیب بغدادی نے ان کو مع دوسرے بہت سے اتہامات کے اپنی تاریخ بغداد میں جمع کر دیا ہے اور علامہ کوثریؒ نے ''تانیب الخطیب'' میں ایک ایک روایت پر مفصل نقد کیا ہے، راویوں کا غیر معتمد اور جھوٹا ہونا کتب رجال و تاریخ سے ثابت کر دیا ہے۔ امام بخاری چونکہ مسئلہ لفظ بالقرآن کے سلسلہ میں اپنے زمانہ کے علماء احناف سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اور اپنے بعض شیوخ و اساتذہ مثلاً امام حمیدی، اسحٰق بن راہویہ، نضر بن شمیل، احمد بن زہیر، عبدالرحمٰن بن مہدی، نعیم بن حماد خزاعی اسماعیل بن عرعرہ، وغیرہ سے بہت متاثر ہو گئے تھے، جن میں سے بعض تو امام صاحب کے سخت مخالفین میں سے تھے اور بعض وہ تھے جنہوں نے فرط تعصب و مخالفت کی وجہ سے امام صاحب کی کتابوں کو دریا میں بہا کر نابود کرنے کی سعی کی تھی۔ اسحٰق بن راہویہ بھی باوجود اپنی جلالت قدر کے اسی گروہ میں تھے جن کے مشورہ و ایما سے امام بخاری نے جامع صحیح مرتب کی، اور اس میں اپنی یاد کردہ ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے صرف ۲۳۵۳ احادیث جمع کیں جو ان کے اپنے اجتہاد کے موافق مسائل سے مطابق تھیں، دوسرے کبار ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کے موافق احادیث جمع کرنے کا کوئی التزام و اہتمام نہیں فرمایا۔

غرض امام بخاریؒ میں تاثر اور یکطرفہ غیر معمولی رجحان کا مادہ بہت تھا اس لئے امام صاحب کے بارے میں غلط نظریات پر جم گئے، اور جہاں وہ جامع صحیح میں رواۃ کی صداقت و دیانت وغیرہ کی حتی الامکان بڑی چھان بین فرماتے ہیں، جامع صحیح کے باہر اپنی تاریخ اور دوسری تصانیف میں وہ بلند معیار باقی نہیں رکھا، اس وقت اس کی ایک دوسری مثال بھی ذکر کرتا ہوں رسالہ رفع یدین میں دعویٰ فرما دیا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی ایک صحابی سے بھی رفع یدین نہ کرنا ثابت نہیں ہے، حالانکہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی، امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث نفی رفع یدین ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ بہت سے اہل علم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین میں سے اسی کے قائل ہیں اور مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، شرح معانی الآثار امام طحاوی اور شروح صحیح بخاری وغیرہ سے بھی۔ امام ترمذی ہی کی بات صحیح معلوم ہوئی ہے۔ اب امام بخاریؒ کی جلالت قدر کے پیش نظر ان کے قول کی تاویل کرنی پڑی، کسی نے کہا کہ ثبوت عدم رفع کا ایک اخص خصوص درجہ مراد ہوگا جو مہیا نہیں ہو سکا، کسی نے کہا مطلب یہ ہے کہ ہر صحابی رفع یدین تو کرتا ہی تھا، خواہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہو، اس لئے عدم رفع کا ثبوت بالکلیہ نہیں ہوا وغیرہ لیکن ظاہر ہے کہ محل نزاع میں ایسی تاویلات کا کوئی موقع نہیں، اس کے بعد ہم ان اعتراضات کے مختصر جوابات تحریر کرتے ہیں۔

۱- ارجاء کے بارے میں پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ امام صاحب کا ارجاء، ارجاء سنت تھا جو تمام اہل حق کا مسلک ہے، خود امام صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں شیخ عثمان بتی کو یہ الفاظ تحریر فرمائے تھے کہ آپ نے جو ہمارے مرجئہ کہے جانے کے بارے میں لکھا ہے تو آپ ہی سوچئے کہ جن لوگوں نے عدل و اعتدال کی بات کہی انہوں نے کیا جرم کیا کہ اہل بدعت نے ان کو مرجئہ کہنا شروع کر دیا۔ درحقیقت ہمارے اصحاب اہل عدل و اہل سنت ہیں، اور ان کو مرجئہ کا لقب ان کے دشمنوں نے دیا[۱] ہے۔''

علامہ کوثری نے اس پر ایک نوٹ بھی دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو گمراہی کی طرف منسوب کرنا، جو مرتکب کبیرہ کو خدا کی مشیت پر محمول کرتے ہیں کہ وہ چاہے تو معاف فرما دے گا، چاہے گا عذاب دے گا۔ معتزلہ خوارج یا ایسے لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو سمجھے بے سمجھے ان ہی کے نقش قدم پر چلنا پسند کریں، حافظ ابن ابی العوام نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ''میں اور علقمۃ بن مرثد حضرت عطاء بن ابی رباح کے پاس گئے اور بتلایا کہ ہمارے بلاد میں کچھ ہیں جو ہمارے اس قول کو ناپسند کرتے ہیں کہ ''ہم مومن ہیں'' انہوں نے پوچھا اس کی کیا وجہ؟ ہم نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم یہ کہو کہ ہم مومن ہیں تو یہ بھی کہو کہ ہم جنتی ہیں'' (گویا ہمارے دعوائے ایمان کو

---

[۱] جس طرح محض دشمنی کی وجہ سے بریلوی اہل بدعت فرقہ نے دیوبندیوں کو ''وہابی'' کا لقب دے دیا۔ جس پر حضرت تھانویؒ کو لکھنا پڑا کہ ہمارے اور ابن عبدالوہاب کے عقائد میں بڑا فرق ہے اور ان بریلویوں سے قیامت کے دن اس بہتان پر مواخذہ ہوگا۔ (اشرف الجواب)

دعوٰئے اہل جنت ہونے کے مرادف قرار دے کر ناپسند کرتے ہیں، حضرت عطاء نے فرمایا کہ نحن مومنون کہنا چاہئے اس میں کچھ حرج نہیں، البتہ نحن من اہل الجنۃ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ کوئی ملک مقرب یا نبی مرسل بھی ایسا نہیں جس پر حق تعالیٰ کی حجت نہ ہو پھر وہ چاہے گا عذاب دے گا، چاہے گا بخش دے گا۔ پھر حضرت عطا نے فرمایا، اے علقمہ! تمہارے اصحاب اہل جماعت کے نام سے مشہور تھے پھر نافع بن ازرق نے ان کو مرجبہ کہنا شروع کیا"۔ اور اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ نافع نے ایک شخص اہل سنت سے پوچھا کہ آخرت میں کفار کس جگہ جائیں گے؟ اس نے کہا دوزخ میں۔ پوچھا مومن کہاں جائیں گے؟ کہاں ان کی دو قسم ہیں، نیک جنت میں جائیں گے اور مومن فاسق فاجر کو خدا چاہے گا تو گناہوں کی وجہ سے عذاب دے گا اور چاہے گا تو ایمان کی وجہ سے اس کی بخشش فرمادے گا۔ اس نے پھر کہا کہ آخر تم نے اس کے لئے کون سی جگہ متعین کی؟ اس نے کہا مجھے اس کے لئے کوئی ایک جگہ طے کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اس کے فیصلے کو خدا کی طرف مؤخر کرتا ہوں، اس پر نافع بولا کہ اچھا تم مرجئی ہو۔ (مرجئی کے معنی ہیں کسی چیز کو مؤخر کرنے والا)

تو جو لوگ اہل سنت کو مرجئی کہتے ہیں وہ نافع خارجی کے پیرو ہیں، جس کے نزدیک مرتکب کبیرہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ علامہ کوثری نے یہ بھی لکھا کہ "علامہ مقبلی نے کسی ایسے شخص کا نام مرجئی رکھنا اور اس پر احادیث مذمت مرجئہ کا چسپاں کرنا جو مرتکب کبیرہ کو توبہ نہ کرنے کی صورت میں تحت المشیۃ کہے، اغلاط خواص میں سے گنایا ہے، کیونکہ اس کے مصداق تو وہ لوگ ہیں، جو تارکین صلوٰۃ کے لئے بھی کسی وعید کے قائل نہیں اور ان کو وعید کی زد سے ہٹا کر بالکل مؤخر کردیا ہے رہا ان کا مشیت خداوندی کے تحت داخل ہونا تو یہ کتاب وسنت میں پوری طرح اور بطریق تواتر معلوم ہے۔ لہٰذا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارجاء بھی خالص سنت ہے اس کو ارجاء بدعت کہنا محض اتہام ہے۔"

سید الحفاظ المتاخرین علامہ زبیدی نے "عقود الجواہر المنیفہ" کے مقدمہ میں لکھا "امام صاحب کی طرف ارجاء کی نسبت ہرگز صحیح نہیں، کیونکہ آپ کے تمام اصحاب کی رائے، مرجئین کے خلاف ہے پس اگر امام صاحب مرجئی ہوتے تو آپ کے اصحاب بھی اسی خیال پر ہوتے دوسرے یہ کہ امام صاحب تو مرجئی کے پیچھے اقتداء نماز کو بھی ناجائز فرماتے تھے پھر جس کے بارے میں اجماع واتفاق ہو۔ کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ایک جلیل القدر امام ہیں اس کے بارے میں کسی ناواقف کی جرح بے اثر و بے محل ہے (اصحاب صحاح ستہ کے شیخ الشیوخ) حماد بن زید (جن کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری صفحہ ۲۱۳/۱ میں ہو چکا ہے، اور ابن معین کا قول تہذیب ہی میں ان کے بارے میں ہے کہ حضرت ایوب سختیانی سے روایت میں ان سے زیادہ باوثوق دوسرا نہیں[1] ہے، اور تمام لوگ بھی کوئی بات ایوب سے خلاف نقل کریں تو حماد بن زید ہی کا قول معتبر ہوگا اور ابوزرعہ نے فرمایا کہ حماد بن زید حماد بن سلمہ سے زیادہ اثبت، اتقن، اور اصح حدیثا ہیں"۔ وغیرہ)

یہ حماد حضرت ایوب سختیانی کی خدمت میں طویل مدت تک رہے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی شخص نے آکر امام صاحب کا ذکر

---

[1] جلیل القدر تابعی اور مشہور محدث ہیں، حضرت انس کو دیکھا، حضرت نافع، عطا، عکرمہ، عمرو بن دینار وغیرہ سے روایت حدیث کی۔ آپ سے اعمش، حماد، ابن زید، حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، شعبہ، امام مالک وغیرہ نے روایت کی، علی بن المدینی کا قول ہے کہ آٹھ سو حدیث آپ سے مروی ہیں (معلوم ہوا کہ ہمارے امام صاحب بہ نسبت ان کے کثیر الحدیث ہیں، امیر المومنین فی الحدیث شعبہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم سے سید الفقہا ایوب نے اس طرح روایت کی، حماد بن زید کا قول ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں میں رہا ان سب سے زیادہ افضل اور نہایت شدت سے متبع سنت ایوب ہی کو پایا شیخ حمیدی نے حضرت سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ ایوب جیسا میں نے نہیں دیکھا ابن مدینی سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت نافع سے روایت میں کون زیادہ اثبت ہے؟ فرمایا ایوب فضل وکمال میں، امام مالک اتقان میں، اور عبیداللہ حفظ میں ممتاز ہیں، ابن سعد نے کہا کہ "ایوب ثقہ، ثبت، جامع، الفضائل، کثیر العلم، حجۃ وعدل تھے، امام مالک نے فرمایا کہ ایوب علماء عاملین خاشعین عباد وخیار ناس میں سے تھے، میں نے بھی ان سے علم حاصل کیا جب دیکھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت اجلال وتعظیم کا معاملہ کرتے ہیں، امام احمد سے پوچھا گیا کہ کیا ایوب کو امام مالک پر بھی تقدم ہے؟ تو فرمایا ہاں! آپ کی ولادت ۶۶ھ یا ۶۸ھ میں ہوئی۔ اور وفات ۱۳۱ھ میں رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ (تہذیب صفحہ ۳۹۷، محدث خوازمی نے لکھا کہ زہاد وکبار تابعین میں سے ہیں۔ آپ نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت حدیث کی ہے (جامع المسانید صفحہ ۳۸۳)

برائی سے کیا تو آپ نے یہ آیت پڑھی **یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافوا ھم ویابی اللہ الاان یتم نورہ** پھر فرمایا کہ ہم نے بہت سے مذاہب ان حضرات کے دیکھے ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ پر جرح کی کہ وہ سارے مذاہب ختم ہوگئے! اور امام صاحب کا مذہب قیامت تک باقی رہنے والا ہے اور انشاء اللہ جتنا وہ پرانا ہوگا اس کے انوار و برکات میں زیادتی ہوگی اب تمام لوگوں کا اس امر پر اتفاق ہو چکا ہے کہ اہل سنت والجماعت اہل مذاہب اربعہ ہیں، جو شخص امام ابوحنیفہ کے مذہب میں کلام کرے گا اس کا مذہب صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے گا اور امام صاحب کا مذہب شرق سے غرب تک پھیلتا رہے گا اور اکثر لوگ اسی پر ہوں گے''۔ (صفحہ ۱۴-۱۵ طبع اسکندریہ ۱۳۹۲ھ)

علامہ کوثری نے تانیب الخطیب میں ایک دوسرے نہج سے بھی ارجاء پر کلام کیا ہے، وہ یہ کہ امام صاحب اور ان کے بعد کے زمانے میں کچھ سادہ لوح نیک نیت لوگ ایسے بھی تھے، جو ایمان کے مجموعہ قول و فعل ہونے اور اس کی زیادتی و نقص کے متعلق بہت زیادہ یقین رکھتے تھے اور اپنے یک طرفہ رجحان و غلو کے باعث وہ ان لوگوں کو مرجئی کہنے لگے تھے، جو ایمان کو مجموعہ عقد و کلمہ (تصدیق قلبی و شہادت لفظی) سمجھتے تھے، حالانکہ حجج شرعیہ کی رو سے حق وہی تھا، جو وہ سمجھتے تھے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے''**ولما یدخل الایمان فی قلوبھم** (یعنی ابھی ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ ایمان دل کے اندر کی چیز ہے، اور حدیث مسلم میں ہے کہ ایمان، خدا، ملائکہ، کتب، رسل، یوم آخرت، قدر خیر و شر پر یقین رکھنا ہے اور یہی جمہور اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ مگر یہ نیک بزرگ اگر واقعی اپنے اعتقاد مذکور کے خلاف کو بدعت و ضلالت سمجھتے تھے تو معتزلہ و خوارج کی پوری موافقت کر گئے وہی یہ کہتے ہیں کہ اعمال رکن ایمان ہیں جو ان میں کمی و کوتاہی کرے گا وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جائے گا اور مخلد فی النار ہوگا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ نیک بزرگ بھی ان دونوں فرقوں اور ان کے عقائد سے قطعاً بیزار تھے، لیکن یہ نہ سوچا کہ جب ہم ان فرق باطلہ کے عقائد سے برات کرتے ہیں اور دوسری طرف امام اعظمؒ اور ان کے اصحاب اور دوسرے حضرات سے بھی برات کا اظہار کریں گے تو یہ کس قدر بے معنی بات ہوگی اور اگر واقعی طور سے یہ لوگ اپنے خلاف کو بدعت و ضلالت نہیں سمجھتے تھے اور اعمال کو صرف کمال ایمان کے لئے ضروری سمجھتے تھے تو پھر امام صاحب وغیرہ سے اختلاف ہی کیا رہا کہ ان کو معطون کیا جائے۔ لیکن ان کے ظاہری تشدد نے یہی بات باور کرائی کہ وہ عمل کو مکمل کے درجہ میں نہیں بلکہ ایمان کا رکن اصلی قرار دیتے ہیں جس کا نتیجہ ظاہر ہے سب سے زیادہ تعجب امیر المومنین فی الحدیث سے ہے کہ وہ بڑی خوشی کا اظہار کر کے فرماتے ہیں میں نے اپنی کتاب میں کسی ایسے شخص سے روایت نہیں لی جو''**الایمان قول و عمل یزید و ینقص**'' کا قائل نہیں تھا، حالانکہ انہوں نے غالی خارجیوں تک سے روایتیں لی ہیں، اور وہ یہ بھی خوب جانتے ہوں گے کہ''**الایمان قول و عمل یزید و ینقص**'' کا بطور حدیث رسول، ناقدین حدیث کے نزدیک کوئی ثبوت نہیں ہے پھر اس قدر وضاحت و اتمام حجت کے بعد ان لوگوں پر طعن و تشنیع کا کیا جواز ہے جو عمل کو اگرچہ ایمان کا رکن اصلی نہیں قرار دیتے لیکن جتنی اہمیت اعمال کی قرآن و سنت سے ثابت ہے اس کے قائل بھی ہیں، اور یہی مذہب جمہور صحابہ اور جمہور اہل سنت کا ہے جو خوارج و معتزلہ کے عقیدوں سے بیزار ہیں اور جو ارجاء بدعت فرقہ باطلہ مرجئہ کا مذہب ہے کہ سرے سے اعمال کی کوئی ضرورت و اہمیت ہی نہیں اور ایمان کے ساتھ کوئی معصیت بھی مضر نہیں، اس قول و عقیدہ سے بھی امام صاحب وغیرہ بری ہیں حتیٰ کہ مرجئی کے پیچھے ان کے نزدیک نماز بھی صحیح نہیں''۔ (تانیب صفحہ ۴۴)

اسی طرح ارجاء بدعت کے بارے میں شیخ معین سندھیؒ نے بھی آخر دراسات میں امام صاحب کی طرف سے نہایت عمدگی کے ساتھ دفاع کیا ہے اور شیخ جزری نے جامع الاصول کی دسویں جلد میں بھی نہایت زوردار الفاظ میں لکھا کہ''امام صاحب کی طرف جو ارجاء، خلق قرآن اور قدر وغیرہ کی نسبتیں کی گئی ہیں خواہ وہ کسی نے بھی کی ہوں وہ گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ امام صاحب کی ذات ان سب سے منزہ تھی، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے مسلک کو مشرق سے مغرب تک غیر محصور علماء و صلحا نے اختیار کیا اگر اس میں سرالٰہی اور رضاء خداوندی نہ ہوتی جس سے امام صاحب مشرف ہوئے تو دنیا کے آدھے مسلمان ان کی تقلید پر جمع ہوتے اور اس وقت تک ساڑھے چار سو سال

گزر گئے ان کی رائے و مذہب پر عمل ہو رہا ہے یہ آپ کے مذہب و عقیدہ کی صحت پر سب سے بڑی دلیل ہے' امام جزری شافعی کا تذکرہ مقدمہ انوارالباری صفحہ ۱۱۴ میں ہو چکا ہے ان کی وفات ۶۰۶ھ میں ہوئی اور انہوں نے امام صاحبؒ کی وفات سے اپنے زمانے تک کا حال ذکر کیا ہے چونکہ یہ بحث ایمان کی چل رہی ہے اور امام صاحب کے بارے میں ارجاء کی نسبت ایک بہت بڑا مغالطہ تھا' بالفرض اگر امام صاحب ایمان کی حقیقت پوری طرح نہ سمجھ سکے تھے تو بنیاد ہی غلط ٹھہرتی ہے اور آگے کی ساری عمارت ہی بے بنیاد ہو جاتی ہے اس لئے اس مسئلہ کی وضاحت مختلف پیرایوں سے ضروری ہوئی اور یوں بھی ایمان اصل دین ہے اس کی حقیقت اور اطراف و جوانب سے جتنی زیادہ واقفیت ہو سکے بہتر ہے اس لئے طوالت کا خیال نہیں کیا گیا۔

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ امام صاحب کے مدارک اجتہاد کس قدر دقیق اور دقت نظر کتنی زیادہ تھی کہ جو فیصلہ فرما گئے' وہ عقل و نقل کی کسوٹی پر پورا ہی اترتا تھا' بقول امام حدیث عبداللہ بن مبارکؒ کے امام صاحبؒ ''مخ العلم'' علم کا مغز تھے' علوم نبوت کے لب لباب اور ان کے انتہائی مقاصد تک رسائی حاصل تھی' مسائل کی ارواح و حقائق پر مطلع تھے ان کے اصول و مبادی سے واقف اور ان کی فروغ نکالنے میں ماہر کامل تھے' بہت جلد اپنی جودت فکر' وسعت علم' اور مناظروں کی شوکت سے سارے زمانہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ایک وقت متکلمین کی مجلس میں بیٹھے ان سے مناقشات کر رہے ہیں دوسرے وقت اہل ہوا کی مضرتوں کو دفع کر رہے ہیں تیسرے وقت فرق باطلہ سے بحث و مجادلہ کر رہے ہیں۔ مسائل علم کلام[1] میں آپ کی آراء کی بڑی اہمیت ہے۔ علم حدیث میں آپ کی طرف ۲۲-۲۳ مسانید منسوب ہیں لہٰذا حدیث میں بھی آپ کا خاص مقام ہے اور فقہ تخریج' فہم معنی حدیث' علم ناسخ و منسوخ احادیث' استنباط علل احکام وغیرہ میں تو سب مجتہدین سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوئے' حتیٰ کہ آپ کے معاصرین نے بھی اعتراف کیا کہ ہم نے آپ سے اچھا حدیث کو سمجھنے والا نہیں دیکھا' یہ صرف اسی لئے تھا کہ آپ حدیث کے ظاہری الفاظ کے فہم پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان الفاظ کے گہرے معانی و مطالب پر غور کر کے ان کے مناسبات علل' ملابسات و حکم دریافت کرتے تھے اور ان ہی پر بنا کر کے اصول منضبط اور فروع متفرع کرتے تھے یہ اتنا بڑا محیر العقول فضل و امتیاز امام صاحب کو کیسے حاصل ہوا' خود امام صاحب کے فطری ملکات و کمالات کس قسم کے تھے' اور کن اساتذہ اور کس ماحول سے ایسی عظیم شخصیت مکمل ہوئی ان سب امور مبہمہ کی کما حقہ تنقیح و تشریح استاذ ابوزہرہ مصری نے اپنی تالیف ''ابوحنیفہؒ'' کے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کی ہے۔

علی ابی حنیفۃ و مصادرہ' صفات ابی حنیفۃ شیوخہ۔ دراساتہ الخاصۃ و تجاربہ''۔ پھر عنوان ''السنۃ'' کے تحت صفحہ ۲۶۸ سے ۲۹۸ تک امام صاحب کے عمل بالحدیث اور عمل بالقیاس پر اتنا کافی و شافی لکھ دیا ہے کہ اس کو پڑھ کر ہر شخص امام صاحب کو اہل حدیث اور ان کے مقابلہ پر دوسروں کو اہل رائے و قیاس کہنے پر مجبور ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے' حنفیہ میں سے جن محدثین نے ائمہ احناف کے عمل بالحدیث کی شان زیادہ نمایاں کی' ان میں سے چند اکابر نمایاں یہ ہیں۔

امام طحاوی حافظ ابوبکر جصاص' محدث خوارزمی' حافظ زیلعی' حافظ مغلطائی' حافظ عینیؒ شیخ ابن ہمام' حافظ قاسم بن قطلو بغا' ملا علی قاری' شیخ عبدالحق محدث دہلوی' شیخ الاسلام دہلوی' شیخ محمد حیات سندھی' شیخ محمد ہاشم سندھی' علامہ زبیدی' شیخ محمد عابد سندھی' الشیخ الکنگوہی' شیخ خلیل احمد سہارنپوری' شیخنا الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری' شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ شیخ التفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی' شیخ محمد زاہد الکوثری' شیخ نیموی' شیخ محمد' الشیخ اشرف علی والشیخ ظفر احمد التھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ و شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا المہاجر مدنیؒ۔

---

[1] اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ماتریدیہ نے حق تعالیٰ کی آٹھویں صفت تکوین کا اثبات کیا ہے وہ امام اعظم ہی کی دینی فکری و کلامی منقبت کی دین ہے' جس کی عظمت و اہمیت کا اعتراف حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں کیا اور کہا کہ اس کلامی مسئلہ میں امام بخاری نے امام صاحب کی رائے کا اتباع کیا ہے یہ نہایت اسلم صورت ہے کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد وہ اعتراضات وارد نہیں ہوتے جو اشاعرہ پر کئے گئے ہیں زیادہ تفصیل اپنے موقع پر آئیگی انشاء اللہ (مؤلف)

ایمان کے ساتھ استثناء کی بحث

ایمان کے متعلق یہ بحث ہو چکی کہ اس کی اصل کیا ہے اور فروع کیا ہیں؟ اور یہ بھی واضح ہو چکا کہ نفس ایمان میں کمی وزیادتی ہوتی ہے یا نہیں، اب ایک تیسری بحث باقی ہے اس کو بھی مختصراً پڑھ لیجئے۔

سلف میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابراہیم نخعیؒ علقمہؒ سفیان ثوریؒ ابن عیینہؒ، امام مالکؒ شافعی واحمدؒ سے منقول ہے کہ وہ ''انا مومن انشاء اللہ'' کہتے تھے اور صرف انا مومن کہنے کو پسند نہیں کرتے تھے، ہمارے متکلمین میں سے بھی بعض اصحاب کا یہی مسلک نقل ہوا ہے امام اوزاعی وغیرہ دونوں صورتوں کو برابر سمجھتے تھے لیکن امام اعظمؒ اور دوسرے متکلمین انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کہنے کو پسند نہ کرتے تھے لیکن باوجود اس کے امام صاحب سے اس قسم کا تشدد بھی منقول نہیں، جو متاخرین حنفیہ نے اختیار کیا کہ انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کہنے والوں کو مشکیہ 'شکیہ' کہتے تھے اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ لوگ چونکہ اپنے ایمان میں شک کرتے ہیں ان کے پیچھے نماز بھی درست نہیں، اس کو تشدد بیجا ہی کہنا چاہئے۔ اگر سلف سے بھی اس قسم کے تشدد کی مثال ملتی ہے۔ علامہ کوثری نے سند کے ساتھ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بکری لائے اور ایک شخص سے کہا کہ اس کو ذبح کرو اس نے ذبح کرنے کے لئے چھری اٹھائی آپ نے پوچھا کیا تم مومن ہو؟ اس نے کہا میں مومن ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ، حضرت ابن عمر نے فرمایا لاؤ مجھے چھری دو اور وہیں چلے جاؤ جہاں کے لئے خدا نے تمہارا مومن ہونا چاہا ہے دوسرا شخص گزرا بلا کر فرمایا، ہماری بکری ذبح کر دو، اس نے بھی چھری لے کر ذبح کرنے کا ارادہ کیا، آپ نے پوچھا کیا تم مومن ہو؟ اس نے بھی کہا ''میں مومن ہوں انشاء اللہ تعالیٰ'' اس سے بھی آپ نے چھری لے لی اور فرمایا جاؤ اپنا کام کرو، پھر تیسرے شخص سے کہا کہ ہماری بکری ذبح کر دو اس نے بھی چھری اٹھائی، آپ نے پوچھا کیا تم مومن ہو؟ اس نے کہا کہ ''میں ظاہر و باطن سے مومن ہوں'' آپ نے فرمایا اچھا ذبح کرو، ذبح کرو۔ پھر فرمایا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ ہماری بکری کو ایسے شخص سے ذبح نہیں کرایا جس کو اپنے خدا پر ایمان میں بھی شک تھا''۔

اس روایت میں ایک راوی کو مجہول کیا گیا ہے مگر علامہ کوثری نے اس کی جہالت رفع کر دی ہے (تانیب صفحہ ۳۵) عامہ سلف کے قول مذکور کی توجیہ کس طرح کی گئی ہے ایک یہ کہ انشاء اللہ باعتبار ایمان موافاۃ ہے یعنی وقت وفات کا ایمان، چونکہ مدار نجات وہی ایمان ہے جو آخر وقت تک رہے۔ اس لئے اسی کا لحاظ واعتبار کر کے انشاء اللہ کہتے تھے کیونکہ کل کے ہر کام کو خدا کی مشیت پر معلق کرنا چاہئے، حافظ ابن تیمیہ نے اس توجیہ کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ خود آئمہ سلف سے اس کی توجیہ اس طرح منقول ہے کہ ایمان مکمل انقیاد ظاہری اور تمام واجبات کی بجا آوری اور ترک جمیع ممنوعات کو مقتضی ہے تو انا مومن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے لئے کمال ایمان کا دعویٰ کیا اس سے بچنے کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ کہتے تھے جس طرح کوئی مومن اپنے لئے بر و تقویٰ اور تزکیہ نفس کی شہادت نہیں دے سکتا۔ حافظ ابن تیمیہؒ کی توجیہ مذکور کا مدار چونکہ اعمال کو ایمان کے اجزاء جوہری ماننے پر ہے اور اس کو ہم خلاف تحقیق بتلا چکے ہیں اس لئے وہ بھی صرف ایک سطحی تاویل کا درجہ رکھتی ہے امام صاحب کی نظر چونکہ ٹھوس حقائق پر ہوتی ہے اس لئے وہ ایمان کو اس کے ٹھیک مقام میں اور اعمال کو ان کے صحیح مرتبہ میں رکھتے ہیں، جہاں سلف سے قول و عمل اور یزید و ینقص کا قول حسب تحقیق حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے کے مقتضیات احوال کے تحت تھا اور اس کو حقیقت نفس الامری نہیں قرار دے سکتے''۔ (جس کی تفصیل اوپر گزر چکی اسی طرح سلف سے انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کا اضافہ بھی ان کے بلند مقامات و مراتب تواضع و کسری شان موافاۃ، یا حسن خاتمہ کو خدا کی مشیت سے وابستہ کرنے، یا اعمال کی غایت اہمیت کے لحاظ سے ضرور ان حضرات کے لئے حسب حال تھا مگر اس کو حقیقت و شریعت قرار نہیں دیا جا سکتا جو سب کے لئے ایک اصول کا کام دے سکے اسی لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ذبح شاۃ کے قصہ میں پہلے دو آدمیوں پر نکیر کی اور تیسرے کی تقویت فرمائی۔

حسب تحقیق حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ' امام صاحب نے ایک دقیق امر کی طرف توجہ کی' جس سے سلف نے تعرض نہیں کیا تھا' یعنی ایمان کے اس مرتبہ محفوظ خاصہ سے بحث کی' جو مدار نجات ہے اور اس کے بعد کفر ہی ہوسکتا ہے اور وہ مرتبہ ایسا جزم و یقین ہے کہ اس کے ساتھ کسی ادنیٰ شک کی بھی گنجائش نہیں' جب ایمان کی یہ حقیقت متعین ہوگئی تو ظاہر ہے کہ امام صاحب انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کا اضافہ بطور تبرک بھی پسند نہیں کریں گے کیونکہ اس کے لئے جہاں بہتر توجیہات نکل سکتی ہیں ایک شق شک والی بھی ہے جس کا وجود ایمان کے ساتھ کسی طرح بھی گوارہ نہیں کیا جاسکتا' جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے بکری ذبح کرانے کے لئے پہلے دو شخصوں کے انشاء اللہ کہنے کو پسند نہیں کیا۔

امام صاحب کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ ایک صحیح فیصلہ کرنے کے بعد' کسی کے سخت سے سخت طعن و ملامت کی وجہ سے بھی مداہنت کو ہرگز روا نہیں رکھتے ہیں' تانیب میں ہے ایک شخص شراب کے نشہ میں چور امام صاحب کے پاس آیا اور امام صاحب کو یا مرجئ کہہ کر خطاب کرنے لگا' امام صاحب نے برجستہ فرمایا ''اگر میں تم جیسوں کے لئے ایمان ثابت نہ کرتا تو آج تم مجھے مرجئ نہ کہتے' اور اگر ارجاء بدعت نہ ہوتا تو مجھے اس کی بھی پروانہ ہوتی کہ مجھے اس کی طرف منسوب کیا جائے'' معلوم ہوا کہ امام صاحب بدعت سے سخت نفرت کرتے تھے اور اس کی طرف نسبت بھی آپ کو گوارہ نہ تھی۔

امام صاحب کی جس طرح ظاہر کی آنکھیں کھلی تھیں باطن کی آنکھیں بھی روشن تھیں' اس لئے ان سے کوئی حقیقت کیونکر محجوب رہ سکتی تھی' امام شعراوی شافعیؒ نے ''المنہج المبین'' میں لکھا کہ ''چاروں مذاہب سنت صحیحہ سے ماخوذ اور شریعت حقہ سے مستنبط ہیں' خصوصاً امام اعظم کا مذہب لیکن اس کے استنباطات بہت دقیق ہیں' ان تک بعض لوگوں کی سمجھ نہیں پہنچ سکتی اور ان کی صحت کا حال کشف صحیح والے ہی پر منکشف ہوسکتا ہے۔

پھر انہوں نے اپنی کتاب ''طبقات الاولیاء الکبار'' میں اور علامہ مناوی شافعی نے اپنی طبقات میں ائمہ اربعہ کو اولیاء کبار میں شمار کیا ہے اور ان کے مناقب جلیلہ لکھے ہیں اور عارف باللہ شعیب الحریفیش یمنی شافعیؒ نے ''الروض الفائق'' میں امام صاحب کے مناقب اور علم باطن کے کمالات کا ذکر کیا ہے۔ (ذب صفحہ ۶۸۰/۲)

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ امام صاحب نماز کو خدا کا فریضہ و دین نہیں سمجھتے' اگر کوئی ادا نہ کرے تو کسی وعید کا مستوجب نہیں تو یہ قول مرجئہ اہل بدعت کا ہے' (مرجئہ اہل سنت کا نہیں) امام صاحب اس اتہام سے قطعاً بری ہیں' جس کی تفصیل ہو چکی ہے۔

۳۔ تیسرا اعتراض امام بخاریؒ نے امام صاحب پر رضاع کی مدت کے بارے میں کیا ہے' اور ڈھائی سال کی مدت کو خلاف نص قرآنی بتلایا ہے' لیکن جس آیت کا حوالہ امام بخاریؒ نے دیا ہے' وہ اجرت رضاعت سے متعلق ہے کہ دو سال تک اجرت رضاعت مطلقہ بیوی کو دی جانی چاہئے۔ **فان ارادا فصالا** سے بتلایا کہ مشورہ کے بعد شوہر و بیوی دودھ چھڑا سکتے ہیں کوئی حرج نہیں اور **وان تسترضعوا** سے یہ بتلایا کہ اس کے بعد بھی دودھ پلانا چاہو تو کوئی حرج نہیں' اس اختیار دینے سے واضح ہوا کہ یہاں مدت رضاعت کی تعیین و تحدید مقصود نہیں ہے (تفسیر احکام القرآن للجصاص) دوسری جگہ سورۂ احقاف میں ارشاد ہوا **وحملہ و فصالہ ثلاثون شھرا** جس کا مطلب زمخشری نے یہ بتلایا کہ ہاتھوں میں اٹھانے اور دودھ چھڑانے کا زمانہ ۱/۲-۲ سال کا ہے۔ لہٰذا یہ کل مدت رضاعت ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلی آیت سورۂ بقرہ میں دو سال دودھ پلانے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ دو سال پر فوراً دودھ چھڑانے اور دوسری غذائیں دینے سے فوراً صحت بگڑ جائے گی۔ اس لیے دو سال کے بعد کچھ زمانہ غذاؤں کی عادت ڈالنے کے لیے بھی ہونا چاہئے تا کہ رفتہ رفتہ دودھ پلانے کے ساتھ تمرین غذا بھی ہو پھر دو سال کے بعد کتنی مدت اور اس کے لیے لی جائے' اس میں اختلاف ہے (جس کی تفصیل آگے آئی ہے) غرض دو سال کی مدت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بعد دودھ پلانا حرام ہو' اگر ایسا ہوتا تو احادیث میں اس کی تشریح آتی' جو مدار احکام بنتی' بلکہ ایک حدیث میں الرضاعۃ من المجاعۃ وارد ہے' یعنی دودھ پلانا بھوک کے لیے ہے کہ جب تک دودھ کی خواہش و ضرورت ہو پی

سکتا ہے اس سے بھی ظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ دوسال پر مدار نہیں ہے البتہ دوسال کے بعد تمرین غذا ضروری ہے تا کہ جلد چھڑایا جاسکے۔

شیخ ابوبکر جصاص نے یہ بھی لکھا کہ **لمن اراد ان یتم الرضاعة** میں تمام کے لفظ سے یہ ضروری نہیں کہ اس پر زیادتی ممنوع ہو جیسے حدیث میں آتا ہے کہ جو وقوف عرفہ کر لے اس کا حج تمام ہو گیا' حالانکہ ابھی دوسرے فرض و واجب باقی ہیں' جو وقوف عرفہ کے بعد ادا کئے جاتے ہیں۔

مدت رضاعت میں بہت سے اقوال ہیں۔

ا۔ دوسال کے اندر دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی' جس کے قائل یہ ہیں:۔ حضرت عمر' ابن عباس' ابن مسعود' امام اعظم (ایک روایت میں) امام مالک' امام شافعی' ابو یوسف' محمد' زفر وغیرہ۔

۲۔ رضاع مقتضی حرمت وہ ہے جو دودھ چھڑانے سے قبل ہو۔ اس کے قائل ابن عباس' ام سلمہ' اوزاعی' عکرمہ وغیرہ ہیں۔

۳۔ حالت صغر میں موجب حرمت ہے اس کی کوئی حد مقرر نہیں' یہ رائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر ازواج مطہرات اور ابن عمر وغیرہ کی ہے۔

۴۔ ڈھائی سال' یہ ایک روایت حضرت امام اعظم و زفر سے ہے۔

۵۔ دوسال اور اس سے کچھ زیادہ' یہ امام مالک کا قول ہے۔

۶۔ تین سال یہ قول ایک جماعت اہل کوفہ' اور حسن بن صالح کا ہے۔

۷۔ سات سال یہ قول حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے۔

۸۔ دوسال اور بارہ دن' حضرت ربیعہ کا قول ہے۔

۹۔ رضاعت میں چھوٹی عمر کا اعتبار ہے' مگر خاص حالات میں رضاع کبیر میں معتبر ہے' جیسے کوئی بڑی عمر کا لڑکا کسی مجبوری سے کسی عورت کے پاس آتا جاتا ہو اور اس سے حجاب بھی دشوار ہو' یہ حافظ ابن تیمیہ کی رائے ہے (بذل المجہود ملخصا من النیل صفحہ ۱۱/۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اول تو نص قرآنی کا خلاف ہی نہیں ہے' اور اگر ہے تو صرف امام صاحب کو ہدف طعن بنانا درست نہیں۔

۴۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ امام صاحب نے خنزیری کو حلال و جائز قرار دیا' یہ بات بھی فرقۂ مرجئہ سے تعلق رکھتی ہے' جیسا کہ ہم ان کا مذہب بتلا آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ **ماجاء به الرسول** کی معرفت اجمالی کافی ہے۔ تفصیل ضروری نہیں بس اتنا جانتا ہو کہ کعبہ معظمہ کہیں ہے' مکہ معظمہ میں ہونے کی معرفت ضروری نہیں' صرف اتنا جاننا ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ وہی تھے' جن کی پیدائش و بعثت مکہ معظمہ میں اور وفات مدینہ طیبہ میں ہوئی یا کوئی اور تھے' سور کو حرام جانتا ہو' خواہ یہ نہ جانتا ہو کہ وہ بکری ہے یا کوئی دوسرا جانور' چونکہ امام بخاریؒ کے خیال میں امام صاحب مرجئی تھے' لہٰذا وہ اسی مذکورہ بالا اجمال و تفصیل کے تحت' خنزیر و بکری میں فرق نہ کر سکنے والے کے لئے گویا خنزیر ہی کو حلال کہتے تھے (نعوذ باللہ منہ) اگرچہ امام بخاریؒ نے ان اتہامات کے لیے کوئی سند ضروری نہیں سمجھی' مگر اس بات کا کچھ سراغ اس امر سے مل جاتا ہے کہ خطیب نے سند کے ساتھ امام صاحب کی طرف اس قسم کی بات منسوب کر دی ہے۔ علامہ کوثری نے خطیب کی یہ روایت تانیب کے صفحہ ۳۶ میں ذکر کی ہے' اس کی روایت کا شرف بھی علامہ حمیدی شیخ بخاری کو حاصل ہے' جنہوں نے امام بخاری کو امام صاحب وغیرہ سے بدظن کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں' علامہ کوثری نے اس روایت کے رواۃ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ طبقات سبکی شافعی صفحہ ۱/۲۲۴ میں ہے کہ شیخ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا کہ حمیدی لوگوں کے حالات بیان کرنے میں کذب و غلط بیانی سے کام لیتے ہیں' (ان کے تعصب وغیرہ کا حال مقدمہ انوارالباری صفحہ ۱/۲۲۴ میں لکھا جا چکا ہے) دوسرے راوی۔ حارث بن عمیر ہیں' جن کو ذہبی نے بین الضعف' ابن حبان نے اثبات سے گھڑی ہوئی باتیں نقل کرنے والا' حاکم نے موضوع احادیث نقل کرنے والا' ازدی

نے ضعیف، منکر الحدیث، ابن خزیمہ نے کذاب لکھا، پھر از روئے درایت بھی یہ کیونکر ممکن ہے کہ امام اعظم ایسی کفر صریح بات اور وہ بھی مسجد حرام میں بیٹھ کر فرمائیں، ہاں جھوٹوں کو کوئی الزام نہیں دے سکتا، جو چاہیں جس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بدزبانیوں سے نہایت تنگ ہو کر خدا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ "ان کی لسانی دل آزاریوں سے مجھے بچا دیجئے" حق تعالیٰ نے فرمایا "اے موسیٰ! لوگوں کی زبان کو اپنے ہی بارے میں نہیں روکا تو تمہارے بارے میں کیا روکوں گا۔

امام صاحب سے تو امام ابو یوسف صاحبؒ نے مسئلہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر غیر کعبہ کی طرف نماز پڑھے اور اتفاق سے اپنی غلطی سے وہ کعبہ ہی کی طرف پڑھ لے، تو اس کی نماز تو کیا ہو گی، وہ اپنی اس کافرانہ حرکت سے جان بوجھ کر کعبہ کی سمت سے اعتراض کیا اور غیر کعبہ کی طرف نماز کا ارادہ کر کے نماز پڑھی۔ کافر ہو جائے گا۔

ہاں! یہ ممکن ہے کہ امام صاحب نے کسی نو مسلم کے لیے اجمالی ایمان کو ابتداء میں کافی فرمایا ہو، تا کہ پھر وہ تدریجاً ایمان تفصیل حاصل کر لے، اور اسی کو روایت بالمعنی کی آڑ لے کر راویوں نے مسخ کر کے پیش کیا ہو، علامہ ابن حزم نے "فصل" میں لکھا ہے کہ ایک جاہل ان پڑھ کے لیے ابتداء میں ایمان اجمالی بھی کافی ہے مثلاً یہ کہ محمد رسول ہیں خدا کے، اور ابھی وہ نہیں جانتا کہ آپ قریشی تھے، یا تمیمی یا فارسی، حجاز میں تھے یا خراسان میں، وغیرہ، البتہ اس کو علم ضروری تفصیلی حاصل کرنا چاہئے اگر جاننے کے بعد بھی عناد سے ایسی بات کہے تو کافر ہے۔

خنزیر بری کے اتہام کے بارے میں حافظ ابن تیمیہ نے بھی "منہاج السنۃ" میں صفحہ ۲۵۹/۱ میں لکھا کہ "امام صاحب کی بعض چیزوں سے اگر چہ کچھ لوگوں نے خلاف کیا ہے، مگر ان کے علم، فہم و تفقہ میں کوئی بھی شک نہیں کر سکتا، بعض لوگوں نے ان کی طرف طعن و تشنیع کے لیے ایسی باتیں بھی منسوب کر دی ہیں، جو آپ پر یقیناً بہتان و جھوٹ ہیں، مثلاً خنزیر وغیرہ کے مسائل۔

علامہ، محقق مولانا عبدالرشید نعمانی نے حاشیہ ذب صفحہ ۲/۵۳ میں لکھا "ناقلین روایات کے یہاں کسی روایت کو ساقط و رد کرنے کے لیے انقطاع، عدم ضبط، تہمت کذب، جہالت، بدعت حسد، بغض، عصبیت میں کوئی ایک بھی کافی ہے، مگر تعصب کا برا ہو کہ جب کوئی بات امام اعظمؒ کے کسی عیب و منقصت کی ہاتھ لگتی ہو تو اس کو باوجود ان علیل مذکورہ کے بھی قبول کر لیا جائے گا۔ چنانچہ خطیب نے بھی بیسوں روایات اسی قسم کے کذابین، مرجئین، معتزلین اور افتراء پردازوں سے جمع کر دی ہیں (جن کی قلعی علامہ کوثری نے کھول دی ہے۔ جزاء اللہ تعالیٰ خیر الجزاء)

۵۔ پانچواں اعتراض، یری السیف علی الامۃ کا ہے، جس کا جواب ہم نے امام صاحب کے حالات میں بھی دیا ہے اور اس جلد کے شروع میں بھی ایک جگہ ضمناً لکھ آئے ہیں، اور امام ابو بکر جصاص نے اپنی مشہور تصنیف "احکام القرآن" کے صفحہ ۱/۸۱ میں بھی اس پر خوب لکھا ہے، چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"امام صاحب کا مسلک ظالم حکام اور ائمۂ جور سے قتال کے بارے میں مشہور تھا (وہ اس بارے میں شمشیر بے نیام تھے، ان کی تلوار حق کی حمایت میں باطل کے مقابلہ کے لیے تھی، امت پر نہیں بلکہ امت کو ظالموں کے ظلم و جور سے نجات دلانے کے لیے تھی، اسی لیے امام اوزاعی (محدث شام) نے فرمایا تھا کہ "امام ابو حنیفہ کی وجہ سے ہم ہر بات کے لیے آمادہ ہو گئے، یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں تلوار اٹھانے پر بھی آمادہ کرنا چاہا (یعنی ظالموں کے خلاف) مگر ہم اس کو برداشت نہ کر سکے، امام صاحب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو فرض فرماتے تھے، اول زبان سے، اور نہ مانیں تو تلوار کے زور سے مجبور کرنے کو ضروری سمجھتے تھے" اس کے بعد امام جصاص نے کچھ واقعات امام صاحب کی مجاہدانہ زندگی کے ذکر کئے، پھر فرمایا کہ "امام صاحب کے اس مسلک پر بعض سادہ مزاج اصحاب حدیث نے نکیر کی ہے، جن کی کمزوری کے باعث امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام سست و بے اثر ہو گیا، اور اسلامی امور پر ظالموں کا تغلب ہو گیا،

۶۔ چھٹا اعتراض یہ تھا کہ امام صاحب قرآن کو مخلوق کہتے تھے، یہ بھی محض بہتان و افترا ہے، امام بیہقی شافعیؒ نے اپنی کتاب "الاسماء و الصفات" صفحہ ۲۵۰ میں امام محمد صاحب کا قول نقل کیا کہ وہ فرماتے تھے "جو شخص قرآن کو مخلوق کہے اس کے پیچھے نماز مت پڑھو" محمد بن سابق نے

امام ابو یوسف سے سوال کیا:۔ کیا امام ابوحنیفہ قرآن کو مخلوق کہتے تھے؟ فرمایا:۔ معاذ اللہ بالکل غلط ہے اور نہ میں ایسا کہتا ہوں، پھر پوچھا کیا امام صاحب جہم کا عقیدہ رکھتے تھے؟ فرمایا معاذ اللہ، بالکل غلط ہے اور نہ میرا ایسا عقیدہ ہے امام ابو یوسف نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے امام صاحب سے اس بارے میں گفتگو کی کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں، تو ہم دونوں اس امر پر متفق ہوئے کہ جو قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے ''کتاب الایمان'' صفحہ ۱۶۳ میں لکھا'' خدائے تعالیٰ کی مسلمان بندوں پر بڑی رحمت تھی کہ جن آئمہ دین کی لسان صدق کا سکہ ساری امت کے قلوب پر جما ہوا تھا، یعنی ائمہ اربعہ وغیرہم جیسے امام مالک ثوری اوزاعی لیث بن سعد امام شافعی امام احمد اسحق ابو عبید امام ابوحنیفہ ابو یوسف محمد سب حضرات قرآن مجید ایمان وصفات رب کے بارے میں فرقہ جہمیہ کے عقائد باطلہ پر نکیر کرتے تھے، اور سب کا بالاتفاق وہی عقیدہ تھا جو سلف کا تھا''۔

علامہ سلیمان بن عبدالقوی الطوفی حنبلی نے ''شرح مختصر الروضہ'' میں لکھا:۔

واللہ میں امام ابوحنیفہ کو ان تمام اتہامات وبرائیوں سے معصوم سمجھتا ہوں جو ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں اور آپ کے بارے میں فیصلہ شدہ بات یہ ہے کہ آپ نے کسی جگہ بھی ازروئے عناد واعراض سنت کی مخالفت ہرگز نہیں کی، ہاں جہاں کہیں کوئی خلاف کیا ہے تو وہ ازروئے اجتہاد اور حجج واضحہ و دلائل صالحہ لائحہ کی بنیاد پر کیا ہے اور ان کے وہ دلائل اب بھی موجود ہیں، اور بہت مشکل ہی سے ان کے مخالفین ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، اور امام صاحب کے لیے بصورت خطا ایک اجر اور بصورت صواب دو اجر ہیں، ان پر طعن کرنے والے یا تو حاسد ہیں یا جاہل جو مواقع اجتہاد سے ناآشنا ہیں۔

امام احمدؒ سے بھی آخری بات جو صحت کو پہنچی ہے وہ امام صاحب کے بارے میں ذکر خیر اور مدح وثناء ہی ہے جس کو ہمارے اصحاب میں سے ابوالورد نے کتاب اصول دین میں ذکر کیا ہے''۔

عقود الجواہر المنیفہ میں امام احمدؒ کا قول نقل ہوا ہے کہ ''ہمارے نزدیک یہ بات صحت کو نہیں پہنچی کہ امام ابوحنیفہ قرآن کو مخلوق کہتے ہیں۔

الحمد للہ الذی بیدہ تتم الصالحات کہ ایمان سے متعلق اکثر ضروری مباحث پر سیر حاصل بحث ہو چکی، اور ضمناً امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بعض اکابر کی طرف سے جو ایمان وغیرہ مسائل کے متعلق غلط باتیں آ گئی تھیں، ان کا بھی ازالہ کیا گیا **واللہ ولی التوفیق للخیرات، اولاً وآخراً۔**

ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ

ایک محترم فاضل نے لکھا کہ ''دوسری ہجری میں اصحاب الرائے اور محدثین کے نام سے دو طبقے پیدا ہو گئے تھے، امام بخاریؒ کا امام اعظمؒ سے اختلاف شخصی ہرگز نہیں، بلکہ طبقاتی اختلاف ہے، مصر کے مشہور فاضل استاذ ابوزہرہ نے اپنی کتاب ''فقہ ابی حنیفہ وآثار'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے اس پس منظر میں دیکھنے کے بعد امام بخاریؒ نے امام صاحبؒ کی شان میں جو سخت کلامی اور بعض جگہ گستاخی کی ہے، اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے''۔ ہم نے ابھی تک استاذ ابوزہرہ کی کتاب مذکورہ نام کی نہیں دیکھی، البتہ امام اعظمؒ پر ان کی نہایت مبسوط تحقیقی کتاب جو ''ابوحنیفہ'' حیاتہ وعصرہ آراءہ وفقہ'' کے نام سے دوبار شائع ہو چکی ہے، ہمارے پاس موجود ہے، اس میں کہیں نہیں لکھا گیا کہ امام بخاری کا خاص امام صاحب سے کوئی طبقاتی اختلاف تھا نہ ہمارے علم میں کسی اور نے آج تک امام صاحب سے امام بخاری کے اختلاف کی یہ نوعیت سمجھی یا بتلائی۔ نہ امام بخاری ہی سے کہیں یہ نقل ہوا کہ انہوں نے خصوصیت سے امام صاحب یا دوسرے حنفیہ کو اصحاب الرائے ہونے کا طعنہ دیا ہو۔

امام بخاریؒ اور ان کا قیاس

البتہ یہ ضرور ہے کہ امام بخاری قیاس کے منکر ہیں لیکن یہ ان کا قیاس کی بات صرف امام صاحب کے خلاف نہیں ہے بلکہ تمام صحابہ، تمام

تابعین، تمام ائمہ مجتہدین سب اصولیین، سارے متکلمین، اولیاء کاملین وعارفین، اکثر محدثین وفقہا کے خلاف ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا کہ "قیاس خبر واحد پر مقدم ہے کیونکہ قیاس باجماع صحابہ حجت ہے، اور اجماع خبر واحد سے زیادہ قوی ہے لہٰذا جو امر اجماع سے ثابت ہے وہ بھی زیادہ قوی ہوگا"۔

نفی جواز قیاس کی رائے عہد تابعین کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اور معدودے چند محدثین و اصحاب ظواہر اس طرف گئے ہیں مثلاً امام بخاری، داؤد ظاہری، ابن حزم، ابن عربی وغیرہ۔ (ذب ذبابات الدراسات صفحہ ا/ ۹۸ صفحہ ا/ ۹۹)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حنفیہ کے نزدیک قول صحابی قیاس پر مقدم ہے، اور سنت مرفوعہ قیاس وقول صحابی دونوں پر مقدم ہے۔

ادبابه صلی الله علیه وسلم۔ نرحمهم الله ما احسن او بهم و صنیعهم۔ (ذب صفحہ ۲۹۱)

غرض امام بخاری کا امام صاحب اور دوسرے اکابر حنفیہ کے خلاف جو کچھ رویہ رہا، اس کے لیے کوئی ایسی معقول وجہ اب تک ہمیں معلوم نہ ہو سکی، جو امام بخاری کی جلالت قدر کے لیے موزوں ہو، اور کافی مطالعہ وتفتیش کے بعد جو کچھ معلوم ہو سکا وہ ہم نے پہلے کئی جگہ لکھا ہے۔ مثلاً ابتدائی تعلیم حنفی شیوخ سے لینے کے بعد یک دم دوسرے مکتب فکر کے شیوخ سے وابستگی جو اکثر ردعمل کی صورت پیدا کیا کرتی ہے، خصوصاً ایسے شخص کے لیے جو زود تاثر ہو، اور پھر وہ شیوخ بھی امام صاحب وغیرہ سے سخت تعصب رکھتے تھے، مثلاً حمیدی اسحٰق بن راہویہ، نضر بن شمیل وغیرہ،

مسئلہ ۲۔ لفظ بالقرآن میں امام بخاری اور ان کے استاذ شیخ ذہلی کا اختلاف ہے، اور اس میں شدت

بعض ۳۔ حنفی قضاۃ سے آپ کو تکلیف پہنچنا۔

بعض ۴۔ مسائل حنفیہ سے پوری طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف میں زیادتی

ایمان ۵۔ کے مسئلہ میں حنفیہ سے مزید توحش، جس کے بارے میں پوری تفصیل ابھی گذر چکی،

۶۔ انکار قیاس کی وجہ سے مذاہب اربعہ کی فقہ سے اختلاف، جس کے ضمن میں فقہ حنفی اور ائمہ حنفیہ سے بھی بعد لازمی تھا، وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ اسی قسم کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں، مگر اس اختلاف کو طبقاتی اختلاف کہہ کر ہلکا کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اس کو تسلیم بھی کر لیں تو اس کی وجہ سے امام صاحب، امام ابو یوسف، امام محمد وغیرہ پر بے سند اور غلط الزامات قائم کرنے کی وجہ جواز کیا ہو سکتی ہے؟!"

امت میں سے سب سے زیادہ خطیب بغدادی نے اکابر امت امام اعظم، اور امام احمد وغیرہ کے خلاف مواد اپنی تاریخ بغداد میں جمع کیا ہے، مگر انہوں نے ہر بات کو "روایتی سند کے ساتھ لکھا ہے، اگرچہ وہ روائتیں غیر معتمد اور متہم راویوں سے ہیں جن سے روایات کرنا ان کی مؤرخانہ شان کے خلاف تھا مگر بہر حال سند تو لکھی ہے، جس سے راویوں کے حالات پر نظر کی جاسکتی ہے، چنانچہ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے "تانیب الخطیب" میں ایک ایک سند پر بحث کر کے ان راویوں کا حال کھول دیا ہے، جس کے بعد یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ سارے اتہامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔ لیکن امام بخاری جو ہر بات کو سند کے ساتھ روایت کرنے کا بڑا التزام کرتے ہیں اپنی تاریخ کبیر وغیرہ میں بھی جو بات کسی کے متعلق کہتے ہیں اس کے ساتھ اکثر حوالہ دیتے ہیں، اور جہاں حوالہ نہیں دیتے، وہ ان کی ذاتی تحقیق سمجھی جاسکتی ہے، مگر بڑی حیرت ہے کہ امام صاحب وغیرہ کے بارے میں جو کچھ تاریخ کبیر، رسالہ قرأت خلف الامام وغیرہ میں لکھا، اس کے ساتھ کوئی سند نہیں لکھی، نہ کسی کا حوالہ دیا، ظاہر ہے کہ امام بخاری اور امام صاحب کے زمانے میں بہت فاصلہ ہے اس لیے ان کی اپنی ذاتی تحقیق بھی نہیں ہو سکتی۔

بہر حال! ہم نے جو کچھ امام بخاریؒ کی اس قسم کی جرح وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا، وہ مجبور ہو کر لکھا تھا کہ آج بھی بہت سے مخالفین ائمہ حنفیہ کے خلاف امام بخاری وغیرہ کی آڑ لے کر فرض تبرا انجام دینے سے نہیں چوکتے۔ **ولا نرید الا الا صلاح ما استطعنا یرحمنا الله و ایاهم جمیعا۔**

درحقیقت امام صاحب وغیرہ کی طرف رائے کی نسبت بھی اسی طرح بطور طعن مشہور کی گئی تھی' جس طرح ارجاء کی نسبت پھر جس طرح ارجاء سنت وارجاء بدعت دو قسم کا تھا اور دونوں کا فرق عظیم آپ نے ہماری مذکورہ بالا تشریحات سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے' اسی طرح رائے کا اطلاق بھی ''قیاس شرعی'' اور ''عقلی ڈھکوسلہ'' دونوں پر ہو سکتا تھا معاندین حنفیہ یا حقیقت حال سے ناواقف حضرات نے یہی مشہور کیا ہے کہ امام صاحب اور ان کے متبعین اصحاب الرائے دوسرے معنی سے ہیں' لیکن محققین نے ہر دور میں صحیح صورت حال کو سمجھا کہ امام صاحب وغیرہ قیاس شرعی کا استعمال کرتے ہیں جس کا بجز اصحاب ظواہر (داؤد ظاہری وغیرہ) کے کوئی محدث وفقیہ منکر نہیں' صحابہ' تابعین' ائمہ مجتہدین سب ہی نے اس کو اپنایا ہے' کبار محدثین میں سے امام مسلم' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام طحاوی' حضرت عبداللہ بن مبارک' حضرت یحییٰ القطان وغیرہ تو ائمہ مجتہدین کے مقلد تھے (اس لیے ان کے اتباع میں یہ سب اصحاب الرائے ہی تھے) فرق صرف اس قدر تھا کہ فقہاء عراق عامل احکام میں کسی قدر زیادہ تعمیر و توسیع سے کام لیتے تھے' اور جب تک قیاس شرعی بن سکے' تخصیص کو جائز نہیں رکھتے تھے' فقہاء حجاز اس قدر تعمیم کے قائل نہ تھے' اس لیے فقہاء عراق کی شہرت ''اہل الرائے'' کے لقب سے زیادہ ہوئی' یہ نہیں کہ ''وہ سنت نبوی کے مقابلہ میں قیاس کو جائز سمجھتے تھے' یا اہل بدعت کی طرح رائے کا اتباع کرتے تھے' حاشا و کلا' یہی اختلاف فقہاء عراق وحجاز کا خلاصہ' طویل بحث کے بعد' استاذ ابوزہرہ نے بھی بحث قیاس کے آخر میں لکھا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۳۴۱)

معلوم ہوا کہ امام بخاری کا امام اعظم سے اختلاف فروعی مسائل میں تھا' نہ امام بخاری اصحاب ظواہر میں سے تھے' بلکہ وہ خود ایک درجۂ اجتہاد رکھتے تھے' (اگرچہ ان کے اجتہاد میں بقول ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شیخ الہندؒ ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔)

امام بخاری نے جن مسائل میں اجتہاد کیا ہے۔ ان میں کہیں امام صاحب کی موافقت ہے اور دوسرے ائمہ مجتہدین کی مخالفت اور کہیں برعکس ہے' مگر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ پوری صحیح بخاری شریف میں موافقت کا پلہ بھاری ہے یہ ساری بحث فقہی نقطۂ نظر سے ہے جو اوپر کی غلط فہمی زائل کرنے کے لیے لکھی گئی' اس سے اس حقیقت کا انکار نہیں کہ امام بخاری کچھ اسباب وجود کے تحت امام صاحب اور ائمہ حنفیہ سے ناراض و منحرف تھے' جس کا اظہار بھی وہ فرماتے رہے ان کی جلالت قدر اور علمی احسانات' نیک نیتی اور اخلاص کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ امام اعظمؒ کا درجہ و مرتبہ نہ صرف امام بخاری وغیرہ کبار محدثین سے بلکہ دوسرے ائمہ مجتہدین سے بھی بہت بلند ہے' اس لیے' ہمیں امام صاحب پر سے ان اتہامات کو بھی اٹھانا ضروری تھا' جو امام بخاری ایسے جلیل القدر امام ومحدث کی طرف سے ان پر عائد کئے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے پوری کوشش کی ہے کہ صحیح منازل ومراتب رجال میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو پاوے' پھر بھی اپنی کوتاہیوں' لغزشوں' اور علمی بے مائگی کا اعتراف ہر قدم پر ہے' اور ناظرین باتمکین سے عفو درگزر کی بھی توقع و درخواست ہے۔ **فمن عفا واصلح فاجره علی اللہ۔**

امام بخاریؒ کے دلائل پر نظر

ایمان واعمال کے متعلق اصولی مباحث اور مختلف فرقوں کے عقائد ونظریات کی تفصیل ہو چکی ہے' یہاں ہم اختصار کے ساتھ امام بخاریؒ کے ان ۱۵ اشارات پر بھی کچھ لکھتے ہیں' جو انہوں نے کتاب الایمان کے شروع میں ضمن ترجمۃ الباب کئے ہیں۔

ا۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس' اس سے مقصد یہ ہے کہ ایمان مجموعۂ تصدیق واعمال ہے' امام بخاری چونکہ ایمان' اسلام' ہدایت' دین' تقویٰ سب کو شئی واحد سمجھتے ہیں' اس لیے یہاں اسلام کو بھی مرادف ایمان قرار دے کر استدلال کیا ہے' ورنہ حدیث میں یہاں ایمان کی تشریح نہیں ہے' اور جن احادیث میں تشریح ہے مثلاً حدیث جبریل میں وہاں ایمان واسلام کی تشریح الگ الگ ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں رواۃ ثقات سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول مروی ہے کہ ''اسلام علانیہ اور ظاہر چیز ہے اور ایمان

یہاں ہے (آپ نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا معلوم ہوا کہ صحابہ دونوں کا فرق سمجھتے تھے' بقول حضرت شاہ صاحب ایمان کے آثار پھوٹ کر جوارح کی طرف نکلتے ہیں' جو ظاہری انقیاد و اطاعت اور اسلام ہے' اور اسلام جوارح سے قلب کی طرف سرایت کرتا ہے' ایمان (جس کی حقیقت تصدیق قلبی ہے) اس کو اقرار لسانی سے قوت اور اعمال صالحہ سے جلاء حاصل ہوتی ہے' اور تصدیق و اذعان اگر اپنی جگہ صحیح ومکمل ہے تو وہ اقرار و اعمال پر ضرور مجبور کرتا ہے' حضرت سفیان ثوری کا قول ہے اگر یقین جیسا چاہیے' قلب میں پیدا ہو جائے۔ تو وہ فرط اشتیاق سے جنت کی طرف اڑتا ہے اور دوزخ سے بھاگتا ہے (فتح صفحہ ۱/۴۷) پھر ہر عمل صالح کا ایک نور ہوتا ہے' جس قدر طاعات بڑھیں گی' اسی قدر انوار بڑھیں گے' اور ایمان میں رونق' شادابی آئے گی' اس کے برعکس معاصی ہیں کہ ہر معصیت ظلمت ہے اور قلب پر ایک سیاہ نقطہ پیدا کرتی ہے اگر توبہ کی تو وہ داغ دھل جائے گا' ورنہ اسی طرح معاصی کے داغ بڑھتے بڑھتے تمام قلب کو گھیر لیتے ہیں' غرض اسلام کے اندر حنفیہ بھی اعمال کو داخل مانتے ہیں' اور ان کی اہمیت و اثرات سے بھی انکار نہیں۔

۲۔ امام بخاری نے فرمایا کہ ایمان قول وفعل ہے اور کم وبیش ہوتا ہے' آپ نے سلف[1] کے قول کو مختصر کر کے پیش کیا' ان کا قول یہ تھا کہ ایمان طاعت سے بڑھتا ہے اور معصیت سے گھٹتا ہے۔ (کما نقلہ الحافظ ابو القاسم اللالکائی واخرجہ ابو نعیم فی ترجمۃ الشافعی من الحلیۃ عن الربیع عن الشافعی ایضاً۔ فتح الباری صفحہ ۱/۳۶) یہ بات بالکل صاف تھی کہ ایمان بمعنی تصدیق قلبی ومعنوی میں فرمانبرداری سے قوت ونمو حاصل ہوتا ہے اور معاصی سے کمزوری آتی ہے' امام بخاری نے طاعت ومعصیت کے الفاظ حذف کر کے اپنی خاص رائے کو مضبوط کیا ہے' لہٰذا قول سلف سے استشہاد صحیح نہ ہوا۔

(۳) امام بخاری نے آیت **لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم** پیش کی ظاہر ہے کہ یہ آیت صحابۂ کرام کے بارے میں نازل ہوئی اور ان کے کمال ایمانی میں کون شک کر سکتا ہے لہٰذا ان کے نفس ایمان کے اندر کمی وزیادتی کا مطلب صحیح نہیں ہو سکتا' البتہ زیادتی باعتبار مومن بہ کے تھی یا نورانیت وانشراح کی زیادتی تھی' جس کا انکار نہیں' حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دو قسم کے لوگ تھے' ایک وہ کہ اجمالی اسلام کو قبول کیا' پھر جب تکالیف ومصائب پیش آئے تو دل تنگی وکم حوصلگی کا ثبوت دینے لگے۔ دوسرے وہ کہ ایمان لانے کے بعد طرح طرح کے مصائب آنے پر اور زیادہ انشراح صدر کے ساتھ ایمان پر جم گئے' یہ ان کی ثابت قدمی اور استقامت ہی ان کے پہلے ایمان پر ایمان کی زیادتی تھی۔

۴۔ **وزدناھم ھدیً** اور بعد کی چار آیات' امام بخاری چونکہ ہدایت وتقویٰ کو باعتبار مصداق عین ایمان سمجھتے ہیں اس سے استدلال کیا' یہاں بھی جواب وہی ہے کہ یہ آیات اس وقت کی ہیں کہ مومن بہ کی تدریجی آمد ہو رہی تھی' لہٰذا ایمان وہدایت میں زیادتی ہو رہی تھی' یا باعتبار کیفیت کے زیادتی مراد ہو اور یہ ہمارے یہاں بھی مسلم ہے کہ عام لوگوں کا ایمان' صحابۂ کرام' جبریل ومیکائل اور انبیاء علیہم السلام جیسا نہیں ہے۔

---

[1] سلف کا مسلک کیا تھا؟:۔ حافظ ابو القاسم عبد اللہ الالکائی نے "شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعت" میں یہ قول نقل کر کے لکھا کہ یہی قول صحابہ میں سے حضرت عمرؓ' علیؓ' ابن مسعودؓ' ابن عباسؓ' ابن عمرؓ' ابو ہریرہؓ' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہم اور تابعین میں سے کعب الاحبار' عروہ' عطاء' مجاہد' عمر بن عبد العزیزؒ وغیرہ بہت سے نام لکھے' پھر ابن مبارک' اسحٰق بن ابراہیم' ابو عبید بن سلام' دارمی' ذیلی' ابو زرعہ' ابو حاتم' ابو داؤد وغیرہ کے نام لکھے" (عمدۃ القاری صفحہ ۱۲۶' معلوم ہوا کہ ایمان کی زیادتی وکمی کا نظریہ مکملات وغیرہ کے باعث تھا' صرف ایمان یا تصدیق سے متعلق نہ تھا بعد کے لوگوں نے نقل مذہب میں اختصار کر کے صرف یزید وینقص لکھنا شروع کر دیا اور اسی کو لالکائی نے "کتاب السنن" میں بھی وکیع' سعید بن عبد العزیز' شریک' ابو بکر بن ابی عیاش' عبد العزیز بن ابی سلمہ' حماد بن' ابو ثور' امام شافعی وامام احمد سے بھی نقل کیا ہے۔ (عمدہ صفحہ ۱۶۷)

پھر لکھا کہ امام نے فرمایا کہ یہ بحث لفظی ہے "اگر ایمان سے مراد تصدیق ہے تو زیادہ وکم نہ ہوگا' اور اگر طاعات بھی ہیں تو ہو سکتا ہے' پھر فرمایا کہ طاعات تصدیق کی تکمیل کرنے والی ہیں جو دلائل عدم قبول زیادۃ ونقص کے ہیں' وہ سب اصل ایمان کی طرف لوٹتے ہیں جو تصدیق ہے جو دلائل قبول پر دال ہیں وہ کامل سے متعلق ہیں یعنی ایمان مع اعمال کے' اور بعض متاخرین نے تصدیق کے قابل قوۃ وضعف ہونے پر قبول زیادۃ ونقص کو رکھا ہے۔ اور بعض محققین نے دو وجہ قبول زیادۃ ونقص کی قرار دی ہیں' ایک قوت وضعف (جو کیفیات سے ہیں) دوسرے کمیت کے اعتبار سے قبل تقرر شرائع کے زمانے کے لحاظ سے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱۶۸)

۵۔ فاخشو هم فزاد هم ایماناً یہاں ایمان سے مراد ثبات واستقامت ہے اس آیت میں واقعۂ بدر صغری کی طرف اشارہ ہے' علامہ عینی نے صفحہ ۱۲/۱۴۱ میں لکھا ہے کہ ابوسفیان جب غزوۂ احد سے شکست کھا کر لوٹنے لگا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگلے سال بدر کے میدان میں یہاں کا بدلہ چکایا جائے گا' حضورؐ نے فرمایا' بہت اچھا! ہم تیار ہیں انشاء اللہ تعالیٰ' جب وہ وقت آیا تو ابوسفیان نے نعیم بن مسعود اشجعی سے (جو عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے تھے) کہا کہ میں غزوۂ احد سے واپسی میں اس طرح کہہ آیا تھا اب اگر میں اپنے لوگوں کے ساتھ نہ جاؤں اور ادھر سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان بدر میں پہنچ گئے' تو اس سے ان کی جرأت وحوصلہ بہت بڑھ جائے گا' اور اصلی بات یہ ہے کہ یہ سال قحط کا ہے' لڑائی کے لیے نکلنا آدمیوں اور جانوروں کی ہلاکت کا مترادف ہے' اس لیے تم مدینہ جا کر ان لوگوں کا حوصلہ پست کرو' تا کہ وہ بھی میدان کا رخ نہ کریں' میں تمہیں اس کے صلہ میں دس اونٹ دوں گا۔

نعیم نے مدینہ منورہ پہنچ کر دیکھا کہ مسلمان جہاد کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں تو کہا کہ تم گذشتہ سال احد کے غزوہ میں اپنے گھروں میں تھے اور وہ لوگ اتنی دور سے آئے تھے پھر بھی تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا' اب تمہارا اتنی دور مقابلہ کے لیے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے' اگر اس طرح تم مقابلہ کے لیے جاؤ گے تو خیال ہے کہ تم میں سے کوئی بھی بچ کر نہ آسکے گا۔ یہ بات سن کر منافق تو کچھ متاثر ہوگئے' مگر پکے سچے مسلمانوں کے دلوں میں صبر وثبات اور جہاد وشہادت کا ذوق وشوق لہرے لینے لگا' جس سے ان کے نور ایمان میں اور بھی زیادہ قوت آ گئی' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ضرور نکلوں گا' خواہ میرے ساتھ ایک آدمی بھی نہ جائے (یہ پیغمبرانہ اولوالعزمی کی شان تھی' چنانچہ آپ ستر ۷۰ مجاہدین کے ساتھ بدر پہنچے۔ اس وقت حسبنا الله و نعم الوكيل ان کا وردزبان تھا' مال تجارت بھی ساتھ تھا وہاں پہنچ کر تجارت کا سامان اچھے منافع سے فروخت کیا اور اسی طرح بغیر کسی قتال وجدال کے سالمین غالمین واپس ہوئے' اور اپنے لوگوں کے ساتھ ابوسفیان مکہ معظمہ پہنچے تو مکہ والوں نے اس لشکر کو ''جیش السویق'' کا نام دیا اور کہا کہ تم تو ستو پینے کے لیے گئے تھے۔

۶۔ ومازادهم الا ایماناً و تسلیما میں ایمان سے مراد ذات خداوندی کی تعظیم واجلال ہے' یعنی اس ذات بے چون وچگوں کی عظمت وجلال کو اس طرح جاننا اور اس کا سکہ اپنے قلب پر بٹھانا کہ اس کی کامل اتباع وانقیاد نتیجۃً حاصل ہو' اور تسلیم کے معنی اس کی بات ماننا (عمل کے درجہ میں) یہ حضرت شاہ صاحب کی تعبیر ہے' اور فرمایا کہ اگر ایمان کا تعلق عقائد سے ہو تو وہ تصدیق قلبی والا ایمان ہے اور اگر اس کا تعلق ذات باری سے ہو تو وہ تصدیق قوی وانقیاد ظاہری ہے' جس کو تسلیم کہا جائے گا۔

اس آیت میں غزوہ خندق کی طرف اشارہ ہے جو ۵ھ میں پیش آیا' اس وقت مسلمانوں پر چاروں طرف سے یورش کی گئی تھی' کفار نے بارہ ہزار یا چوبیس ۲۴ ہزار کی تعداد میں پورے سامان حرب سے تیار ہو کر مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا تھا' اس وقت مدینہ منورہ میں مسلمان بمشکل چار ہزار ہوں گے۔ اور کفار کے مقابلہ میں میدان میں آنے والوں کی تعداد تو دو ہزار سے زیادہ نہ تھی ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ان میں خوف وہراس اور گھبراہٹ وہراس کی صورت پیدا ہونی چاہیے تھی مگر اس کے برعکس ان کے اندر ایمان وتسلیم اور استقلال واستقامت میں اضافہ ہوا۔ اور جب ان کی یہ کیفیت ہوئی تو حق تعالیٰ کی نصرت اور امداد بھی پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوگئی' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر مدینہ کی اس جانب خندق کھدوائی تھی جس طرف سے کفار مکہ کے حملہ کا خطرہ تھا' یعنی شمال ومغرب کی سمت' خندق کافی گہری اور چوڑی تھی۔ جس پر جگہ جگہ مسلمان جاں باز متعین کر دیے گئے تھے کہ دشمنوں کو آگے نہ بڑھنے دیں' ان کو خندق کو عبور کر کے مدینہ منورہ میں گھسنا بہت دشوار کر دیا تھا' اگر کوئی بہادر ہمت کر کے آگے بڑھنا بھی چاہتا تو محافظ دستے اس کو تیروں سے چھلنی کر دیتے تھے' ۲۸' ۲۹ روز تک کفار نے محاصرہ جاری رکھا' ان کی بہت تعداد تھی' کھانے پینے وغیرہ کے لمبے مصارف اور مسلسل ناکامیوں نے ان کی ہمت پست کر دی' مزید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمادی کہ یا اللہ! اپنے مخلص مومن بندوں کی مدد فرما اور کفار کو ایسی ہزیمت دے کہ پھر بار بار چڑھ دوڑنے کا حوصلہ ہی باقی

نہ رہے، چنانچہ ایسی زبردست آندھی آئی کہ کفار کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے خیمے اکھڑ اکھڑ کر دور جا پڑے سخت پریشان ہوئے اور سمجھے کہ بس اب قیامت ہی آگئی، اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

۷۔ **والحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان** امام بخاری نے یہ استدلال کیا ہے کہ خدا کے واسطے محبت اور بغض بھی ایمان کا جزو ہیں، جو کہ احوال میں سے اور اکثر غیر اختیاری ہوتے ہیں، لیکن یہ استدلال اس پر موقوف ہے کہ من کو تبعیضیہ سمجھا جائے، ہم کہیں گے کہ ابتدائیہ واتصالیہ ہے، جیسے **انت منی بمنزلة ھارون من موسے**'' میں ہے۔

۸۔ **کتب عمر بن عبد العزیز** الخ چونکہ آپ نے ایمان کے لیے فرائض، شرائع، حدود وسنن بتلائے، معلوم ہوا کہ ایمان ان سب سے مرکب ہے۔ یہ استدلال بھی ناقص ہے، کیونکہ اول تو ایمان کے لیے یہ خارجی چیزیں بتلائیں، یہ نہیں فرمایا کہ ایمان یہ سب امور ہیں، پھر استکمال کا لفظ بھی بتلا رہا ہے کہ یہ سب خارجی اوصاف ہیں، جن کا وجود ایمان کے لیے ضروری ہے۔ متممات نہیں فرمایا۔ جس سے جزئیت پر استدلال صحیح ہوتا۔

پھر یہ امر بھی پہلے واضح ہو چکا کہ ایمان کامل تو وہی ہے جو اعمال صالحہ اور احوال طیبہ سے مزین ہو، باقی نفس ایمان کی اصل حقیقت صرف وہی مرتبہ محفوظ (غیر مرکب) ہے جو امام صاحب وغیرہ کی تحقیق ہے۔

۹۔ **ولکن لیطمئن قلبی**۔ اس آیت سے استدلال حنفیہ کے لیے زیادہ موزوں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان نہ صرف کامل بلکہ اعلیٰ مراتب کمال میں موجود تھا، پھر اس میں زیادتی کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ **اولم تؤمن** اور **قال بلےٰ** سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ نفس ایمان حاصل تھا، اور مطالبہ زائد چیز کا تھا، جو خارجی کیفیات واحوال سے متعلق ہے۔

۱۰۔ **قال معاذ اجلس بنا نؤمن ساعة** یہاں مقصود صرف ایک ساعت کے لیے ایمان لانا نہیں ہے بلکہ حسب روایت حصن حصین ''**جددوا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ**'' تجدید واحضار ایمان مراد ہے، ظاہر ہے کہ ایمان کی نضرت وتازگی، اس کے حسن کی افزائش وبہار وغیرہ اصل ایمان کے علاوہ اوصاف ہیں۔

۱۱۔ **قال ابن مسعود "الیقین الایمان کلہ** یہاں لفظ کل سے استدلال کیا گیا ہے، کہ ایمان کے اجزاء ہیں، جب ہی تو کل کا اطلاق ہوا ہے، لہٰذا ایمان اجزاء سے مرکب ہوا، اس کی تائید روایت طبرانی سے بھی ہوتی ہے جس میں صبر کو نصف ایمان فرمایا ہے، لیکن اس کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ نفس ایمان کی پوری حقیقت تو یقین واذعان ہی ہے، جو تصدیق قلب ہے لہٰذا ایمان کی بساطت ظاہر ہوئی اور اشارہ اس طرف ہوا کہ یقین واذعان قلبی کے سوا دوسری سب چیزوں کا تعلق اسلام سے ہے کہ اسلام تمام اعمال و اخلاق حسنہ کا مقتضی ہے اور دین کا اطلاق ایمان واسلام دونوں پر آتا ہے۔ **ان الذین عنداللہ الاسلام** اور **رضیت لکم الاسلام دینا** اور مشہور حدیث جبرائیل میں فرمایا کہ ایمان واسلام دونوں کی تشریح آپ فرما چکے تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ یہ جبرائیل تھے، جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے، چنانچہ بغوی شافعی نے حدیث جبرائیل میں فرمایا کہ ایمان باطنی اعتقاد کا نام ہے اور اسلام ظاہری اعمال کا اور ان دونوں کا جامع دین ہے اور خدا کے یہاں دین وہی مرضی ومقبول ہے جو ایمان واسلام دونوں کو شامل ہو۔ (نووی شرح مسلم صفحہ ۲۵ انصاری دہلی)

امام نووی نے صفحہ ۲۶ میں یہ بھی لکھا کہ ہمارے اصحاب متکلمین میں سے محققین کا یہ قول ہے کہ نفس تصدیق میں کمی وزیادتی نہیں ہوئی البتہ ایمان شرعی میں کمی وزیادتی، ثمرات ایمان یعنی اعمال کے سبب ہوتی ہے اور اس صورت سے ایمان حسب ظواہر نصوص واقوال سلف کی ایمان بمعنی لغوی وایمان حسب اصطلاح متکلمین کے ساتھ مطابقت ہو جاتی ہے پھر امام نووی نے لکھا ہے کہ اگرچہ فی نفسہ متکلمین کی بات تو اچھی ہے، مگر ہماری سمجھ میں ایک بات یہ بھی آتی ہے کہ نفس تصدیق میں بھی کثرت نظر وفکر اور ادلہ وافرہ کے باعث زیادتی ہو سکتی ہے اور اسی لئے صدیقین کا ایمان دوسروں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

ہماری طرف سے اس استدلال کا جواب صاف ہے کہ کیفیت کے اعتبار سے ایمان میں زیادتی و کمی ہم بھی مانتے ہیں۔ہمیں اس کا انکارنہیں‘اسی لئے کسی مومن کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے ایمان کو صدیقین یا ملائکہ کے جیسا کہے‘ کیونکہ ان کے ساتھ کیفیات میں کوئی برابری نہیں ہو سکتی البتہ کم میں برابری ہے کہ جن چیزوں پر ان سب کو ایمان رکھنا ضروری ہے‘ہمیں بھی ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے دوسرے یہ کہ ایمان تصدیق قلبی کا ایک خاص درجہ ہے جو بسیط ہے اس میں کمی وبیشی نہیں ہے‘ کمی کی صورت شک وریب والی ہے‘اس لئے ایمان نہیں اور زیادتی کی صورتیں کیفیات کے لحاظ سے ہیں اس۔لئے وہ بھی نفس ایمان سے زائد ہیں۔معتزلہ اعمال کو شرط صحت ایمان و متحمات قرار دیتے ہیں‘ محدثین شرط کمال ایمان ومکملات کہتے ہیں‘ مرجئہ اعمال کو کوئی درجہ نہیں دیتے‘ حنفیہ و متکلمین اعمال کو ضروری لازمی‘ شرط دخول اولی جنت اور بطور مقویات وحافظات مکملات[1] ایمان سمجھتے ہیں۔متمات نہیں کہتے۔

مراتب ایمان واعمال پر دوسری نظر

تمام دلائل شرعیہ اور مذاہب اہل سنت کی روشنی میں اعمال صالحہ کو مقویات وحافظات یا مکملات ثانوی ہی کا درجہ دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے‘جو حنفیہ و متکلمین فقہاء ومحدثین احناف کا مختار ہے‘اس کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ علماء نے روح کی غذا علوم نبوت کو قرار دیا ہے‘ اعمال کو نہیں‘ طاعات کو روح کے لیے بطور مقوی ومحافظ صحت ادویہ اور معاصی کو بطور ادویۂ مہلکہ وبد پرہیزیوں کے قرار دیا ہے۔پھر قلب اشرف اعضاء انسانی ہے۔جس کے صلاح وفساد پر بفحوائے حدیث صحیح تمام جسم کا صلاح وفساد موقوف ہے۔اس سے جو امور متعلق ہیں‘ان کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے‘ پھر ان میں سے ایمانیات وعقائد کا درجۂ اول ہے اور اخلاق وملکات فاضلہ کا درجہ ثانوی ہے‘اس کے بعد لسان کو دوسرے جوارح پر شرف ہے تو اس سے تمام کلمات طیبات‘ تلاوت کلام اللہ‘ دعاء‘ ذکر واستغفار‘ تعلیم وتعلم‘ درود وسلام وغیرہ متعلق ہوئے اس کے بعد دوسرے جوارح کے اعمال کا درجہ ہے‘ البتہ بعض اعمال فرض وواجب ہونے کی حیثیت سے افضل ہوجاتے ہیں (کہ طاعت قافلہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد بھی ایک فرض کو نہیں پہنچتی) یا جس عبادت میں مختلف قسم کی طاعات جمع ہوں وہ دوسری عبادات سے افضل ہوگی۔مثلاً نماز۔

---

[1] حضرت علامہ کشمیریؒ کی خاص تحقیق: یہاں مکملات کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کی ایک نہایت اہم تحقیق قابل ذکر ہے اس کو بھی پیش نظر رکھئے‘ فرمایا امام بخاری اور شوافع کے یہاں ایمان ایک مجموعہ مرکب ہے۔جس کے اجزاء اعمال بھی ہیں‘ لیکن یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کے بعض اجزاء وعقائد تو ایسے ہیں جن کے نہ ہونے سے ایمان ختم ہوجاتا ہے اور بعض اجزاء (اعمال وغیرہ) ایسے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے بھی ایمان باقی رہتا ہے اور ان اجزاء کو وہ اجزاء مہملہ مانتے ہیں۔اسی طرح نماز میں اختلاف ہے کہ شوافع اس کو مجموعہ ارکان وسنن ومستحبات۔کہتے ہیں‘ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے نماز نہ ہوگی اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے بھی نماز درست ہے‘ حنفیہ نے کہا کہ نماز مجموعہ ارکان ہے‘ فرائض اجزاء مقومہ ہیں اور سنن ومستحبات اس کے اجزاء مکملہ غیر مقومہ ہیں۔

پس اگر نزاع کا اصل محور اس امر کو قرار دیں کہ آیا کوئی حقیقت چند ایسے اجزاء سے مرکب ہوسکتی ہے یا نہیں جن میں سے بعض اجزاء کے نہ ہونے پر بھی کل کا اطلاق صحیح ہوسکتا ہو تو اس صورت میں تو شافعیہ کا نظریہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایسی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن کے بعض اجزاء موجود نہ ہونے پر بھی ان پر کل کا اطلاق ہوتا ہے جیسے نماز وغیرہ اور اگر نزاع کا اصل محور اس امر کو مانیں کہ کسی شئی کے مکملات ہمیشہ اس کے صرف اجزاء ہی نہ ہوں گے بلکہ غیر اجزاء بھی ہوسکتے ہیں‘ تو حنفیہ کا نظریہ زیادہ صواب ہے کیونکہ ایمان پر اعمال کے عطف سے (جو تغائر کا مقتضی ہے) یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اعمال ایمان کے لئے اجزاء نہیں‘ اور پھر بھی مکملات ہیں‘ لہٰذا حنفیہ کے ہی مختار کو ترجیح ہوئی کہ ایمان مجموعہ مرکب نہیں ہے۔

البتہ اب یہ دیکھا جائے گا کہ ''ایمان کا اطلاق جو اعمال پر احادیث میں بکثرت ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ تصدیق پر اطلاق اصالۃً ہے اور اعمال پر تبعاً تو یہ توجیہ حنفیہ کی تائید کرتی ہے اور اگر کہا جائے کہ دونوں پر اطلاق بطور جزو کل کے ہے تو یہ بات شافعیہ کے موافق ہوگی۔راقم الحروف کے نزدیک اجزاء شئی کو مکملات اولیہ اور غیر اجزاء کو مکملات ثانویہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

نوٹ: حضرت شاہ صاحبؒ کی مذکورہ بالا تحقیق سے (اور اس قسم کے آپ کے فیصلے آئندہ بھی بہ کثرت آئیں گے) آپ کی شان انصاف اور دقت نظر پوری طرح نمایاں ہے اور یہی شان ہمارے دوسرے اکابر محققین حنفیہ کی بھی ہے۔نفعنا اللہ بعلومھم الممتعۃ۔

مذکورہ بالا نظریہ کی تائید حافظ ابن تیمیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے، جو ایمان و اسلام کا فرق بتاتے ہوئے انہوں نے کتاب الایمان صفحہ ۱۴۹ میں لکھا ہے" فرق یہ ہے کہ اسلام دراصل عمل ہی عمل ہے اور ایمان ایک علم ہے، عمل یہاں تابع ہے اس کے بعد اگر احادیث پر ایک اجمالی نظر ڈالو گے تو اس سے بھی تم کو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی اس فرق کی رعایت کی گئی ہے یعنی اسلام کا تعلق ظاہر سے اور تصدیق کا باطن سے قرار دیا گیا ہے"۔

مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ" اسلام ظاہر ہے اور ایمان دل میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ" مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے اور مومن وہ ہے، جس کی طرف سے لوگ اپنے جان و مال کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں"۔

ان تصریحات سے حنفیہ کے موقف کی پوری پوری تائید ہوتی ہے اور ہر امر کو اپنے اپنے صحیح مرتبہ و مقام میں رکھنے کی عملی شکل سامنے آجاتی ہے، جس سے ائمہ حنفیہ و متکلمین کی دقت نظر و اصابت رائے کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

۱۲۔ **قال ابن عمر لایبلغ العبد حقیقة التقویٰ** الخ بعض روایات میں حقیقت الایمان آیا ہے، اور امام بخاری بھی چونکہ ایمان و تقویٰ کو ایک ہی سمجھتے ہیں اس لئے استدلال درست ہو گیا کہ بقول ابن عمرؓ حقیقت ایمان کا حصول اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ایسی باتوں کو بھی ترک نہ کر دیا جائے جو دل میں کھٹکتی ہوں۔ یعنی معمولی مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب چاہئے جو تقویٰ کا اعلیٰ مرتبہ ہے گویا امام بخاری ترقی کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بڑے اعمال ہی نہیں چھوٹے عمل بھی ایمان کے اجزاء ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کہ امام بخاری کی بات تو ٹھیک ہو جائے گی، مگر مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد حقیقت ایمان تک رسائی سے محروم قرار پائے گی، یہ وہی بات ہے کہ امام بخاری کے مزاج میں یک طرفہ رجحان کا مادہ زیادہ تھا جس کی وجہ سے افراط و تفریط تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور اعتدال کی بات وہی ہے جو امام صاحب وغیرہ نے اختیار فرمائی۔

۱۳۔ **قال مجاهد شرع لکم من الدین** الخ امام بخاری نے اس طرح استدلال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے اب تک دین وہی ایک ہے، اگرچہ جزئیات و فروع بدلتے رہے ہیں اور جب دین کے اجزاء اصول و فروع رہے ہیں تو ایمان کے بھی ہوں گے۔ کیونکہ امام بخاری دین و ایمان کو ایک سمجھتے ہیں۔

یہاں بھی غلطی دونوں کو ایک سمجھنے سے ہوئی ہے، ہم نے امام نووی سے نقل کیا تھا کہ دین کا اطلاق ایمان و اسلام دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ اور اسلام کی حقیقت میں ہمارے نزدیک بھی انقیاد ظاہری کے تمام اعمال داخل ہیں، لہٰذا ایمان جس میں بحث تھی، اس کے لیے یہ استدلال بے محل ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی وقت درس فرمایا تھا کہ امام بخاری کا یہ استدلال بے محل ہے۔ اور امام بخاری کے اس استدلال کے مقابلہ میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ **واللہ اعلم و علمه اتم**

۱۴۔ **قال ابن عباسؓ شرعة و منها جا**" ہر ایک کے لیے ہم نے چھوٹے اور بڑے راستے مقرر کئے، یعنی ہر امت کے لیے منہاج (بڑا راستہ اصول و عقائد کا) تو ایک ہی رہا مگر شریعتیں امتوں اور زمانوں کے مناسب حال بدلتی رہیں، امام بخاری نے استدلال کیا کہ فروع و شرائع کے اختلاف کے باوجود دین و منہاج ایک ہی رہا ہے، جس کے تحت عملی شرائع ہیں، یہاں بھی جواب حسب سابق ہے۔ کہ منہاج و دین یا سبیل و شرعت میں بحث نہیں ہے بلکہ ایمان میں ہے۔ جس سے استدلال ہٹ گیا۔ آپ اگر سب کو ایک کہنے لگیں تو یہ بات دوسروں پر تو حجت نہیں ہو سکتی۔ **کما لا یخفی۔**

۱۵۔ **ودعاء کم ایمانکم**"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دعاء کی تفسیر ایمان سے ہوئی، حالانکہ وہ عمل ہے، معلوم ہوا کہ ایمان میں عمل داخل ہے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے نزدیک آیت مذکورہ کو محل نزاع سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ وہ کافروں کے بارے میں ہے، پوری آیت آخر سورت فرقان میں ہے اور ترجمہ یہ ہے۔ کہہ دیجئے! میرے رب کو تمہاری پروا نہیں اگر تم اس کو نہ پکارو، سو تم جھٹلا چکے اب آگے کو ہوتی

ہے مڈبھیڑ (یعنی کافر جو حق کو جھٹلا چکے، یہ تکذیب عنقریب ان کے گلے کا ہار بنے گی، اس کی سزا سے کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا' آخرت کی ابدی ہلاکت تو ہے ہی، دنیا میں بھی اب جلد مڈبھیڑ ہونے والی ہے، یعنی لڑائی جہاد، چنانچہ "غزوۂ بدر" میں اس مڈبھیڑ کا نتیجہ دیکھ لیا"۔) (فوائد علامہ عثمانیؒ)

علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ حضرت ابن عباس کو تفسیر **و دعاء کم ایمانکم** کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو حق تعالےٰ نے خبر دی "ان کی خدا کو ضرورت نہیں، اسی لیے ان کو ایمان کی دولت سے نہیں نوازا، ورنہ جس طرح مومنوں کے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا تھا ان کے لیے بھی بنا دیتا۔ پھر فرمایا کہ تم تو حق کی تکذیب کر چکے ہو، پھر اس کا نتیجہ بھی جلد دیکھ لو گے (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۲۰/۳ مطبعۃ مصطفےٰ محمد)

حضرت شاہ صاحب کا جواب

مذکورہ بالا تشریحات سے آیت مستدلۂ امام بخاری کا کفار کے حق میں ہونا واضح ہو چکا اس کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحب کی تحقیق پڑھیئے، فرمایا کہ اگر دعا کو اپنے معنی میں رکھا جائے۔ تو اس سے مراد یہاں عرفی دعا نہیں بلکہ دلوں کی پکار اور خدا کی طرف توجہ قلبی و تضرع مراد ہے، جو بعض مرتبہ سخت مصائب و پریشانیوں میں گھر کر کفار سے بھی واقع ہوا ہے، جیسے قرآن مجید میں آیا' **واذا غشیھم موج کا لظلل دعوا اللہ مخلصین لہ الدین** '(لقمان) مطلب یہ ہوا کہ حق تعالےٰ تمہارا خیال اس لیے فرمالیتے ہیں کہ تم اس کو پکار لیتے ہو، فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ دنیا میں کفار کی دعاء بھی قبول ہوتی ہے، اسی طرح ان کے استغفار سے بھی دنیا میں ان کو نفع ہو سکتا ہے، مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ابن جدعان (جو ایام جاہلیت میں مر گیا تھا) کیا اس کے صدقات سے اس کو نفع پہنچا ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا "نہیں' کیونکہ اس نے کبھی اپنی زبان سے خدا کی مغفرت و رحمت طلب نہیں کی تھی'۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس سے میں سمجھا کہ استغفار سے کفار کو بھی نفع پہنچتا ہے، مگر دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔

اور اگر دعا سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق ایمان لیا جائے تو حق تعالےٰ یہ تنبیہ فرما رہے ہیں کہ خدا جس چیز کا لحاظ و خیال فرماتے ہیں، وہ عرفی دعاء یا پریشانی و مصیبت سے گھبرا کر اس کو پکارنا نہیں، بلکہ ایمان ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی رحمت خاصہ مومنوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اگر ایمان نہیں تو وہ خصوصی فضل و رحمت کا معاملہ بھی نہیں، غرض حضرت شاہ صاحب کی رائے میں امام بخاری کا یہ استدلال بے محل ہے اس لیے کہ بحث ایمان شرعی اور مومنین کے ایمان میں ہے، اور یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر امام بخاری کے استدلال کو برمحل کہیں گے اور تفسیر ابن عباس کی مدد سے دعاء کو ایمان یا جزو ایمان قرار دیں گے جس طرح اور جگہ امام بخاری نے استدلال کیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہو جائے گا کہ خاص اس مقام میں دعاء کفار کو ایمان یا ایمان کا جزو سمجھیں تو ایمان کی حقیقت کس قدر نیچے گر جائیگی کہ اس کا ایک جزو یا فرد مستحقین عذاب کفار کی تکذیب کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے، اور پھر ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ امام بخاری اپنے یک طرفہ رجحان کے غلو اور بہاؤ میں اتنی دور تک چلے جاتے ہیں جو ان کی جلالت قدر و رفعت شان علم کے لیے موزوں نہیں۔

امام صاحب کی دقت نظر

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ امام صاحب رضی اللہ عنہ نے جو ایمان شرعی کا ایک محفوظ مرتبہ سمجھا ہے، جو ہر قسم کے شک و شبہ اور تکذیب سے بالاتر ہو' اس سے کم درجہ اگر کوئی ہے تو وہ کفر ہے ایمان ہرگز نہیں، پھر وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایسا ایمان و یقین جن ایمانیات و عقائد سے متعلق ہونا چاہیئے' ان کو ماننے میں اولین و آخرین' ادنیٰ مومنین سے لے کر انبیاء و مرسلین تک سب برابر ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مقرب فرشتوں یا برگزیدہ نبیوں کا ایمان زیادہ چیزوں پر ہوتا ہے، اور کم درجہ کے مسلمانوں کا کم چیزوں پر ہوتا ہے' اس کے بعد امام صاحب وغیرہ کو اس امر سے انکار ہرگز نہیں کہ سب کے مراتب یکساں نہیں، فرق مراتب سے جو کیفیات ایمان کے باعث ہوتی ہے بڑے سے بڑا

فرق ہوتا ہے حتیٰ کہ صرف حضرت صدیق اکبرؓ کا ایمان ساری امت کے ایمانوں سے زیادہ وزنی مانا گیا ہے، ہم یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ سلف سے جو مقولہ امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ ایمان قول وعمل، اور کم وزیادہ ہوتا ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں سے ملا، سب کا قول یہی تھا اور اپنے گہرے تاثر کا اظہار امام بخاریؒ نے اس سے بھی ظاہر کیا کہ میں نے

اپنی کتاب میں کسی ایسے شخص کی روایت نہیں لی۔ جو اس قول مذکور کا قائل نہیں تھا، ہم حوالوں سے لکھ آئے ہیں، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری میں ارشاد فرمایا تھا کہ امام بخاری نے اس جملہ کو پورا نقل نہیں کیا۔ اور فرمایا کہ قول وعمل تو اس زمانے کے مقتضاء حال کے مطابق تھا کہ فساق وفجار نے ترک عمل وارتکاب کبائر کے لیے مرجئہ کی آڑ میں بہانے بنالئے تھے، اس کی روک تھام کے لیے قول وعمل اہل حق کا شعار بن گیا تھا، دوسرا جملہ یزید وینقص والا یہ تھا کہ طاعات سے ایمان میں زیادتی اور معاصی سے نقص آتا ہے، جس کو امام بخاری نے مختصر کردیا، تو طاعات سے زیادتی اور معاصی سے نقص کا کیفیت کے اعتبار سے امام صاحب وغیرہ کو بھی انکار نہیں، بلکہ ان سے اتنی بات تو نقل بھی کی گئی ہے کہ طاعات سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے، اور کوئی نقل اس قسم کی خود امام صاحب سے نہیں ملی کہ ایمان کے طاعات سے زیادہ ہونے اور معاصی سے ناقص ہونے کا انکار فرمایا ہو، اگر ایسا ہوتا تو یہ بات ضرور قول سلف کے خلاف وضد ہوتی، غرض اعمال صالحہ سے ایمان کے اندر نورانیت میں اضافہ اور انبساط وانشراح وغیرہ کیفیات پیدا ہونے سے حنفیہ کو بھی انکار نہیں ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

حافظ عینی کے ارشادات

آخر میں اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے راس المحققین، عمدۃ المحدثین، حافظ بدرالدین عینی کی وجوہ ثمانیہ کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

۱۔ اقرار لسانی ایمان کا رکن نہیں ہے، کیونکہ اس کا وجود، وجود تصدیق قلبی کے لیے یا عدم اس کے عدم کے لیے دلیل قطعی نہیں ہے البتہ اجراء احکام ظاہری کے لیے شرط ہے، کیونکہ ان احکام کا مدار ظاہر پر ہی ہے، پس بدوں اقرار لسانی بھی خدا اور بندہ کے مابین ایمان کا تحقق ہوجاتا ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ ''دوزخ سے وہ شخص بھی نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہوگا''، تو ایسا شخص جس کو خدا کی پوری معرفت حاصل ہوگئی اور تمام عقائد پر پختگی بھی اس کو حاصل ہے اور اس کا دل نور ایمان سے معمور ہوچکا ہے پھر محض زبان سے کلمہ نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کو غیر مومن کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اقرار لسانی ایمان میں معتبر نہ ہوا اور یہ خلاف اجماع ہے، کیونکہ اس امر پر اجماع ہوچکا ہے کہ وہ معتبر ہے'' خلاف صرف اس میں ہے کہ رکن ہے یا شرط جواب یہ ہے کہ امام غزالی نے اجماع کا انکار کیا ہے، اور شخص مذکور کے مومن ہونے کا حکم کیا ہے اور باوجود قدرت یا وقت ملنے کے اقرار لسانی نہ کرنے کو منجملہ معاصی قرار دیا ہے اور بعض حالات میں ترک اقرار بحالت اختیار کا جواز بھی ان کے یہاں مفہوم ہوتا ہے۔

۲۔ اعمال جوارح ایمان میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ آیات میں عمل صالح کو ایمان سے الگ کرکے عطف کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ اگر وہ ایمان میں داخل تھے، تو تکرار بے فائدہ ہوا۔

۳۔ آیات قرآنی میں ایمان کے ساتھ ضد عمل صالح کو ذکر کیا گیا ہے جیسے **وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا الایۃ** حالانکہ ایک چیز کو اس کے جزو کی ضد کے ساتھ ملانا درست نہیں ہے، معلوم ہوا کہ عمل صالح ایمان کا جزو نہیں ہے۔

۴۔ آیت **الذین آمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم** میں ظلم سے مراد ارتکاب محرمات ہیں، اگر طاعت ایمان کا جزو ہوتی تو ظلم و ایمان سے خود ہی منفی ہوتا، کیونکہ ضد تجزء الشیٔ اس سے منفی ہوا کرتا ہے، ورنہ اجتماع ضدین لازم آئے گا۔ پس ایسی صورت میں **و لم یلبسوا**

ایمانهم بظلم کا عطف **الذین آمنوا** پر تکرار بے فائدہ ہوا۔

۵۔ حق تعالیٰ نے بہت سی آیات میں ایمان کو صحت اعمال کے لیے شرط قرار دیا' جیسے **واصلحوا ذات بینکم و اطیعوا اللہ ورسولہ ان کنتم مومنین ۔ و من یعمل من الصالحات و ھو مومن۔** وغیرہ اور قاعدہ ہے کہ شرط شئی' اس کی ماہیت وحقیقت سے خارج ہوتی ہے۔

۶۔ حق تعالیٰ نے بندوں کو وصف ایمان کے ساتھ خطاب کیا' پھر ان کو اعمال بجالانے کے احکام دیئے جیسے کہ آیات صوم وصلوٰۃ ووضوٗ میں' اس سے معلوم ہوا کہ عمل مفہوم ایمان سے خارج ہے' ورنہ تحصیل حاصل کی تکلیف لازم آئے گی۔

۷۔ حدیث جبریل میں ایمان کے سوال پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تصدیق پر اکتفا فرمایا کہ فلاں فلاں باتوں پر ایمان لاؤ اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ یہ جبرائیل تھے جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے' پس اگر ایمان میں تصدیق کے علاوہ اعمال وغیرہ بھی داخل تھے' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کیوں بیان نہیں فرمایا' اور جبریل علیہ السلام نے بجائے تصدیق کے اصلاح کیوں نہیں دی؟ دین سکھانے آئے تھے' تو ایسے مغالطہ والی بات کو صاف نہ کرتے' یہ کیونکر ممکن تھا؟

۸۔ حق تعالیٰ نے مومنین کو توبہ کا حکم فرمایا **یایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا و توبوا الی اللہ جمیعا ایھا المومنون** جس سے معلوم ہوا کہ ایمان معصیت کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے' حالانکہ کوئی چیز اپنے جز کی ضد کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۲۴)

اگر کہا جائے کہ حدیث میں **لا یزنی الزانی حین یزنی و ھو مومن** آیا ہے تو حدیث ہی میں "**من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق**" بھی وارد ہے۔ نیز حدیث میں ہے کہ جو توحید ورسالت کا اقرار کرے اس کو جنت سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے تاہم اہل حق اہمیت وفرضیت اعمال اور ترک اعمال وارتکاب کبائر پر استحقاق عذاب ومحرومی دخول اولی جنت کے قائل ہیں' اور فرقۂ باطلہ مرجہ ان امور سے منکر ہے' کہتا ہے کہ ایمان کی موجودگی میں ارتکاب معصیت یا ترک اعمال پر کوئی موخذہ نہیں ہوگا **واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم**

۷۔ **حدثنا عبید اللہ بن موسیٰ قال انا حنظلۃ بن ابی سفیان عن عکرمۃ بن خالد عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علیٰ خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتآء الزکوٰۃ والحج و صوم رمضان۔**

ترجمہ:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس امر کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا۔ زکوٰۃ ادا کرنا' حج کرنا' اور رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح:۔ اسلام کو مع ارکان خمسہ کے خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح ایک خیمہ کو قائم رکھنے کے لیے ایک عمود وقطب (درمیانی بانس یا دوسری مضبوط ومستحکم لانبی لکڑی) کا ہونا ضروری ہے' جس پر پورا خیمہ قائم ہوجاتا ہے اور اس کے پھیلاؤ کو قائم رکھنے اور تند وتیز ہواؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے چاروں طرف اوتاد (کھونٹے) گاڑ کر اطناب (رسیوں) سے باندھ دیا جاتا ہے' اور اس کی تکمیل ہوجاتی ہے اسی طرح اسلام کو ایک خیمہ سمجھئے' جس کا عمود وقطب' شہادت توحید ورسالت یا ایمان وتصدیق قلبی ہے۔ اور اس کے دوسرے تمام شعبے' اعمال' اخلاق' وغیرہ بطور اوتاد واطناب ہیں کہ یہ سب مکملات ایمان اور مقویات وحافظات ہیں چنانچہ حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے کسی جنازہ پر اجتماع کے موقعہ پر مشہور شاعر فرزدق سے فرمایا کہ تم نے اس مقام کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ انہوں نے کہا اتنے برسوں سے شہادت توحید پر قائم ہوں' حضرت حسنؓ نے فرمایا:۔ یہ تو عمود ہے اطناب کہاں ہیں؟ یعنی اعمال صالحہ (کذا فی المرقاۃ)

اس کے علاوہ حدیث معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی تائید ملتی ہے' جس کو ترمذی' نسائی' امام احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ غزوہ تبوک کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ ساتھ نکلے' راستہ میں ایک تنہائی کا موقع پا کر معاذ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ

عمل دریافت کیا جو جنت میں لے جائے' آپ نے فرمایا'' دین اسلام کا راس رئیس عمل تو شہادت توحید و رسالت ہے' پھر جس عمل سے دین کی بندش مضبوط و مستحکم ہوتی ہے وہ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اس کے اونچے عملوں میں سے سب سے اوپر اور چوٹی کا عمل خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے' پھر آخر میں فرمایا کہ فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر کوئی نیکی نہیں'' ایک حدیث طبرانی وطیالسی کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے سوال فرمایا' تم جانتے ہوٗ ایمان کو تھامنے والے دستوں میں سب سے زیادہ مضبوط ہینڈل (دستہ وعروہ) کون سا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا'' نماز'' فرمایا نماز بہت اچھی ہے مگر اس کا دائرۂ عمل دوسرا ہے' پھر عرض کیا'' روزہ'' آپ نے پھر اسی طرح فرمایا' صحابہؓ نے جہاد کا ذکر کیا' اس پر بھی آپ نے اسی طرح فرمایا' پھر فرمایا' ایمان کے عروں میں سے سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم عروہ خدا ہی کے لیے دوستی اور خدا ہی کے لیے دشمنی ہے اور اسی کی وجہ سے کسی سے محبت کرنا اور اسی کے لیے کسی سے بغض رکھنا''۔

اس قسم کی تمام احادیث سے واضح ہے کہ ایمان کی تکمیل' حفاظت و استحکام کے لیے سارے اعمال کام دیتے ہیں یہ نہیں کہ خود ایمان کی جنس سے یہ سب اعمال جوارح ہیں' یا اس کے اجزاءِ مقومہ یا مکملہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

پھر اگر کہا جائے کہ ایمان و اسلام کے تو ۷۰'۷۷ تک شعبے ہیں' یہاں صرف چار کا ذکر کیوں کیا گیا تو ملا علی قاریؒ نے جواب دیا۔

کہ ان میں سے اہم ترین ارکان کا ذکر کر دیا گیا ہے' علامہ عینی نے فرمایا کہ عبادات دو قسم کی ہوتی ہیں قولی جیسے اداء کلمہ شہادت' یا غیر قولی اور وہ بھی دو قسم کی ہے' ترکی جیسے صوم' یا فعلی اور بھی دو قسم ہے۔ بدنی جیسے نماز' یا مالی جیسے زکوٰۃ' یا بدنی و مالی دونوں کا مجموعہ جیسے حج' اس طرح ہر قسم کی عبادات کی طرف اشارات فرما دیئے گئے۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ ایک خدائے **وحدہ لا شریک** کے سامنے عبادات کے لیے سرنگوں ہو جانا' اب اگر دین اسلام کا تجزیہ کرو تو اس میں چند قسم کے احکام پاؤ گے۔

۱۔ وہ احکام جو سب پر یکساں واجب ہیں۔

۲۔ وہ احکام جو خاص خاص افراد سے متعلق ہیں' پہلی قسم میں ایک بڑا حصہ صرف فرض علی الکفایہ ہے کہ ہر شخص پر واجب نہیں' جیسا کہ جہاد' امر بالمعروف نہی عن المنکر' امارت' حاکم' قاضی' مفتی' شہادۃ وغیرہ ان سب کا تعلق خاص مصالح اور عارضی اسباب سے وابستہ ہے' فرض کر لو اگر یہ مصالح ہماری نقل و حرکت کے بغیر حاصل ہو جائیں تو یہ احکام واجب نہیں رہتے' اسی طرح حدود وغیرہ کے ابواب ہیں ان کا تعلق بھی چند جرائم کے ساتھ ہے' اگر اس کا انسداد ہو جائے تو ان ابواب کی حاجت بھی نہیں رہتی' دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسا کہ قرض کی ادائیگی غصب وعاریت' ودیعت و امانت وغیرہ تمام ابواب انسانوں کے حقوق کے تحفظ اور مظلوم کی دادرسی کے لیے ہیں اگر صاحب حق معاف کر دے تو یہ ابواب بھی معطل ہو جاتے ہیں صلۂ رحمی' حقوق زوجیت' حقوق اولاد پڑوسی' شریک' فقیر وغیرہ ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص افراد سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں اسی طرح شریعت کے بقیہ ابواب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال جایئے اور غور کیجئے کہ اب وہ کون سے احکام ہیں جو ہر فرد پر واجب ہیں اور کسی وقتی مصلحت پر بھی مبنی نہیں' اور انسان کے انقیاد ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت بھی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہی مبانی خمسہ ہیں' اسی لیے حدیث مذکور میں صرف ان پانچ ہی کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ (کتاب الایمان۔ صفحہ ۱۴۶'۱۲۶)۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ توحید کی دعویٰ دار تو دنیا کی اکثر قومیں ہیں' اور ایک قسم کا ناقص اقرار توحید کچھ مذاہب میں پایا بھی جاتا ہے مگر مکمل صحیح وخالص توحید جو توحید الوہیت' توحید ربوبیت' اور توحید صفات سب پر شامل ہے' صرف مذہب اسلام میں پائی جاتی ہے' اور وہی راس الطاعات' لب الاعتقادات' ام العبادات' اور راس القربات ہے' پھر مسلمانوں میں عقائد و اعمال کی زیادہ صحیح تعبیر اہل سنت والجماعت میں فروعی مسائل میں حق وانصاف ائمۂ احناف کے ساتھ اور موجودہ دور کے مسائل میں حق واعتدال علماء دیوبند کی طرف ملے گا۔ واللہ اعلم۔

''توحید باری تعالیٰ'' پر بہت سے دلائل عقلی ونقلی قائم ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات میں بھی دلائل عقلیہ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے' مثلاً آیت سورۂ انبیاء **لو کان فیهما الهة الا الله لفسدتا** یا آیت سورۂ مومنون **و ما کان معه من اله اذالذهب کل اله بما خلق و لعلا بعضهم علی بعض** اس برہان کو ''برہان تمانع'' کہا جاتا ہے۔ جس کی بہترین توضیح وتقریر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے ''تقریر دلپذیر'' میں کی ہے' اوراس کا دلنشین خلاصہ'' حضرت علامہ عثمانیؒ نے فوائد صفحہ ۴۱۹ میں حسب ذیل کیا ہے:۔(اس میں ہم نے معمولی تصرف کیا ہے)

''عبادت کامل تذلل کو کہتے ہیں جو صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے' جواپنی ذات وصفات میں ہرطرح کامل ہو' اسی کو ہم اللہ یا خدا کہتے ہیں' اس کو ہم تمام عیب ونقائص سے پاک سمجھتے ہیں' وہ نہ کسی حیثیت سے ناقص ہے نہ بے کار ہے' نہ عاجز ہے نہ مغلوب کوئی اس کے کسی کام میں کسی وقت بھی روک ٹوک نہیں کرسکتا' وہ مختار مطلق ہے۔(**یفعل ما یرید ' یفعل ما یشاء' فعال لما یرید** اور **لا یسئل عما یفعل** اس کی شان ہے' اب اگر فرض کرلیں کہ آسمان وزمین میں دوخدا ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ دونوں اسی شان کے ہوں گے پھر دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اورعلویات وسفلیات کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ بگاہ ان کے باہم اختلاف بھی ہوجاتا ہے' اتفاق کی صورت میں دواحتمال ہیں یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا ہے اس لئے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں' اور اگر ایک تنہا سارے عالم کا کامل طور پر انتظام کرسکتا ہے تو دوسرا بیکار ٹھیرا اس کو ماننے سے کیا فائدہ؟ خدا کو وجود تو اسی لیے ماننا پڑا ہے کہ اس کے ماننے بغیر چارہ ہی نہیں اور اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں ایک مغلوب ہوکر اپنے ارادہ وتجویز کو چھوڑ بیٹھے گا تو وہ خدا نہ رہا' اور یا دونوں مساوی ومتوازی طاقت سے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ارادہ وتجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے ۔اول تو معاذ اللہ خداؤں کی رسہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہ ہوسکے گی' اور موجود بھی ہوگئی تو پھر اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے گی' غرض آسمان وزمین میں اگر دوخدا ہوتے تو ان کا یہ مضبوط ومحکم نظام کبھی کا درہم برہم ہوجاتا۔

حضرت علامہ عثمانیؒ نے اس تحقیق کا حوالہ صفحہ ۴۵۱ میں دیا ہے' مگر سورۂ انبیاء کی جگہ سورۂ حج کا حوالہ غلطی کتابت یا طباعت سے درج ہو گیا ہے' توحید کے بعد عبادات وطاعات کا درجہ ہے' ان کی حقیقت' ان کے مقصد' اوران کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کے لیے بھی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی دلنشیں اور جامع مانع تحریر سے بہرہ اندوز ہوجایئے۔

عبادت درحقیقت' عبدیت اور بندگی کی ایک عملی ٹریننگ ہے' عبدیت درحقیقت وہ صحیح رشتہ ہے جو بندہ اوراس کے معبود کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے کو اوراس کے حقوق بتانے کو آئے' باپ بیٹے' دوست دوست' ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ امتی اور رسول کا رشتہ بھی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے اور نہ اس میں اثنینیۃ کی گنجائش ہے وہ صرف مخلوق اوراس کے خالق کے درمیان قائم ہے اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک طرز ادا سے ہم کو رنگین بنانا بھی ہے اگر اس رشتہ کا تجزیہ کرو تو جو اس کے بڑے بڑے عنصر نظر آئیں گے وہ صرف دو ہیں' طاعت ومحبت ہر غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولا کے سامنے ہمہ تن اطاعت ہومگر وہ اطاعت نہیں جو ذوق ومحبت سے خالی ہو' اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولےٰ سے محبت کرے مگر وہ محبت نہیں جس میں سرموخلاف کی گنجائش باقی ہو' یہ دونوں فرائض بڑی حد تک بندوں کے ساتھ بھی مشترک ہیں' شریعت چاہتی ہے کہ ان مشترک فرائض کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دے جس کے بعد دونوں کی حدود میں کوئی اشتراک باقی نہ رہے اسی کا نام عبادت ہے۔

داغ عبدیت وتاج خلافت

دشواری یہ ہے کہ انسان فطرۃً داغ عبدیت برداشت نہیں کرتا اس لیے اس کے سامنے ایک ایسا آئین رکھا گیا ہے جسے وہ سمجھے اور پھر اس پر عمل پیرا ہوکر اس منزل تک پہنچ جائے جہاں یہ داغ عبدیت تاج خلافت کا سب سے آبدار موتی نظر آنے لگتا ہے اس لیے اسے صرف سمجھایا

نہیں گیا بلکہ عملی طور پر بھی اس کی ٹریننگ دی گئی۔ جس کے اثر سے تدریجاً اس کی فطرت اطاعت ومحبت کی خوگر ہوتی چلی جائے سب سے پہلے مولیٰ حقیقی نے اپنے ایسے ایسے خوبصورت نام بتائے جن میں حسن وخوبی کا جلوہ بھی ہے اور حکومت وسلطنت کا دبدبہ بھی۔ اور ہمیں حکم دیا کہ ہم ان ناموں سے اسے پکارا کریں اس کا نتیجہ نفسیاتی طور پر یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے حسن وجمال کا بے کیف وبے مثال نقش ہمارے دل پر جمتا چلا جائے اس کے ساتھ اس کی بے پناہ قدرت وطاقت کا تسلط بھی قلب پر چھاتا چلا جائے اور ان اسماء کے لحاظ سے عبادات میں یہ تقسیم کر دی گئی:۔

عبادات کی تقسیم

کچھ عبادتیں تو وہ رکھیں جو اس کی حکومت کا سکہ دل پر قائم کریں اور جو کچھ وہ جو جذبۂ محبت بھڑکائیں‘ اب اگر تم ذرا غور کرو گے تو اسلام کی عبادت میں نماز اور زکوٰۃ تمہیں پہلی قسم میں نظر آئیں گی اور روزہ حج دوسری قسم میں‘ نماز وزکوٰۃ میں تمام تر بارگاہ سلطنت وحکومت کا ظہور ہے اور روزہ وحج میں سرتاسر محبوبیت واجمال کا جلوہ۔

نماز: نماز کیا ہے؟ حاضری کے ایک عام نوٹس کے بعد لباس وجسم کی صفائی‘ اس کے بعد کورٹ کی حاضری کے لیے تیاری‘ وکیل کا انتخاب‘ پھر کورٹ میں پہنچ کر دست بستہ باادب قیام‘ دائیں بائیں دیکھنے‘ بات چیت کرنے‘ کھانے پینے حتیٰ کہ بلا وجہ کھانسنے اور نظریں اٹھانے تک کی ممانعت‘ آخر میں بذریعہ وکیل درخواست پیش کرنا‘ پھر باادب سلام کر کے واپس آجانا۔

زکوٰۃ: زکوٰۃ پر غور کیجئے تو اس میں بھی غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالے کر دینا‘ سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے آئیں تو ان کو راضی کر کے واپس کر دینا‘ اور جو وہ لینا چاہیں بے چون وچرا ان کے سپرد کر دینا۔

اب سوچو اگر پانچ وقت اسی طرح حاضری اور اتنی عاجزانہ جبہ سائی کی تابعمر ٹریننگ حاصل کی جائے۔ پھر سال بھر میں اپنا کمایا ہوا مال ایسی خاموشی اور بیچارگی سے سپرد کیا جائے تو کیا اس ذات کی ملکوت وجبروت کا نقش دل پر قائم نہیں ہوگا۔ جس کے پرشوکت اسماء پکارتے پکارتے اور یہ عاجزانہ عبادتیں کرتے کرتے عمر بسر ہوگئی۔

روزہ: دوسری طرف اگر غور کرو تو محبت کا پہلا اثر کم خفتن‘ کم گفتن‘ کم خوردن ہی ہوتا ہے اس لیے اگر پہلے ہی قدم میں یہاں کوئی عاشق نہیں ہے تو یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس جمیل مطلق کی محبت کی عشقانہ ادائیں ہی اختیار کرے‘ کھانا‘ پینا ترک کرے‘ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی نیند خراب کرے اور ایک جگہ جمع ہو کر اس کلام کی ایک معقول مقدار سنا کرے جسے سن کر مردہ روحیں بھی تڑپنے لگتی ہیں‘ اگر ایک ماہ کی اس ٹریننگ سے اس کے رنگ ڈھنگ‘ طور وطریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہوگیا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہیئے اور وہ یہ ہے۔

حج: جب کھانے پینے‘ سونے جاگنے‘ اور دنیا کے دوسرے لذائذ میں اس کے لیے کوئی لذت نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانا چاہیئے‘ یہاں زیب وزینت‘ تزک واحتشام درکار نہیں بلکہ سرتاسر ذل وافتقار‘ ہمہ تن عجز وانکسار شکستہ حال واشکبار‘ برہنہ پاؤں وجاں نثار‘ غرض کہ سرتاپا دیوانہ وار چلنا مقصود ہے‘ یہی احرام کا خلاصہ ہے‘ پھر لق ودق میدانوں کی صحرانوردی اور لیلائے حقیقت کے سامنے چیخ وپکار یہی تلبیہ اور میدان عرفات کا قیام ہے اس کے بعد ایک ایسے گھر کے سامنے حاضری ہوتی ہے جس کا مکیں کوئی نہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے حسن وجمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور دلہائے عشاق کو پاش پاش کئے دیتی ہیں‘ ایسے دل کش نظارہ کے موقع پر بے ساختہ وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو مجنوں نے دیار لیلےٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا اسی کا نام طواف ہے۔

روزہ وحج کا ارتباط

شاید صوم وحج کے اسی ربط کی وجہ سے ماہ رمضان کے بعد ہی حج کے ایام شروع ہو جاتے ہیں۔

جہاد:۔ اگر جذبہ محبت اس سے بھی آگے ترقی کر جائے تو آخری منزل جہاد ہے یہ عشق ومحبت کی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر محب صادق و مدعی کاذب نکھر جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں جہاد کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے اس میدان سے جو بھاگ گا وہ اس لائق نہیں سمجھا جاتا ہے کہ پھر خدا اور رسول کی محبت کا دم بھر سکے اور جس نے ذرا کوئی کمزوری دکھائی اس پر پھر بیوفائی کا دھبہ لگے بغیر نہیں رہتا' اس میدان کا مرد صرف وہ ہے جو اپنی موت کو اپنی زیست پر ترجیح دیتا نظر آئے' دشمن کی تلوار کی چمک اس کو اتنی محبوب ہو جائے کہ سو جان سے گلے لگانے کی آرزو ہو اور وہ بڑے جذبہ کے ساتھ یہ کہتا ہوا خدا کی راہ میں قربان ہو جائے

عمریست کہ آوازہ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

''یہ وہ عاشق صادق ہے کہ جب اس طرح پروانہ وار اپنی جان دے دیتا ہے تو قرآن کو اسے مردہ کہنے پر غیرت آتی ہے وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگرچہ تمہیں اس کی زندگی اور اس زندگی کے مقام بلند کا شعور نہیں''

مولانا مرحوم کے اس نقشہ کے مطابق نماز اور زکوٰۃ' روزہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ ربط واضح ہو جاتا ہے اگر یہ چاروں عبادتیں اس تصور سے ادا ہوتی رہیں تو ممکن نہیں کہ طاعات ومحبت کی دونوں شاخیں جو ایک عبد کے لئے مطلوب ہیں پیدا نہ ہو جائیں۔

(ترجمان السنۃ صفحہ ۵۸۷ تا صفحہ ۱/۵۸۹)

باب امور الایمان وقول اللہ عزوجل لیس البر ان تولو ا وجو ھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ الی قولہ تعالیٰ المتقون' قد افلح المؤمنون الایۃ

۸- حدثنا عبداللہ بن محمد ن الجعفی قال ثناابو عامر ن العقدی قال سلیمان بن بلال عن عبداللہ بن دینار عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال "الایمان بضع وستون شعبۃ والحیاء شعبۃ من الایمان.

ترجمہ:- باب امور ایمان کے بیان میں' حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نیکی صرف یہ نہیں کہ تم (عبادت کے وقت) اپنے چہرے مشرق یا مغرب[1] کی طرف کرلو بلکہ بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان لائے (وغیرہ آخر آیت تک) اور حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک ان ایمان والوں نے فلاح حاصل کرلی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں (وغیرہ آخر آیت تک)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں اور حیاء بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

تشریح:۔ امام بخاریؒ نے اس باب کے عنوان وترجمہ میں دو آیات پیش کی ہیں اول **لیس البر الایت** جس کا شان نزول یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے لئے خرابی عقائد واعمال پر جو عذاب خداوندی وغیرہ کا ذکر سابقہ آیات میں ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں عذاب کیوں ہوگا' ہم تو ہدایت یافتہ اور مستحق مغفرت ہیں' کیونکہ نماز جیسی افضل عبادات کو خدا کے حکم ومرضی کے موافق قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھتے ہیں' اس سے بڑی نیکی کیا ہوگی؟ اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں' سب سے بڑی اور بنیادی نیکی تو ایمان باللہ وغیرہ عقائد کی درستگی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے اعمال کی صحیح طور سے ادائیگی اس لئے یہود ونصاریٰ کا صرف اپنے استقبال قبلہ پر ناز کرنا اور محض اس کی وجہ سے اپنے کو ہدایت یافتہ اور مستحق مغفرت سمجھنا خیال خام ہے تاوقتیکہ ان سب اعتقادات' اخلاق واعمال پر قائم نہ ہوں' جو مذکورہ بالا آیت کریمہ میں مذکور ہیں۔

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ یہاں ''نفی بر'' کی تعمیم صرف یہود ونصاریٰ کے ''زعم باطل'' کے مقابلہ

---

[1] زمخشری نے کہا کہ خطاب اہل کتاب کو ہے کیونکہ یہود مغرب (بیت المقدس) کی طرف نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۴۴)

میں کی گئی ہے کہ انہوں نے **الاهم فا لاهم** کی رعایت ترک کر دی تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ فی نفسہ قبلہ کی طرف توجہ بھی معمولی نیکی نہیں ہے بلکہ اعمال جوارح میں سے بڑی نیکیوں میں شمار ہے کیونکہ ایک دو یا چند نیکیاں بھی خواہ وہ اپنی جگہ کتنی ہی اہم اور بڑی ہوں اگر ان کے ساتھ کسی درجہ کی بھی ایمان وعقائد کی خرابی شامل ہے، یا دوسرے اعمال واخلاق کی طرف سے لاپروائی ہے تو وہ چند نیکیاں بے سود ورائیگاں ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی آیت کا اقتباس حدیث "**لیس من البرا الصیام فی السفر**" کو قرار دے کر داؤد ظاہری کے استدلال کو باطل فرمایا جو اس حدیث سے سفر میں روزہ رکھنے کو قطعاً باطل و ناجائز کہتے ہیں، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہاں بھی ایسی ہی صورت تھی کہ بعض صحابہ نے رمضان میں روزے کے ترک کو باوجود مشقت سفر وشدت حر وغیرہ کے بھی گوارہ نہ کیا، جس سے ان پر غشی طاری ہوگئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے تنبیہ فرمائی کو نیکی کو اسی میں منحصر سمجھنا کوئی دینی سمجھ نہیں ہے بلکہ موقع ومحل کی مناسبت اور **الاھم فالاھم** کی رعایت سے عمل کرنا چاہئے، لہذا جس وقت عزیمت پر عمل دشوار ہو تو رخصت پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

حضرت شاہ نے کچھ مزاح کے انداز میں یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کی ایک قسم نیک بخت بیوقوفوں کی بھی ہے اور اس حدیث سے ان ہی کی اصلاح مقصود ہے کیونکہ ایسے لوگ گو نیک بخت ہوتے ہیں مگر قلت تفقہ کے باعث معمولی باتوں کا اہتمام کرتے ہیں اور امور مہمہ عظیمہ کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔

دوسری آیت **قد افلح المومنون الایۃ** میں بھی ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ شمار کئے گئے ہیں، جن سے اعمال کی اہمیت واضح ہے، لیکن امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ تمام امور متعلقہ ایمان، اجزاء ایمان ہیں، اسی لیے ان کو ساتھ ذکر کیا گیا، پھر حدیث میں ایمان کے ساٹھ سے اوپر شعبے بتلائے ہیں، جس میں اعمال واخلاق سب ہیں، لہذا ایمان کا ان سب سے مرکب ہونا ثابت ہوا۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ دونوں آیتوں میں تو ایمان پر اعمال کا عطف کیا ہے۔ جس سے جزئیت کے خلاف مغایرت مفہوم ہو رہی ہے اور حدیث میں بھی شعبوں سے مراد فروع وآثار ایمان ہیں۔

علامہ قسطلانیؒ نے فرمایا کہ حدیث میں ایمان کو تنوں اور شاخوں والے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ مجازاً ہے کیونکہ ایمان لغۃً تصدیق ہے اور عرف شرع میں تصدیق قلب ولسان کا نام ہے، جس کی تکمیل طاعات سے ہوتی ہے، لہذا ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اصل کا فرع پر اطلاق کیا گیا ہے۔ ایمان اصل ہے اور اعمال اس کی فروع، اور یہ اطلاق مجازی ہے قبول زیادت ونقصان کی صورت میں بھی اعمال ہی کے باعث ہے اور امام شافعی وغیرہ نے جو اعمال کو رکن ایمان قرار دیا ہے۔ وہ "ایمان کامل" کے اعتبار سے ہے اسی لئے تارک اعمال ان کے نزدیک حقیقت ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہے، البتہ معتزلہ کے نزدیک خارج ہو جاتا ہے، **قالہ العلا مۃ التفتازانی** (شروح البخاری صفحہ ۱۲۴)

ایمان کی کتنی شاخیں ہیں

یہاں بضع وستون کی روایت ہے مسلم شریف کی ایک روایت میں بضع وسبعون ہے دوسری میں بضع وسبعون او بضع وستون شک کے ساتھ ہے ابوداؤد ترمذی میں بضع وسبعون بلاشک ہے۔

قاضی عیاض نے فرمایا کہ تمام احادیث اور سب رواۃ پر نظر کر کے بضع وسبعون ہی راجح ہے، امام نوویؒ نے فرمایا کہ صواب یہی ہے کہ بضع وسبعون کو ترجیح دی جائے، کیونکہ ثقات کی زیادتی مقبول ہے دوسرے یہ کہ بضع وستون کی روایت ماسوا روایات کے منافی نہیں ہے کیونکہ تخصیص بالعدد نفی زائد پر دلالت نہیں کرتی، تیسرے یہ بھی احتمال ہے کہ کم والی روایات ابتدائی ہوں۔ پھر شعبے بڑھتے رہے ہوں گے۔

امام حافظ ابوحاتم ابن حبان بستی نے فرمایا کہ "میں نے اس حدیث کے بارے میں مدت تک تتبع کیا اور طاعات کو شمار کرتا رہا تو عدد مذکورہ حدیث سے بہت بڑھ گیا۔ پھر صرف کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مراجعت کے بعد ۷۹ شعبے دریافت ہوئے نہ کم نہ زیادہ، اس سے میں سمجھا

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کتاب وسنت سے ثابت شدہ عدد ہے؛ ذکرہ ابوحاتم فی کتاب ''وصف الایمان و شعبہ'' (شروح البخاری صفحہ ۱۲۴)
بضع کے اطلاق میں بہت سے اقوال ہیں؛ زیادہ صحیح تین اور دس کے درمیان کا قول ہے؛ لہٰذا ۷۹ کا عدد راجح ہوا واللہ اعلم پھر علماء نے ان شعبوں کی تعیین کے لئے بہت سی کتابیں مستقل طور سے تصنیف کی ہیں جن میں شعب الایمان امام بیہقی کی بہت مشہور ہے۔
شیخ عبدالجلیل نے بھی اسی نام سے کتاب لکھی ہے اور محدث شہیر شیخ محمد مرتضیٰ زبیدی حنفیؒ نے ان دونوں کتابوں کا خلاصہ کیا ہے۔ جس کا نام ''عقدالجمان'' رکھا اور سب سے بہتر فوائد وتحقیقات عالیہ کے اعتبار سے شیخ ابوعبداللہ حلیمی کی کتاب المنہاج ہے۔
حافظ نے فتح الباری میں ابن حبان کی توضیح وتشریح کو زیادہ پسند کیا اور اسی کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔ شعب ایمان کا تعلق قلب' لسان اور بدن تینوں سے ہے اور ہر ایک کے ماتحت شعبوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱- اعمال قلب کی (جن میں معتقدات ونیات شامل ہیں) ۲۴ خصلت' ایمان باللہ (جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر یقین اور اس امر کا اعتقاد شامل ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں اور اس کے سوا سب حادث ہیں) ایمان فرشتوں پر آسمانی کتب پر' انبیاء ومرسلین پر' قدر خیر وشر پر یوم آخرت پر (جس میں قبر کا سوال' بعث ونشور' حساب' میزان' صراط جنت ونار پر یقین شامل ہے) خدا کی محبت' دوسروں سے خدا کے لئے حسد وبغض' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت (جس میں درود شریف اور آپ کی سنت مطہرہ کا اتباع شامل ہے) اخلاص (جس میں ترک ریاء ونفاق شامل ہے) توبہ' خوف' رجاء' شکر' صبر' وفاء عہد' رضا بالقضاء' توکل' رحم وشفقت' تواضع (جس میں بڑوں کی توقیر شامل ہے) ترک کبر وعجب' ترک حسد' ترک حقد وکینہ' ترک غضب'

۲- اعمال لسان' سات خصلتوں پر شامل ہیں:۔ کلمہ توحید زبان سے ادا کرنا۔ تلاوت قرآن مجید' علم دین کا سیکھنا۔ دین کا علم سکھانا' دعا' ذکر (جس میں استغفار شامل ہے) لغو باتوں سے اجتناب۔

۳- اعمال بدن' ۳۸ خصلتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ۱۵ کا تعلق اعیان سے ہے۔ پاکی حسی حکمی (جس میں نجاستوں سے بچنا بھی شامل ہے) ستر عورت' نماز' فرض ونفل' زکوٰۃ' فرض ونفل' فک رکاب' جود (جس میں کھانا کھلانا شامل ہے) اکرام ضیف' روزہ' فرض ونفل' حج وعمرہ' فرض ونفل' طواف' اعتکاف' التماس لیلۃ القدر۔ دین کو بچانے کی سعی (جس میں دارالشرک سے ہجرت بھی شامل ہے) نذر کو پورا کرنا' ایمان میں تحری واداء کفارات۔
چھ خصلتیں وہ ہیں جن کا تعلق اپنے خاص متعلقین واتباع سے ہے (۱) نکاح کے ذریعہ عفت اختیار کرنا (۲) عیال واولاد کے حقوق کی نگہداشت کرنا اور تربیت کرنا (۳) بروالدین یعنی ان کے ساتھ حسن سلوک (جس میں ان کی نافرمانی سے بچنا بھی شامل ہے) صلہ رحم (۵) سرداروں کی اطاعت (۶) غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ۔
۱۷۔ خصلتیں وہ ہیں جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہے۔ (۱) حاکم ہو کر عدل کرنا۔ (۲) متابعت جماعت' (۳) اطاعت اولی الامر (۴) اصلاح بین الناس (جس میں قتال خوارج وبغاۃ شامل ہے) (۵) بر ونیکی کے کام میں اعانت (جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی شامل ہے) (۶) اقامت حدود' (۷) جہاد (جس میں مرابطہ شامل ہے) (۸) ادائے امانت (جس میں ادائیگی خمس شامل ہے) (۹) ضرورت مند کو قرض دینا اور قرض کی ادائیگی (۱۰) اکرام جار (۱۱) حسن معاملہ (جس میں حلال طریقہ پر مال جمع کرنا شامل ہے' (۱۲) مال کو طریقہ حق میں صرف کرنا (جس میں ترک تبذیر واشراف شامل ہیں) (۱۳) سلام کا جواب دینا (۱۴) چھینکنے والے کو یرحمک اللہ کہنا' (۱۵) لوگوں کو ایذا پہنچانے سے باز رہنا (۱۶) لہو ولعب سے اجتناب' (۱۷) راستے سے تکلیف دینے والی چیز ہٹانا۔ یہ سب ۶۹ خصلتیں ہوئیں' اور اگر تفصیل کر دی جائے کہ بعض جگہ کئی خصلتیں ایک نمبر میں آ گئی ہیں تو عدد ۷۹ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔ (شروح البخاری صفحہ ۱/۱۳۵)

قلبی وساوس:۔ شعب ایمان کی تفصیل وضاحت کے بعد ایک اہم امر قابل تنبیہ یہ ہے کہ شیطان جس طرح انسان کو بے عمل اور بدعمل بنانے کے لئے اپنی ہر ممکن کوشش کر ڈالتا ہے اسی طرح انسان کے دل میں وساوس پیدا کر کے اس کو بے ایمان بنانے میں بھی کسر اٹھا کر نہیں

رکھتا اس لئے ایک شخص وساوس قلبی کا شکار ہو کر نہایت پریشان ہو جاتا ہے اور اس کو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ایمان کی لازوال دولت سے محروم نہ ہو جائے' اس لئے اس سلسلے کی چند احادیث لکھی جاتی ہیں۔

۱-حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دلوں کے برے خیالات و وساوس کو معاف فرما دیا ہے جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یا زبان سے کچھ نہ کہا جائے' ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا (بخاری ومسلم)

۲-ایک شخص نے عرض کیا کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو زبان سے ادا کروں' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس بات کو وسوسہ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ (ابوداؤد)

۳-اسی طرح چند صحابہ نے حال عرض کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کیا واقعی ایسا ہوا؟ عرض کیا' جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص ایمان کی علامت ہے (مسلم)

باب: "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده"۔

۹-حدثنا ادم بن ابی ایاس قال حد ثنا شعبة عن عبد الله بن ابی السفر وا سمعیل عن الشعبی عن عبد الله بن عمر و عن النبی صلی الله علیه وسلم قال" المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده والمهاجر من هجر ما نهی الله عنه "قال ابو عبد الله و قال ابو معاویة ثنا داود بن ابی هند عن عامر قال سمعت عبد الله بن عمر و یحدث عن النبی صلی الله علیه وسلم و قال عبد الاعلیٰ عن داو د عن عامر عن عبد الله عن النبی صلی الله علیه وسلم۔

باب۔"مسلمان وہ ہے (جس کی زبان اور ہاتھ سے) مسلمان محفوظ رہیں"۔

ترجمہ:۔ حضرت عامر شعبی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کے ضرر) سے مسلمان محفوظ رہیں' مہاجر وہ ہے جو ان کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

تشریح:۔ سچا اور پکا مسلمان وہ کہلائے گا جو کسی دوسرے مومن بھائی کو اپنے ہاتھ سے یا اپنی زبان سے کوئی نقصان نہ پہنچائے' اسی طرح اصل ہجرت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی منع کی ہوئی باتوں سے رک جائے یعنی سراسر اللہ کا اطاعت گزار بن جائے اس حدیث میں مہاجرین کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا تا کہ لوگ صرف ترک وطن کو ہجرت سمجھ کر دین کی دوسری باتوں میں سستی نہ کرنے لگیں یا بتلایا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہو جانے پر اب ہجرت کا ثواب اس طرح آدمی کو حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ حرام باتوں کو قطعاً چھوڑ دے (یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے' اس لئے بخاری کی ان حدیثوں میں شامل ہے جو افراد بخاری کے نام سے موسوم ہیں)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام جس طرح خدائے تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص رابطہ و معاملہ ہے اسی طرح وہ لوگوں کے ساتھ بھی ایک معاملہ و رابطہ خاصہ ہے اور یہ اس دین کا خصوصی امتیاز ہے گویا ایک مسلمان کے دل کی آواز دوسرے ملنے والے کے لئے ہوتی ہے کہ تم مجھ سے مطمئن و بے خوف رہو اور میں تم سے مطمئن ہوں۔

اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں لوگوں کا شب و روز مشغلہ خوں ریزی' ہتک عزت اور لوٹ مار تھی' اسلامی شریعت نے ان تمام مفاسد کو ممنوع و حرام قرار دیا اور لوگوں کو ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن زندگی گزارنے کا موقع دیا اور ہر ملاقات کے وقت "السلام علیکم" کہنے کو اسلامی شعار قرار دیا جس کا بہت بڑا اجر و ثواب بتلایا' حدیث میں ہے کہ آپس میں بکثرت سلام مسنون کا رواج دو' ایک دوسرے کو کھانا کھلاؤ' جنت میں بسلامت و کرامت داخل ہو جاؤ گے' یہ بھی حدیث میں ہے کہ سلام میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں ہر ایک کو ابتداء کی فضیلت حاصل کرنی چاہئے اور جان پہچان پر بھی مدار نہیں' اس لئے بہتر ہے کہ ہر مسلمان کو سلام کیا جائے خواہ اس کو جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔

پھر جواب دینے والے کو مزید تاکیدات ہیں کہ جواب سلام اس پر واجب کیا' اور جواب میں زیادہ بہتر اور زائد الفاظ ادا کرنے کی ترغیب دی' مثلاً اگر السلام علیکم کہے تو دوسرا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے' وہ اگر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو یہ وعلیکم السلام ورحمۃ وبرکاتہ کہے' جواب میں زیادہ بلند وصاف آواز اختیار کرنے کی بھی ترغیب ہے تاکہ پہلا آدمی اچھی طرح سن لے اور اس کا دل زیادہ خوش ہو جائے۔

سلام کرنے میں اور جواب دینے میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پورا مجمع اور جماعت ایک شخص واحد کے حکم میں شمار ہے اسی لئے ایک بڑے مجمع میں سے ایک شخص مقابل آنے والے کو سلام کہہ دے تو وہ سب کی طرف سے ہو جائے گا اور اسی طرح جواب دینے والوں میں سے بھی صرف ایک شخص جواب دے گا تو وہ بھی ان سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا یعنی سب سے وجوب ساقط ہو جائے گا' فرض کیجئے کہ ایک مسلمان ریڈیو پر مسلمانان عالم کو خطاب کر کے سلام کہے تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر جو اس کی آواز سنیں گے جواب سلام واجب ہو جائے گا۔ مگر کسی ایک کے جواب دے دینے سے بھی سب کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور دور سے بھی ادا ہو جائے گا جس طرح خطوط میں ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایسی متعدد چیزیں ہیں' جن میں جماعت کو شخص واحد کے درجے میں قرار دیا گیا ہے یا ایک شخص سب کا قائم مقام ہو جاتا ہے' جس طرح یہاں سلام میں ہے یا مسئلہ امان میں ہے کہ اگر حرب کے وقت مسلمانوں میں سے ایک شخص بھی کسی ایک یا زیادہ اہل حرب کفار کو امن دے دے گا تو اس کا امن دے دینا سب کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ یعنی سارے مسلمانوں پر ان کفار کی حفاظت جان و مال فرض ہو جائے گی' یا سترہ ہے کہ صرف امام کے سامنے ہو تو وہ سارے مقتدیوں کے لئے کافی ہے خواہ وہ ہزاروں لاکھوں بھی ہوں اور اسی طرح حنفیہ کی نماز جماعت بھی ہے کہ امام ضامن (ذمہ دار) ہے۔ اس کی نماز کی صحت پر سب کی نمازوں کی صحت موقوف ہے اور صرف امام کی قرات سارے مقتدیوں کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے۔ **''قراۃ الامام قراءۃ لمن خلفه''**۔

غرض یہاں یہ بتلانا تھا کہ اسلام دوسروں کے لئے بہت بڑی ضمانت اس امر کی ہے کہ ان کو ایک مسلمان سے کوئی ضرر و نقصان نہیں پہنچ سکتا' یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام میں کفار و مشرکین اہل ذمہ کے لئے حفاظت جان و مال آزادی کاروبار عدل و انصاف آزادی عبادات وغیرہ کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں' دارالاسلام کے سارے مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک ادنیٰ کافر و مشرک کی معمولی توہین یا اضاعۃ مال بھی جائز نہیں کسی کی مذہبی توہین یا بڑے نقصان جان و مال کا تو امکان ہی نہیں' دارالاسلام کو دارالاسلام صرف اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں اسلام کی شوکت' اسلامی احکام و شعار کی ترویج اور مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت گارنٹی کے ساتھ ہوتی ہے' لیکن اسی کے ساتھ جو کفار وہاں رہتے ہیں ان کی بھی پوری حفاظت جان و مال و آبرو حکومت اسلامی کا فرض اولین ہے' اگر اس میں کوتاہی ہے تو وہ اسلام پر بدنما داغ ہے۔

اسلامی شریعت نے تو ذمی کفار و مشرکین کی عزت اور جان و مال کو مسلمانوں کی عزت و مال کے برابر مساوی درجہ دے دیا ہے حتیٰ کہ ذمی کافر و مشرک کی غیبت تک کو حرام قرار دیا ہے' اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے ذمی فقیر کو دیکھا کہ سوال کر رہا ہے تو ساتھیوں سے فرمایا کہ اس کا وظیفہ بیت المال سے جاری کر دو' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دارالاسلام میں رہنے والا ایک بوڑھا ذمی یوں پریشان ہوتا پھرے اور دست سوال دراز کر کے گزارہ کرے۔

دارالاسلام کے مقابلہ میں دوسری شرعی اصطلاح دارالحرب کی ہے۔ جہاں کفر کی شوکت ہوتی ہے اور وہاں کفر و شرک کے احکام سربلند ہوتے ہیں' غرض سارا دار و مدار اسلام یا کفر کی شوکت پر اور اسلام یا کفر و شرک کے احکام کی فوقیت و سربلندی یا محکومانہ و عاجزانہ ادائیگی پر ہے اگر کسی دارالحرب میں مسلمانوں کو بھی سر چھپانے کی جگہ میسر ہو اور وہاں ان کے لئے امن و اطمینان کے ساتھ' جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ان کا دین بھی محفوظ ہو تو اس کو دارالامان کہا جاتا ہے' ایسی جگہ اگر مسلمان ہوں تو ان کو ملکی و قومی معاملات میں کفار کے دوش بدوش چلنا چاہئے اور اسلامی مذہبی رواداری کا پورا نمونہ بننا چاہئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ دارالاسلام' دارالحرب اور دارالامان کی یہی تشریح فرمایا کرتے تھے' اور یہی حق و صواب ہے' جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ جس ملک میں بھی امن و امان اور عدل و انصاف کا قانون ہو اور مذہبی آزادی ہو مسلمانوں کے لئے' خواہ وہاں شوکت اسلام ہو یا نہ ہو' اور

خواہ وہاں اسلامی احکام وشعار کا اجراء بھی جیسا چاہئے نہ ہو وہ بھی دارالاسلام ہے ان کی غلط فہمی ظاہر ہے۔ آج عدل وانصاف اور امن وامان کا قانون اور مذہبی آزادی کی خوشنما دفعہ کس ملک میں رائج نہیں؟ تو کیا دنیا کے سارے ممالک ''دارالاسلام'' کہلائیں گے۔

الحاصل کہنا یہاں یہ تھا کہ اسلام چونکہ سلام سے مشتق ہے تو اس میں سلام وامن کا بھرپور سرمایہ موجود ہے اور حدیث مذکورہ باب میں یہی سبق دیا گیا ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی ایذا سے مسلمان، مومن ہوں، بلکہ اگر کفار ومشرکین بھی اس کے سایہ میں آباد ہوں تو وہ بھی اپنے کو پوری طرح سے محفوظ سمجھیں اور ان کی عزت وحرمت دینوی کی پاس داری اس حد تک ہونی چاہئے کہ ان کے پیٹھ پیچھے بھی ان کو ناگوار ہونے والی کوئی بات، ہم اپنی نجی مجالس میں نہیں کہہ سکتے، جس طرح ایک مسلمان کی غیبت حرام ہے، ایک ذمی کافر ومشرک کی بھی حرام وناجائز ہے، کیا اسلامی شریعت کی اس رواداری، اور حکومت اسلام کے اس قانون کی کوئی نظیر پیش کی جاسکتی ہے؟

دوسری ایک حدیث صحیح میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ ''مومن وہ ہے جس سے سارے لوگ اپنے دماء واموال کے بارے میں مطمئن ہوں'' اس سے ہماری اوپر کی تشریحات کی اور بھی تائید ہوتی ہے۔

اس حدیث کی سند میں عامر شعبی آئے ہیں، جو ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ واستاذ ہیں اور ان کا ذکر ہم نے مقدمہ انوار الباری صفحہ ۳۹/۱ میں کیا ہے۔

باب: ای الاسلام افضل؟ (کون سا اسلام افضل ہے)

۱۰۔ حدثنا سعید بن یحییٰ بن سعید الاموی القرشی قال ثنا ابی قال ثنا ابو بردة بن عبداللہ بن ابی بردة عن ابی بردة عن ابی موسیٰ قال قالوا: یارسول اللہ! ای الاسلام افضل؟ قال: من سلم المسلمون من لسانه ویده

ترجمہ:۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا:۔ یارسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کی زبان وہاتھ کی ایذاء سے مسلمان محفوظ ہوں'' (اس کا اسلام سب سے افضل ہے)

تشریح:۔ علامہ نوویؒ نے شرح بخاری میں فرمایا کہ ای الاسلام سے انکے سوال کا مطلب یہ تھا کہ کون[1] سی خصلت اسلام کی سب سے افضل ہے؟ اس کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی بہت بڑی امتیازی شان اور کھلا ہوا وصف جس کا مشاہدہ وتجربہ ہر خاص وعام کرسکتا ہے یہ ہے کہ اس سے کسی مسلمان کو بھی ایذا نہ پہنچے لہٰذا ایسے ہی وصف والے کا اسلام بھی سب سے زیادہ برتر وافضل ہوگا۔ دوسری روایت میں ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ بھی آچکا ہے کہ مومن کی امتیازی شان یہ ہے کہ تمام لوگ اپنی جان ومال کے بارے میں اس کی طرف سے مامون ومطمئن ہوں، امام بخاری نے اس وصف خاص کی اہمیت کے پیش نظر کئی طریقوں سے اس حدیث کو بیان فرمایا ہے تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کا اہتمام کریں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اس امر کا غایت اہتمام فرماتے تھے کہ کسی کو بھی ادنیٰ درجہ کی جسمانی یا روحانی ایذاء نہ پہنچائی جائے اور ایسے شخص کو بہت بڑا صاحب کمال بتلایا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات کسی شخص کی بڑی مدح کے طور پر فرماتے تھے کہ وہ شخص بے ضرر ہے اور فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب! انسانیت کی بات نہیں ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو تکلیف پہنچائے یہ تو موذی جانوروں کا کام ہے، خود بھی اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے، ان کی مجلس میں کسی کی غیبت یا برائی نہ ہوسکتی تھی۔

ڈابھیل کے زمانہ قیام میں راقم الحروف نے بارہا دیکھا کہ مدرسہ کی جس بلڈنگ میں آپ کا اور دوسرے اساتذہ کا قیام تھا اس کے متصل دو بیت الخلاء تھے، آپ کی عادت تھی کہ جب تک ایک بیت الخلا میں کوئی ہوتا، آپ دوسرے میں تشریف نہ لے جاتے، بعض مرتبہ کافی انتظار فرماتے، تا کہ اس کو دوسرے بیت الخلاء میں کسی کی موجودگی سے انقباض نہ ہو، اسی طرح بیت الخلاء سے نکلتے تو نل سے کئی کئی لوٹے پانی

---

[1] ای الاسلام کا مطلب ای خصال الاسلام لینا اس لئے بھی راجح ہے کہ آگے جو دوسری حدیث ای الاسلام خیر؟ والی آرہی ہے اس میں ایک روایت ای خصال الاسلام خیر؟ بھی ہے۔ حافظ عینی نے یہاں ای اصحاب الاسلام کی تقدیر کو ترجیح دی ہے، کیونکہ روایت مسلم میں ای المسلمین افضل آیا ہے، واللہ اعلم (عمدۃ القاری صفحہ ۱۵۹/۱ طبع استنبول)

کے بھر کر بیت الخلاء لے جاتے اور طہارت کے قدمچہ پر بہاتے تھے تاکہ آپ کے بعد جانے والوں کو کسی قسم کی کراہت واذیت نہ ہو یہ اس سلسلہ کی ادنیٰ مثال ہے ایک روز فرمایا کہ دنیا کی تعریف بہت سے لوگوں نے کی ہے، کسی نے کہا کہ دنیا مجمع الاضداد ہے۔

کہ اس میں اضداد کا اجتماع ہے اچھی سے اچھی چیزیں بھی موجود ہیں اور بری سے بری بھی، کفر بھی ہے ایمان بھی، نیک عملی بھی ہے اور بدعملی وفسق بھی بہترین اخلاق کے مظاہر بھی ہیں اور بدترین کے بھی وغیرہ۔

کسی نے کہا کہ دنیا وہ جگہ ہے جہاں مجتمعات افترقت ومفترقات اجتمعت کہ کبھی کچھ چیزیں جمع شدہ منتشر ومتفرق ہوجاتی ہیں اور کبھی منتشر چیزیں یکجا ہوجاتی ہیں، مگر میں نے دنیا کا نام "بیت الحمیر" رکھا ہے جس طرح ایک طویلے میں گدھوں کو جمع کردیا جاتا ہے تو وہ چین سے کھڑے نہیں رہتے، بلکہ ایک دوسرے کو لاتیں مارتے رہتے ہیں، اسی طرح یہاں انسانوں کا حال ہے کہ بے وجہ ایک دوسرے کو ایذا پہنچانے میں مشغول ہیں، غرض ایذا رسانی کا کام اسلام سے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتا۔ کیونکہ اسلام انسانی اخلاق فاضلہ کی تکمیل کے لئے آیا ہے **بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** محدثین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایسے شخص کی فضیلت اس لئے زیادہ ہے کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ اس حدیث کے تمام راوی کوفی ہیں۔

ایک اہم علمی فائدہ

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں پانچ لاکھ احادیث میں سے منتخب کر کے چار ہزار آٹھ سو احادیث ذکر کیں، پھر ان میں سے چار کا انتخاب کیا کہ انسان کو اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے صرف یہ حدیثیں کافی ہیں (۱) **انما الاعمال بالنیات**۔ عبادات کی درستگی کے لئے (۲) **من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ**۔ عمر عزیز کے گرانقدر لمحات کی حفاظت کے لئے (۳) **لا یومن احد کم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ** حقوق العباد کی صحیح طور پر ادائیگی کے لئے، (۴) **الحلال بین والحرام بین و مابینھمامشتبھات فمن اتقی الشبھات فقد استبرا لدینہ** "مشتبہات سے بچنے کے لئے۔

اگرچہ یہ بات امام ابوداؤد کی طرف منسوب ہوکر مشہور ہوئی مگر ان سے پہلے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادے حمادؒ سے فرمایا تھا کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ احادیث منتخب کی ہیں، پھر ان چار مندرجہ بالا احادیث کے ساتھ پانچویں حدیث **المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ** بیان فرمائی تھی۔

امام ابوداؤد چونکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مداحین میں سے ہیں، ممکن ہے یہ انتخاب ان ہی کے انتخاب سے کیا ہو،

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

باب: "اطعام الطعام من الاسلام" (کھانا کھلانا اسلام میں داخل ہے)

۱۱- حدثنا عمرو بن خالد قال حدثنا اللیث عن یزید عن ابی الخیر عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنھما ان رجلاً سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای الاسلام خیر؟ قال:. تطعم الطعام وتقرا السلام علیٰ من عرفت ومن لم تعرف"

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اسلام کی کون سی خصلت سب سے اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا:۔ لوگوں کو کھانا کھلاؤ، اور سب کو سلام کرو خواہ ان کو جانتے پہچانتے ہو یا نہیں۔

تشریح:۔ غالباً یہ سوال کرنے والے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہیں، اور بظاہر اسی قسم کی اسلامی تعلیمات کا اثر ان پر بہت زیادہ تھا کہ اپنے پاس کچھ جمع نہ رکھتے تھے سب کچھ مستحقین پر صرف فرما دیتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ دولت جمع کرنے پر بھی

سختی سے نکیر کرتے تھے ان کی رائے تھی کہ زکوٰۃ وغیرہ حقوق مالیہ ادا کرنے پر بھی دولت جمع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ دولت کمائی جائے وہ سب غرباء و مستحقین پر صرف کر دی جائے۔

اس روایت میں تمام رواۃ مصری ہیں اور سب جلیل القدر ائمہ حدیث ہیں' حضرت لیث بن سعد کے بارے میں علامہ قسطلانی شافعی نے لکھا کہ آپ امام جلیل مشہور قلقشندی المولد حنفی المذہب' مجتہد وقت تھے اور ان کا مفصل تذکرہ ہم نے مقدمہ صفحہ ۲۱۲ میں کیا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ بھی ہیں۔

اطعام الطعام میں کھلانا' پلانا' مہمانداری کرنا' اعطاء وغیرہ سب داخل ہیں چنانچہ پینے کے لئے طعام کا لفظ طالوت[1] کے واقعہ میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] طالوت کے واقعہ میں بہت سے فوائد ہیں اس لئے فوائد عثمانی وغیرہ سے اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و سامراج سے نجات دلائی تھی کچھ عرصہ تک وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی ٹھیک رہے مگر جب ان کی نیت بگڑی تو ایک کافر بادشاہ جالوت نامی ان پر مسلط ہوا اور بنی اسرائیل پھر سے غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے مجبور ہو کر بیت المقدس پہنچے اور پیغمبر وقت حضرت شموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیں تا کہ اس کی سر کردگی میں جہاد کریں اور اپنی عظمت رفتہ کو واپس لائیں' حضرت شموئیل علیہ السلام نے طالوت نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا وہ اگرچہ غریب محنتی معمولی حیثیت کے تھے مگر علم و فضل' عقل و خرد اور جسم جثہ کے لحاظ سے بادشاہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے' پھر بنی اسرائیل کی طلب پر خدائے تعالیٰ نے طالوت کی بادشاہت پر ایک نشانی بھی دے دی' وہ اس طرح کہ بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے تبرکات تھے' بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی کے وقت آگے رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا تھا' جب جالوت غالب آیا تو وہ اس صندوق کو بھی ساتھ لے گیا تفسیر ابن کثیر میں تفصیل ہے کہ جب مشرکوں نے اس صندوق پر اپنا قبضہ کر لیا تو اس کو اپنے صنم خانہ میں پہنچا کر بڑے بت کے نیچے رکھا' صبح کو آ کر دیکھا تو وہ صندوق اوپر تھا اور بت نیچے' اس کو اتار کر بت کے نیچے رکھا۔ اگلے دن دیکھا تو پھر وہی صورت تھی' اب انہوں نے صندوق نیچے اور بت اوپر رکھ کر میخوں سے مستحکم کر دیا صبح کو دیکھا کہ بت کے سب ہاتھ پیر کٹے ہوئے ہیں اور دور فاصلہ پر پڑا ہے اس پر ان کو تنبہ ہوا کہ یہ بات خدا کی طرف سے ہے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اپنے شہر سے ہٹا کر اس کو دوسری آبادی میں لے گئے تو وہاں کے سب لوگوں کی گردنوں میں بیماری لگ گئی' اسی طرح پانچ شہروں میں لے گئے' سب جگہ وبا اور بلا پھیل جاتی' بستیاں ویرانے بن جاتے تھے' ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد دیا فرشتے ان کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے' اس نشانی سے بنی اسرائیل کو طالوت کی بادشاہت پر یقین آ گیا اور ان کے ساتھ جالوت کے خلاف فوج کشی کے لئے تیار ہو گئے' یہ موسم نہایت سخت گرمی کا تھا'' طالوت نے کہا کہ صرف زور آور' بے فکرے جوان جہاد کے لئے نکلیں' چنانچہ اسی ہزار نوجوان ساتھ نکلے' حق تعالیٰ نے ان کو آزمانا چاہا' ایک منزل پر پانی نہ ملا دوسری منزل میں ایک نہر ملی (تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کا قول نقل کیا کہ وہ نہر فلسطین اور اردن کے درمیان ہے اور نہر شریعت کے نام سے مشہور ہے) طالوت نے حکم دیا کہ جو شخص اس نہر کے پانی میں سے ایک چلو سے زیادہ پانی پیے وہ میرے ساتھ جہاد میں نہ چلے' منقول ہے کہ اس شرط پر صرف ۳۱۳ نوجوان پورے اترے (جو غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تھی اور خدا کی قدرت کا کرشمہ کہ جنہوں نے ایک چلو سے زیادہ پانی نہ پیا ان کی پیاس بجھی اور جنہوں نے زیادہ پیا ان کو پیاس اور زیادہ لگی اور آگے نہ چل سکے جو ۳۱۳ مجاہدین جالوت کے لشکر جرار کے مقابلہ پر نکلے تھے ان میں حضرت داؤد علیہ السلام ان کے والد اور چھ بھائی بھی تھے جو بڑے قد آور جوان تھے' حضرت داؤد علیہ السلام کا قد چھوٹا تھا' تاہم حضرت شموئیل علیہ السلام نے جالوت کو قتل کرنے کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام ہی کا انتخاب کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے کہ ہمیں اٹھا لو ہم جالوت کو قتل کریں گے۔ جالوت نے ان مٹھی بھر آدمیوں کو دیکھ کر کہا کہ تم سب کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں میرے سامنے آتے جاؤ (پہلے زمانے میں دستور یہی تھا کہ ابتداء جنگ میں ایک ایک شخص مقابلہ پر نکل کر زور آزمائی کرتا تھا' جالوت خود باہر نکلا تو حضرت داؤد علیہ السلام مقابلہ پر گئے اور تین پتھر فلاخن (گوپھیہ) میں رکھ کر جالوت کے ماتھے پر سر کئے' جالوت کا تمام بدن زرہ سے ڈکا ہوا تھا' صرف پیشانی کھلی تھی' وہ تینوں پتھر اس کے ماتھے پر لگے اور پیچھے کو نکل گئے' جالوت کے مرتے ہی اس کا سارا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی پھر طالوت بادشاہ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور طالوت کے بعد وہی بادشاہ ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ حکم جہاد ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت و منت ہے وہ لوگ نادان ہیں جو کہتے ہیں کہ لڑائی نبیوں کا کام نہیں''۔ (فوائد عثمانی صفحہ ۵۱-۵۲) سورہ بقرہ)

اس قسم کے قرآنی واقعات میں ہمارے لئے کتنے کتنے سبق ہیں' ہدایت ہے' روشنی ہے' لائحہ عمل ہے' کاش! مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو' اور وہ انبیاء سابقین علیہم السلام' امم سابقہ' خصوصاً خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سلف کے عمل سے مستفید و مستنیر ہوں' اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کا زریں اصول کبھی نہ بھولیں' اس کے بغیر ان کی اور ان کے دین کی سربلندی امر موہوم ہے۔ واللہ المستعان۔

ومن لم يطعمه فانه منى الايه یعنی جس نے اس نہر کا پانی نہ پیا وہ میرا ہے مگر ایک چلو اپنے ہاتھ سے پی لے (تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، یہاں پانی پینے پر طعم کا اطلاق ہوا ہے۔

تقرا السلام، جو کلمہ تسلم سے عام ہے کیونکہ خط و کتابت وغیرہ کے سلام کو بھی شامل ہے اس حدیث میں اسلام کی ایسی دو خصلتیں جمع فرمائی ہیں، جو مالی و بدنی ہر دو قسم کے مکارم اخلاق وفضائل پر مشتمل ہیں، حافظ عینی نے ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر سب سے پہلے ان ہی دو امر کی ترغیب دی تھی کیونکہ اس وقت کے حالات میں ان دونوں باتوں کی زیادہ ضرورت تھی، لوگوں کی ناداری کی حالت تھی اور تالیف قلب کی بھی مصلحت تھی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور مدینہ تشریف لائے تو لوگ آپ کی خدمت میں جلد جلد پہنچنے لگے۔ میں بھی حاضر ہوا۔ اور چہرہ مبارک کو دیکھتے ہی یقین ہو گیا کہ یہ منور چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا اور حضور سے سب سے پہلا ارشاد میں نے یہ سنا' **ايها الناس افشوا السلام واطعموا اطعام وصلوا بالليل والناس نيام تدخلوا الجنة بسلام**"۔ علامہ خطابی نے فرمایا کہ کھانا کھلانا اس لئے افضل ہوا کہ وہ قوائے بدنیہ کا محافظ ہے، پھر کسی کے ساتھ نیکی بھلائی اور اکرام و تعظیم کا معاملہ کرنے میں افشاء اسلام کا بڑا درجہ ہے، خصوصاً جب کہ وہ ہر متعارف و غیر متعارف کے لئے ہو، کیونکہ وہ خالصاً لوجہ اللہ ہو گا۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہے کہ سلام آخری زمانہ میں صرف متعارفین میں رہ جائے گا۔ (کیونکہ ریاء و تصنع اور مصلحت پروری عام ہو جائے گی) (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۶۳)

اختلاف جوابات کی وجوہ

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی قسم کے سوال کے جواب میں مختلف قسم کے جوابات کیوں دیئے؟ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس وقت جو جواب دیا ہے وہی اس وقت کے مناسب تھا دوسری وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے والے کی رعایت سے جواب دیا ہے کہ اس میں جو کمی تھی اس کو ترغیب فرما کر تکمیل کی، تیسرے یہ کہ اہل مجلس کی رعایت سے وہ جواب دیا گیا کہ ان کو ایسے امور کی ترغیب و اہمیت دلانی تھی۔ (نووی شرح البخاری صفحہ ۱/۱۲۹)

باب:۔من الايمان ان يحب لاخيه مايحب لنفسه (ایمان یہ ہے کہ اپنے بھائی کیلئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)

۱۲۔ حدثنا مسدد قال حدثنا يحيىٰ عن شعبة عن قتادة عن انس رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم و عن حسين المعلم قال حدثنا قتادة عن انس عن النبى صلى الله عليه قال: "لايومن احدكم حتىٰ يحب لاخيه مايحب لنفسه"

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکے گا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تشریح:۔ امام بخاری نے سابقہ احادیث میں اسلام کی شان بتلائی تھی کہ اس کے تحت فلاں فلاں اعمال کو خاص افضیلت حاصل ہے اب ایمان کے تحت خاص خاص فضائل کا ذکر کریں گے، اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ جن امور خیر کی تمنا و طلب اپنے لئے کرتا ہے، دوسرے بھائیوں کے لئے بھی کرے، خواہ وہ چیزیں امور دنیوی سے متعلق ہوں یا امور آخرت سے، لیکن ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کی طلب و خواہش کا تعلق کسی ناجائز امر کے متعلق نہیں ہو سکتا، اس لئے ناجائز و مکروہات شرعیہ کی طلب و تمنا نہ خود اپنے لئے کر سکتا ہے نہ دوسرے کے لئے۔

حسد وغبطہ کا فرق

اس حدیث سے حسد کی برائی بھی نکلتی ہے کیونکہ حسد کہتے ہیں، دوسرے بھائی کی اچھی حالت دیکھ کر اس کی نعمت چھن جانے کی تمنا کرنا،

جب مومن کی شان یہ ہوئی کہ دوسرے بھائی کے لئے ان چیزوں کو بھی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اچھی چیزوں کے لئے جس طرح خود اپنے لئے سعی کرتا ہے اس کے لئے بھی حتی الامکان سعی کرے تو حسد جیسی برائی سے تو خود ہی بہت دور ہو جائے گا' البتہ غبطہ کی گنجائش اس حدیث سے نکلتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے بھائی کے پاس کوئی نعمت دیکھے تو اس کی تمنا وطلب اپنے لئے بھی کرے بغیر اس کے کہ اس شخص سے اس نعمت کا زوال چاہے اس کی شرعاً اجازت ہے۔ حسد وغبطہ کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

روایت مسلم میں لجارہ کا لفظ وارد ہے یعنی اپنے پڑوسی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے' ظاہر ہے کہ پڑوسی مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور کافر بھی' اس لئے اخ سے بھی مراد عام ہی ہونا راجح ہے' حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ من الایمان کے لفظ سے ظاہر ہوا کہ یہاں ایک خصلت ذکر ہوئی ہے ایمان میں سے اور ان امور میں جہاں حدیث میں ان کے بغیر ایمان کی نفی کا حکم ہے وہ اس امر پر محمول ہے کہ ناقص کو بمنزلہ معدوم کہا جایا کرتا ہے اس سے تو امام بخاریؒ کے نظریہ کی وضاحت ہوئی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ شارع علیہ السلام کا طریقہ وعظ وتذکیر کا طریقہ ہوتا ہے اس لئے وہ ایسا طرز اختیار کرتے ہیں جس سے لوگوں کو عمل کی طرف زیادہ سے زیادہ رغبت ہو اس لئے اس قسم کی احادیث میں کمال کی تقدیر نکالنا' شارع کے مقصد کو فوت کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ سلف **من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر**۔ میں' ترک استحلال وغیرہ کی تاویل کو پسند نہیں کرتے کیونکہ تاویل سے بات ہلکی ہو جاتی ہے اور عمل کا داعیہ ختم ہو جاتا ہے۔

باب:۔ **حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان** (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایمان میں داخل ہے)

۱۳۔ حدثنا ابو الیمان قال ثنا شعیب قال ثنا ابوالزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: "والذی نفسی بیدہ لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ"

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات باری کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے آبا واجداد اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''۔

تشریح:۔ جسمانی ابوت وبنوت کا علاقہ روحانی ابوت وبنوت کے مقابلہ میں بہت کم درجہ کا اور کمزور ہے اسی لئے قرآن مجید میں جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت روحانی کا ذکر فرمایا' اس کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہوا کہ روحانی علاقہ تمام قریب ترین علاقوں پر برتر وفائق ہے' فرمایا ''**النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم** (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (روحانی علاقہ سے) مومنوں کے ساتھ' ان کی جانوں سے بھی زیادہ ولایت وقرب کا مرتبہ حاصل ہے اور آپ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں'') ایک قرات میں **وھواب لھم** بھی ہے یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے باپ ہیں پس اگر جسمانی تعلق مذکور محبت ومودت کا سبب ہوتا ہے تو مہانی تعلق محبت کا باعث کیوں نہ ہوگا بلکہ روحانی تعلق اگر کم سے کم درجہ کا بھی ہو تو وہ بڑے سے بڑے جسمانی تعلق سے زیادہ قوی ہوتا ہے اس لئے اگر یہاں محبت ہوگی تو وہاں عشق کا درجہ ہوگا اور یہاں عشق مجازی ہوگا تو وہاں عشق حقیقی کی کارفرمائی ہوگی اور عشق کا حال یہ ہے۔

عشق آں شعلہ ایست کوچوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

اور جب عشق کی لذتوں سے شناسائی حاصل ہو جاتی ہے تو عاشق عشق کی بدولت ہزار تکالیف اور رسوائیوں کو بھی بہزار مسرت وخوشی اس طرح خوش آمدید کہتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے دوائے جملہ علت ہائے ما

اے دواء نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور شیفتہ نے کہا۔

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی　　　　شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اور حالی نے یوں ادا کیا ؎

خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا　　　　سنتے تھے عشق جسے وہ یہی ہوگا شاید

معلوم ہوا کہ عشق و محبت بڑے کام کی چیز ہے مگر ایسی کار آمد اور قیمتی نعمت کو کسی فانی شے سے وابستہ کرنا نہ صرف یہ کہ اس کا بے جا مصرف ہے بلکہ بہت بڑی حماقت بھی ہے' اس لئے حدیث مذکور بالا میں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے' تاکہ اول درجہ کی محبت و عشق کا تعلق حی و قیوم سے اور اس کی وجہ سے اس کے محبوب و برگزیدہ رسول سے قائم کیا جائے' اگر صحیح معنی میں خدا اور رسول سے جیسی محبت ہونی چاہئے ہو جائے تو اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کی اطاعت سہل تر ہو جائے گی۔ ؎

ان المحب لمن یحب مطیع

(طبعاً و فطرتاً ایک محب اپنے محبوب کا مطیع ہوا کرتا ہے)

النبی اولی بالمومنین کی بہترین تشریح و توضیح دیکھنی ہو اور ''علوم نبوت'' کی سرسبز و شاداب وادیوں سے دل و دماغ کو بہرہ اندوز کرنا ہو تو حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی ''آب حیات''[1] ملاحظہ کی جائے۔

علامہ محقق حافظ بدرالدین عینیؒ نے بھی کچھ اشارہ فرمایا ہے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱۶۹/ الطبع استنبول)

بحث و نظر: یہاں یہ بحث ہے کہ **حب الرسول من الایمان** میں کون سی محبت مراد ہے' طبعی یا عقلی یا ایمانی و شرعی۔ علامہ بیضاوی نے حب عقلی مراد لی ہے کیونکہ جب طبعی ایک اضطراری امر ہے اور کسی کو اضطراری و غیر اختیاری امر کا مکلّف نہیں بنایا جا سکتا۔ بعض نے کہا کہ حب ایمانی مراد ہونی چاہئے جس کا مرتبہ حب طبعی و عقلی دونوں سے اوپر ہے لیکن ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حقیقت میں تو محبت ایک ہی ہے اس کی اقسام نکالنا فلسفیانہ موشگافی ہے البتہ جن چیزوں سے محبت کا تعلق ہوتا ہے ان کے اختلاف سے اس ایک محبت کے متعدد نام ہو گئے۔ مثلاً آباء و ابناء کے ساتھ تعلق ہو تو اس کو حب طبعی کہتے ہیں' شریعت کے ناتہ سے جن چیزوں سے تعلق ہوا اس کو حب شرعی و ایمانی کہنے لگے عقل کے راستہ سے علاقہ مفہوم ہوا تو اس کو حب عقلی کہدیا۔ چنانچہ آیت قرآنی۔ **قل ان کان آباء کم و ابنآ ء کم و ازواجکم وعشیر تکم و اموال ن اقترفتموھا وتجارة تخشون کساد ھا ومساکن ترضو نھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا الایہ** سے ظاہر ہے کہ محبت تو ایک ہی صفت ہے' جس کو میلان قلبی کہنا چاہئے اگر وہ میلان ان سب دنیوی محبوبات و مرغوبات کی طرف زیادہ ہے اور خدا اور سول اور ان کی مرضیات کی طرف کم ہے تو یہی آخرت کے بڑے خسران اور برے نتائج کا پیش خیمہ ہے' پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

''آپ ان کو بتلا دیجئے کہ تمہارے آباؤ اجداد' تمہاری آل اولاد' تمہاری بیویاں' تمہاری برادری و کنبہ و قبیلہ' تمہارے کمائے ہوئے اموال و دولت' تجارتی کاروبار جن کے فیل ہونے کا اندیشہ تمہیں ستایا کرتا ہے (عالیشان بلڈنگیں' جن میں عیش و آرام کی زندگی گزارنا تمہیں بہت پیارا ہے یہ سب چیزیں اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے اس کے رسول معظم سے اور خدا کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو (اس دنیا کی عارضی و چندروزہ زندگی کے بعد) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے عذاب و نکال کا انتظار کرو جو لوگ (کفار و مشرکین کی موالات یا

---

[1] یہ لاجواب کتاب موضوع ''حیات سرور کائنات'' صلی اللہ علیہ وسلم پر بے نظیر و بے مثال ہے راقم الحروف نے عرصہ ہوا' قیام ڈابھیل کے زمانے میں اس کی تصحیح تسہیل' تبویب اور عنوانات لگانے کی خدمت انجام دی تھی' اور اس کے اہم نظریات کی تائید و توثیق کے لئے اکابر سلف کے اقوال بھی جمع کئے تھے خدا نے مزید توفیق بخشی تو اس کو جدید ترتیب کے ساتھ شائع کرانے کی تمنا ہے۔ واللہ المیسر۔

دنیوی خواہشات میں پھنس کر) خدا کی نافرمانیاں کرتے ہیں، وہ اس کی ہدایت سے محروم رہے ہیں (سورۃ توبہ)"

حدیث میں ہے کہ جب تم بیلوں کی دم پکڑ کر کھیتی باڑی سے اس طرح دل لگالو گے کہ "جہاد" کو چھوڑ بیٹھو گے تو خدا تم پر ایسی ذلت مسلط کردے گا، جس سے تم کبھی نہ نکل سکو گے، یہاں تک کہ پھر اپنے دین (جہاد فی سبیل اللہ) کی طرف واپس آؤ۔

لـه یہاں یہ امر لائق ہے کہ احکام اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ سب سے زیادہ دشوار گذار مرحلہ ہے، جو کفر و شرک کی طاغوتی طاقتوں کے مقابلہ میں اعلاء کلمۃ اللہ دین اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عزت و سطوت کے لیے واحد نسخہ کیمیا ہے، جہاد کا حکم قیام قیامت تک باقی ہے، جب بھی اس کی ضرورت ہوگی اور مسلمان اس سے غفلت برتیں گے، ان کی دینی و دنیاوی ہلاکت و خسران یقینی ہے۔ و لا تلقوا بایدیکم الی التهلکة" میں ہلاکت سے مراد ترک جہاد ہی ہے اور حدیث صحیح میں یہ بھی ہے کہ جو مسلمان جہاد نہ کرے، اور نہ کبھی اس کے حاشیہ خیال میں جہاد کا ارادہ و تصور آئے، وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرے گا (مسلم) اعاذنا اللہ منہ)

اس کے علاوہ جہاد کے فضائل بے شمار ہیں، یہاں تک کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص بھی دنیا کی طرف واپس ہونے کو پسند نہ کرے گا، اگر چہ اس کو ساری زمین کی دولت و حکومت بھی حاصل ہو مگر شہید کہ وہ نہ صرف دنیا میں واپس ہونے کو پسند کرے گا بلکہ تمنا کرے گا تا کہ دنیا میں آکر (کم سے کم) دس مرتبہ تو پھر خدا کی راہ میں جہاد کر کے آخرت کی اس عظیم الشان عزت و کرامت کو حاصل کرے جو شہادت پر موقوف ہے۔

جہاد و شہادت کے احکام، فضائل وغیرہ اپنے موقع پر آئیں گے، یہاں صرف یہ دکھلانا ہے کہ جہاد کی جو عظیم الشان عظمت و کرامت شریعت کی نظر میں ہے، یہاں تک کہ جہاد میں نکلنے پر ایک نیکی کا ثواب سات لاکھ گنے تک وارد ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ جہاد کہتے ہیں کلمۃ اللہ کو بلند اور کلمہ کفر و شرک کو سرنگوں کے لیے نفس و نفیس کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل جانے کو، جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں اشارہ ہے کہ اگر تمہیں دنیا کی یہ ساری زندگی اور مال و متاع خدا اور رسول کی رضا مندی اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ عزیز ہے تو آخرت کی بھلائی سے مایوس ہو جاؤ، معلوم ہوا کہ ساری عبادات میں سے سب سے زیادہ شاق اور نفس پر گراں ترین عمل گھر بار کاروبار اور اعزہ و اقارب اور عمر کی ساری کمائی ہوئی دولت کی طرف سے پیٹھ پھیر کر اور ان کے تعلق و محبت سے دل کو صاف کر کے اسلام اور مسلمانوں کی عزت کو سربلند کرنے کی نیت سے نکل جانا ہے، تب اس کا ثواب اتنا بڑا ہے کہ دوسری کسی عبادت کا ثواب اس قدر نہیں مثلاً جہاد کے وقت ایک روپیہ صرف کرنے کا ثواب سات لاکھ روپے کے برابر ہے، اس زمانے میں عام طور سے ہماری تبلیغی جماعت کے افراد علماء و عوام کے ذہن میں یہ بات آگئی ہے کہ تبلیغ کے لیے نکلنے پر بھی ہر نیکی کا ثواب سات لاکھ کے حساب سے ملے گا، کیونکہ وہ بھی مثل جہاد کے ہے۔

تو اول تو کسی کو شارع علیہ السلام کا منصب اختیار کر کے یہ کہنے کا حق نہیں کہ فلاں عمل چونکہ فلاں عمل سے مشابہ ہے اس لیے ان دونوں کا ثواب برابر ہے، پھر جب کہ قرآن و حدیث کے مجموعی مطالعہ سے جہاد فی سبیل اللہ اور دوسرے اعمال کا فرق زمین و آسمان کا معلوم ہوتا ہے۔ ذروۃ سامنه الجهاد جہاد دین کے سب اعمال میں سے چوٹی کا عمل ہے، جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بغیر اعلاء کلمۃ اللہ کے دوسرے اعمال کی ادائیگی کی شان نہایت گری ہوتی رہتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جہاد کے جو کچھ فضائل و مناقب ہیں وہ مشرحہ بالا عظیم قربانیوں کے تحت ہیں، چند روز کے لیے گھر سے نکلنا، خواہ وہ تبلیغ جیسے اہم دینی مقصد ہی کے لیے ہو، جہاد کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، پھر اگر ایسا ہی قیاس کرنا ہے تو جب تین دن کے لیے گھر سے مسلمانوں ہی میں تبلیغ کے لیے نکلنا (خواہ وہ صرف ایک بستی سے دوسری بستی کے لیے ہو) جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے، اور ایسے شخص کو ہر نماز اور ہر روپیہ صرف کرنے کا ثواب سات لاکھ گنا مل سکتا ہے تو حج جیسے فرض عین کے لیے ۳-۴ ماہ کے واسطے اتنے دور دراز سفر پر نکلنے والے کو ہر نیکی پر سات لاکھ گنا ثواب کیوں نہ ملے گا، اگر اس کو بھی ملتا ہے تو کتابوں میں اس کا ذکر کیوں نہیں؟

ایک مرتبہ راقم الحروف نے تبلیغی جماعت میں کام کرنے والے ایک جید عالم سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو انہوں نے یہی کہا کہ یہ بھی جہاد کے مشابہ ہے اس لیے جہاد کی ساری فضیلت اس کو حاصل ہے اور وہ اپنی تحقیق پر مصر رہے، احقر نے خیال کیا کہ لوگوں کو رغبت دلانے کے نیک خیال سے اس قسم کی فضیلت بیان کرنے کی ضرورت سے یہ حضرات مجبور ہوئے ہیں، تو حساب لگا کر ایک بیان میں لوگوں کو بتلایا تھا کہ صرف ایک دن میں باجماعت نمازوں میں جتنا قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس کی نیکیاں شمار کی جائیں تو ۶۶ لاکھ سے زیادہ حسنات کا ثواب ملتا ہے۔ جب کہ نماز کے دوسرے ارکان، سنن و مستحبات کا ثواب الگ رہا۔ کیونکہ قرآن مجید کے ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور نماز میں پڑھنے سے ایک سو نیکیاں حدیث سے ثابت ہیں اور جماعت کا ثواب ۲۷ گنا ہے، جس کو بعض علماء نے لکھا کہ ۲۷ بار ڈبل کیا جائے۔ غرض صرف ترغیب کے لیے کچھ کہنا ہے تو اس میں علماء اور ذمہ دار حضرات کو کچی بات نہ کہنی چاہئے، اس تحریر کا مقصد صرف ایک علمی تحقیق و اصلاح ہے، تبلیغ کی ضرورت و اہمیت سے صرف نظر ہرگز نہیں، خود تبلیغ کے فضائل و مناقب بھی اپنی جگہ بے شمار ہیں اور تبلیغی جماعت کے کارنامے آب زر سے لکھے جائیں تو کم ہے، ہر مسلمان کو اس کام میں لگنا چاہیئے، دوسری اہم قابل اصلاح بات یہ ہے کہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ تبلیغی جماعت میں کام کرنے والوں کے دلوں میں علماء اسلام اور مدارس عربیہ کی وقعت کم ہو جاتی ہے، حالانکہ علماء اور مدارس عربیہ دین کے مستحکم قلعے ہیں، ان سے کٹ کر ان سے بدظن ہو کر، یا ان سے بے نیاز ہو کر جو دین کا کام ہوگا اس کے اثرات پائیدار و مستحکم نہ ہوں گے اور مجموعی حیثیت سے دین و علم کو اس سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچے گا۔ و ما علینا الا البلاغ۔

جہاد کی تشریح سے اجتناب

جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی طرف جواوپر چند اشارات ضمنی طور سے ذکر ہوئے ان کو لکھتے وقت راقم الحروف نے علماء حال کی چند تالیفات پر نظر کی جو اسلام کو مکمل طور پر پیش کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں، مگر نہایت افسوس ہے کہ ان میں اصل جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی تفصیل وتشریح کرنے سے پہلو تہی کی گئی ہے اور صرف دین کی نصرت وحمایت کا جلی عنوان دے کر کچھ لکھا گیا ہے۔ پھر شہادت کی فضیلت اور شہیدوں کا مرتبہ بتلانے کے لئے بھی صرف اتنا لکھا گیا کہ دین حق پر قائم رہنے کی وجہ سے یا دین کی کوشش وحمایت میں کسی خوش نصیب کی جان چلی جائے تو دین کی خاص زبان میں اس کو شہید کہتے ہیں، پھر آیات واحادیث میں جو مراتب شہیدوں کے ہیں وہ بھی ان ہی خوش نصیب مسلمانوں کے بتلائے ہیں جن کو بزعم خود دین کی خالص زبان میں شہید سمجھا ہے۔ جو کتابیں اسلام کا مکمل تعارف کرانے کے لئے لکھی جائیں اور ان سے ہم یہ نہ معلوم کرسکیں کہ جہاد وقتال فی سبیل اللہ بھی اسلام کا کوئی جزو ہے بلکہ دین کی خاص زبان میں شہید کا ایک جزوی ومحدود تصور بتلا کر اصل جہاد وقتال فی سبیل اللہ کو منظر عام سے بالکل ہٹادیں، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوئی، ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اصل جہاد پر روشنی ڈالیں اس کے شرائط و احکام کی شرح کریں، اور ضرورت ہو تو بھی لکھ دیں کہ ہندوستان میں اصل جہاد کے قائم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے یہاں کے حالات میں یہ بھی ثانوی درجہ میں جہاد فی سبیل اللہ ہی کی ایک قسم ہے کہ دین کی نصرت وحمایت کی جائے اگر کفار ومشرکین کو دعوت اسلامی نہیں دے سکتے اور اس کے خطرات سے دوچار ہونے کا حوصلہ نہیں، تو صرف مسلمانوں کو ہی مسلمان بنانے اور اسلام پر قائم رکھنے کی مہم جاری رکھی جائے اور اس میں کچھ تکالیف ومصائب پیش آئیں تو ان کو خدا کے لئے برداشت کیا جائے، وغیرہ اور اگر موجودہ ہندوستان میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی اتنی تشریح بھی خطرات سے خالی نہیں سمجھی گئی تو یہ بات اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ انگریزی دور سامراجیت میں جبکہ مرحوم جہاد اسلامی کے بہت سے نقوش دنیا کے مختلف خطوں پر ابھرے ہوئے تھے، اور خود ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی امام المجاہدین حضرت سید احمد صاحب شہید قدس سرہ کی قیادت میں اور پھر حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ حضرت حاجی صاحب، حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی رہنمائی میں بھی سرفروشانہ جہاد وقتال کیا تھا اور انگریزوں کو سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی جہادی اسپرٹ ہی سے رہتا تھا۔ اس وقت بھی مودودی نے الجہاد فی الاسلام ایسی ضخیم کتاب لکھ کر شائع کردی تھی آج تک ہمارے علم میں نہیں کہ ان کی کتاب ضبط ہوئی ہو یا انگریزوں نے ان کو کوئی سزا دی ہو۔ پھر ہمارے علماء "اسلام" پر کتابیں لکھتے وقت اسلام کی پوری تصویر کھینچنے سے کیوں ہچکچاتے ہیں؟۔

اگر کسی اسلامی حکم کو موجودہ احوال وظروف کی مجبوری سے عملی صورت نہیں دی جاسکتی تو اس کا علمی ونظریاتی تصور تو حاشیہ خیال میں ضرور رہنا چاہئے اگر کہا جائے کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ تو اس کے لئے مسلم شریف کی حدیث سامنے رکھیے! "**من مات ولم يغز ولم يحدث به نفسه مات على شعبة من النفاق**" (مسلم شریف صفحہ ۲/۱۴۱ مطبوعہ نولکشور)

غرض آیات واحادیث سے ثابت ہے کہ خدا اور رسول کی محبت سب چیزوں کی محبت پر غالب ... چاہئے اور ظاہر ہے کہ ان سب مرغوبات دنیوی کی محبت طبعی ہے لہٰذا خدا اور رسول کی محبت بھی طبعی ہونی چاہئے اور جب طبعی ہوگی تو عقلی وشرعی بدرجہ اولیٰ ہوگی، صحابہ کرام کے حالات پڑھنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت طبعی تھی، بطور مثال چند اشارات عرض ہیں۔

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یقیناً آپ مجھے ... سے زیادہ محبوب ہیں۔ بجز میری جان کے! آپ نے فرمایا کہ ابھی ایمان کامل نہیں اور واللہ اس وقت تک کامل نہ ہوگا کہ میں سب چیزوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ:۔ حضرت! اب وہ بات نہیں رہی اور آپ کی محبت مجھے اپنی جان عزیز سے بھی زیادہ عزیز ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:۔اب تمہاراایمان بھی مکمل ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ عقلی وشرعی نقطہ نظر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جاں نثار صحابی کو کیا تردد ہوسکتا تھا' البتہ طبعی لحاظ سے کچھ تامل تھا' جو نور مجسم ہدایت معظم کے ادنی اشارہ سے زائل ہوگیا۔

۲-حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ،فرماتے ہیں کہ احد کے موقع پر ایک رات کو میرے والد نے مجھے بلا کر وصیت کی کہ مجھے معلوم ہوا کل کو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے پہلے میں شہید ہوں گا،اپنے بعدر ہنے والوں میں نفس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم ہی مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو،مجھ پر قرضہ ہے،اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا(بخاری شریف)یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ قسم دونوں محبت کی ایک ہی تھی۔یعنی طبعی۔

۳-حضرت عبداللہ بن زید بن عبداللہ اپنے باغ میں پانی دے رہے تھے،بیٹے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سنائی تو فوراً آنکھیں بند کرلیں اور حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ جن آنکھوں سے میں نے محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا، دیکھا ہے،ان سے اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا،مجھ سے میری بصیرت لے لے،چنانچہ ان کی بصیرت جاتی رہی۔شفاء قاضی عیاض میں اور بھی بعض واقعات لکھے ہیں مثلاً:۔

۴-جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ، بھائی اور شوہر تینوں شہید ہوگئے، جب اس کو خبر ملی تو اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عافیت دریافت کی،لوگوں نے بتلایا کہ بخیر ہیں اس نے کہا کہ جب آپ زندہ وسلامت ہیں تو پھر ہر مصیبت کا جھیلنا آسان ہے۔

۵-حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہمیں مال،اولاد،والدین اور پیاس میں سرد پانی سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

۶-اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر لے چلے' تو ابوسفیان نے پوچھا کہ زید' قسم کھا کر کہو کیا تمہیں اس وقت یہ پسند ہے کہ محمد(صلی اللہ علیہ وسلم)یہاں تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے' زید نے کہا''بخدائے لایزال مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے'ابوسفیان نے کہا کہ میں نے ایسی محبت کہیں نہیں دیکھی' جیسی محمد(صلی اللہ علیہ وسلم)کے ساتھی اس سے کرتے ہیں۔

۷-تفسیر ابن کثیر میں آیت **ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا.** کا شان نزول یہ لکھا ہے کہ ایک صحابی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ مجھے آپ کی ذات سے بڑی محبت ہے' حتیٰ کہ جب گھر میں ہوتا ہوں تب بھی آپ کا ہی دھیان رہتا ہے اور جدائی شاق ہوتی ہے! تاہم یہاں تو ہم حاضری کا شرف حاصل بھی کرلیتے ہیں' زیادہ فکر یہ ہے کہ جنت میں آپ درجات عالیہ میں انبیاء کے ساتھ ہوں گے' اس وقت تو مستقل جدائی ہوگی اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں' حضور نے کوئی جواب نہیں دیا' اور وحی کا انتظار فرمایا' پھر یہ آیت نازل ہوئی' اور آپ نے اس شخص کو بلا کر بشارت سنائی۔

اسی طرح دوسرے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں' جب عقلی وایمانی' شرعی وغیرہ کی تاویل اس لئے کرنی پڑتی ہے کہ عموماً حق تعالیٰ جل ذکرہ کی رحمت عامہ وخاصہ' اس کے فضل وانعامات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات والطاف بے پایاں کا استحضار نہیں رہتا' اگر ان امور کا نقش دل پر اچھی طرح بیٹھ جائے تو ناممکن ہے کہ ان سے ہزاروں درجہ کم احسانات کی وجہ سے آباؤ اجداد' اور مال واولاد' ازواج وغیرہ سے تو حب طبعی ہو' اور خدا اور رسول سے حب طبعی نہ ہو' انسانی روح چونکہ اس قلب خاکی میں محبوس ہوکر غفلت وجہالت کے پردوں میں مستور ہوجاتی ہے' جس طرح آگ کی چنگاری راکھ کے ڈھیر میں محبوس ہو تو اس کی اصل صفات گرمی وروشنی وغیرہ بھی چھپ جاتی ہیں' اسی طرح ایمان وعقل سلیم کے صفات وملکات کے اصل مظاہر وآثار بھی دنیوی تعیشات اور فسق وفجور کی زندگی میں پڑ کر پوشیدہ ہوجاتے ہیں۔

طاعات وعبادات کی ضرورت

التزام طاعات وعبادات اور اجتناب معاصی ومنکرات کا حکم شرعی اس لئے نہایت اہتمام سے کیا گیا ہے کہ ایمان کی چنگاری معاصی و منکرات کی راکھ میں چھپ کر بے اثر نہ ہو جائے۔ اور طاعات وعبادات کے ذریعہ جلاء وحرارت پاتی رہے، یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حسب تحقیق ومشاہدہ شیخ عبدالعزیز دباغ قدس سرہ ہم سب مومنوں کے دلوں میں جو نور ایمان کی روشنی خدا کے فضل وکرم لامتناہی کے صدقہ میں موجود ہیں وہ سب گویا ایمانی بلب ہیں، جو ساری دنیا کے مرکز انوار الٰہیہ قلب منور ونور اعظم ذات محمدی علی صاحبہا الف الف صلوٰت وتحیات سے مستنیر ومستفید ہیں، جس کو حضرت مجدد صاحب قدس سرہ نے حقیقۃ الحقائق ونور الخلائق وغیرہ سے تعبیر فرمایا اور اس سلسلے کی بہت کچھ شرح حضرت نانوتوی قدس سرہ نے آب حیات وغیرہ میں کی ہے اس قسم کی تفصیلات میں موقع بموقع راقم الحروف اس لئے بھی چلا جاتا ہے تاکہ ہمارا ایمان صرف اجمالی نہ رہے، کیونکہ ایمان تفصیلی ہی سے اس قسم کی احادیث کی پوری شرح سمجھ میں آسکتی ہے اور یہی وہ علوم نبوت ہیں جن سے ایمانی روح کو غذاء روحانی ملتی ہے اور اس سے ترقی ونشو ونما حاصل ہوتی ہے واضح ہو کہ روح ایمانی کی ترقیات کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے اس کے زینے کا سب سے پہلا درجہ اعمال ہیں، اس کے بعد سارے درجات کی ترقی علوم نبوت پر موقوف ہے معلوم ہوا کہ جس درجہ پر ہم نے اکتفا کرلی ہے اور اس پر بھی ہم پوری طرح نہ چڑھ سکے وہ کم سے کم مطالبہ ہے ہمیں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی زندگی سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے کس طرح اور کتنے مدارج قرب الٰہی کے طے کئے، اور سوائے قرب نبوت کے تمام مدارج ہم بھی طے کرسکتے ہیں اور ہمارا مطمح نظر اور آخری مقصد انتہائی امکانی درجہ قرب ورضاء الٰہی ہونا چاہئے، تب ہم کچھ آگے بڑھ سکتے ہیں، اگر دنیا کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے بڑے سے بڑا مقصد ہو تو دینی ترقی کا اصول بھی یہی ہے کہ سب سے اعلیٰ مقصد کو اپنی منزل مقصود بناؤ اور حوصلہ کرکے آگے بڑھتے جاؤ حدیث[1] میں آتا ہے کہ (دخول جنت کے وقت) صاحب قرآن سے کہا جائے گا۔ قرآن مجید پڑھتے جاؤ اور اوپر چڑھتے جاؤ، جہاں رک جاؤ گے وہی تمہاری منزل ہوگی۔

۱۴ — **حدثنا یعقوب بن ابراهیم قال ثنا ابن علیة عن عبدالعزیز بن صهیب عن انس عن النبی صلی الله علیه وسلم: وحدثنا آدم بن ابی ایاس قال ثنا شعبة عن قتادة عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لایومن احد کم حتیٰ اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین.**

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو میری محبت اپنے آباؤ اجداد، اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہو جائے۔

تشریح:۔ پہلی حدیث میں صرف **من والده وولده** تھا، اس حدیث میں **والناس اجمعین** کی زیادتی ہے، جس میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری ہے ایک روایت میں **من اهله وماله** بھی آیا ہے، اپنے اہل ومال سے بھی زیادہ محبوب ہونا۔ علامہ عینیؒ نے لکھا، کہ محبت کے تین اسباب ہیں،

---

[1] یہ حدیث ترمذی وابوداؤد میں ہے، خطابی نے کہا: اثر سے ثابت ہے کہ جتنی تعداد آیات قرآنی کی ہے، اتنے ہی درجات جنت میں ہوں گے، اس لئے حامل قرآن مجید سے (جس نے اس کی تلاوت کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا ہوگا، یہ بات کہی جائیگی، اور ہر مومن اپنے ایمان وعمل کے اعتبار سے ان درجات پر فائز ہوگا۔ وہ اتنی ہی آیات پڑھ سکے گا جتنی پر عمل کیا ہوگا چنانچہ ہر ایک کا منتہی الثواب اس کا منتہی القراۃ ہوگا، لہٰذا پورے قرآن مجید، اس کی تفسیر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی شرح اور فقہی مسائل کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل اور حال وقال بنانا چاہئے، یہ تینوں چیزیں علوم نبوت کا مکمل ترین مجموعہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صرف قرآن مجید کی بھی روشنی کافی تھی اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ''کان خلقه القرآن'' فرمایا، صحابہ کرام، تابعین وائمہ مجتہدین کے لئے قرآن مجید کی تفسیر واحادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ضرورت تھی ان کے بعد آنے والے علماء وعوام کے لئے درجہ بدرجہ فقہ اسلامی کی روشنی بھی ضروری ہوئی، جو قرآن مجید، حدیث، آثار صحابہ واقوال تابعین کی روشنی میں مرتب ہوا۔ واللہ اعلم۔

کمال، جمال، جودوسخا۔ اور یہ تینوں اوصاف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود تھے، آپ کا کمال آپ کی کامل ومکمل شریعت سے ظاہر ہے، جمال جہاں آراء کا ذکر جمیل احادیث شمائل میں ہے اور آپ کا کرم وجود ظاہری وباطنی تو سارے عالم وعالمیان کو شامل ہے، پھر آپ کی محبت تمام مخلوق سے زیادہ کیوں نہ ہو اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں حاصل ہونے والے چند انعامات واکرامات کا ذکر مناسب ہے۔

(۱) پہلی امتوں پر معاصی اور کفر وشرک کے سبب عام عذاب الٰہی آتا تھا، آپ کی امت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبیت کے صدقہ میں اس سے محفوظ کردی گئی، اس کی سپاس گزاری دوسرے خواہ نہ کریں، مگر مسلمان تو بندہ احسان ہیں۔

(۲) پہلی امتوں کے لیے جسم ولباس کی پاکی کے لیے احکام بہت سخت تھے، جو اس امت کے لیے بہت نرم کردیئے گئے ہیں حتیٰ کہ تیمم تک کا جواز ہوا۔

(۳) پہلی امتوں کے واسطے اداءِ عبادت کے لئے صرف معابد مخصوص تھے، دوسری جگہ ان کی ادائیگی درست نہ تھی، اس امت کے لئے ہر جگہ عبادت کرنا درست ہے۔

(۴) اس امت کو ''خیر الامم'' کا لقب عطا ہوا

(۵) درمنثور کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''قیامت کے دن ۶۹ دوسری امتیں ہوں گی اور سترویں امت میری ہوگی، ہم سب سے آخر میں اور سب سے بہتر ہوں گے۔

(۶) ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا کہ تم ہم سے پہلے ہو اور ہم آخر میں ہیں مگر قیامت کے دن حساب میں تم سے پہلے ہوں گے (مصنف ابن ابی شیبہ ابن ماجہ وکنز العمال)

(۷) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کا انتظام ان کے انبیاء علیہم السلام فرماتے تھے، جب ایک نبی کی وفات ہوتی تو دوسرا اس کا جانشین ہو جاتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور میرے خلفاء (امت میں سے) انتظام کریں گے اور وہ بہت ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم کس طرح کریں؟ فرمایا: الاول فالاول کے بیعت کے حقوق ادا کرنا (بخاری ومسلم وغیرہ)

(۸) تورات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس امت کا بھی ذکر خیر ہوا اور ان کے اوصاف حسنہ سے امم سابقہ کو متعارف کرایا گیا مثلاً حسب روایت دارمی ومصابیح یہ اوصاف مذکور ہوئے، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اللہ تعالیٰ کی ہر وقت ثنا کرے گی، ہر حال میں حمد کریگی، ہر جگہ اس کی حمد اور ہر بلندی پر خدا کی تکبیر کہے گی۔ آفتاب کے تغیرات کا انتظار کرے گی، جب نماز کا صحیح وقت آجائے گا فوراً نماز ادا کرے گی، ان کے تہبند نصف ساق تک ہوں گے، وہ اپنے ہاتھ پاؤں دھوئے گی (یعنی وضو کے لئے) ان کا مؤذن فضاء آسمان میں اعلان کرے گا، جہاد اور نماز دونوں میں ان کی صفیں یکساں ہوں گی۔ راتوں میں ان کی (تلاوت قرآن مجید، ذکر وغیرہ کی) آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح (دھیمی وپست) ہوگی۔

(۹) اس امت کی عمریں کم مگر ثواب پہلی امتوں کے برابر ہوگا۔

(۱۰) قیامت کے دن امت محمدیہ دوسری تمام امتوں سے ممتاز ہوگی کہ ان کے اعضاءِ وضو روشن ومنور ہوں گے۔

(۱۱) قیامت کے دن سب سے پہلے یہی امت پل صراط سے گزرے گی۔

(۱۲) سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔

(۱۳) جنت والوں کی ۱۲۰ صفیں ہوں گی، جن میں بہت بڑی تعداد یعنی ۸۰ صفیں اس امت محمدیہ کی ہوں گی۔

شکر نعمتہائے تو چند آنکہ نعمتہائے تو　　عذر تقصیرات ماچند آنکہ تقصیرات ما

ترمذی شریف کی ایک روایت میں حب رسول کا آسان طریقہ بھی بیان ہوا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو کیونکہ وہ تمہیں انواع واقسام کی نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے اور مجھ سے خدا کی محبت کی وجہ سے محبت کرو اور میرے اہل بیت سے میری وجہ سے محبت کرو۔

حدیث بخاری میں "حب رسول" کا نہایت ہی بیش بہا ثمرہ بھی ذکر ہوا ہے اس طرح کہ ایک شخص نے محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کے لئے کیا کچھ تیاری کر رکھی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضرت! مجھ سے تو نہ زیادہ نمازیں پڑھی گئیں، نہ زیادہ روزوں اور صدقات کی توفیق ہوئی، البتہ اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے محبت ہے آپ نے فرمایا کہ تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گے جس سے تمہیں محبت ہوگی۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز کی رائے عالی پہلے درج ہو چکی ہے کہ حب رسول میں حب طبعی ہی مانتے ہیں، جس کی وجوہ گزر چکیں، دوسرے اس لئے بھی کہ حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اصولی طور سے بھی ایسے مواقع میں اہل عرف ولغت کے متعارف و عام معنی کو ترجیح دیتے تھے، حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی رائے یہ بھی ہے کہ نبی کریم اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے صرف اوصاف ہدایت اور اخلاق فاصلہ وغیرہ کے سبب نہیں، بلکہ آپ کی ذات اقدس کی وجہ سے بھی ہونی چاہئے۔

لہٰذا آپ اپنی ذات مبارکہ طیبہ کے سبب بھی محبوب ہیں، اور اپنے اوصاف حسنہ، ملکات فاضلہ اور اخلاق کاملہ کی وجہ سے بھی۔

صلی اللہ علیہ وسلم بعد و کل ذرة الف الف مرة.

باب حلاوة الایمان

"حلاوت ایمان کے بیان میں"

۱۵ - حدثنا محمد بن المثنی قال ثنا عبدالوھاب الثقفی قال ثنا ایوب[۱] عن ابی قلابة عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:. ثلاث من کن فیه وجدا حلاوة الایمان ' ان یکون اللہ ورسوله احب الیه مما سوا ھما وان یحب المرء لایحبه الا للہ وان یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار.

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص میں تین باتیں ہوں گی، وہ ایمان کی حلاوت پالے گا، خدا اور رسول خدا اس کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، جس سے بھی محبت کرے، خدا کے واسطے کرے، کفر وشرک اختیار کرنے سے اس قدر متنفر و بیزار ہو جس قدر آگ میں ڈالے جانے سے دور اور متنفر ہو سکتا ہے۔

تشریح:۔ علماء نے لکھا ہے کہ حلاوت ایمان سے مراد یہ ہے کہ طاعات میں لذت محسوس ہو اور خدا اور رسول کی رضا مندی کے لئے بڑی سے بڑی تکالیف بھی گوارا ہوں، حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے ان میں سے پہلا نمبر یہ ہے کہ اللہ ورسول کی محبت دوسری سب چیزوں کی محبت پر غالب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی محبت تو اس لئے کہ وہ رب الارباب، اور منعم حقیقی ہے، ساری نعمتیں اسی کے فضل وکرم سے وابستہ ہیں، رسول

---

[۱] کنیت ابوبکر نام ایوب بن ابی تمیمہ السختیانی، ولادت 68-66ھ وفات ۱۳۱ھ مشہور زہاد کبار تابعین سے ہیں، صحاح ستہ میں ان سے روایت ہیں، تہذیب صفحہ ۱/۳۹۷ میں مفصل تذکرہ اور مناقب جلیلہ ذکر ہیں، جامع المسانید صفحہ ۲/۳۸۳ میں لکھا کہ امام اعظمؒ نے بھی آپ کے روایت حدیث کی ہے، حافظ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا کہ آپ سے آٹھ سو احادیث روایت کی گئی ہیں، امام المحدثین حضرت شعبہؒ نے آپ کو سید الفقہا کہا، حماد بن زید نے اپنے سب شیوخ ومعاصرین سے افضل اور زیادہ متبع سنت کہا، دار قطنی نے حفاظ اثبات میں شمار کیا۔ ابن سعد نے ثقہ، مثبت فی الحدیث، جامع، کثیر العلم، حجت وعدل لکھا، اتنے بڑے جلیل القدر محدث سے صرف ۸ سو حدیث روایت ہوئیں اور کسی نے ان کو قلت روایت کا طعنہ نہیں دیا اور امام اعظمؒ سے ہزار ہا احادیث روایت ہوئیں تب بھی ان کو قلب روایت سے مطعون کیا گیا، درحقیقت اس دور کے محدثین خصوصاً فقہا محدثین سب ہی روایت میں نہایت محتاط تھے۔

8

کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اس لئے کہ روحانی انعامات وعلوم الٰہیہ کیلئے وہی واسطہ ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ان دونوں محبوب سے جونعمتیں حاصل ہوئیں ان میں سے سب سے زیادہ عزیز ترین دولت ایمان کی دولت ہے اور ان کی سب سے زیادہ مبغوض چیز کفر وشرک ہے لہٰذا ایمان کی دولت کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں دی جاسکتی، اور کفر وشرک کے ادنیٰ شائبہ سے بھی پوری بے زاری ونفرت ہونی ضروری ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ دنیا کے مجازی محبوبوں کی محبت کا یہ حال ہے کہ ان سے ادنیٰ تعلق رکھنے والوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے تو پھر محبوب حقیقی سے محبت کا تقاضا یہ کیوں نہ ہوگا کہ اس سے محبت کرنے والوں سے تعلق رکھنے والوں سے محبت نہ ہو، بلکہ ایک مومن مخلص کے لئے اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ جس سے بھی وہ محبت کرے یہی دیکھ کر کرے کہ وہ خدا سے بھی کچھ علاقہ ومحبت رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے "**من احب للہ وابغض للہ فقد استکمل الایمان**" (جس نے خدا کے لئے محبت کی اور خدا کے لئے بغض کیا اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا) اس تشریح سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلی دو چیزیں نہایت اہم ہیں اور تیسری چیز (حب للہ) مکملات ایمان میں سے ہے۔ **واللہ اعلم۔**

بحث ونظر: محدث عارف ابن ابی جمرہؒ نے بہجۃ النفوس صفحہ ۱/۲۵ تا صفحہ ۱/۲۸ میں حدیث مذکور کے متعلقات پر بہت اچھی بحث کی ہے اس میں یہ بھی فرمایا کہ حلاوت ایمان کے بارے میں بحث ہوئی ہے کہ وہ امر محسوس ہے یا باطنی ومعنوی بعض حضرات نے معنوی قرار دیا۔ یعنی جس میں وہ موجود ہوگی وہ ایمان میں پختہ اور احکام اسلامی کا پورا مطیع ومنقاد ہوگا یہ فقہا کی رائے ہے، دوسرے حضرات نے اس کو محسوس چیز قرار دیا، اور یہ سادات صوفیہ کی رائے ہے، صاحب بہجہ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک حق وصواب بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس سے حدیث کا مطلب بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ بات ایسی ہے کہ اس کا ادراک واحساس وہی کر سکتے ہیں۔ جو خود بھی اس مرتبہ ومقام تک پہنچے ہوں، لہٰذا ایسا دعویٰ کرنا موزوں نہیں کہ حدیث میں وہ مرتبہ ومقام مراد ہی نہیں ہے۔

واذا لم ترالھلال فسلم لاناس راوہ بالا بصار

(تو نے اگر خود چاند کو نہیں دیکھا تو ان لوگوں کی بات ہی مان لے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیا ہے) دوسرے یہ کہ سادات صوفیہ کی رائے کی تائید صحابہ وسلف اور واصلین کاملین کے حالات سے بھی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حلاوت ایمان کو محسوس طریقہ پر حاصل کرلیا تھا۔ مثلاً

(۱) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ کہ ان کو ایمان سے ہٹا کر کفر کی طرف لوٹانے کے لئے قسم قسم کی تکالیف دی گئیں مگر وہ برابر احد احد کہتے رہے، تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ عذاب وتکلیف کی تلخی ایمان کی حلاوت کے ساتھ ایسی مل گئی تھی کہ حلاوت تلخی پر غالب آ گئی تھی، اسی لئے جب ان کی موت بھی اسی حالت میں آ گئی تو ان کے گھر کے آدمی تو واکرباہ (کیسی سخت مصیبت وبلا ہے) کہتے تھے، اور وہ خود واطرباہ (کیسی خوشی ومسرت کا مقام ہے) کہہ رہے تھے پھر فرماتے تھے۔ **غدا القی الاحبہ محمداً وحذبہ**

(کل کو میں اپنے دوستوں سے ملوں گا، محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ساری جماعت سے جاملوں گا) گویا انہوں نے موت کی تلخی کو لقاء سرور دوعالم وصحابہ کی حلاوت کے ساتھ ملا کر اس تلخی کے احساس کو مغلوب کردیا تھا۔ اور یہی حلاوت ایمان ہے۔

(۲) ایک صحابی اپنا گھوڑا باندھ کر نماز پڑھنے لگے، ایک شخص آیا اور گھوڑا کھول کرلے گیا، انہوں نے نماز نہیں توڑی، لوگوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ فرمایا کہ میں جس امر میں مشغول تھا وہ گھوڑے سے بہت زیادہ قیمتی تھا، یہ بھی حلاوت ایمان ہی تھی۔

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ کسی جہاد کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کی ڈیوٹی لگائی کہ رات کے وقت لشکر اسلام کی حفاظت کے لئے جاگ کر پہرہ دیں، انہوں نے طے کیا کہ نوبت بہ نوبت ایک سو جائے اور دوسرا جاگتا رہے اور جاگنے والا نماز کی نیت باندھ کر کھڑا

ہو گیا، دشمن کے جاسوس ادھر آ نکلے اور دیکھا کہ ایک سو رہا ہے دوسرا نماز میں مشغول ہے، پہلے نماز والے کا خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ اپنی کمان کھینچ کر اس پر تیر برسانا شروع کر دیئے باوجود اس کے وہ صحابی نماز میں مشغول رہے اور زخموں کی کوئی پروا نہ کی۔ جب سارے بدن سے گرم خون بہہ کر سونے والے صحابی تک گیا تو وہ اٹھ بیٹھے اور نماز والے صحابی نے بھی نماز توڑ کر دشمن کی طرف توجہ کی اور کہا کہ اگر لشکر اسلام کی حفاظت کا خیال نہ آتا تو میں اب بھی اپنی نماز نہ توڑتا یہ بھی حلاوت ایمان ہی نہ تھی تو اور کیا تھا۔ اور اس طرح کے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔

شیخ ابو العباس اسکندرانی کا ارشاد

صاحب بہجہ کی طرح عارف کبیر ابو العباس تاج الدین ابن عطاء اللہ اسکندرانی نے بھی لکھا کہ اس حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو قلوب تندرست ہیں یعنی غفلت و خواہشات نفسانیہ وغیرہ کے امراض سے محفوظ ہیں وہ روحانی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس طرح ایک صحت مند آدمی کھانوں کے صحیح ذائقوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور مریض کو ہر اچھی چیز کا ذائقہ بھی کڑوا یا میٹھا معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ صفرا کے مریض کو شہد جیسی میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم ادہم کا ارشاد

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں خدا کے ذکر و اطاعت میں وہ لذت حاصل ہے کہ اگر شاہان دنیا کو اس کا علم ہو جائے تو ہم پر لشکر کشی کر کے اس کو چھین لینے کی سعی کریں۔

حضرت جنید رحمہ اللہ کا ارشاد

حضرت جنید رحمتہ اللہ کا قول ہے ''اهل الليل في ليلهم الذمن اهل الهوىٰ في هواهم'' یعنی دنیا والوں کو کسی لہو و لعب اور بڑے سے بڑے تعیش میں وہ لذت و سرور نہیں مل سکتا جو شب خیز لوگوں کو رات کی عبادات و ذکر الٰہی میں ملتا ہے۔

شیخ اسکندرانی کا بقیہ ارشاد

ابن عطا نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کو رب حقیقی مان کر اس کے احکام کے پوری طرح مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں وہی حقیقت میں عیش کی لذت اور تفویض کی راحت محسوس کرتے ہیں اور خدا ان سے راضی ہو کر ان پر دنیا میں بھی انعامات و اکرامات کی بارش فرماتا ہے ایسے لوگوں کے قلوب امراض روحانی سے محفوظ رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا ادراک صحیح اور ذوق سلیم رہتا ہے اور وہ پوری طرح ایمان کا ذائقہ اور حلاوت حاصل کر لیتے ہیں۔ (فتح الملہم من المواہب و شرحہ۔ صفحہ ۱/۲۱۷)

صاحب بہجۃ النفوس وغیرہ کی مذکورہ بالا تحقیق بہت اونچی ہے، مگر جو واقعات و شواہد انہوں نے بیان فرمائے ہیں، وہ جس طرح حلاوت محسوسہ کی دلیل بن سکتے ہیں، حلاوت معنویہ کی بھی بن سکتے ہیں اور روحانی امور میں معنوی حلاوت ہی زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ نووی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ علماء کے نزدیک حلاوت سے مراد طاعات کو لذیذ و محبوب سمجھنا، خدا اور رسول کے راستہ میں تکالیف و مصائب کو بخوشی برداشت کرنا، اور ان کو دنیوی مرغوبات پر ترجیح دینا ہے (شروح البخاری صفحہ ۱۳۹)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کے استعارہ سے زیادہ و نقصان ایمان پر استدلال کرنا چاہا ہے (کما اشار الیہ شیخنا الانور) لیکن حلاوت کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ اس حدیث میں ارکان و اجزاء ایمان کا بیان مقصود نہیں بلکہ مکملات ایمان کی تفصیل مقصود ہے، اسی لئے جو چیزیں اس میں بیان ہوئیں وہ سب ایک درجے کی نہیں، اور غالباً اسی طرف علامہ قسطلانی نے اشارہ کیا ہے، انہوں نے لکھا کہ:-

هذا (باب حلاوۃ الایمان) والمراد ان الحلاوۃ من ثمراتہ فھی اصل زائد ملیہ" (مراد یہ ہے کہ حلاوت ایمان کے ثمرات میں سے ہے لہٰذا وہ اس کے لئے بطور اصل زائد ہے) یعنی جس طرح ایمان کو قوت واستحکام پہنچانے والے اور اس کی تکمیل کرنے والے اور بہت سے امور ہیں ان تین باتوں سے بھی ایمان میں کمال بطور استلذ اذ طاعات پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایمان کے زیادۃ ونقص پر ہم پہلے بہت کچھ لکھ آئے ہیں جو کافی وشافی ہے وللہ الحمد۔

علمی فائدہ

عود کا صلہ عموماً الیٰ ہوتا ہے اس حدیث میں فی کیوں آیا ہے؟ اس کا جواب علامہ کرمانی اور حافظ ابن حجر نے یہ دیا ہے کہ عود متضمن ہے معنی استقرار کو گویا "ان یعود مستقرا فیہ" کہا گیا ہے، مگر امام عربیت حافظ عینی نے اس امر پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ یہ بے ضرورت تاویل بعید ہے پھر فرمایا کہ یہاں فی بمعنی الیٰ ہی ہے جس طرح دوسری آیت اولتعودن فی ملتنا وللہ درہ۔

اشکال وجواب

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مما سواھما فرمایا حالانکہ ایک خطبہ پڑھنے والے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر فرمائی تھی جس نے ومن یعصھما فقد غویٰ کہا تھا اگر ایک کلمہ میں دونوں کو جمع کرنا ناپسند تھا تو اس کو خود کیوں اختیار فرمایا؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں جو حافظ عینی نے نقل فرمائے ہیں۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت میں جمع فرمایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کی محبت ضروری ہے ایک کی کافی نہیں اور معصیت والی صورت میں منع فرمایا کیونکہ نافرمانی صرف ایک کی بھی مضر ہے یہ جواب قاضی عیاض کا ہے۔

(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کو اس لئے منع فرمایا کہ اس سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ کہنے والا دونوں کو ایک مرتبہ میں سمجھتا ہے مگر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چونکہ ایسا وہم نہیں ہوسکتا اس لئے آپ کے جمع فرمانے میں کوئی مضائقہ نہیں پس یہ آپ کے خصائص سے ہوا۔

(۳) خطبہ کا مقام ایضاح وتفسیر کا ہوتا ہے اس لئے جمع واختصار کو ناپسند فرمایا اور احادیث میں بیان حکم کے موقع پر اختصار موزوں ہے تاکہ اس کو مختصر ہونے کی وجہ سے بسہولت یاد کرلیا جائے چنانچہ سنن ابی داؤد وغیرہ کی حدیث میں جمع کے ساتھ وارد ہے۔

من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فلا یضر الا نفسہ۔

(۴) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطیب کو افراد کا حکم اس لئے دیا کہ وہ مقام حق تعالیٰ کا ذکر مستقلاً الگ کرکے زیادہ سے زیادہ تعظیم کے اظہار کا تھا یہ جواب اصولیوں کا ہے (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۷۵)

(۵) ہمارے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ جواب پسند تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطیب کو بطور تادیب وتہذیب روکا تھا جس طرح قرآن مجید میں "لاتقولوا راعنا" ادب وتہذیب سکھانے کے لئے فرمایا گیا ہے اس جواب سے ایک زیادہ معتدل صورت بن جاتی ہے جو قرآن وسنت سے زیادہ موافق ہے۔ واللہ اعلم

باب

علامۃ الایمان حب الانصار"۔ (انصار کی محبت علامت ایمان ہے)

۱۶۔ حدثنا ابوالولید قال ثنا شعبۃ قال اخبرنی عبداللہ بن جبیر قال سمعت انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال آیۃ الایمان حب الانصار وآیۃ نفاق بغض الانصار

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض نفاق کی علامت ہے۔

تشریح:۔ پہلے امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے مطلق محبت کی فضیلت کا ذکر کیا تھا' جو خدا کے لئے ہر ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے' اب ایک خاص گروہ کی محبت کا ذکر لائے اور ان میں سے بھی انصار کو منتخب کیا' جن کی محبت نظر شارع علیہ السلام میں ایمان کی علامت ہے۔ اور ابتدا سے ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے ایمان کا ذکر ہوا' پھر اس کی حلاوت کا بیان ہوا اور اب اس کی علامت بتلا رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا قرآن و حدیث کو سمجھنے کا ایک خاص طرز تھا اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ فلاں حدیث کا مضمون فلاں آیت سے مستنبط ہے یا فلاں حدیث فلاں آیت کے مضمون کی تشریح ہے وغیرہ' حضرت کا یہ طرز تحقیق نہایت گرانقدر تھا اسی لئے حضرت علامہ عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری بہت بڑی کوشش ہوگی تو ہم کتابوں کا مطالعہ کر کے مسائل کی تحقیق کر لیں گے مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی رسائی مسائل کی ارواح تک تھی جو ہمارے بس کی بات نہیں۔ **وفوق کل ذی علم علیم۔**

یہ حضرت عثمانیؒ کا ارشاد تھا جو وسعت مطالعہ اور علم و فضل خداداد کے لحاظ سے اپنے زمانے کے فرد بے مثال تھے۔ **متعنا اللہ بعلومہ النافعہ۔**

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس حدیث الباب کے بارے میں فرمایا کہ اس کا ماخذ قرآن مجید کی آیت "**والذین تبوؤا الدار والایمان**" ہے یعنی حق تعالیٰ نے سورہ حشر کی ان آیات میں انصار کے فضل و شرف' کرم وجود' حب و ایثار وغیرہ اوصاف کا بیان فرمایا ہے اور یہ وصف بھی خاص طور سے بیان فرمایا کہ جنہوں نے مہاجرین کی آمد مدینہ منورہ سے پہلے مدینہ طیبہ اور ایمان کو اپنا گھر بنا لیا تھا' مدینہ طیبہ کو گھر بنانا تو ظاہر ہے مگر ایمان کو گھر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھر میں بیٹھ کر آدمی اس میں محفوظ ہوتا ہے اسی طرح انصار ایمان کے گھیرے اور احاطہ میں آچکے تھے' ایمان بطور ظرف تھا اور وہ مظروف تھے' ایمان کے در و دیوار ان کے چاروں طرف تھے اور وہ ان کے بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے' جس طرح اہل جنت کا حال مذکور ہے "**ان المتقین فی جنات ونھر فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر**"۔

(متقین' جنتوں اور نہروں میں' سچائی کے گھر میں' سب سے بڑے با اقتدار بادشاہ کے قرب سے سرفراز ہوں گے) اس سے پہلے مجرمین کفار و مشرکین کے لئے فرمایا تھا کہ وہ گمراہی اور آگ کی لپٹوں میں گھرے ہوں گے' گویا جرم کفر و شرک کی سزا آخرت میں یہ ہوگی کہ ان کی دنیا کی گمراہی و طغیان و عصیان' وہاں ان کو آگ کی لپٹوں کی شکل میں مجسد ہو کر محصور کئے ہوگی اور چونکہ متقین نے سچائی اختیار کی تھی تو آخرت میں وہ ایمان و ہدایت کی سچائی مجسد ہو کر مقعد صدق بن جائے گی۔ کیونکہ یہاں جتنی چیزیں مستور ہیں مثلاً معانی و اعراض وہ سب آخرت میں مجسد و محسوس ہو جائیں گی۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مومن کا گھر ایمان و ایمانیات ہے وہ ان کے حصار میں رہ کر کفر و شرک کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے اور اعمال صالحہ باہر سے اس گھر کی حفاظت بطور قلعہ اور اس کی خندقوں وغیرہ کے کرتے ہیں' اعمال صالحہ کے قلعہ میں محصور ہو کر ایک مومن فسق و فجور اور معاصی کی یلغار سے محفوظ رہتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ رسی

خیال کیجئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی دور رس نظر نے کتنی اونچی بات کا کھوج لگایا۔ جس سے ایمان و کفر اور عمل صالح و معاصی کی صحیح پوزیشن واضح ہوگئی اور فی ضلال و سعر' اور تبوؤا الدار والایمان کی بہترین تفسیر بھی بغیر کسی تاویل بعید کے سمجھ میں آگئی' اور یہاں اس

حدیث میں انصار کی محبت کو علامت ایمان فرمانے کی وجہ بھی روشن ہوگئی' ایک تو یہ کہ سب سے پہلے مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ جا کر اسلام سے مشرف ہونے والے یہ لوگ تھے جس کی تفصیل آگے آتی ہے) پھر ان کا ایمان و اسلام بھی کامل و مکمل اور تقلیدی تھا کہ سب مسلمانوں کا ایمان اس شان کا ہونا چاہئے' ان کے ایمان کی قیمت اتنی زیادہ قرار دی گئی کہ مہاجرین کو ان کی محبت کی ترغیب دی گئی۔ حالانکہ مہاجرین کے درجات خود اپنی جگہ نہایت بلند تھے' ان کے مستحکم ایمان اور عظیم الشان قربانیوں کی مثال نہیں مل سکتی' اور صرف ہجرت ہی بہت بڑی فضیلت ہے' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں اپنا شمار انصار میں کراتا (بخاری) بلکہ اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو انصار کی محبت وغیرہ کی ترغیب سے مقصد بھی ان کے فضائل کو نمایاں کرنا اس لئے ہے کہ ان کے فضائل حضرات مہاجرین کے فضائل و مناقب کے مقابلے نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے دوسرے یہ کہ مہاجرین میں اکثر حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت تھے' ان سے محبت آپ کی قرابت کے سبب بھی ہر مسلمان کو فطری طور سے تھی لیکن انصار مدینہ بظاہر اجانب تھے' ان کی محبت سے ذہن غافل ہو سکتا تھا اس لئے تنبیہ فرمادی کہ ان کی محبت بھی اس لحاظ سے فطری ہونی چاہئے کہ انہوں نے بھی اہل بیت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ "والذین تبوؤ االدار و الایمان یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "ایمانی گھر" کی نسبت سے جس طرح مہاجرین آپ کے اہل بیت ہیں' ایسے ہی انصار بھی ہیں۔ اس کے بعد اسی روحانی و ایمانی رشتہ سے سارے مومنین و متقین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ہیں اور ایک حدیث میں ایک ایسا مضمون بھی ہے کہ ہر تقی و نقی مسلمان میری آل میں داخل ہے۔

النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم و فی قراء ۃ وھواب لھم. واللہ اعلم و علمہ اتم واحکم.

انصار مدینہ کے حالات

انصار کا اصل وطن مدینہ طیبہ نہ تھا' بلکہ وہ سبا کی بستیوں میں یمن کے علاقہ میں رہتے تھے جب سبا پر تباہی آئی تو ایک کاہنہ نے اطلاع دی کہ ان بستیوں پر جلد ہی خدا کا عذاب آنے والا ہے' جو اس سے بچنا چاہے یہاں سے نکل جائے' چنانچہ قبیلۂ سبا کے لوگ اور بنوقیلہ (انصار مدینہ کے آباؤ اجداد) ادھر ادھر منتشر ہوگئے' کچھ لوگ شام چلے گئے' اور بنوقیلہ کے دو قبیلے اوس و خزرج مدینہ طیبہ میں آکر مقیم ہوگئے۔

اس وقت مدینہ طیبہ میں یہود کا تسلط تھا' ان میں تین قبیلے بڑے تھے' بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ' بنوقینقاع سب سے بہادر تھے' لوہاری کا پیشہ کرتے تھے' یہودیوں نے اوس و خزرج کو اس شرط پر اقامت مدینہ کی اجازت دی کہ جب کسی کے یہاں شادی ہوگی' اسے سب سے پہلی رات میں دلہن کو ہمارے یہاں بھیجنا پڑے گا' ان لوگوں نے مجبوری میں اس شرط کو قبول کر لیا' مگر خدا کو ان کی حفاظت منظور تھی' جس کی صورت یہ ہوئی کہ جب شادی ہوئی تو وہ شادی شدہ لڑکی منہ کھول کر سارے مجمع کے سامنے آگئی' مجمع میں جو اعزہ و اقرباء موجود تھے انہوں نے اس کو بے حجابی پر عار دلائی تو اس نے کہا کہ مجھ سے پہلے تمہیں بے غیرتی کا ماتم کرنا چاہئے کہ مجھے غیر شوہر کے پاس بھیجنے پر راضی ہو۔

اس پر ان لوگوں کی غیرت و حمیت کو بھی جوش آیا اور تہیہ کر لیا کہ اس ذلت کو ہرگز گوارہ نہیں کریں گے اور ضرورت ہوئی تو یہود مدینہ سے جنگ بھی کریں گے' جنگ کی تیاری کی اور خدا کے بھروسہ پر وہ لوگ یہود سے بھڑ گئے' اور خدا نے ان کو یہود پر غالب کر دیا' اس کے بعد یہود مدینہ اوس و خزرج سے کہا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں کے ظہور پر ہم تمہاری ان حرکات کا جواب دیں گے' اوس و خزرج کو بھی ان کی اس بات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی امید ہوگئی تھی پھر موسم حج پر جو لوگ مکہ معظمہ جاتے تھے' ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی بھی خبریں آنی شروع ہوگئیں' اور ان لوگوں نے ارادہ کر لیا کہ ہم یہود سے بھی پہلے نبی آخر الزماں پر ایمان لائیں گے۔

اوس و خزرج میں سے پہلا قافلہ موسم حج پر مکہ معظمہ پہنچا اور منیٰ میں جمرہ عقبہ کے مقام پر ٹھہرا' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ اسلام کے

لئے ان کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے کہا کہ ہمارے چند آدمی باہر گئے ہیں، ہم ان سے مشورہ کرلیں گے آپ شب کو تشریف لائیں، مشورہ میں طے پایا کہ یہ وہی پیغمبر آخرالزمان معلوم ہوتے ہیں جن کے ساتھ مل کر یہود ہمیں استیصال کی دھمکیاں دیا کرتے تھے، اس لئے موقع غنیمت ہے، ہمیں ان کی بات قبول کرلینی چاہئے، پھر جب آپ رات میں تشریف لے گئے تو ان بارہ آدمیوں نے دعوت اسلام قبول کرلی اس رات کو لیلتہ العقبہ کہا جاتا ہے، اور اس مقام جمرہ عقبہ پر انصار سے دو بیعتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔ ایک یہی ہے کہ جو اسلام کی سب سے پہلی بیعت ہے دوسری بیعت انصار سے اگلے سال لی ہے جس میں ستر انصاری تھے، انصار میں سے جن لوگوں نے پہلے بیعت کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا عہد کیا وہ ''نقباء الانصار'' کہلائے گئے، کیونکہ نقیب قوم کے ناظر نگراں وسردار کو کہتے ہیں۔

ایک انصاری جنتی کا واقعہ

حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں **والذین تبوء وا الدار الایمان الایة** کے ذیل میں ایک حدیث بروایت امام احمدؒ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں، ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا کہ ابھی تمہارے پاس ایک شخص اہل جنت میں سے آئے گا، اتنے میں ایک انصاری آئے جن کی ریش مبارک سے وضو کے قطرات گر رہے تھے اور انہوں نے اپنے دونوں چپل اپنے بائیں ہاتھ میں لٹکا رکھے تھے، اگلے روز بھی آپ نے اسی طرح فرمایا اور شخص مذکور اسی شان سے حاضر مجلس ہوئے، تیسرے دن بھی آپ نے اسی طرح فرمایا، اور وہ اسی طرح آئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص ان انصاری کے ساتھ ہوئے اور کہا کہ میرا باپ سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور میں نے قسم کھالی ہے کہ تین دن تک ان کے پاس نہ جاؤں گا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو اتنے وقت کے لئے مجھے اپنے پاس ٹھہرالیں۔ انصاری نے فرمایا، بہت اچھا!

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ وہ تین رات ان انصاری کے پاس رہے (تاکہ ان کی شب وروز کی پوری زندگی کا مطالعہ کریں) دیکھا کہ کسی رات میں بھی اٹھ کر عبادات نہیں کی، بجز اس کے کہ رات کو جس وقت بھی نیند سے بیدار ہوتے تو اپنے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے خدا کا ذکر و تکبیر ضرور کرتے، حتیٰ کہ صبح کی نماز کے لئے اٹھ بیٹھتے تھے دوسرے یہ کہ کبھی میں نے ان کو سوائے خیر کے کوئی بات کہتے نہیں سنا، جب تینوں راتیں گزر گئیں اور مجھے ان کے اعمال شبانہ روز کی کوئی وقعت محسوس نہ ہوئی تو مجھے ان سے کہنا پڑا کہ بھائی واقعہ یہ ہے کہ میرا باپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا نہ میں نے ان کو چھوڑا، میں نے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار سنا تھا کہ ایک جنتی شخص آرہا ہے اور تینوں دن آپ ہی آئے اس لئے ارادہ کیا کہ آپ کے پاس رہ کر دیکھوں کیا عمل کرتے ہیں تو میں نے کوئی بہت بڑا عمل آپ کا نہیں دیکھا، اب آپ ہی بتلایئے کہ اس مرتبے کو کس طرح پہنچے؟ (کہ دنیا ہی میں جنتی ہونے کی بشارت مل گئی، انصاری نے فرمایا کہ عمل تو میرا اتنا ہی ہے جو آپ نے دیکھا، میں یہ سن کر لوٹ پڑا تو انہوں نے بلایا اور پھر کہا کہ عمل تو اتنا ہی ہے جو آپ نے دیکھا البتہ اتنی بات اور ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کھوٹ کی بات (کینہ، عداوت وغیرہ) نہیں رکھتا اور نہ کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر حسد کرتا ہوں، حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے آپ اس مرتبہ پر پہنچے ہیں اور یہ وہ بات ہے جو ہر شخص کی طاقت و وسعت سے باہر ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

غرض انصار مدینہ کے اسی قسم کے باطنی اخلاق اور کمال ایمان کے اوصاف تھے، اور ان کی ابتداء اسلام کی بے نظیر خدمات تھیں جن کی وجہ سے ان کی محبت ایمان کی علامت قرار پائی، اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ٹھہرائی گئی۔ **اللھم اجعلنا معھم ومع من احبھم برحمتک وفضلک.**

باب (۱۷) حدثنا ابوالیمان قال حدثنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی ابوادریس عائذالله بن عبدالله عن عبادة بن الصامت وکان شهد بدرا وهو احد النقباء لیلة العقبة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال وحوله عصابة من اصحابة بایعونی علیٰ ان لا تشرکوا بالله شیئا ولاتسرقوا ولاتزنو ولاتقتلوآ اولادکم ولاتاتو ببهتان تفترونه بین ایدیکم وارجلکم ولاتعصوانی معروف فمن وفی منکم فاجره علی الله ومن اصاب من ذلک شیئاً فعوقب فی الدنیا فهو کفارة له ومن اصاب من ذلک شیئًا ثم ستره الله فهو الی الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه فبایعناه علی ذلک.

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ جو بدر کی لڑائی میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ کے نقیبوں میں سے تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جب آپ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی یہ فرمایا کہ مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے، اپنی نسل کشی نہ کرو گے، اور نہ عمداً کوئی بہتان باندھو گے، اور کسی اچھی بات میں (خدا کی) نافرمانی نہ کرو گے، جو کوئی تم میں (اس عہد کو) پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان (بری باتوں) میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے، اور اسے دنیا میں سزا دے دی گئی تو یہ سزا اس کے (گناہوں) لیے کفارہ ہو جائے گی۔ اور جو کوئی ان میں سے کسی بات میں مبتلا ہو گیا اور اللہ نے اس (گناہ) کو چھپا لیا تو وہ (معاملہ) اللہ کے سپرد ہے اگر چاہے معاف کر دے اور اگر چاہے سزا دے دے (عبادہؓ کہتے ہیں کہ) پھر ہم سب نے ان (سب باتوں پر) آپ سے بیعت کر لی۔

تشریح: یہاں امام بخاری نے صرف باب کا لفظ لکھا اور کوئی ترجمہ یا عنوان قائم نہیں کیا جس کی وجہ اکثر شارحین بخاری نے یہ لکھی ہے کہ اس باب کی حدیث باب سابق سے ہی متعلق ہے گویا اس کا تتمہ ہے کیونکہ اس میں انصار کی وجہ تسمیہ اور وجہ فضیلت ظاہر کی گئی ہے، پہلے وہ بنو قیلہ کہلاتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "انصار" کا لقب مرحمت فرمایا اور ان کے دینی فضائل کی وجہ سے ان کی محبت کو ایمان کی علامت فرمایا، اس حدیث میں انصار کہلانے کی وجہ اور فضیلت کا بھی اظہار ہے کہ مکہ معظمہ کی زندگی میں (ایسے وقت کہ تقریباً سارے اہل مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کے سخت مخالفت کر رہے تھے اور حضور کو اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی ایذائیں دے رہے تھے) انصار کا پہلا قافلہ حج کے موسم میں مکہ معظمہ پہنچتا ہے اور منی میں جمرہ عقبہ کے پاس جہاں حاجی ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو رمی جمار کرتے ہیں۔ قیام کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام و نصرت اسلام کے لئے بیعت کی۔

اس حدیث کی روایت کرنے والے بھی ایک جلیل القدر صحابی انصاری حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہیں، جو لیلۃ العقبہ کی اس پہلی بیعت میں بھی شریک تھے۔ اور اگلے سال دوسری بیعت میں بھی شریک ہوئے جس میں ستر (۷۰) انصار نے مدینہ طیبہ سے آکر اسی مقام پر بیعت کی تھی اس کے علاوہ بدر احد بیعت رضوان اور تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، امام اوزاعی نے فرمایا کہ سب سے پہلے فلسطین کے قاضی بھی عبادہ ہی تھے، ۷۲ سال کی عمر میں ۳۴ھ میں وفات پائی آپ سے ۱۸۱ حدیثیں مروی ہیں امام بخاری نے آپ سے ۸ یا ۹ حدیث روایت کی ہیں۔

اس حدیث کی روایت کرنے والے سب شامی ہیں اور اس ایک ہی حدیث میں تحدیث، اخبار اور عنعنہ تینوں صورتیں روایت حدیث کی جمع ہیں اس میں ایک قاضی کی روایت دوسرے قاضی سے ہے، ابوادریس بھی قاضی تھے۔ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے روایت کی ہے کیونکہ ابوادریس بھی صحابی ہیں۔

بحث و نظر: اس حدیث میں احکام اسلام پر بیعت فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سارے احکام کی پابندی کرے وہ پورے اجر کا مستحق ہے جو معاصی کا مرتکب ہوا اور دنیا میں عقاب کی زد میں بھی آ گیا تو وہ عقاب اس کے لیے معاصی کا کفارہ ہو گیا

اور جو یہاں اس سے بچ گیا تو اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، چاہے گا بخش دے گا، چاہے گا عقاب دے گا۔

اس وضاحت سے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ارجاء سنت کی حقیقت ثابت فرمادی، اور بعینہ یہی ارشاد ہے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تابعین اور دوسرے سلف وخلف کا بھی، جس پر امام بخاریؒ نے خاص طور سے امام صاحب کو مطعون کیا کہ وہ تو مرجئ تھے وغیرہ، اور قرآن مجید میں تو **و آخرون مرجون لا مر اللہ اما یعذ بھم و اما یتوب علیھم** (توبہ) میں تو ارجاء کا لفظ ہی ذکر فرمادیا، اب ظاہر ہے کہ خدا کے نزدیک مرتکب معاصی تو مرجون ہیں، ان کے لیے یہی خدا کا فیصلہ بتلانے والے مرجئ ہیں۔ تو جس امر کی اجازت خود اللہ تعالیٰ دیں اور ابھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی وہی بات نکلی پھر ان کے اتباع میں اگر امام صاحب وغیرہ نے بعینہ یہی بات کہی تو ان کو بطور طعن وطنز مرجئ کہنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ ہاں! ارجاء بدعت ضرور بدعت ہے اور اس سے امام صاحب خود ہی بری وبیزار ہیں، اگر اس معنی سے ان کو مرجئ کہا جائے تو یہ ظلم فوق ظلم ہے۔

حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟

اس حدیث میں جو عقوبت کو کفارۂ معاصی فرمایا گیا ہے، اس کی وجہ سے یہ بحث بھی چھڑ گئی ہے کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟ کسی معصیت پر شرعی حد لگ جانے پر اگر وہ مجرم توبہ[1] اور انابت الی اللہ بھی کرے تو اس جرم کے اثرات ظاہری و باطنی، دنیوی و اخروی سب ختم ہو جاتے ہیں، التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ اس صورت میں سب کا اتفاق ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جرم کیا مثلاً زنا، سرقہ وغیرہ اور جرم ثابت ہونے پر حد لگ گئی لیکن توبہ یا توبہ کے کچھ آثار ظاہر نہ ہوئے تو کیا صرف حد لگنے سے بھی وہ پاک صاف ہو گیا یا نہیں، اس میں اختلاف ہے امام اعظم اور دیگر ائمۂ احناف فرماتے ہیں کہ حد صرف دنیوی زجر وتنبیہ ہے، دنیاوی اعتبار سے حد کا مقصد حاصل ہو گیا کہ اس کو تنبیہ ہوگئی اور دوسروں کو اس سے عبرت ملی، اور اب اس کو دنیا والے۔ زانی یا سارق کہہ کر پکار بھی نہیں سکتے، لیکن آخرت کا مواخذہ ختم کرنے اور پوری طرح پاک صاف کرنے والی چیز توبہ ہے **و من لم یتب فاؤلئک ھم الظالمون** (حجرات) غرض احناف کے نزدیک بغیر توبہ کے صرف حد کافی نہیں۔ خصوصاً جب کہ جرائم پیشہ لوگ یا عادی مجرم ہمیشہ زنا، سرقہ، شرب خمر وغیرہ کے عادی ہوتے ہیں اور ان پر حد بھی لگتی رہتی ہے، کیونکہ وہ صحیح معنی میں دل وزبان سے توبہ نہیں کرتے، اس کے برعکس شوافع کی رائے یہ ہے کہ حد سے گناہ بالکل دھل جاتا ہے، توبہ کرے یا نہ کرے، یہ حد ہی اس کے لیے توبہ کا قائم مقام ہے، امام بخاری کی رائے بھی شوافع کے ساتھ ہے چنانچہ کتاب الحدود میں ایک باب ''الحدود کفارۃ'' صفحہ ۱۰۰۳ میں آئے گا اور وہاں امام بخاری نے یہی عبادہ والی حدیث پیش کی ہے، ہم اس بحث کو مکمل طور پر انشاء اللہ تعالیٰ اسی مقام پر لکھیں گے اور بتلائیں گے کہ قرآن حدیث اور علم وعقل کی روشنی میں ائمۂ حنفیہ کا مسلک نہایت قوی ہے، یہاں مختصراً حضرت شاہ صاحب کی تحقیق عرض ہے کہ قرآن مجید میں کہیں بھی حدود کو کفارہ نہیں کہا گیا، بلکہ آیت **السارق و السارقة فاقطعوا ایدیھما الآیۃ** میں تو تفصیل کے ساتھ فرمایا گیا کہ قطع ید بطور سزاء ہے اس کے بعد اگر وہ توبہ کرے گا اور اپنی حالت کی اصلاح کرلے گا (جو توبہ ہی کا جزو ہے) تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ عموماً چونکہ حدود کے ضمن میں توبہ ہوتی ہے، خصوصاً صحابۂ کرام کے حالات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، اس لیے بعض احادیث میں حدود کا مطلقا کفارہ ہونا بیان ہوا ہے۔

حضرت ماعز[2] رضی اللہ عنہ اور امرأۃ غامدیہ کا بار بار اپنے جرم کا اقرار اور حد رجم کو بخوشی قبول کرنا، ان کی سچی توبہ کو ظاہر کرتا ہے حضرت شاہ

---

[1] حقیقت میں توبہ تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اندم (کہ اپنے گناہوں پر نادم ہو جائے اور سمجھے کہ مجھ سے خدا کی نافرمانی ہوئی) اقلاع (کہ اس گناہ کو ترک کر دے) عزم علی الترک (کہ آئندہ اس معصیت کو ترک کرنے کا عزم اور پختہ ارادہ کرے)

[2] حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے خود حاضر ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ سے زنا کا جرم ہو گیا ہے آپ نے بار بار ان کو ٹالا کوئی شک وشبہ کی بات نہ رہے، مگر وہ برابر اقرار کرتے رہے، تب ان کو رجم کیا گیا، اس کے بعد کچھ لوگوں نے کہا کہ ماعز برباد ہوئے، کتنی بڑی معصیت کی ہے؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صاحبؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہاں نظری اختلاف ہے مسئلہ کا اختلاف نہیں ہے اور نظر حنفیہ کی اصوب ہے۔

حدیث عبادہ مذکور کے مقابلہ میں دوسری حدیث حضرت ابو ہریرۃؓ کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"میں نہیں جانتا کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں"، اس کو حاکم نے مستدرک میں بہ سند صحیح روایت کیا' ان دونوں حدیثوں پر محدثانہ بحث حافظ عینی و حافظ ابن حجر نے کی ہے' جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) دوسروں نے کہا نہیں' ان کی توبہ سے بڑی کس کی توبہ ہو سکتی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں تشریف لائے اور فرمایا کہ ماعز کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرو' انہوں نے دعاء مغفرت کی' پھر فرمایا کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت پر تقسیم کی جائے تو اس کو بھی کافی ہو سکتی ہے (مسلم باب حدالزنا)

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف رجم کفارہ نہیں' چنانچہ آپ نے دعا مغفرت کرائی' حالانکہ خود اپنے اقرار سے رجم کئے گئے تھے جس سے ندامت وغیرہ توبہ کے ارکان کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے' دوسرے یہ کہ اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماعز کی توبہ میں کوئی کمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمائی ہوگی اور شاید اسی لیے دعائے مغفرت کرائی' بخلاف غامدیہ صحابیہ کے وہاں اکثر روایات سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے اور ان کے واقعہ میں حضور کا ان کے لیے دعاء مغفرت کرانا بھی ثابت نہیں' دونوں کے واقعات میں وجہ فرق یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ صحابیہ نسبتاً ماعز سے زیادہ مستقل مزاج اور خدا کی حد پر صبر کرنے والی تھیں' جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت ماعز نے اقرار جرم کیا' حضور نے سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیا' حضرت ماعز کچھ دور جا کر واپس ہوئے پھر اقرار کیا' اور اس طرح چار بار اقرار کیا' تھوڑے وقت میں خیال بدلنے کا احتمال کم ہوتا ہے' بخلاف صحابیہ مذکورہ کے کہ انہوں نے اقرار کیا' حضور نے واپس کر دیا' انہوں نے پھر حاضر ہو کر اقرار کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ حضور! آپ شاید مجھے ماعز کی طرح لوٹا رہے ہیں خدا کی قسم مجھے تو حمل بھی زنا سے ہی ہے (یعنی مجھ پر رجم کی سزا خود ہی جاری ہونی چاہیے۔ ٹلنی نہیں چاہیے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اچھا ایسا ہے تو ولادت کے بعد حد لگے گی۔ صحابیہ چلی گئیں' ولادت کے بعد خبر بھیجی یا بچہ کو لے کر خود حاضر ہوئیں (دونوں روایت ہیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ کو دودھ پلاؤ پھر آنا' اس کے بعد وہ بچے کو دودھ پلاتی رہیں حتیٰ کہ وہ روٹی کا ٹکڑا منہ میں لینے لگا (یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دستور یہی تھا کہ دودھ پلانے کے بعد جب تک بچہ روٹی کا ٹکڑا منہ میں نہ لینے لگے' وہ رضاعت ہی میں رہتا ہے' جس سے مدت رضاعت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق دو سال سے زیادہ اڑھائی سال کے اندر ثابت ہوتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ (چوتھی بار) صحابیہ مذکورہ بچہ کو اسی شان سے لے کر حاضر ہوئیں کہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا' انہوں نے عرض کیا کہ اب تو ساری شرطیں پوری ہو گئیں' یا رسول اللہ! اب تو مجھ پر خدا کی حد جاری کر دیجئے! اس پر آپ نے اس کا بچہ کسی صحابی کے سپرد کر دیا اور رجم کا حکم دیا۔

(۲) حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ماعز کو رجم کیا گیا تو وہ بھاگنے لگے تھے (یہ محض ایک فطری و بشری کمزوری تھی معاذ اللہ رجم سے بھاگنا نہیں تھا' مگر صحابیہ مذکورہ نے اس بشری کمزوری کا بھی اظہار نہیں کیا تھا' بلکہ یہ بھی بعض روایات میں ملتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ماعز کی طرح نہیں بھاگوں گی' اللہ اکبر! حضرات صحابہ و صحابیات کے ایمان کتنے قوی تھے کہ پہاڑ ہل جائیں مگر ان کے ایمان اپنی جگہ سے نہ ہل سکتے تھے۔

(۳) حضرت ماعز پر اسلام میں سب سے پہلی بار رجم ہوا اور ان کے رجم کے ہولناک حالات تمام صحابہ و صحابیات کو معلوم ہو چکے تھے' پھر بھی صحابیہ مذکورہ نے اس قدر استقلال و پامردی کا ثبوت دیا' اور کہیں ذرا سی بھی جھجک خدا کی حد کے قائم کرانے میں نہ ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توبہ انابت الی اللہ بھی نہایت کامل مکمل تھی' اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی اور فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ایسی توبہ اگر "صاحب مکس" بھی کرتا تو اس کے گناہ بخش دیے جاتے "صاحب مکس" وہ ہے جو لوگوں سے بطور ظلم و جبر کے ٹیکس وصول کرتا ہے' جیسے ایام جاہلیت میں بازاروں میں چیزیں فروخت کرنے والوں سے ٹیکس لیا جاتا تھا یا صدقہ وصول کرنے والے رقوم صدقات کے علاوہ رقوم وصول کرتے تھے (گویا دوسروں کا مال بغیر حق لینا اور وہ بھی جبر و ظلم سے یہ مکس ہے۔

امام نوویؒ شارح مسلم نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا مکس تمام معاصی اور برباد کر دینے والے گناہوں سے زیادہ فتیح ہے۔ کیونکہ لوگوں کے بہ کثرت مطالبات و حقوق اس سے متعلق ہوتے ہیں' اور وہ برابر یہی کام کرتا رہتا ہے (مثلاً روزانہ' ماہانہ یا سال بہ سال)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی جنازہ آتا دریافت فرماتے کہ اس مرنے والے پر کوئی دین و قرض تو نہیں ہے؟ اگر نہ ہوتا تو خود نماز میت پڑھاتے' ورنہ فرما دیتے کہ تم لوگ نماز پڑھ لو یہ معاملہ قرض والے کے ساتھ تھا' حالانکہ اکثر قرضہ ضرورت میں لیا جاتا ہے' اور کوشش بھی ادائیگی کی ہوتی ہے پھر صحابہؓ کی ورع و احتیاط کا تو کہنا ہی کیا؟! مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیہؓ مذکورہ کی توبہ کو اس کے اعلیٰ درجہ کے اخلاص و خشیۃ خداوندی کے سبب کہ اس قدر گھبرا دینے والی موت بشکل رجم سے بھی نہ ڈری' وہ مرتبہ دیا کہ بڑے بڑے گناہ والے کو بھی ایسی توبہ سے مستحق مغفرت قرار دیا اور شاید ایسے شخص کی ایسی توبہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھا دیتے جس طرح صحابیہ مذکورہ کی پڑھائی وجہ یہ کہ عام اصول تو یہی ہے کہ حقوق العباد بغیر بندوں سے معاف کرائے معاف نہیں ہو سکتے' مگر اللہ تعالیٰ جس بندے کی گلو خلاصی کرانا چاہیں' اس کے لیے اپنے خصوصی فضل و انعام کی شان سے ان اصحاب حقوق کو راضی کر کے معاف کرا سکتے ہیں۔ اللھم اغفرلنا وارحمنا و اکرم علینا بفضلک الخاص و جودک العام التام انک علی کل شیء قدیر و بالا جابۃ جدیر۔

بہت اہم ہے' اس کو بھی ہم کتاب الحدود میں ذکر کریں گے (انشاء اللہ تعالیٰ) اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ ان دونوں میں تطبیق کی بھی صورت نکالتے تھے' پوری بحث سے معلوم ہوگا کہ امام صاحب اور ائمہ حنفیہ کا مرتبہ بمقابلہ امام شافعی وامام بخاری وغیرہ نہ صرف فقہ و علم قیاس میں بہت بڑھا ہوا تھا' بلکہ حدیث دانی وعلم معانی حدیث میں بھی وہ نہایت اونچے مقام پر تھے' مگر چونکہ اس امر کا پروپیگنڈہ نہیں کیا گیا' بلکہ مخالفوں نے اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا اس لیے عام ذہنوں میں غلط تصور قائم ہوتا رہا' انوارالباری میں ہم انشاءاللہ تعالیٰ پوری دیانت کے ساتھ صحیح پوزیشن واضح کریں گے' اور جہاں کوئی کمزوری اپنے یہاں ہوگی' اس کو بھی بے تامل ظاہر کریں گے' یہی طریقہ ہمارے اکابر اور حضرت شاہ صاحبؒ کا تھا' کتاب کا اکثر حصہ سامنے آنے پر فیصلہ بخوبی ہوسکے گا کہ ہمارا مقصد خدمت علوم نبوت ہے کسی مسلک کی تائید اس لیے نہیں کرنی ہے کہ اس سے ہم وابستہ ہیں' نہ کسی مسلک کی تردید اس لیے ہوگی کہ ہم اس کے پیرو نہیں۔ **واللہ الموفق۔**

بیعت اور ان کی اقسام

چونکہ اس حدیث میں بیعت کا ذکر ہے' اس لیے اس کی تعریف اور اقسام ذکر کی جاتی ہیں بیعت کے شرعی معنی کسی متبع شریعت الٰہیہ کے ہاتھ پر کسی امر دینی کو...... سرانجام دینے کا عہد و میثاق کرنے کے ہیں' چونکہ بیعت کا مقصد خدا کے کسی حکم کی بجا آوری کا عہد و میثاق رسول یا نائب رسول کی وساطت سے پورا ہوتا ہے' اس لئے حق تعالیٰ نے اس طریقہ کو نہایت پسند فرمایا اور یہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ بلاشک وشبہ خدا سے بیعت کررہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے پھر جو کوئی (اس بیعت کو) توڑے گا تو اس کے توڑنے سے اپنا ہی نقصان کرے گا' اور جو اپنے عہد کو پورا کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائیں گے' حضرت علامہ عثمانیؒ نے اس آیت کے فوائد میں تحریر فرمایا لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیعت کرتے تھے' اس کو فرمایا کہ نبی کے ہاتھ پر بیعت کرنا گویا خدا سے بیعت کرنا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں نبی خدا ہی کی طرف سے بیعت لیتا ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل وتاکید بیعت کے ذریعے کراتا ہے' جب بیعت نبوی کی حقیقت یہ ہوئی تو یقیناً خدا تعالیٰ کا دست شفقت وحمایت ان کے ہاتھوں کے اوپر ہوگا۔ (تنبیہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے کبھی اسلام پر' کبھی جہاد پر' کبھی کسی دوسرے امر خیر پر بیعت لیتے تھے' صحیح مسلم میں "وعلی الخیر" لفظ آیا ہے' مشائخ طریقت کی بیعت' اگر بطریق مشروع ہو تو اسی لفظ کے تحت میں مندرج ہوگی' حدیبیہ میں اس امر پر بیعت لی گئی تھی کہ مرتے دم تک میدان جہاد سے نہیں بھاگیں گے۔

غرض بہ کثرت احادیث سے ثابت ہے کہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے' کبھی ہجرت پر' کبھی جہاد پر' کبھی ارکان اسلام کو قائم رکھنے پر' کبھی میدان جہاد میں ڈٹے رہنے پر' کبھی ترک خواہشات ومنکرات پر (جیسا کہ حدیث میں ہے) کبھی تمسک بالسنۃ' اجتناب عن البدعۃ اور حرص علی الطاعات پر (جیسا کہ انصاری عورتوں سے بیعت لی تھی) ایک دفعہ فقراً مہاجرین سے اس امر پر بیعت لی کہ کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے جس کی وجہ سے انہوں نے اتنی سختی سے اپنے اس عہد بیعت کو پورا کیا کہ اگر گھوڑے پر سوار جارہے ہیں اور کوڑا ہاتھ سے گر گیا تو راہ چلتے سے کوڑا اٹھا کر دینے کو نہ کہتے تھے' بلکہ خود اتر کر اٹھاتے تھے۔ (ابن ماجہ)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جریر صحابی سے ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت لی اور کچھ انصار صحابہ سے اس امر پر بیعت لی کہ خدا لگتی بات کہنے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے اور ہر موقعہ پر حق بات ہی کہیں گے جس کی وجہ سے ان میں سے ایک آدمی بڑے سے بڑے امیر اور بادشاہ تک کو بھی بری بات پر ٹوک دیتا تھا۔ اسی طرح دوسرے امور خیر پر بھی بیعت لینا ثابت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیعت کا طریقہ مسنون ہے اور مشائخ وصوفیہ کا طریقہ بھی اس میں داخل ہے کیونکہ وہ تمام احکام اسلام کی پابندی کے عہد

بیعت پر مشتمل ہے اوراسی کے ساتھ ذکر ومراقبہ وغیرہ کے ذریعہ بھی انابت الی اللہ وتقرب الی اللہ کے وسائل اختیار کراتے ہیں، جو وسائل معین انابت و تقرب ہوں ان کو بدعت نہیں کہا جاسکتا، البتہ بیعت لینے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صحیح معنی میں نائب رسول ہو ورنہ جادہ شریعت سے انحراف کا خطرہ رہے گا۔ جس سے، بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہے۔ علماء کرام نے بیعت لینے والے کے چند اوصاف لکھے ہیں ان پر توجہ ضروری ہے۔

(۱) عالم کتاب وسنت ہو، تاکہ بیعت کے اہم مقاصد حاصل ہوں مثلاً امر معروف، نہی منکر، سکینت باطنی واطمینان قلبی حاصل کرانے کے شرعی طریقے بتلانا، ازالہ رذائل واکتساب فضائل قرآن وحدیث کے خلاف طریقوں سے نہ کرانا وغیرہ۔

(۲) عدالت، تقویٰ، صدق وضبط وغیرہ اوصاف سے متصف ہو لہٰذا کبائر معاصی سے قطعاً مجتنب اور صغائر پر مصر نہ ہو،

(۳) دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف پوری طرح راغب ہو طاعات مؤکدہ اور اذکار ماثورہ مسنونہ کا پابند ہو،

(۴) علماء کی خدمت میں کافی زمانہ گزار کر ان سے علم ظاہر، نور باطن، سکینت وتعلق مع اللہ کی کیفیات حاصل کی ہوں وغیرہ۔

شیخ طریقت سے ظہور کرامات وخوارق عادات ضروری نہیں، کیونکہ وہ مجاہدات وریاضات کا ثمرہ ہیں، شرط کمال نہیں ہیں، اسی طرح شیخ کے لئے ترک اکتساب بھی ضروری نہیں بلکہ خلاف شریعت ہے (مغلوب الحال بزرگوں کے حالات سے اس بارے میں سند لینا درست نہیں) نیز قلیل پر قناعت اور مشتبہ اموال سے اجتناب مشائخ کے لئے ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ جو مشائخ حب جاہ ومال میں مبتلا ہیں، وہ ہرگز مشیخت کے لائق نہیں، دوسرے یہ کہ شیخ ایسے شخص کو بنانا چاہئے۔ جو علم وعمل کے لحاظ سے بھی زیادہ سے زیادہ مکمل ہو، ہر کہہ ومہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا نہ مناسب ہے نہ مفید ونافع، اس لئے محض رسمی بیعت کی کوئی شرعی اہمیت نہیں ہے۔

نیز معلوم ہوا کہ بیعت لینا یا کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنا دونوں نہایت اہم ذمہ داریوں کو مقتضی ہیں، اور کسی شیخ کا اپنے کسی مرید کو خلیفہ یا قائم مقام بنانا نہایت درجہ ذمہ داری کا منصب ہے اس میں تساہل برتنا اس منصب رفیع کو بے وقعت بنانا ہے۔ جس سے بے شمار دینی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ کیونکہ ایسی باتوں سے دین میں کمزوری آجاتی ہے جو قرب قیامت کے ساتھ بڑھتی جائیگی۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرات مشائخ طریقت نے اپنے اپنے سلسلہائے طریقت کی حفاظت بھی سلسلہائے نسب کی طرح کی ہے، اس لئے ان کی رخنہ اندازیوں سے اجتناب ضروری ہے مثلاً۔

(۱) جس شیخ اور پیر مرشد سے کسی کو اجازت بیعت یا خلافت ملی ہو اسی سے اپنا سلسلہ بیعت جاری کرنا چاہئے، قطع سلسلہ مناسب نہیں (۲) اگر کسی شیخ نے خود خلافت نہیں دی ہے تو اس کی موجودگی میں یا اس کے بعد دوسرے خلفاء شیخ مذکور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو اس شیخ کی طرف سے خلافت دیدیں البتہ اپنی طرف سے دے سکتے ہیں، اور اس مجاز کو بھی شیخ مذکور کی بجائے ان مجیزین کے واسطے سے سلسلہ کو متصل کرنا چاہئے۔

(۳) کسی شیخ کی موجودگی میں یا اس کے بعد کسی ایک یا چند خلفاء شیخ مذکور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مجاز شیخ مذکور کی خلافت سلب کردیں۔ ہاں! اگر مجاز مذکور میں خود ہی کسی وجہ سے اہلیت بیعت باقی نہ رہے گی تو وہ عنداللہ اس خلافت سے محروم ہوجائے گا۔

طرق سلوک اور علوم طریقت کی پوری معرفت کے لئے حضرت امام ربانی مجدد صاحب الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات شریفہ وغیرہ، حضرت شاہ ولی اللہ کے رسائل تصوف، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی قصد السبیل اور التکشف عن مہمات التصوف وغیرہ دیکھی جائیں۔

باب:۔من الدین الفرار من الفتن (فتنوں سے دور بھاگنا بھی دین میں داخل ہے)

۱۸. حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن عبدالرحمن بن عبداللہ بن ابی صعصعۃ عن ابی سعیدن الخدری انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شعف الجبال و مواقع القطر یفر بدینہ من الفتن.

ترجمہ:۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ مسلمان کا سب سے بہتر مال وہ بکریاں ہوں گی، جنہیں لیکر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں یا ان کی وادیوں میں گزر اوقات کرے گا، تاکہ اپنے دین کو اس زمانہ کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکے۔

تشریح:۔ دین کے عمومی منافع وفوائد کے لحاظ سے اجتماعی زندگی اسلام میں زیادہ پسندیدہ ہے اور اسوہ انبیاء علیہم السلام بھی یہی ہے کہ معاشرہ میں رہ کر اپنی اور معاشرہ کی اصلاح پر توجہ دی جائے، اسی لئے اسلام میں رہبانیت کو پسند نہیں کیا گیا کہ سب سے الگ تھلگ ہو کر صرف اپنی دینی زندگی کو سنوارا جائے اور دوسروں کے احوال سے صرف نظر کر لی جائے مگر قرب قیامت کے ساتھ طرح طرح کے فتنے بھی زیادہ ہوتے جائیں گے حتیٰ کہ وہ وقت بھی آجائے گا کہ بڑی بستیوں اور شہروں میں زندگی گزارنے والوں کو اپنے دین پر قائم رہنا دشوار ہو جائے گا، بجائے اس کے کہ معاشرے میں رہ کر اپنی اور دوسروں کی اصلاح حال ہو، ان میں رہ کر اپنا دین وایمان بھی خطرہ میں پڑ جائے تو ایسے مجبور کن حالات میں شارع اسلام کی طرف سے اجازت ہے کہ بستیوں اور معاشروں کو چھوڑ کر پہاڑوں اور وادیوں میں سر چھپا کر، معمولی گزران کی صورتیں اختیار کر کے اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں۔

مقصد یہ ہے کہ دین وایمان کی حفاظت دوسری انسانی ضرورتوں پر مقدم ہے، ایک حدیث ترمذی وابوداؤد میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آجائے گا کہ اس میں صبر واستقلال سے زندگی گزارنا آگ کے انگاروں کو ہاتھ میں پکڑنے کی طرح دشوار ہوگا اسی لئے اس وقت جو دین کے مقتضیات پر عمل کرے گا اس کو تمہارے پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا۔ (یعنی صحابہ کرام کے) دوسری حدیث ترمذی وابوداؤد میں ہے کہ قرب قیامت میں بہ کثرت فتنے اندھیری رات کے تاریک حصوں کی طرح چھا جائیں گے، ان میں ایک شخص صبح کو مومن ہوگا اور شام تک ایمان باقی نہ رہ سکے گا، یا شام کے وقت مومن ہوگا تو ایمان کے ساتھ صبح پکڑنی مشکل ہوگی۔ ان فتنوں کے وقت ایک جگہ پر بیٹھنے والا ادھر ادھر جانے والے سے بہتر ہوگا اور آہستہ چلنے والا تیز رفتار سے بہتر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے اپنے گھروں میں جمے بیٹھے رہنا اسی طرح اور بہت سی احادیث فتن واشراط ساعت کے بارے میں ماثور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تدریجی طور سے اور فتنوں کی نوعیت کے فرق سے دین وایمان کی حفاظت کے طریقے بھی مختلف ہوں گے، ایک وقت میں شہروں میں رہتے ہوئے ہی گھروں میں جم کر بیٹھ جانا، اور باہر کی مسموم ہوا سے دین کو محفوظ کر لینا کافی ہوگا، کبھی بڑے شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے قصبات ودیہات کی زندگی میں سکون ملے گا اور بالکل آخر میں وہ نوبت بھی آجائے گی جس کا ذکر حدیث الباب میں ہے، حدیث میں ''دین'' کا لفظ ہے، جس کا اطلاق ہم بتلا چکے ہیں کہ مجموعہ ایمان واسلام پر ہوتا ہے، لہٰذا اس حدیث سے اعمال کا جز وایمان ہونے پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایمان کے ساتھ اعمال کی اہمیت پر استدلال درست ہے، جن کے منکر مرجئہ اہل بدعت ہیں۔ واللہ اعلم۔

باب:۔ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلمکم باللہ وان المعرفة فعل القلب لقول اللہ تعالیٰ:۔ ولکن یؤاخذ کم بما کسبت قلوبکم"

(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفصیل کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں، اور یہ کہ معرفت دل کا فعل ہے، کیونکہ خدا کا ارشاد ہے ''لیکن اللہ تعالیٰ ان امور کی بابت تم سے مواخذہ کرے گا، جو تمہارے قلوب سے صادر ہوئے ہیں''۔)

(۱۹) حدثنا محمد بن سلام البیکندی قال اخبر نا عبدة عن ھشام عن عائشة قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذاامر ھم امرھم من الا عمال بما یطیقون قالو ا انا لسنا کھیئتک یا رسول اللہ!ان اللہ قد غفر لک ما تقدم من ذنبک و ما تا خر فیغضب حتی یعرف الغضب فی وجھہ ثم یقول ان اتقاکم و اعلمکم باللہ انا.

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کو کوئی حکم فرماتے تو اس امر کی رعایت فرماتے تھے کہ وہ عمل کی طاقت واستطاعت سے باہر نہ ہو، صحابہؓ عرض کرتے یا رسول اللہ! ہم آپ جیسے نہیں ہیں، آپ کی تو پہلی بعد کی سب لغزشیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادی ہیں، (یعنی ہمیں تو زیادہ سخت اعمال کا حکم ملنا چاہئے) اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر غصہ وملال کے آثار ظاہر ہوتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں تم سے زیادہ خدا کو جاننے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں، (اس لحاظ سے مجھے تم سب سے زیادہ اعمال کی ضرورت ہے۔

تشریح:۔ صحابہ کرام کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور سخت سے سخت اعمال انجام دے کر خدا کی خوشنودی حاصل کریں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر کرتے، تو دیکھتے کہ بظاہر آپ کے سارے اوقات عبادت میں مشغول نہیں، دوسری دنیوی حاجات میں بھی وقت لگ جاتا ہے، تو وہ اس سے یہ سمجھتے تھے کہ آپ کو زیادہ اعمال کی ضرورت اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کی سب اگلی پچھلی لغزشیں معاف فرمادی ہیں، پھر جب آپ صحابہ کو ان کی وسعت واستطاعت کا خیال کر کے زیادہ دشوار احکام نہ دیتے، تو اور بھی خیال ہوتا کہ ہمارا حصہ دین میں بہت کم ہے، جو شاید نجات اخروی کے لیے بھی کافی نہ ہو۔

چنانچہ دوسری ایک حدیث میں زیادہ تفصیل آتی ہے کہ صحابہ کرام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رات دن کے اعمال کیا ہیں؟ آپ نے بتلائے تو صحابہ نے ان کو کم سمجھا اور سوچا کہ آپ کو اعمال کی ضرورت ہی کیا ہے، آپ مغفور ومعصوم ہیں، لیکن ہم تو ایسے نہیں ہیں، اس لیے ہمیں زیادہ اور سخت اعمال کی ضرورت ہے، پھر کسی نے کہا میں ہمیشہ جہاد کروں گا، کسی نے کہا کہ میں ہمیشہ کے لیے بیوی سے الگ رہوں گا، کسی نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ساری بات معلوم ہوئی تو یہی فرمایا کہ میں تو تم سب سے زیادہ اعلم واتقی ہوں، مقصد یہ ہے کہ اگر عبادت کی اتنی زیادتی کہ سارے دنیا کے کام معطل ہو جائیں محمود ہوتی اور خدا اس کو پسند فرماتا تو مجھے تو اپنا کوئی وقت بھی عبادت سے خالی نہ کرنا چاہئے تھا، کیونکہ تمہیں اگر آخرت کی فکر ہے تو مجھے تم سب سے زیادہ ہے، کیونکہ میرا علم، خدا کی معرفت اور تقویٰ تم سب سے زیادہ ہے، پھر بھی تم دیکھتے ہو کہ میں عبادت کے علاوہ، کھانا، پینا، سونا اور گھر وباہر کے دوسرے کام بھی کرتا ہوں،

یہ تو ایک جواب ہوا، دوسرے یہ کہ اور احادیث سے ثابت ہے کہ خدا کو سب سے زیادہ وہ عمل پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے خواہ وہ کم ہو، تیسرے یہ کہ فرائض وطاعات کی ادائیگی کے بعد جتنا وقت جائز طریقہ پر دوسرے کاموں میں صرف ہوتا ہے وہ سب بھی عبادات ہی کے حکم میں اور موجب اجر وثواب ہے، صرف اتنی ضرورت ہے کہ ہم اپنی نیت صحیح کر لیں وہ اس طرح کہ یہ سوچ کر وہ سب کام کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاعات کے ساتھ ان سب دنیوی کاموں کی بھی اجازت دی ہے اور ہم جتنے کام کر رہے ہیں، وہ سب خدا ورسول کی اطاعت ہی کا ایک جزو ہیں، مثلاً کسب معاش کے تمام جائز ذرائع اختیار کرنا، دولت زیادہ سے زیادہ کمانا بشرطیکہ اس دولت کے شرعی حقوق ادا ہوں اور طاعات وعبادات پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑے، دنیوی علوم وصنائع کی تحصیل بشرطیکہ ان سے عقائد حقہ واعمال شرعیہ پر اثر نہ پڑے، گھر باہر کے کام کاج میں وقت صرف کرنا، غرض تمام امور مباح میں وقت صرف کرنا اگر یہ سمجھ کر ہو کہ شریعت نے بشرط عدم ضرر دینی ان کی اجازت دی ہے اور جن کاموں سے کوئی دین یا دنیا کا فائدہ دوسروں کو پہنچ سکتا ہو، وہ تو مزید اجر وثواب کا باعث ہیں، اسی طرح اپنے کنبہ قبیلہ، اعزہ اقرباء اور عام مسلمانوں بلکہ عام انسانوں کی مالی وغیر مالی سرپرستی وامداد تو دین اسلام ہی کا ایک جزو ہے اور علوم نبوت کی تحصیل واشتغال بالعلم، تبلیغ دین، امر معروف نہی منکر، جہاد فی سبیل اللہ، وغیرہ تو دین کے بڑے ستون ہیں، اس طرح اگر سوچ سمجھ کر اور نیت کی تصحیح کے ساتھ ہم پوری زندگی گزاریں تو اس کا ہر لمحہ عبادت ہے، لہٰذا اس کو کم سمجھنا مناسب نہیں۔ وفقنا اللہ ایانا و المسلمین جمیعاً لما یحب و یرضی۔

بحث ونظر: (۱) امام بخاریؒ نے یہاں ارشاد نبوی انا اعلمکم باللہ پر باب باندھا جو بظاہر کتاب العلم کے مناسب تھا، یہاں کتاب

الایمان میں اس کو کیوں لائے؟ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ وجہ بیان فرمائی کہ علم ومعرفت ویقین کا اطلاق احوال پر بھی ہوتا ہے اور علوم نبوت جس وقت انسان کے تمام جوارح پر چھا جاتے ہیں تو وہی بعینہ ایمان کی شان ہے جس کو حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے **من مات و هو يعلم ان لا اله الا الله** الخ یہاں **و هو یومن باللہ** نہیں فرمایا' حالانکہ مراد وہی ہے' اسی طرح آیت **انما يخشى الله من عباده العلماء** میں بھی علما سے مراد وہ حضرات ہیں جن کے قلوب میں علوم نبوت راسخ ہوجاتے ہیں۔ اور ان علوم کی بشاشت سے ایک قسم کا نور' حلاوت وانبساط ان کو حاصل ہوجاتا ہے اور وہی ایمان کا نور ہے جس کی زیادتی ایمان کی زیادتی اور کمی ایمان کی کمی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ امام بخاری کا استدلال بطور "الحاق نظیر بالنظیر" یعنی جس طرح علم میں مراتب ہیں اسی طرح ایمان میں بھی ہیں کیونکہ علم سبب ایمان ہے۔ پس جب کہ سبب میں تشکیک ثابت ہے' مسبب یعنی ایمان میں بھی ثابت ہوئی۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس سے امام بخاری کا مقصد معتزلہ کی تردید ہے' جو کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت اول واجبات ہے اس کے بعد ایمان ہے' امام بخاری نے بتلایا کہ معرفت فعل قلب ہے لہٰذا وہی ایمان ہے اور وہی واجب اول بھی ہے پس معرفت کوئی دوسری چیز علاوہ ایمان کے نہیں ہے' جس کو واجب اول اور اس کے بعد ایمان کو دوسرا واجب قرار دیں۔

(۲) عنوان باب کا دوسرا جزو یہ ہے کہ معرفت فعل قلب ہے' حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہاں معرفت سے اضطراری معرفت تو ہو نہیں سکتی جیسی **يعرفونه كما يعرفون ابناء هم** میں ہے اول تو اس پر لغوی اعتبار سے فعل کا اطلاق ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ فعل کا اطلاق صرف اختیاری امر پر ہوتا ہے' دوسرے اس کا ایمان سے تعلق بھی نہیں' لہٰذا معرفت سے مراد وہی اختیاری معرفت ہوگی جو دل میں جاگزیں اور جوارح پر متسلط ہوجاتی ہے' وہ کسبی ہے اور یقیناً فعل قلب بھی ہے اور وہ عین ایمان بھی ہے' امام بخاری کی یہ مراد اور بھی واضح ہوجاتی ہے اگر وہ معرفت کی جگہ یہاں ایمان کو فعل قلب کہتے' مگر وہ عبارتی تفنن کے عادی ہیں اس لیے اس طرح ادا کیا۔

امام اعظمؒ سے تعصب

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقعہ پر فرمایا کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی احیاء العلوم وغیرہ میں نقل ہوا ہے کہ ایمان معرفت ہے' اور امام صاحب کی مراد یہی معرفت ہے جس کی ہم نے اوپر شرح کی۔ اور امام بخاری کی مراد بتلائی اور امام احمد سے بھی یہی تعبیر منقول ہے' مگر عجیب بات ہے کہ جب یہی بات امام احمد سے نقل ہوئی تو کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ اور امام صاحب سے نقل ہوئی تو انکار واعتراض کا رخ اختیار کیا گیا بقول عربی شاعر ؎

اصم عن الشیء الذی لا اریده　　　واسمع خلق الله حين اريد

جس بات کو میں سننا نہیں چاہتا اس کو سننے سے سب سے زیادہ بہرا ہوجاتا ہوں۔ اور جس کو سننا چاہتا ہوں اس کو ساری مخلوق سے زیادہ سننے والا ہوجاتا ہوں۔

(۳) امام بخاریؒ نے یہاں معرفت کے فعل قلب ہونے پر آیت **ولكن يؤاخذكم بما كسبت قلوبكم** سے استشہاد کیا' اس پر کسی نے اعتراض کیا کہ آیت مذکورہ تو یمین وحلف کے بارے میں ہے نہ کہ ایمان کے بارے میں' لیکن ایسا اعتراض امام بخاریؒ کے استدلال طریقوں سے ناواقفیت کے باعث ہوسکتا ہے' امام نے محض اس امر سے استدلال کرلیا کہ جس طرح کسب فعل قلب ہے' معرفت بھی قلب کا فعل اور اس کا مکسوب ہے۔

(۴) "**امر هم بما يطيقون**" پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا رہا ہے کہ اپنی جانوں پر تو سختی جھیلتے ہیں' اعمال شاقہ اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے سہولتوں آسانیوں کے راستے نکالتے ہیں۔ **عزيز عليه ماعنتم حريص**

علیکم بالمومنین رؤف رحیم ارشاد باری ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمہارا کسی مشقت میں پڑنا نہایت ہی شاق ہے، وہ تمہاری فلاح و بہبود پر نہایت حریص ہیں اور مومنوں کے لئے تو بہت ہی شفیق اور رحمت مجسم ہیں۔

(۵) ''یارسول اللہ'' پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خطاب کے موقعہ پر صلوٰۃ وسلام کے الفاظ ادا کرنے کا ثبوت نہیں ملا، اس لئے...... اس کی قرأت میں بھی ان کا اتباع مناسب ہے۔

(۶) ''**وقد غفرلک الله ماتقدم**'' یہ اشارہ ہے آیت قرآنی ''**لیغفرلک الله ماتقدم من ذنبک وماتأخر**'' کی طرف جس میں فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کو فتح مبین دی تاکہ آپ کی سب اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر دیں، کیونکہ فتح سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے بڑے بڑے مصائب و آلام برداشت کئے اور بہت سے معرکہ ہائے جہاد میں عظیم خطرات ومہالک سے دوچار ہوئے تھے، اس کے بعد یہ بحث ہوئی کہ لیغفر میں لام کیسا ہے۔ اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے، لہٰذا یہ لام عاقبت ہے صاحب روح المعانی نے علامہ ابن قیم سے نقل کیا کہ ''سلف ان کو معلل بالاغراض مانتے تھے اور حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال مصالح وحکم کے ساتھ معلل ہیں، یہ بات ظاہر ہے اور نصوص اس پر شاہد ہیں، تاہم اس کو اتنا عام سمجھنا کہ کوئی فعل بھی اس کے افعال میں سے غرض سے خالی نہ ہو، محل بحث ہے۔

اصفہانی نے شرح الطوالع میں لکھا کہ اس مسئلہ میں معتزلہ اور اکثر فقہا کا اختلاف ہے اور میں اسی کا قائل ہوں جو سلف کا مسلک ہے کیونکہ دس ہزار سے زیادہ آیات واحادیث میں تعلیل کی صورت موجود ہے اور سب میں تاویل کرتے جانا انصاف سے بعید ہے۔ (روح المعانی صفحہ ۲/۶۸۹)

دوسری بحث یہ ہے کہ انبیاء سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ بحث نہایت اہم ہے اور پہلے سے ہمارا ارادہ تھا کہ اس کو مکمل طریقہ پر بخاری کی ''کتاب الانبیاء'' میں لکھیں گے اور وہی اس کے لئے زیادہ بہتر موقعہ ہے، مگر دیکھا کہ بعض شائع شدہ تقاریر درس بخاری میں اسی حدیث مذکور کے تحت یہ بحث آ گئی ہے اس لئے خیال بدل گیا اور یہاں بھی کچھ ضروری اجزاء پیش کرنے کا ارادہ ہو گیا۔ **والله المیسر و علیه التکلان**۔

عصمت انبیاء علیہم السلام

خدا کی مخلوق میں سے خدا کے بعد سب سے بڑا مرتبہ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا ہے وہ دنیا کے لئے خدا کے نائب وخلیفہ ہیں وہ **تخلقوا باخلاق الله** کے سب سے بڑے نمونے، اس کی اطاعت وعبودیت کے سب سے اونچے پیکر مجسم، علوم ومعرفت الٰہیہ کے سب سے زیادہ عالم وعارف، خدا کی ذات وصفات کے ہمہ وقتی مشاہدہ واستحضار سے مستفید ومستنیر، غرض جتنی خوبیاں، جتنے اوصاف کمال خدا کی ذات والاصفات جل مجدہ کے سوا کسی مخلوق میں جمع ہو سکتے ہیں وہ انبیاء ومرسلین میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی لئے کسی ایک نبی کے مرتبہ کمال علمی وعملی کو بھی خواہ وہ کسی درجہ کا بھی ہو۔ بڑے سے بڑا ملک مقرب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنے اپنے دور کے ہر نبی کو...... بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کا مصداق کہا جا سکتا ہے اس کے بعد ان انبیاء میں بھی باہم فرق مراتب ہے، خداوند تعالیٰ کی لانہایہ بارگاہ کے مراتب قرب بھی بے نہایت ہیں۔

اے برادر بے نہایت در گہیست　　ہر چہ بروے می رسی بروے مایست

انبیاء مرسلین کی مثال چاند، سورج کی ہے کہ لاکھوں چاند اور سورجوں کے کہکشاں[1]!

[1] کہکشاں سے مراد ''علم فلکیات جدید'' میں ثوابت ستاروں کا عدسہ کی شکل کا نظام ہوتا ہے جو زمین کے مرکز سے بہت دور واقع ہے، یہ ہمارا کہکشاں ہے جس کا ایک جزو ہمارا نظام شمسی ہے، اور اس کی موٹائی یا بلندی ۲۷ ہزار نوری سال ہے (یعنی ۳۲ ہزار کھرب میل) اور چوڑائی تین لاکھ نوری سال ہے۔ پھر ہمارے اس کہکشاں کے علاوہ بھی اور بہت سے کہکشاں ہیں، جن میں سے بعض تک اب یورپ وامریکہ کی نو

ایجادِ عظیم دوربینوں کے ذریعہ رسائی ہو رہی ہے' مثلاً کہکشاں سیدیم اینڈ رومیدہ' جو ہم سے آٹھ لاکھ ۵۰ ہزار نوری سال دور ہے (روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے' اس رفتار سے روشنی ایک سال یعنی ۳۶۵ دن میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اسے نوری سال کہتے ہیں (LIGHTYEAR) نظام شمسی ہمارے کہکشاں کا نہایت حقیر جزو ہے اور اس نظام شمسی میں ہمارے سورج جیسے تقریباً ایک کھرب ثوابت و سیارے ہیں' جبکہ ہمارے سورج کا قطر ۸ لاکھ ۶۶ ہزار میل کا ہے اور اس میں روشنی اس قدر ہے جس قدر ۵۵۶۲۳ موم بتیاں ایک مربع فٹ میں جلانے سے حاصل ہو سکتی ہے' ستارے میں سے ہمارا آفتاب سب سے چھوٹا ستارہ ہے اور وہ زمین سے تقریباً نو کروڑ ۲۹ لاکھ میل دور ہے' ہماری زمین نظام شمسی کا ایک نہایت حقیر جزو ہے' کیونکہ زمین کا قطر خط استوا پر صرف ۷۹۲۷ میل کا ہے' سورج سے ہماری زمین تک روشنی ۸ منٹ میں پہنچتی ہے جبکہ بعض ستارے ایسے بھی خدا کی مخلوق ہیں' جن کی روشنی زمین تک دو ہزار برس میں پہنچتی ہے یعنی جو روشنی آج سے دو ہزار سال قبل چلی تھی وہ ہمیں اس وقت نظر آ رہی ہے اس سے خدا کی خدائی کی وسعت اس کی مخلوقات کی کثرت و عظمت' اور خلاق عوالم کی بے نہایت جبروت و بڑائی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے یورپ و امریکہ کے سائنس دانوں نے یہاں تک تحقیق کی ہے کہ بعض ستارے ایسے بھی ہیں کہ جن کی روشنی زمین تک کئی کروڑ برس میں پہنچتی ہے' اور ایک ستارے کی دریافت حال میں ہوئی ہے جس کا فاصلہ زمین سے آٹھ سو مہاسنگ میل دور ہے' ایسی باتوں سے ہمارے بہت سے مسلمانوں کو حیرت ہوگی اور بہت سے محض ان کو خیال آرائی سمجھیں گے مگر سوچنے کی بات ہے کہ قرآن مجید میں چاند' سورج' ستاروں اور ملکوت السمٰوٰت والارض' اور کم از کم زمین کے خطوں میں ہی گھوم پھر کر اس کے عجائب و غرائب میں فکر و نظر دوڑا کر رب العالمین کے وجود و حدانیت کا یقین حاصل کرنے کا حکم بار بار کس کو ملا تھا قرآن مجید ماننے والوں کو یا نہ ماننے والوں کو؟ اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا تھا۔

نئی میں اور پرانی روشنی میں فرق اتنا ہے انہیں ساحل نہیں ملتا' انہیں کشتی نہیں ملتی

اکبر مرحوم کا دور یورپ و امریکہ کے لوگوں کے لئے بحرانی دور تھا' جس میں وہ اسلام اور مسلمانوں سے تعصب رکھتے تھے اور حقائق عالم سے حقیقۃ الحقائق تک رسائی ان کے لئے دشوار ہو گئی تھی' مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ دور جاہلیت ختم ہوا اور اب اس دور کا یو[illegible] و امریکہ بہت کچھ اسلام سے قریب ہو چکا ہے' ہزاروں سعید روحیں اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکی ہیں' اور بڑے پیمانہ پر بھی وہاں اسلام کی روشنی پھیل سکتی ہے کیونکہ سائنس کی جتنی ترقی آگے ہو رہی ہے ان لوگوں کے دلوں میں حقیقۃ الحقائق کی جستجو بھی بڑھ رہی ہے' چنانچہ ایک جدید فلاسفر سائنسدان ''ایف آر مولٹن'' نے کہا:۔

''کائنات کا حجم یا لامحدودیت انسان کے لئے اتنی زیادہ اہم نہیں' بلکہ جس چیز سے انسان ششدر و حیران رہ جاتا ہے وہ کائنات کی مکمل باضابطگی ہے کہ کوئی گڑبڑ نہیں' کوئی چیز خلاف توقع نہیں ہے''۔

یہ مکمل باضابطگی کو قائم رکھنے والی کون سی ذات ہے بس علوم نبوت کی ذرا سی بھی ر[illegible] مل جائے تو اس کی معرفت ہی تو ساحل مراد تک رسائی ہے اس کے سوا اور کیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ تل اوٹ پہاڑ ہے' ساحل کے قریب کھڑے ہیں مگر ابر و غبار کی وجہ سے اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے یا آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے تو ساحل سے روشناسی حاصل ہو۔

افسوس کہ دوسرے لوگ دنیوی علوم کی ترقی کے راستہ سے علیٰ وجہ البصیرت ساحل مراد کے قریب آ رہے ہیں اور ہم میں سے لاکھوں کروڑوں مسلمان ایسے ہوں گے جو اپنے گھر کی دولت علوم نبوت کے ذریعہ بھی صحیح معنی میں خدا کے وجود و حدانیت سے ناآشنا ملیں گے۔

ظاہر ہے کہ حقیقی اسلام کے بغیر رسمی و اسمی اسلام کی دعویداری کی کیا حیثیت ہے؟ ایسے ہی حالات سے متاثر ہو کر حالی مرحوم نے کہا تھا۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے گر کر جو ہمارا نہ ابھرتا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ہمارے گردفضاء محیط میں موجود ہیں، ہر دور کے ہر خطہ کے نبی کی مثال اس وقت کے چاند یا سورج کی ہے، جس کے انوار و برکات روحانی ومعنوی سے ساری دنیا کو روشنی ملی، اور وہ تمام چاند و سورج اب بھی اپنی اسی آب وتاب کے ساتھ روشن ہیں، مگر ہماری ارواح کو ان مادی اجسام میں مقید ہونے کی وجہ سے ان کا ادراک نہیں ہوسکتا، حضرت نبی الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں شب معراج بہت سے انبیاء و مرسلین علیہم السلام سے ملاقات کی اور مسجد اقصیٰ میں سب نے آپ کے پیچھے مقتدی بن کر نماز جماعت ادا فرمائی۔

وہ سارے انبیاء شموس ہدایت تھے، اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شمس اعظم تھے۔ آپ تمام علوم وکمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع تھے، حق تعالیٰ جل ذکرہ کی بارگاہ میں جو قرب ومنزلت آپ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔

اے ختم رسل مرتبہ ات معلوم شد دیر آمدہ زراہ دور آمدہ!

انبیاء علیہم السلام کے خصائص وفضائل بے شمار ہیں مگر نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وخصائل کی شان سب سے بلند ہے آپ کے خصائص پر مستقل کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے امام سیوطی کی ''خصائص کبریٰ'' بہت مشہور و مستوعب ہے۔

افسوس ہے کہ اردو میں خصائص پر بہت کم مواد ملتا ہے، حالانکہ ان سے نبی ورسول کی عظمت کا سکہ دلوں پر نقش ہوتا ہے کتاب الانبیاء میں ہم بھی خصائص نبوت اور بالخصوص خصائص نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تشریح وتفصیل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہم یہاں صرف ایک خصوصیت کا ذکر کریں گے جس کے باعث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے سب انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہیں اور وہ آپ کی سب اگلی پچھلی لغزشوں کی مغفرت کا اعلان ہے، کیونکہ یوں لغزشیں تو تمام ہی انبیاء کی حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے بخش دی جاتی ہیں مگر اس طرح کھول کر اعلان صرف آپ ہی کے لئے ہوا ہے جس کی بڑی حکمت میدان حشر میں ظاہر ہوگی، سارے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام امتوں کی شفاعت سے عذر کریں گے اور اپنی لغزشوں کو یاد کریں گے، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور درخواست شفاعت کریں گے تو آپ کسی لغزش کا ذکر نہیں کریں گے، بلکہ **انا لھا انالھا** فرمائیں گے، یعنی میں تم سب کے لئے بارگاہ رب العزت میں شفاعت کرنے کے لئے تیار ہوں، جس ذات اقدس کی ساری عمر امت کی خیر خواہی وغم خواری میں گزری تھی، وہ میدان حشر میں اپنی اور اپنے سب بھائیوں کی امتوں کی اس ہولناک دن کی پریشانیوں پر خود ہی کس قدر بے چین ہوگا اور جوں ہی ان سب کی خدمت کا ایک اور زریں موقع وہاں ہاتھ آیا، کیسی جی داری سے ان کی سب کی دلداری **انا لھا انالھا** کی تکرار سے فرمائیں گے، گویا **ومارسلناک الا رحمتہ للعالمین** کا دنیوی زندگی کے ثبوت کے بعد دوسرا ثبوت آخرت میں اس شان کے ساتھ ہوگا۔

یارب تو کریمی و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

انبیاء کی سیرت، صفات، ملکات

عصمت انبیاء علیہم السلام کے بیان سے پہلے مناسب ہے کہ ان کے چند اہم خصوصی ملکات واحوال کا ذکر کردیا جائے، تاکہ ان کا تعارف زیادہ بہتر طریقہ پر ہوکر ان کے ساتھ تعلق عظمت ومحبت میں بھی اضافہ ہو اور وجوہ عصمت بھی زیادہ خوبی سے ذہن نشین ہوں۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کی تربیت وتعلیم کا اہتمام اول سے آخر تک براہ راست اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کے تحت ہوتا ہے اس لیے ان کے تمام احوال زندگی دوسرے لوگوں کے احوال سے مختلف ہوتے ہیں، ان کی طفولیت، شباب، کہولت، شیخوخت کے اطوار بھی سب سے جدا ہوتے ہیں، ان کے ملکات بھی دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، **اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب** ' (حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے مجتبیٰ ومصطفےٰ تو ان کو کرتے ہیں جن کو چاہیں، اور اپنی ہدایت کا راستہ ہر اس شخص کو دکھلا دیتے ہیں جو اس کی طرف رجوع وانابت

کرے) معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ شان عطا ہونے کی شرط اور ہے اور ہدایت کی شرط الگ اللہ اعلم حیث یجعل رسالته (خدا ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کے لیے کون ساظرف موزوں ہے' معلوم ہوا کہ عطا نبوت خاص ملکات موہوبہ پر موقوف ہے۔

(۲) بار نبوت اٹھانے سے قبل ہی ان کے قلوب اس قدر مزکی و مصفیٰ ہو جاتے ہیں کہ ان کے خواب و بیداری کے حالات یکساں ہو جاتے ہیں' وہ اپنے نور باطن سے سامنے اور پیچھے کی چیزوں کو یکساں دیکھتے ہیں' پست و بلند آواز کو یکساں سننے لگتے ہیں' وہ ساری خلق کو خدا کا کنبہ سمجھتے' اور دوست و دشمن' بدخواہ و خیر خواہ کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں' ان کی معصومانہ فطرت و فرشتگی پر فرشتوں کو رشک ہوتا ہے' خلاصہ یہ کہ وہ بشر صورت مگر فرشتہ سیرت ہوتے ہیں۔

(۳) خلعت نبوت سے سرفراز ہو کر انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لیے اسوہ حسنہ اور تمثالی نمونہ ہوتے ہیں ان کا ہر قول و فعل دعوت اتباع ہے' کیونکہ ان کی تمام حرکات و سکنات مرضیات الٰہیہ کی آئینہ دار ہیں۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ   ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنة"

(۴) انبیاء علیہم السلام کے نفوس پیدائشی و خلقی طور پر مطمئنہ ہوتے ہیں' دوسرے انسانوں کی طرح نفوس امارہ نہیں ہوتے یعنی ان کے نفوس فطرۃ ہر معصیت و برائی سے متنفر ہوتے ہیں' اسی طرح دوسرا اور بیرونی دشمن انسان کا شیطان ہے' وہ بھی انبیاء علیہم السلام کے اعلیٰ تقدس و تقویٰ کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان میرا مطیع و منقاد ہو گیا ہے۔ اور فرمایا کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اس لیے جس نے مجھے دیکھا' اس نے مجھے ہی دیکھا۔ بلکہ خیر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں خیر الامم کے بھی بہت سے افراد کو اس قسم کے مناقب عالیہ عطا ہو گئے ہیں' چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ شیطان تم سے ڈرتا ہے' ایک دفعہ فرمایا کہ اے عمر! جس راستہ پر تم چلتے ہو' اس پر شیطان نہیں چل سکتا' ایک بار فرمایا کہ میں نے دیکھا جن و انس کے شیاطین سب ہی عمر سے ڈر کر دور بھاگ گئے ہیں۔ (جمع الفوائد صفحہ ۲۰۷ ج ۲)

(۵) انبیاء علیہم السلام کی بے نظیر قوت علم و عمل کے پورے پورے اثرات ان کے شرف صحبت سے مستفیدین پر پڑتے ہیں' اور وہ سب اپنے وقت کے نبی مرسل کے تمثالی نمونے بن جاتے ہیں' چنانچہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شان' ان کے حالات و مناقب' سب کو معلوم ہے' خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب کی مثال ستاروں کی سی ہے' جس سے بھی تم چاہو گے' ہدایت حاصل کر لو گے' وہ سب عدول تھے' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نہایت ہی ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے اتنی بڑی تعداد میں' جو ایک لاکھ چوبیس ہزار تک منقول ہے' اپنے صحیح جانشین چھوڑے اور وہ سب ہی حق و ہدایت کے مینار تھے' بعض حضرات نے چند صحابہ کے کبار معاصی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ رائے قائم کی کہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین معیار حق نہیں ہیں" یہ رائے ہمارے نزدیک حق صواب سے ہٹی ہوئی ہے' اگر بفحوائے حدیثِ صحیح صحابہ کرام مثل نجوم' اور سب کے سب عدول تھے' تو پھر ان کو معیار حق نہ سمجھنا' کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ تعبیر درست ہو سکتی ہے کہ معیار حق کا اولین درجہ قرآن و حدیث ہے اس کے بعد صحابہ کرام بھی ضروری و بدیہی طور پر معیار حق ہیں۔

ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آثار صحابہ کی حجیت سے قطع نظر کا معاملہ تیسری صدی سے شروع ہوا' اور یہی بات ترقی کر کے اس حد پر پہنچ گئی کہ اس زمانے کے بعض لوگوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ صحابہ معیار حق ہی نہیں ہیں' علاوہ اس کے کہ یہ بات خلاف تحقیق ہے' اس کے مضر اثرات نہایت دور رس ہوں گے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض کے بے مثال گہرے اثرات کا انکار کون کر سکتا ہے' ان کے حالات پڑھ کر اسی طرح ایمان تازہ ہوتا ہے' جس طرح انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھ کر ہوتا ہے' ہمارے اکابر اساتذہ دیوبند تو فرمایا کرتے تھے کہ مشاجرات صحابہ کے صحیح حالات پڑھنے سے بھی ایمان تازہ ہوتا ہے' کیونکہ ہر معاملہ میں ان کی نیک نیتی' بے نفسی و خدمت دین ہی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جن چند صحابہ سے بہ تقاضائے بشریت کسی معصیت کا صدور ہوا ہے' ان کی بے مثال ندامت و توبہ کی صورت حال کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ایک شخص کی توبہ پوری ایک امت پر تقسیم ہو سکتی ہے' ہمارے نزدیک تو ایسے صحابی یا صحابیہ کی زندگی بھی معیار حق و صداقت بن سکتی ہے' پھر دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کا تو کہنا ہی کیا؟

کچھ اسی طرح کی تفریط ائمہ مجتہدین متبوعین اور حضرات مجددین امت رحمہم اللہ تعالےٰ کے بارے میں بھی ہوئی ہے' کہ ان کے کچھ نقائص واقعی یا غیر واقعی پر نظر کر کے' ان کے مراتب عالیہ کو گھٹا کر دکھایا گیا' اس قسم کی تحقیقات پر تنقیدی نظر ہم کچھ مقدمہ انوار الباری میں کر چکے ہیں اور کسی آئندہ فرصت میں بھی کریں گے' انشاء اللہ تعالےٰ۔

انبیاء علیہم السلام کے جلیل القدر ملکات و اوصاف کی طرف چند اشارات پیش کرنے کے بعد مناسب ہے کہ وجوہ عصمت پر کچھ روشنی ڈالی جائے' پہلے مسئلہ عصمت کے بارے میں اکابر امت کے نظریات معلوم کر لیجئے۔

عصمت انبیاء کے متعلق مختلف نظریات اور حقیقت عصمت

عقیدۂ سفارینی میں حافظ امین الدین عراقی سے نقل ہے کہ نبی بعد النبوۃ عمداً گناہ کرنے سے بالا جماع معصوم ہوتا ہے' اور بطور سہو وقوع صغیرہ میں اختلاف ہے' استاذ ابو اسحاق اسفرائنی اور قاضی عیاض مانعین جواز میں ہیں' شیخ تقی الدین سبکی کا شمار مجوزین میں ہے اور حافظ عراقی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

علامہ تفتازانیؒ نے لکھا کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام ذنوب سے معصوم ہونے کے مسئلہ میں تفصیل ہے' کفر و شرک سے تو بالا جماع معصوم ہیں' قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی' اور حشویہ کو چھوڑ کر جمہور امت کے نزدیک اسی طرح قبل و بعد نبوت تعمد کبائر سے بھی معصوم ہیں' البتہ سہواً کو اکثر نے جائز رکھا ہے' صغائر کا صدور عمداً جمہور کے نزدیک اور سہواً بالا تفاق جائز ہے' بجز ان باتوں کے جو اخلاقی گراوٹ سے تعلق رکھتی ہیں (کیونکہ نبی کا وصف خلق عظیم ہے)

اس کے علاوہ عام اشاعرہ کا مسلک جواز وقوع صغائر سہواً و عمداً قبل نبوت و بعد نبوت ہے' اور عام ماتریدیہ اس کی بالکلیہ نفی کرتے ہیں' ہمارے فقہاء حنفیہ بھی انبیاء علیہم السلام کی عصمت مطلقہ کے قائل ہیں۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عصمت حق تعالیٰ کا وہ خصوصی فضل و انعام ہے' جس سے انبیاء علیہم السلام ہر آن و ہر لحہ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے مستعد رہتے ہیں اور کسی وقت بھی ادنی نافرمانی کا دھیان و خیال تک نہیں لاتے' اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے معصیت کا اختیار فرشتوں کی طرح سلب کر لیا جاتا ہے' بلکہ اختیار و قدرت بدستور اور انسانوں کی طرح باقی ہوتے ہوئے بھی نافرمانی کا ہر داعیہ ان کے دواعی خیر کے تحت ایسا دبا مٹا ہوا ہو جاتا ہے کہ اس کے ابھرنے کا امکان وقوع باقی نہیں رہتا' واللہ اعلم۔

حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے "منصب امامت" میں عصمت کی تشریح اس طرح فرمائی:۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت یہ ہے کہ "حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ان کے اقوال' افعال عبادات' عادات' معاملات' مقامات' اخلاق و احوال کو نفس امارہ اور شیطان رجیم کی دخل اندازی اور خطاؤ نسیان سے محفوظ کر دیتا ہے' اور نگرانی و حفاظت کرنے والے فرشتے ان پر مسلط فرما

دیتا ہے تا کہ بشریت کا غبار بھی ان کے دامن پاک تک نہ پہنچ سکے"۔اس کے بعد وجوہ واسباب عصمت نمبروار لکھے جاتے ہیں۔

وجوہ واسباب عصمت

(۱) عصمت کے ظاہری اسباب چار ہیں اور چونکہ یہ سب انبیاء علیہم السلام میں بکل معنی الکلمہ موجود ہوتے ہیں اس لیے ان کی عصمت بھی یقینی ہے (۱) شر کے عواقب ونتائج کا ذاتی علم جو انبیاء کو اپنی عقل کامل کے ذریعہ ہوتا ہے (۲) وحی الٰہی سے اس علم ویقین میں مزید اضافہ (۳) تعلق مع اللہ اور تقرب خاص کے سبب نسیان وترک اولیٰ پر بھی "اندیشہ مواخذہ" (۴) عدالت وثقاہت جو برائیوں سے بچاتی ہے۔

(۲) دیگر صفات کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی ایک بڑی صفت دائمی حضور مع اللہ کی ہے جو عصمت کے لیے بہت بڑا سبب ووسیلہ بن جاتی ہے۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کو اپنی عصمت کا خود بھی پورا یقین ہوتا ہے اور کسی حکم رسول کی بجا آوری میں اگر امتی کی طرف سے کوئی تساہل پایا گیا ہے تو اس پر خدا اور رسول کی طرف سے تنبیہ کی گئی ہے' مثلاً ایک تو اسی حدیث زیر بحث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب وغصہ کا اظہار معلوم ہو چکا ہے' اور اسی نوع کی دوسری حدیث کا بھی ذکر ہم کر چکے ہیں' تیسری حدیث بخاری کی باب **الا عتصام بالسنة** میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عمل میں رخصت کا پہلو اختیار فرمایا' جس پر عمل کرنے کو بعض لوگوں نے پسند نہ کیا' حضور کو اطلاع ہوئی تو آپ نے حمد وثناء کے بعد فرمایا۔

لوگوں کا عجیب حال ہے کہ جس عمل کو میں نے اختیار کیا اس سے احتراز کرتے ہیں' واللہ! میں ان سے زیادہ خدا کا علم رکھنا والا اور سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں۔

چوتھی حدیث بھی بخاری میں ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسرے صحابی کا جھگڑا باغ میں آبپاشی پر ہو گیا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نوبت پہنچی تو آپ نے حالات سن کر فیصلہ فرمایا کہ پہلے زبیر آبپاشی کر لیں' پھر اپنے انصاری پڑوسی مذکور کے باغ میں پانی جانے دیں۔انصاری نے کہا کہ آپ نے ایسا فیصلہ اس لیے کیا کہ زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے رنج وملال ہوا۔کیونکہ آپ کا فیصلہ حق کا فیصلہ تھا' اس کو قبول نہ کرنا یا رسول کے فیصلہ کو دنیوی مصالح وتعلقات پر محمول کرنا اسلامی شان کے خلاف ہے' حضرت زبیر کا بیان ہے کہ اسی معاملہ میں یہ آیت نازل ہوئی' **فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم الایة** (پس نہیں اور قسم ہے تیرے رب کی نہیں مومن ہوں گے وہ لوگ تا آنکہ اپنے تمام نزاعی امور میں آپ کو حتمی طور پر حکم نہ مانیں اور وہ بھی اس شان سے کہ آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں بھی کسی قسم کی تنگی وگرانی محسوس نہ کریں اور اس پوری پوری طرح تسلیم کر لیں)

درحقیقت یہی ایمان والوں کی شان ہے کہ وہ نبی کے مرتبہ کو صحیح طور سے سمجھتے ہیں' اس کی پوری زندگی اور ہر قول وفعل کو اپنے لیے اسوہ اور عملی نمونہ جانتے ہیں' جن چیزوں کا بھی حکم بارگاہ رسالت سے ملتا ہے اس پر بے چون وچرا عمل کرتے ہیں' اور جن چیزوں سے روک دیا اس کے پاس نہیں پھٹکتے' اسی لیے سنت رسول کا اتباع اور امور بدعت سے قطعی اجتناب ایک مومن کی زندگی کا اہم ترین نصب العین ہے۔

جس حدیث کی اس وقت ہم نے تفصیل کی' اس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے جھگڑے کا ذکر ہے' جو بدری صحابی تھے' کوئی معمولی صحابی بھی نہیں' مگر نزول قرآن مجید کا دور تھا' رفتہ رفتہ دین مکمل ہو رہا تھا' اس لیے بڑے بڑے صحابہ سے بھی لغزشیں ہوئی تھیں اور خدا اور رسول خدا ان کی اصلاح فرماتے تھے' اور ان سب احوال وواقعات سے ہمیشہ کے لیے امت محمد یہ کو روشنی ملتی رہے گی' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے مکمل نزول اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی سامنے آجانے کے بعد صحابہ کرام کی علمی وعملی زندگی مکمل ہو گئی تھی' اور جس

طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ زندگی میں مرضیات الٰہیہ اور تخلق باخلاق اللہ کا کامل ومکمل مرقع پیش ہوگیا تھا' اس مرقع کا فوٹو آفسٹ ہو کر ہر ہر صحابی رسول کی لوح قلب پر اس کی کاپی چھپ گئی تھی' فوٹو آفسٹ کی مثال ہم نے وضاحت کے لیے اور اس خیال سے دی ہے کہ فوٹو میں غلطی کا امکان نہیں رہتا' اور شاید اسی لیے پورے وثوق کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' **اصحابی کا لنجوم با یھم ا قتدیتم اھتد یتم** ' کیونکہ ان پر آپ کے اعمال زندگی کی چھاپ پوری اور صحیح طور سے پڑھ چکی تھی' صحابہ کے بعد کے دور میں نقل وروایت شروع ہوئی' جس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے اسی لیے تابعین ومن بعد ہم کے لیے کوئی ایسی توثیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر نہیں ہوئی' البتہ اتنا فرمایا: "**خیر القرون قرنی ثم الذین یلو نھم ' ثم الذین یلو نھم**"۔ اور یہ توثیق صرف خیریت کی ہے۔ کما لا یخفیٰ۔

صحابہؓ معیار حق ہیں

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اگر ہم صحابہ کرام کو بھی معیار حق نہیں مانیں گے تو دین اسلام کے ایک نہایت شاندار دور کو تاریک سمجھ لیں گے اور جو کمزوری تابعین اور ان کے بعد آئی' اس کو بہت پہلے سے مان کر دین کے بیشتر اجزاء کو جو صحابہ کے فتاوی وآثار وغیرہ پر موقوف ہیں' کمزور کردیں گے' غالباً اتنی صراحت کافی ہے لیکن ضرورت ہوئی تو ہم اس سے زیادہ کھل کر بھی کچھ عرض کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ وھو المستعان۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بعض لغزشیں ہوئی ہیں' جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور ان کا اعتراف خود انبیاء علیہم السلام سے بھی ثابت ہے اور احادیث شفاعت میں بھی حشر کے روز ہر نبی کا اپنی کسی لغزش وغیرہ کے سبب شفاعت سے اعتذار ثابت ہے اس کے چند جوابات ہیں وہ بھی ذہن نشین کرلیجئے۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کی جن لغزشوں کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے وہ ان کی پوری زندگی کے ہزارہا نیک اعمال میں سے صرف ایک دو عمل ہیں جن کی عدم اہمیت ظاہر ہے۔

(۲) وہ لغزشیں بھی کفر وشرک یا گناہ کبیرہ کی قسم سے نہیں ہیں۔

(۳) اکثر لغزشوں کا تعلق خطا ونسیان سے ہے جن کا مواخذہ امت سے بھی نہ ہوگا۔

(۴) انبیاء علیہم السلام پر عتاب ہے اس لئے ہوا کہ '**حسنات الابرار سیئات المقربین**' پھر جن کے رتبے ہیں سوا اس کے سوا مشکل ہے۔

نیز اس لئے کہ امت کے کان اچھی طرح کھول دیئے جائیں کہ خدا کی بارگاہ جلیل میں رعایت' بڑے سے بڑے کی بھی نہیں کہ رسولوں سے اوپر تو کسی کا مرتبہ ہو ہی نہیں سکتا' مگر وہ بھی خدا کی مخلوق اور بندے ہیں' باوجود مراتب عالیہ اور اعلیٰ ترین تقرب بارگاہ رب العزت کے ان کی لغزشوں پر بھی گرفت ہوسکتی ہے اور یہ بھی نہیں کہ اگر ان کی لاکھ دس لاکھ نیکیاں ہیں تو ایک دو لغزشوں پر نظر نہ ہو' یوں شان رحمت سے جب غیر نوازے جائیں گے تو اپنے کیسے محروم ہوسکتے ہیں۔

غرض ان لغزشوں کا ذکر اور بعض جگہ زیادہ تند وتیز لہجہ میں بھی صرف اپنی شان جلال وجبروت کا اظہار ہے اسی لئے ایک ایک ہی لغزش کو کہیں سخت گرفت میں لیا ہے اور دوسری جگہ اس کو شان رحمت کے انداز سے دکھلایا ہے اس کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش میں ملتی ہے' ایک جگہ '**فعصی ادم ربہ فغوی**' سے ادا فرمایا اور دوسری جگہ **فنسی ولم نجد لہ عزماً** فرمایا' اور بات صرف اتنی تھی کہ آدم وذریت آدم کو اپنے علم تقدیری کے اعتبار سے جنت میں ہمیشہ کے لئے اس وقت رکھا ہی نہیں گیا تھا' بلکہ دنیا میں بھیج کر ایک معین مدت تک کے لئے آباد کرنا اور اعمال (اوامر ونواہی) کا مکلف کرنا تھا' پھر سب کو آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق صحیح طور سے مستحق جنت وجہنم

بنانا تھا، غرض ایک عبوری دور کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو داخل جنت کیا اور بطور نہی شفقت ایک خاص درخت کے پھل کھانے سے روک دیا، شیطان نے اسی کے کھانے پر طرح طرح سے آمادہ کیا اور خدائے برتر کی قسمیں تک کھائیں کہ اس درخت کے پھل کھا کر تم فرشتے بن جاؤ گے (جس سے خدا کا تقرب اور بڑھ جائے گا) یا تم ہمیشہ جنت میں رہو گے (نکالے نہ جاؤ گے) سنتے سنتے آدم علیہ السلام کا اشتیاق ادھر بڑھا اور سوچا کہ نہی تشریع تو ہے نہیں، نہی شفقت ہے، کچھ زیادہ نقصان اور وہ بھی شرعی ضرر تو ہوگا نہیں اور ممکن ہے وہ مبینہ فوائد حاصل ہو جائیں، شیطان کی باتوں سے دھوکہ کھا گئے اپنے منصب رفیع کو بھول گئے کہ نبی کو خدا کے معمولی سے احکام کی بھی زیادہ سے زیادہ رعایت کرنی چاہئے اور اس کے کسی امر و نہی کے مقابلہ میں کسی عقلی مصلحت و فائدہ پر دھیان نہ دینا چاہئے تاہم یہ صرف ایک بھول تھی اور اس کے ساتھ عزم بھی نہ تھا کہ خدا کے حکم کو جان بوجھ کر، سوچ سمجھ کر نظر انداز کیا ہو جو نہی تشریعی کی صورت میں ہوسکتا تھا، نہی شفقت میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس کے خلاف سے اپنا ذاتی کوئی ضرر ہوسکتا ہے۔ آدم علیہ السلام نے اس کے مقابلہ میں نفع کثیر کا خیال باندھ لیا، یہ کیا خبر تھی کہ اس نہی شفقت پر عمل نہ کرنے کے اثرات اتنے زیادہ اور دیرپا ہوں گے کہ ذریت آدم کو جنت کی نعمتوں سے محرم ہو کر ہزاروں ہزار سال بطور ابتلائی دور کے گزارنے پڑیں گے اس لغزش پر حضرت آدم علیہ السلام کو جس قدر ندامت ہوئی۔

اور برسہا برس تک اس سے توبہ واستغفار فرماتے رہے وہ ان کی پیغمبرانہ علوشان کا مظاہرہ تھا، جو احکم الحاکمین کی اعلیٰ وارفع ذات کی نہی شفقت کی عدم رعایت کا لازمی نتیجہ تھا ورنہ فی نفسہ اس کی حیثیت ایک لغزش یا نسیان سے زیادہ نہ تھی، اس لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جد بزرگوار حضرت آدم علیہ السلام کو الزام دینا چاہا کہ آپ کی لغزش کے باعث آپ کی ساری ذریت ایک طول طویل ابتلا کی دلدل میں پھنس گئی تو دادا جان (ارواحنا فداہ) نے کیسا کھرا جواب دیا کہ تم مجھے ایسی بات پر ملامت کرنے لگے ہو، جو تقدیر الٰہی میں میری پیدائش سے بھی ہزاروں سال پہلے لکھی ہوئی تھی، سرور دو عالم محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ دادا جان علیہ السلام کی حجت بھائی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں قوی تھی، اس لئے وہ غالب رہے اور بھائی جان کو لاجواب ہونا پڑا۔

شرک فی التسمیہ والی لغزش بے بنیاد ہے

اس لغزش کے علاوہ جو بات شرک فی التسمیہ والی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی، وہ قطعاً غلط ہے اور جو حدیث ترمذی میں روایت کی گئی وہ حسب تصریح حافظ ابن کثیر و شیخ التفسیر علامہ آلوسی صاحب روح المعانی وغیرہ اسرائیلیات سے ہے اور اسرائیلیات میں سے بلکہ دوسری اخبار آحاد سے بھی ہم وہی چیز لے سکتے ہیں جو قطعیات اسلام کے خلاف نہ ہو، ظاہر ہے کہ نبی کا ہر شائبہ شرک سے بری ہونا قطعی واجماعی مسئلہ ہے۔

لہٰذا آیت **جعلاله شركاء** میں حضرت آدم علیہ السلام وحواء مراد نہیں بلکہ جس طرح محققین اہل تفسیر کی رائے ہے وہی اصوب واسلم ہے کہ حضرت آدم وحواء کا ذکر بطور تمہید تھا پھر ذکر ان کی اولاد کا شروع ہوا کہ ہر ماں باپ اچھی اولاد کی تمنا ودعا تو خدا سے کرتے ہیں اور وہی عطا بھی کرتا ہے مگر بدعقیدہ ماں باپ شرک کی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالعزیٰ کوئی عبدمناف، کوئی عبدالشمس، کوئی عبدالدار رکھ دیتا ہے، یہ لوگ ان بتوں کو خدا کا شریک سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جو خود ہی مخلوق ہیں وہ کس طرح خدا یا خالق کے شریک بن سکتے ہیں، پھر ایسے نام رکھنا بڑا شرک نہ بھی ہو تو شرک فی التسمیہ تو ضروری ہے، جس سے بچنا چاہئے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جس نبی سے کوئی لغزش دنیا میں ہوئی ہے اس کا ذکر احادیث شفاعت میں آیا ہے اور کسی حدیث میں مذکور نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام قیامت کے روز اس لغزش کا ذکر کریں گے کہ مجھ سے شرک فی التسمیہ ہو گیا تھا اس لئے شفاعت نہیں کر سکتا، البتہ اکل

شجرہ والی لغزش کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ اگر مذکورہ بات صحیح ہوتی تو یہ بہت بڑا عذر بن سکتا تھا جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس امر کو بھی بطور عذر پیش کر دیں گے کہ مجھے لوگوں نے ابن اللہ کہا تھا' یا خدائی کا شریک بنالیا تھا' حالانکہ اس بات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی ادنیٰ اشارے کو بھی دخل نہیں' اسی لئے نہ ان سے اس پر مواخذہ ہوا اور نہ ہوگا۔

شک فی الاحیاء والی لغزش بے بنیاد ہے

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول رب ارنی کیف تحیی الموتی کو کسی درجہ میں بھی شک فی الاحیاء وغیرہ میں بھی شک فی الاحیاء وغیرہ پر محمول کرنا غلط ہے' اول تو آگے قال اولم تومن الآیہ سے یہ بات خود صاف ہوگئی کہ کسی شک وشبہ کی بات تھی ہی نہیں جو ایمان کے خلاف پڑتی' دوسرے یہ کہ حدیث شفاعت میں بھی اس کا ذکر نہیں' ورنہ جس طرح دینی مصلحت کے لئے تین مرتبہ توریہ کے کلمات کہہ دینے کو عذر بنائیں گے' اس بات کو بھی پیش کر کے ڈبل عذر کر سکتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول ھذا ربی کی بھی توجیہ ہے کہ وہ بطور ذہنی انتقالات کے یا مقابل کفار ومشرکین کے فاسد مزعومات پر فرما رہے ہیں کہ یہ رب ہے! پھر غروب ہونے پر جتلایا کہ کیا رب کی یہ شان ہوتی ہے؟ اور آخر میں رب حقیقی کا تعارف کرا دیا اور واقعی کوئی لغزش ہوتی تو اس کو بھی وہ شفاعت کے وقت سند عذر بناتے'

اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کا حال ہے' جس کی تفصیل حسبِ موقع پیش ہوگی' یہاں اتنی بات صاف ہوگئی کہ انبیاء سب معصوم تھے اور وہ خود بھی اپنے کو معصوم ہی سمجھتے تھے' یہ اور بات ہے کہ خدائے تعالیٰ کی مبرا ومنزہ ذات گرامی صفات کا شعور جس قدر قوی ہوتا ہے اسی قدر بشری کمزوریوں کا احساس بھی قوی تر ہو جاتا ہے اور اس مقام رفیع میں بڑے بڑوں کو اپنی حسنات بھی سیئات معلوم ہوتی ہیں' لغزشیں تو پھر لغزشیں ہیں۔

یہاں اس امر پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ جن آیات میں انبیاء علیہم السلام کو خطاب کر کے بعض معاصی ورذائل اور کفر وشرک سے اجتناب کرنیکی ہدایت کی گئی ہے ان سے مقصود تو غیر ہی ہیں' صرف نوازش خطاب سے انبیاء کو نوازا گیا ہے۔

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

اس طرز خطاب کے بہت فائدے ہیں' ایک حکمت یہ بھی ہے ان امور کی اہمیت کا زیادہ سے زیادہ احساس کرانا وغیرہ' ایسے ہی انبیاء علیہم السلام کی کثرت توبہ واستغفار بھی ان کی شان عصمت کے خلاف نہیں' کیونکہ توبہ کے معنی رجوع وانابت الی اللہ کے ہیں اس کی ضرورت جس طرح ایک عاصی وخطا کار کو ہے بڑے سے بڑا نبی وولی بھی اس کا محتاج ہے اس لئے اس نسخہ کیمیا کی سب ہی کو ضرورت ہے اور استغفار جس طرح گناہوں سے ہوتی ہے معمولی لغزشوں اور ذرا ذرا سی غفلتوں پر بھی ہوتی ہے چنانچہ نبی امی فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے دل پر کبھی غبار آتا ہے' جس کی وجہ سے میں ستر بار استغفار کرتا ہوں' انبیاء علیہم السلام حضور دوام کی دولت سے مشرف ہوتے ہیں کہ ہمہ وقتی خدا کا مشاہدہ اور دھیان ان کو حاصل رہتا ہے' پھر نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو سب سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہے' فرمایا کہ میری آنکھیں سوئی مگر دل جاگتا رہتا ہے' یہی قلب منور جو ہر وقت خدا کے ذکر وتصور میں مستغرق رہتا ہے اگر کبھی اتفاق سے اس پر کوئی لمحہ غفلت کا گزر گیا تو اسی کو غین وغبار سے تعبیر فرمایا' اور اپنے مرتبہ ومقام کے لحاظ سے اس کو ستر مرتبہ استغفار فرما کر پھر سے صاف وشفاف فرمالیا' یہ تھی نبوت کی شان رفیع کہ ذرا سا لمحہ بھی غفلت کا گوارا نہیں' جبکہ غفلت کا لفظ لکھتے ہوئے بھی دل ڈر رہا ہے کہ اس کا مصداق شاید ہزاروں لاکھواں جز بھی وہاں نہ ہوگا۔

سرور دو عالم ارواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں آپ کی امت کے لئے بڑا سبق ہے آج کتنے ہیں جو اپنے آئینہ قلب کو صاف رکھنے کی فکر کرتے ہیں' کیا صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ان کے سامنے نہیں کہ ایک گناہ کرنے سے دل پر سیاہ نقطہ لگ

جاتا ہے اور توبہ واستغفار سے اگر اس کو صاف نہ کرلیا جائے تو اسی طرح دوسرے اور تیسرے گناہ سے اس پر سیاہ نقطوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، جو معاذ اللہ غفلت میں پڑے رہنے سے کبھی کبھی پورا کا پورا بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔

خدا سے ڈرنا چاہئے، ارتکاب معاصی وترک واجبات وفرائض سے سخت پرہیز کرنا چاہئے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو اس کا تدارک فوراً کرنا چاہئے، جس کا نہایت آسان نسخہ توبہ واستغفار ہے، یہ خدائے تعالیٰ کا امت محمدیہ کے لئے بہت ہی بڑا فضل وانعام ہے کہ مومن کے لئے توبہ واستغفار کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھا ہے، اگر ایمان کی چنگاری بڑے سے بڑے اور زیادہ سے زیادہ گناہوں کی راکھ میں بھی مستور ہو گئی ہے تو وہ ساری راکھ کا ڈھیر توبہ واستغفار کی پھونک سے دور ہو سکتا ہے اور ایمان کی چنگاری پھر سے پوری آب وتاب سے روشن ہو جاتی ہے، **التائب من الذنب کمن لاذنب له. واللہ الموفق۔**

اب ہم بقیہ وجوہ واسباب عصمت انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرتے ہیں۔

۴- اللہ تعالیٰ اپنے خاص محافظ دستے فرشتوں کے انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے لئے مقرر فرماتے ہیں تاکہ اگر کسی وقت کسی نبی کے لئے حالات، ماحول اور نزاکت وقت سے ایسی صورت پیش آجائے کہ بشریت کے تقاضوں کو روک تھام دشوار تر ہو جائے تو اس وقت بھی نبی کا قدم ڈگمگا نہ سکے، کیونکہ نبی کی ذراسی لغزش سے امت پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام بھول گئے تھے، تو ان کی ساری ذریت کو بھول کی بیماری نے پکڑلیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی لغزش نبی سے ہو جائے تو اسی قسم کی لغزش کا شکار اس کی ساری امت ہو سکتی ہے اس لئے انبیاء کا دامن تمام گناہوں سے پاک وصاف ہی رکھا جاتا ہے اور اس کے لئے قسم قسم کے اسباب حفاظت کے مقرر کر دیئے گئے ہیں، اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا واقعہ اپنے سامنے لے آیئے، کہ بچپن میں کس طرح گھر کے بہترین ماحول (خاندان نبوت) سے نکلے (جہاں نہایت اعلیٰ تربیت خود اپنے والد بزرگوار سے حاصل ہو سکتی تھی جو بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے) عزیز مصر کے گھر پہنچایا اور بغیر ظاہری اسباب کے صرف اپنے الطاف غیبیہ وشان ربوبیت خاصہ سے آپ کی تربیت فرمائی، بظاہر زندگی شہزادوں کی طرح عزیز مصر کے محل میں گزر رہی ہے عزیز مصر اور اس کی بیوی زلیخا انتہائی پیار وشفقت سے آپ کو پال رہے ہیں، عزیز مصر کی زلیخا کو بڑی تاکید ہے کہ اس بچہ کا نہایت خیال رکھا جائے، یہ ظاہری بدن کی تربیت کا سامان ہے اور دل ودماغ کی تربیت خود رب العلمین فرما رہے ہیں، اب حضرت یوسف علیہ السلام (جو حسن وجمال میں یکتائے زمانہ تھے) جوں جوں بڑے ہو رہے ہیں، زلیخا کے دل میں ان کی محبت کی پینگ بڑھ رہی ہے۔

یزیدک وجهه حسنا اذا ما زدته نظرا

(حسین وجمیل چہرہ پر جتنی زیادہ نظر کی جاتی ہے اتنی ہی اس کے حسن وجمال کی کشش بڑھا کرتی ہے)

اسی لئے حدیث میں آنکھیں سینکنے کی ممانعت ہے اور حسن وجمال کی فتنہ سامانیوں سے بچنے کا واحد اور کیمیا اثر نسخہ یہ بتلا دیا گیا ہے کہ ایک نگاہ دفعتہً پڑ جائے تو خیر، دوسری، تیسری نگاہ ڈالنا غضب ہے چہ جائیکہ مستقل سنکائی کی عادت اختیار کرلی جائے تو اس سے بڑا اور برا تو دوسرا مرض ہی نہیں، اور سب سے بڑی ایک خرابی یہ ہے کہ ہر کام سے آدمی تھک جاتا ہے ہر چیز سے دل بھر جاتا ہے مگر صرف آنکھ ایسی چیز ہے کہ وہ دیکھنے سے نہیں تھکتی اور نہ کبھی سیر ہوتی ہے، غرض اس بیماری کا کوئی علاج نہیں، عربی کے مشہور شاعر متنبی نے کہا تھا کہ "خدا میرے محسن ومکرم بادشاہ کو آنکھوں کی فسوں کاریوں سے محفوظ رکھے، کیونکہ ان کا مقابلہ نہ وہ اپنی فوج فرا سے کر سکتا ہے، نہ جود وسخاوت سے کر سکتا ہے۔ فارسی شاعر نے کہا۔

زنا توانی خود ایں قدر خبر دارم   کہ از رخش نتوانم کہ دیدہ بردارم

اکبر الہ آبادی مرحوم بہت مایوس ہیں کہ اس زمانہ میں کم از کم اس حکم شرعی پر عمل بہت کم ہے کیونکہ شریعت نے دونوں طرف بند لگائے تھے جب ایک بند ٹوٹ چکا ہے تو صرف ایک بند سے کام کیسے چلے گا؟ وہ کہتے ہیں۔

نئے طریقوں پہ مقصد شرع کارفرما نہ ہو سکے گا ادھر جو پردہ نہ ہو سکے گا' ادھر بھی تقویٰ نہ ہو سکے گا

مگر شریعت کا قانون ہے کہ جتنے زیادہ نامساعد حالات وماحول میں شرعی حکم پر عمل کیا جائے گا' اتنا ہی اس کا اجر وثواب بھی بڑھ جائے گا' اس لئے شکست ہمت کا اسلام میں کوئی درجہ نہیں' یہ مردان خدا کا دین ہے یہاں پست ہمتی وکم حوصلگی جرم عظیم ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ آزمائش کس کی ہوسکتی ہے؟

ایک ملکہ حسن وجمال' یکتائے روزگار شاہزادہ حسن وجمال پر بری طرح فریفتہ ہو جاتی ہے' دونوں کی زندگی ایک ہی گھر میں گزر رہی ہے۔ زلیخا بقول غالب ؎

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست بزم خیال میکدہ بے خروش ہے

اس ماحول سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے کوئی شرعی وعقلی پابندی اس پر نہیں ہے اکبر مرحوم دیکھتے کہ ایک طرف کا بند پوری طرح شکست ہے' وہ حسن رہ گزر سے ہی ڈر گئے' یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگذشت پڑھتے کہ ایسے نازک ترین موقع پر انہوں نے کس جی داری سے شریعت کو تھاما' کیا ان کی ایمانی' عملی'' فکری' عصمت پر ذرہ کے برابر بھی کوئی داغ آسکا؟

ان کے دل ودماغ فکر ونظر کی حفاظت خود رب العالمین فرمارہے تھے اور اس کے فرشتے پہرہ پر لگے ہوئے تھے خدائی احکام کا پورا تسلط حضرت یوسف علیہ السلام کے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا ایسے حالات میں خلاف عصمت کوئی بات کس طرح ہو سکتی تھی' دوسروں کے لئے یہ بات بہت دشوار تھی مگر خدا کے مطیع بندوں اور خصوصیت سے انبیاء علیہم السلام کے لئے ایسے دشوار گزار مرحلے آسان ہو جاتے ہیں وہ ایسے مواقع میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی استعانت چاہتے ہیں' زلیخا نے پوری تیاریاں کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں پھانسنے کی آخری کوشش کر ڈالی مگر آپ بڑے اطمینان کے ساتھ ''معاذ اللہ'' کہہ کر خدائی حصار میں داخل ہو گئے' جہاں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت وتدبیر بیکار محض ہو جاتی ہے۔

آگے کیا ہوتا ہے' اسے بھی سن لیجئے! پہلے ہر دو طرف سے صرف زبانی بات چیت تھی' زلیخا نے پورے اطمینان سے اپنی تدابیر پر بھروسہ کر کے کہا تھا کہ ادھر آیئے! اور حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمادیا کہ یہ بات ممکن نہیں! اس پر بھی زلیخا باز نہ آئی اور پورے عزم وحوصلہ سے عملی قدم اٹھانے کی تدابیر کر ڈالیں' تو دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے جال سے نکلنے کی پوری عملی تدابیر اختیار فرمالیں' آگے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ واقعی اس قدر نازک موقع تھا کہ اس کے توڑ میں پیغمبرانہ اولوالعزمی کے ساتھ بشری تدابیر کمزور پڑ سکتی تھیں' چنانچہ اس کمزوری کا احساس حضرت یوسف علیہ السلام کے قول ''والا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن'' سے بھی ظاہر ہوتا ہے) اس لئے ہم نے بھی اپنے طریقہ پر اپنی برہان وحجت دکھلا کر ان کی مدد کی' اس کے بغیر ممکن تھا کہ وہ اس قدر ثابت قدمی نہ دکھا سکتے' اس اگر مگر والی بات سے ہو سکتا ہے کہ آپ اس قسم کا خیال دل میں لائیں کہ پیغمبرانہ عصمت میں بھی رخنہ پڑنے کا امکان ضرور ہے' مگر یہاں' ہمیں دکھلانا بھی یہی ہے کہ اگر ایسی سنگین صورت حال بھی پیش آجائے جیسی حضرت یوسف علیہ السلام کو پیش آئی تو نبی کی عصمت کی نگرانی خدا کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حفاظت سے بھی ہوتی ہے اور اس قسم کی گارنٹی غیر انبیاء علیہم السلام کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا انبیاء کی عصمت ہر صورت میں بے داغ' بے شک ولاریب ہے۔ وھو المراد۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کو پیدائشی طور پر بہت سے خواص اہل جنت کے دنیا میں بھی حاصل ہوتے ہیں' مثلاً دائمی حیات' دائمی عبادت (کہ قبور میں بھی مشغول عبادت رہتے ہیں' کثرت' ازواج:۔ وفات پر اجساد مبارکہ کا عدم تغیر' وغیرہ' لہٰذا اہل جنت ہی کی طرح ان کے لئے دنیا میں عصمت بھی ثابت ہے' واضح ہو کہ جنت واہل جنت کے بہت سے نمونے دنیا میں دکھائے گئے ہیں بلکہ بعض چیزیں جنت کی دنیا میں اتار دی گئی ہیں' مثلاً مقام ابراہیم' حجر اسود وغیرہ اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی کچھ چیزیں جنت میں جائیں گی' مثلاً بیت اللہ' مسجد حرام اور دوسری تمام مساجد جنت کے علاقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور سب اسی طرح جنت کی طرف اٹھالی جائیں گی۔ واللہ اعلم۔

عصمت انبیاء کے متعلق حضرت نانوتوی کی تحقیق

عصمت انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک نہایت مکمل و مدلل تحقیق حضرت حجتہ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہ کے مکتوبات گرامی میں ملتی ہے، اس کا بھی کچھ خلاصہ ملاحظہ کیجئے! آپ کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام تمام صغائر و کبائر سے قبل نبوت و بعد نبوت ہر زمانے میں معصوم ہوتے ہیں، مندرجہ ذیل ہر دو دلیل آپ کے مکتوب گرامی سے ماخوذ ہیں۔

(۶) قرآن مجید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلقہ کا امر کیا گیا ہے، جب ہر معاملہ میں آپ کی اتباع ضروری ہوئی تو آپ کی عصمت ضروری ٹھہری، ورنہ معصیت میں بھی اتباع ماننی پڑے گی، جو خدا کا حکم نہیں ہوسکتا۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے جن وانس کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ معصیت عبادت و طاعت کی ضد ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے اندر مادہ شیطانی نہیں ہے، جس سے معصیتوں کا صدور ہوتا ہے عام انسانوں میں چونکہ مادہ ملکی اور مادہ شیطانی دونوں ہوتے ہیں اس لئے ان سے دونوں کے لوازم و آثار یعنی اچھے و برے اعمال بھی صادر ہوتے ہیں، ملائکہ میں چونکہ صرف نیکی کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے، وہ صرف نیک اعمال کرتے ہیں گناہ نہیں کرسکتے، اس کے برعکس شیاطین میں صرف مادہ معصیت و کفر رکھا گیا ہے ان سے کفر و معصیت ہی کا صدور ہوتا ہے، ایمان و اعمال صالحہ کا نہیں ہوسکتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر چونکہ صرف مادہ ملکی ودیعت کیا گیا ہے اس لئے ان سے بھی ملائکہ کی طرح صرف نیکیاں صادر ہوں گی، اس لئے وہ معصوم ہیں، اور ان کی کامل اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور چونکہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انبیاء سابقین کے طریقوں کی پیروی کیجئے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ سب بھی معصوم تھے ورنہ یہاں حضور کو ان کی مطلق اتباع و اقتدار کا حکم نہ ہوتا۔

حضرت نانوتویؒ نے یہاں اس امر کی بھی وضاحت فرمادی ہے کہ اگرچہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں وہ قوت نہیں ہوتی جو صدور عصیان کا اقتضاء کرتی ہے مگر کسی خارجی وعارضی سبب سے صدور عصیان کا امکان ضرور باقی رہتا ہے اسی لئے قدرت ان کی نگہبان رہتی ہے اور اس قسم کی نافرمانی سے بھی بچالیتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا۔ "**کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین**" (سورۃ یوسف)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اس آیت سے چند فوائد معلوم ہوئے۔

(۱) جو نوع سوء اور فحشاء کی تعریف میں نہ آتی ہو اس کا صدور کسی عارضی وجہ سے متشنیٰ ہوسکتا ہے۔

(۲) سوء و فحشاء کا تحقق خارجی اسباب سے یہاں بھی ہوسکتا ہے۔

(۳) اس امکان مذکور کے باوجود قدرت ان کے صدور سے بھی نگہبان رہتی ہے پھر لکھا معصومیت بایں معنیٰ کہ ذات معصوم میں صدور معاصی کا منشا بھی نہ ہو، صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اولیاء اللہ کی بھی یہ شان نہیں البتہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بھی حفاظت فرماتے ہیں، تو ان کا درجہ محفوظیت کا ہے، جو معصومیت سے کم تر ہے۔

(۷) قرآن مجید میں ہے "**عالم الغیب، فلایظهر علی غیبه احداً الامن ارتضیٰ من رسول فانه یسلک من بین یدیه و من خلفه رصدا**" (جن) وہ عالم الغیب ہے، اپنی غیب کی خبریں بجز اپنی پسندیدہ مخلوق رسولوں کے اور کسی کو نہیں دیتا، اور ان کی وحی کے آگے پیچھے فرشتوں کے پہرے اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں (تاکہ کسی طرف سے شیطان اس میں دخل نہ دے سکیں) معلوم ہوا کہ پیغمبروں کے علوم و اخبار میں غلطی کا کوئی امکان نہیں اس کے علاوہ انبیاء کا اپنے تمام اعمال زندگی میں معصوم ہونا وہ بھی اسی آیت سے ثابت ہے، جس کے لئے حضرت نانوتویؒ کا طریق استدلال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو اپنا برگزیدہ و پسندیدہ فرمایا اور یہاں کوئی قید و شرط بھی نہیں کہ فلاں عمل کے باعث وہ

مرتضٰی ہوئے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ اپنی پوری زندگی کے اعمال کی رو سے برگزیدہ و پسندیدہ ہیں اور یہی شان عصمت ہے۔

عظمت و عصمت انبیاء علیہم السلام کی بحث چونکہ نہایت اہم ہے اور مذاہب حقہ کی عظمت و فضیلت و حقیت کا مدار بھی بڑی حد تک اس پر ہے' اس لئے ہم نے یہاں کسی قدر تفصیلی بحث کی' باقی انبیاء علیہم السلام کے مکمل حالات و مناقب و فضائل کے لئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کی کتاب ''قصص القرآن'' کا مطالعہ کیا جائے جو چار ضخیم جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہے اردو زبان میں وہ نہایت بیش قیمت نادر علمی ذخیرہ ہے جو بحمد اللہ کافی احتیاط سے مرتب ہوا ہے۔ اس کے بعد گزارش ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بیان حالات میں ادنیٰ درجہ کی بے احتیاطی یا محض واعظانہ رنگ کی نکتہ آفرینیاں مناسب نہیں' انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کوئی بات بھی لکھنی ہو۔ خصوصاً نئی قسم کی تو اس کے لئے نہایت وسیع مطالعہ' کثیر معلومات اور مکمل احتیاط کی ضرورت ہے کہ اکابر سلف کی تحقیقات بھی نظر انداز نہ ہو سکیں' کیونکہ جمہور سلف اور ائمہ محدثین و مفسرین کو چھوڑ کر ایک دو عالموں کی رائے پر کوئی جدید نظریہ قائم کر لینا اور اس کو شرعی دعویٰ کی صورت میں پیش کر دینا بہت سی دینی مضرتوں کا سبب بن سکتا ہے۔

علی الخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے' معلوم ہے کہ یہود نصاریٰ نے کس قدر غلط باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی تھیں' جن کا ازالہ قرآن و حدیث میں کیا گیا ہے۔ پھر امت محمدیہ میں بھی کچھ غیر محتاط قلموں سے ایسے مضامین نکل گئے' جن سے فرق باطلہ کو قوت ملی' اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی افراط و تفریط ہوئی ہے' جس کے مضر نتائج سب کو آشکار ہیں ہمارے اکابر حضرات دیوبند کی یہ شان تھی کہ ان کی تحریر و تقریر نہایت محتاط ہوتی تھی' حتیٰ کہ مواعظ میں بھی اتنی احتیاط برت گئے جو ہمارے اس دور کے اکثر علماء سے دشوار نظر آ رہی ہے' حضرت تھانویؒ کے مواعظ شائع شدہ ہیں' حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت عثمانیؒ کے مواعظ بھی اکثر سننے کا شرف حاصل ہوا' مگر آج کل جو سیرت کے جلسوں میں بیان ہوتے ہیں' ان کا رنگ بالکل دوسرا دیکھنے میں نظر آ رہا ہے' جس کا مقصد عوام کو خوش کرنا اور ان کی داد حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے۔ آخر اس عوام پسندی کے رجحان سے ہمارا کوئی شعبہ زندگی بھی محفوظ رہ سکے گا یا نہیں؟ ہر وعظ اور تقریر سیرت پر اس کی اجرت اور نذرانے وصول کئے جاتے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر وصول کرنے کی فکر میں رہتا ہے' کیا یہی ہمارے اکابر و اسلاف کی شان تھی' اور کیا ایسے مواعظ و تقاریر سیرت سے عام مسلمانوں پر اچھے اثرات پڑ سکتے ہیں؟ مدارس سے بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں' پھر بھی عوام سے گرانقدر نذرانوں کے متمنی رہتے ہیں'

اہل بدعت کی جن باتوں کو ہمارے اکابر نے خلاف تحقیق و احتیاط بتلایا تھا' آج ہم خود اپنی تقاریر و تصانیف میں' ان سے احتیاط کو غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اپنے مواعظ میں یہ جملہ بھی فرمادیا کرتے تھے کہ ''بھائی! عمل تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ علم صحیح ہے' اس لئے جو بات بتائیں گے وہ دین کی صحیح ترجمانی یعنی ٹکسالی و معیاری ہوگی۔ کاش! ہم اپنے اس مرکز سے دور نہ ہوں۔ واللہ الموفق والمیسر:۔

بقیہ فوائد متعلقہ حدیث باب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث میں ذنب کا ذکر ہے' جو سب سے کم درجہ ہے۔ جس نے معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات معظم اور شان رفیع کے لحاظ سے غیر مناسب امر کے ہیں' اس سے زیادہ درجہ خطا کا ہے' جو نادرست و ناصواب فعل کو کہتے ہیں' اور ان سب کے اوپر معصیت کا درجہ ہے' جو عدول حکمی نافرمانی ہے' اور صغائر و کبائر کی تقسیم بھی اسی میں جاری ہوتی ہے' ذنب و خطا میں نہیں۔

اشکال وجواب

جب انبیاءعلیہم السلام سب ہی مغفور ہیں تو پھر زیر بحث آیت وحدیث میں صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت ذنوب کا ذکر کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص اعلان مغفرت کے لئے ہے' کیونکہ آپ کے لیے شفاعت کبریٰ اور مقام محمود مقدر ہو چکی ہے' لہٰذا دنیا میں اعلان مناسب ہوا' تا کہ قیامت کے ہولناک دن میں آپ کے قلب مبارک کو ڈھارس اور سکون حاصل ہو'اور بے تامل شفاعت کبریٰ فرما سکیں' اگر دنیا میں آپ کی مغفرت کا اعلان نہ ہوا ہوتا تو ممکن تھا آپ بھی اپنے ذنوب کو اسی طرح یاد فرما کر عذر فرما دیتے جیسے دوسرے انبیاءعلیہم السلام کریں گے۔ چنانچہ اس روز عذر کے ساتھ انبیاءعلیہم السلام یہ بھی فرمائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ! کہ ان کے تمام گذشتہ ذنوب بخشے جا چکے ہیں۔

دوسرا اشکال وجواب

جو ذنوب بعد کو ہونے والے ہیں ان کی مغفرت پہلے سے ہو جانا کیوں کر ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں:۔

(۱) اگرچہ مغفرت کا عام مفہوم یہی ہے کہ وجود ذنب کے بعد اس کا وجود ہو' مگر اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم سے کوئی ذنب ہو تو ہم اس پر مواخذہ نہیں کریں گے' پس مغفرت بمعنی عدم مواخذہ ہوئی۔

(۲) علم خداوندی میں سب اگلے پچھلے موجود ہیں' کیونکہ اس میں تقدم و تاخر نہیں ہے' پس سب کی مغفرت بھی دفعۃً درست ہے۔

(۳) مغفرت احکام آخرت سے ہے' جہاں سب ذنوب ماضی سے متعلق ہو چکیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ارشاد

کہ وعدۂ مغفرت کا مقتضیٰ عمل واحتیاط ہے' نہ کہ عدم عمل وترک احتیاط اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود مغفرت ذنوب کے بہت زیادہ عبادت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ راتوں کو نوافل میں کھڑے کھڑے پاؤں متورم ہو جاتے تھے صحابہ کرام عرض کرتے کہ آپ کو اس قدر زیادہ عبادت کی کیا ضرورت ہے'؟ تو فرماتے' کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟!

عتاب نبوی کا سبب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ زیر بحث حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عتاب وغضب کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنے لیے اعمال شاقہ کے احکام کی درخواست' صحابہ کرام کے لیے ان کے مرتبہ رفیع کے لحاظ سے موزوں نہ تھی' کیونکہ ایسی درخواست فطرت سلیمہ کے خلاف تھی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب صحابہ میں سے کسی سے کوئی غلطی اجتہادی خطا کے درجے کی ہوتی تو کچھ نہ فرماتے' نہ غصہ ہوتے' لیکن کوئی بات خلاف فطرت سلیمہ ہو جاتی تو ناگواری اور غصہ کا اظہار فرماتے تھے' اس قسم کی مثالیں آئندہ ذکر ہوں گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ اور یہاں صحابہ کرام کی درخواست مذکور کا بے محل اور غیر موزوں ہونا اوپر کی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے۔

''ان اعلمکم'' حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ جس کا علم ومعرفت خداوندی زیادہ ہوتی ہے اس کی عبادت خدا کو زیادہ پسند ہوتی ہے' کیونکہ عبادت نام ہی مطاع کی مرضی کے موافق طاعت کرنے کا ہے۔ حق تعالیٰ کس عبادت سے اور کس وقت' اور کس موقع ومحل میں زیادہ خوش ہوتے ہیں' جتنا علم ان امور کا زیادہ ہوگا تقرب خداوندی بھی ان کے مطابق ادا کرنے سے زیادہ ہوگا' اعمال کی مشقت رضا خداوندی یا تقرب کا معیار نہیں ہے۔

نماز جیسی مقبول و پسندیدہ عبادت بھی غیر وقت مثلاً طلوع وغروب آفتاب کے وقت' خدا کے یہاں قابل رد ناپسند ہوتی ہے' غرض ان لوگوں کو

اس سے تنبیہ کی گئی جو مشقتوں کے تحمل میں زیادہ فضیلت تلاش کیا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اگرچہ مقدار کے اعتبار سے طاعات وعبادات میں بڑھے ہوئے ہیں مگر کیفیت کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے کم اعمال کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتے' مثلاً ترمذی شریف میں حضرت عمیر بن ہانی کے متعلق ماثور ہے کہ وہ ہر دن میں ایک ہزار سجدے کرتے تھے اور ایک لاکھ مرتبہ تسبیح کرتے تھے **(باب ماجاء اذا انتبه من الليل)**

حضرت امام ابو یوسفؒ کے بارے میں منقول ہے کہ اپنے زمانہ قضا میں ہر روز دو سو رکعت پڑھ لیا کرتے تھے' اسی طرح اولیاء اللہ کی بڑی بڑی عبادات وریاضات کے حالات منقول ہوئے ہیں۔

وفقنا الله لما يحب و يرضىٰ

باب من كره ان يعود فى الكفر كما يكره ان يقذف فى النار من الايمان.

(جو کفر طرف لوٹنے کو ایسا ہی برا سمجھے' جیسا آگ میں ڈالے جانے کو تو یہ بھی ایمان کی علامت ہے)

۲۰ - حدثنا سليمان بن حرب قال حدثنا شعبة عن قتادة عن انس عن النبى صلى الله عليه وسلم قال ثلاث من كن فيه وجد حلاوة الايمان من كان الله و رسوله احب اليه مما سواهما و من احب عبدا لايحبه الا لله و من يكره ان يعود فى الكفر بعد اذا نقذه الله كما يكره ان يلقىٰ فى النار

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت ولذت پالے گا جس شخص کو اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات عالم سے زیادہ محبوب ہوں اور جس شخص کو کسی سے محبت ہو تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور جس کو کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہی برا معلوم ہو جیسا آگ میں ڈالا جاتا۔

تشریح:۔ یہ حدیث اور اس کی تشریح وغیرہ پہلے گزر چکی' کفر کی طرف لوٹنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے مقصود صرف نیا اسلام لانے والا ہی ہو بلکہ وہ بھی اس میں داخل ہے جو پہلے ہی سے مسلمان تھا کیونکہ جب اسلام لانے والا کفر کی طرف لوٹنے سے اس قدر متنفر و بے زار ہوگا تو جو شخص اباً عن جد مسلمان چلا آرہا ہے اس کو تو کفر و شرک سے اور بھی زیادہ بیزار ہونا چاہئے اور اس کو ایمان کی حلاوت بھی زیادہ حاصل ہونی چاہئے۔

افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں کو دین وعلم دین سے ناواقفیت ولاپروائی کے باعث ایمان واعمال صالحہ سے بے تعلقی عام ہوتی جارہی ہے اور اس لئے وہ ایمان واعمال کی قدر وقیمت بھی نہیں پہچانتے اور بعض نومسلموں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ چونکہ پورے علم وبصیرت کے ساتھ ایمان و اسلام قبول کرتے ہیں' وہ ایمان واعمال کے زیادہ گرویدہ نظر آتے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ بغیر علم ومعرفت کے کوئی ترقی صحیح وپائیدار نہیں ہوسکتی۔

باب تفاضل اهل الايمان فى الاعمال (اعمال کی وجہ سے اہل ایمان کا ایک دوسرے سے بڑھ جانا)

۲۱. حدثنا اسمٰعيل قال حدثنى مالك عن عمر و بن يحى المازنى عن ابيه عن ابى سعيد ن الخدرى عن النبى صلى الله عليه وسلم قال يدخل اهل الجنة الجنة و اهل النار النار ثم يقول الله اخرجو من كان فى قلبه مثقال حبة من خردل من ايمان فيخرجون منها قد اسودو افيلقون فى نحر الحيا او الحياة شك مالك فينبتون كماتنبت الحبة فى جانب السيل الم ترانها تخرج صفرآء ملتوية قال وهيب حدثنا عمر والحياة وقال خردل من خير

ترجمہ:۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اہل جنت' جنت میں اہل دوزخ' دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر (بھی) ایمان ہے اس کو (دوزخ سے) نکال لو۔ تب (ایسے لوگ) دوزخ سے نکال لئے جائیں گے' وہ جل کر کوئلے کی طرح سیاہ ہوں گے' پھر وہ زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے' یا بارش کے پانی میں (یہاں راوی کو شک ہو گیا کہ اوپر کے راوی نے کون سا لفظ استعمال کیا) اس وقت وہ دانے کی اگ آئیں گے (یعنی تر وتازہ وشاداب ہو

جائیں گے) جس طرح سیلاب کے کنارے دانہ اگ آتا ہے کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ دانہ زردی مائل پیچ در پیچ نکلتا ہے۔

وہیب نے کہا، ہم سے عمرو نے (حیا کی بجائے) حیاۃ اور (خردل من ایمان کی بجائے) خردل من خیر (کالفظ) بیان کیا۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ میں تفاضل کا لفظ ہے، جو اشخاص سے متعلق ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہوا ہے کیونکہ ان میں کمی ونقص نہیں ہے اور آئندہ حدیث انس رضی اللہ عنہ میں (جو ۴۴ پر آرہی ہے) باب **زیادة الایمان و نقصانه**" ذکر کیا ہے کیونکہ زیادتی وکمی معانی میں ہوتی ہے، اشخاص میں نہیں۔ پس یہاں عاملین پر نظر کر کے تفاضل کا لائے اور وہاں نفس ایمان پر نظر کر کے زیادہ ونقص لائیں گے، دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اعمال کے لحاظ سے تفاضل بتلایا ہے اگرچہ ایمان میں برابر ہوں اور وہاں ایمان میں کمی وزیادتی بتلانی ہوگی، پھر خواہ اعمال میں بھی متفاضل ہوں یا نہ ہوں۔

یہ خطاب اللہ تعالیٰ کس سے فرمائیں گے کہ دوزخ سے نکال لو علامہ قسطلانیؒ نے تصریح کی ہے کہ مراد ملائکہ ہیں، چنانچہ ایک روایت میں للملائکہ کا لفظ بھی موجود ہے کہاں سے نکال لو اس کو بھی علامہ موصوف نے لکھا کہ مراد دوزخ سے نکالنا ہے جیسا کہ اصیلی کی روایت میں من النار کا لفظ زائد روایت ہوا ہے، پھر یہ نکالنے کا حکم ان لوگوں کے لئے ہوگا جنھوں نے توحید کے ساتھ کوئی قلبی نیکی (حسن نیت وغیرہ) کی ہوگی کیونکہ ایک روایت میں یہ زیادتی موجود ہے **اخرجوا من قال لااله الله و عمل من الخیر مایزن کذا** (نووی قسطلانی فی شروح البخاری صفحہ ۱/۱۵۷)

یہی حدیث ابی سعید خدریؓ مسلم شریف میں زیادہ تفصیل سے مروی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت جنت میں پہنچ کر حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کریں گے کہ اے رب! ہمارے بہت سے ساتھی تھے، جنھوں نے دنیا میں ہمارے ساتھ نمازیں پڑھی تھیں۔ روزے رکھے تھے، حج کیا تھا، اور آج وہ ہمارے ساتھ جنت میں نہیں آئے، حق تعالےٰ فرمائیں گے کہ تم ان کو دوزخ سے نکال لاؤ۔

جا کر پہچان لو وہ ان لوگوں کو حق تعالیٰ کی اجازت سے نکال لائیں گے، اور عرض کریں گے کہ جتنے ظاہری اعمال کے اعتبار سے ہم پہچان کر نکال کر لا سکتے تھے، نکال لائے، اور اب کوئی ایسا نہیں رہا ہے۔ یہ غالباً وہ لوگ ہوں گے جن کے ظاہری اعمال بکثرت ہوں گے، مگر معاصی کے باعث دوزخ میں ڈال دیے گئے ہوں گے، اس کے بعد حق تعالیٰ ہی کے فرمانے سے وہ اہل جنت دوسری بار ان کو بھی نکال لائیں گے، جن کے بہت تھوڑے نیک عمل ہوں گے یا صرف اکا دکا عمل ہوگا، جو پہلی بار میں نظر انداز ہوگیا ہوگا۔ تیسری بار میں حق تعالےٰ فرمائیں گے کہ اچھا! اب تم پھر جاؤ اور ان لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے ظاہری اعمال کچھ نہیں تھے، مگر ان کے قلبی اعمال (کوئی اچھی نیت، اچھے ارادے وغیرہ ہوں گے، علامہ نووی نے یہ بھی لکھا کہ حق تعالیٰ ان کو قلبی اعمال کی معرفت کے لیے علامت بھی بتلا دیں گے، اور وہ ایسے لوگوں کو بھی نکال لائیں گے، چوتھے اور آخری مرتبہ میں وہ لوگ نکالے جائیں گے، جن کے پاس نہ ظاہری اعمال کم یا زیادہ ہوں گے، نہ اعمال قلب ہوں گے، صرف اقرار توحید یا ایمان کا کچھ حصہ ان کے پاس ہوگا، حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالےٰ سے درخواست کریں گے کہ بار الٰہا! مجھے اجازت دیجئے کہ ان لوگوں کو نکال لاؤں حق تعالےٰ جواب دیں گے کہ یہ کام آپ کے لیے نہیں ہے، پھر حق تعالیٰ اپنی ارحم الراحمینی کا اظہار فرمائیں گے اور ایسے لوگوں کو خود ہی نکالیں گے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ **فیقبض الله قبضة من النار فیخرج منها قومالم یعملوا خیر اقط** (حق تعالیٰ اپنا مٹھ بھر کر دوزخ سے ایسے لوگوں کو نکال لیں گے، جنھوں نے کسی قسم کی بھی کوئی نیکی نہ کی ہوگی، یعنی علاوہ ایمان یا کلمۂ توحید کے) کیونکہ بغیر ایمان کے تو کوئی صورت نجات کی ہوگی ہی نہیں، یہ طے شدہ اور یقینی وحتمی بات ہے۔

جہنم سے نکلے ہوئے لوگ چونکہ جھلس کر کالے سیاہ ہوگئے ہوں گے، اس لیے جنت کے دروازہ پر جو نہر حیات جاری ہوگی اس میں ان کو غسل دیا جائے گا، جس سے جہنم کے تمام اثرات زائل ہو جائیں گے، اور وہ لوگ اس آب حیات کے اثر سے فوراً ہی ایک نئی سرسبز وشاداب زندگی سے بہرمند ہو جائیں گے۔

بحث ونظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تراجم بخاری میں سے یہ ترجمہ وعنوان باب مشکل ترین تراجم میں سے ہے جس کی چار وجہ ہیں۔

(۱) یہ حدیث اور حدیث انسؓ (صفحہ نمبر ۴۲) دونوں کا مضمون ایک ہی ہے (اگر چہ اصطلاح محدثین میں دو اس لیے ہوگئیں کہ ہر ایک کا راوی الگ صحابی ہے، اور اسی اصطلاح کے تحت مسند احمد کی احادیث کا شمار تیں ہزار کہا گیا ہے۔

پھر باوجود مضمون واحد ہونے کے ترجمے الگ الگ کیوں قائم کئے گئے؟

(۲) امام بخاریؒ نے جو یہاں حضرت ابوسعیدؓ کی حدیث ذکر کی ہے، اس میں عمل کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ صرف ایمان کا ذکر ہے، اور حدیث انسؓ میں خیر یعنی عمل کا ذکر ہے، پس یہاں کا ترجمہ وہاں اور وہاں کا یہاں ہونا چاہئے تھا؟

(۳) امام بخاریؒ نے یہاں اصل میں ایمان کا لفظ رکھا اور خیر کا لفظ بطور متابع لائے، اور حدیث انسؓ میں برعکس کیا، حالانکہ ترجمہ کی مناسبت سے برعکس صورت ہونی چاہئے تھی؟

(۴) زیادۃ ونقص ایمان کی بحث پہلے گزر چکی ہے، پھر یہاں اس کا اعادہ کیوں کیا گیا؟

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس موقع پر شارحین بخاری نے جیسی ضرورت تھی پر مغز کلام نہیں کیا، حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب میں مسئلہ ایمان پر خوب تفصیل سے لکھا ہے لیکن اشکالات مذکورہ پر کچھ نہیں لکھا، کیونکہ انہوں نے حل تراجم ابواب بخاری سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، وہ اس طرف توجہ کرتے تو اچھا لکھ سکتے تھے، اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ کے جوابات لکھے جاتے ہیں۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ کے جوابات ذکر ہوں گے۔

اشکال اول وثانی کا جواب حافظ نے یہ دیا کہ دونوں حدیث میں زیادۃ ونقص ایمان وتفاضل اعمال کے لیے دلیل ملتی ہے اس لیے امام بخاری نے ہر احتمال پر ترجمہ قائم کر دیا۔

پھر حدیث ابی سعیدؓ کو تفاضل اعمال کے ترجمہ سے خاص کر دیا، کیونکہ اس کے اندر تفاوت مراتب ایمان کا ذکر نہیں تھا اس کے لیے زیادۃ ونقصان والا ترجمہ مناسب نہیں تھا، البتہ یہ ترجمہ حدیث انسؓ کے لیے موزوں تھا، کہ اس میں تفاوت اختلاف وزن شعیرہ، برہ ذرہ کے لحاظ سے تھا، چوتھے اشکال کا جواب حافظ نے یہ دیا ہے کہ پہلے ایمان میں زیادتی ونقصان کا ذکر تھا اور یہاں نفس تصدیق میں زیادتی ونقصان کا ذکر کر رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے کسی جگہ بھی نفس تصدیق کے لحاظ سے ایمان میں زیادتی کا ذکر نہیں کیا ہے، ان کا مختار مسلک تو ایمان کو مرکب مان کر زیادتی کا قول ہے خواہ اجزاء کے لحاظ سے ہو یا اسباب کے اعتبار سے، اسی لیے انہوں نے کہیں تصدیق و اعمال میں تقابل نہیں کیا غرض حدیث انسؓ میں امام بخاریؒ کے نزدیک زیادتی ونقصان باعتبار مجموعہ کے ہے، باعتبار نفس تصدیق کے نہیں، لہذا حافظ کی توجیہ مذکور قائل کی منشا کے خلاف ہے، اسی طرح حافظ کا جواب اشکال اول وثانی سے بھی چلنے والا نہیں ہے، کیونکہ تفاوت موزونات اور ذکر مراتب حدیث ابی سعید میں بھی حسب روایت مسلم موجود ہے، اگر کہا جائے کہ تفاوت مذکور روایت بخاری میں تو نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ روایت بخاری میں تو اعمال کا بھی ذکر نہیں ہے، پھر اس پر امام بخاری کا ترجمہ تفاضل اعمال کا قائم کرنا کیسے درست ہوگا؟

حضرت شاہ صاحب کے بقیہ جوابات

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کے جوابات ملاحظہ فرمائے۔

(۱) امام بخاریؒ نے حدیث ابی سعیدؓ کو تفاضل اعمال کے ساتھ دو وجہ سے خاص کیا، اول اس لیے کہ انہوں نے دونوں مفصل روایتوں پر نظر رکھی، اور چونکہ مسلم کی روایت ابی سعید میں اعمال کا بھی ذکر موجود ہے، اس لیے ترجمہ تفاضل اعمال کا قائم کیا، اور حدیث انس کے کسی طریقہ میں بھی ذکر اعمال نہیں ہے، اس لیے وہاں ایمان کا بھی ذکر موجود ہے، اس لیے ترجمہ تفاضل اعمال کا قائم کیا، اور حدیث انس کے کسی

طریقہ میں بھی ذکر اعمال نہیں ہے، اس لیے وہاں ایمان کی زیادتی ونقصان کا ترجمہ مناسب ہے، دوسرے یہ کہ امام بخاری نے حدیث ابی سعید میں لفظ ایمان ذکر کیا۔ اوراس کے بعد اس کی مراد متابعت بالخیر کے ذریعہ عمل متعین کی، گویا اس امر پر متنبہ کیا کہ مراد امراتب ایمان سے مراتب اعمال ہیں، پس لفظ ایمان مفسر اور لفظ خیر اس کا مفسر ہوا، امام بخاری کے یہاں ایمان کا اطلاق خیر پر جائز ودرست ہے اور حدیث انس میں برعکس کیا کہ لفظ خیر کو اصالتاً ذکر کیا، اوراس کی مراد متابعت لفظ ایمان سے متعین کی، یہ جواب اول وثانی سے ہوا۔

(۲) تیسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ اپنے علم ووجدان کے مطابق طریقے اختیار کرتے ہیں، ہر مقام پر متعین صحیح وجہ نہیں معلوم ہوسکتی اور یہاں بھی ہم اس کا تعین نہیں کرسکے۔

(۳) چوتھے اشکال کا جواب سہل ہے کہ پہلے ایمان کی زیادۃ ونقص پر قصداً کوئی ترجمہ نہیں لائے تھے، استطراداً بیان ہوا تھا، اسی لئے کوئی حدیث اس کے لئے ذکر نہیں کی تھی، یہاں قصداً لائے اور اپنے طریقہ پر استدلال کے لئے حدیث بھی روایت کی پھر فرمایا کہ میرے نزدیک دونوں حدیث میں خیر ایمان سے زائد چیز ہے لیکن حدیث الباب میں وہ اعمال قلب سے ہے اور حدیث انس میں متعلقات ایمان سے ہے جو نور ایمان اور انشراح وانبساط کی کیفیت ہے، نہ کہ عمل قلبی، حسن نیت وغیرہ دوسرے شارحین بخاری نے دونوں میں ایک ہی طریقہ پر سمجھا ہے۔ نیز یہ کہ دونوں حدیث کے درمیانی مراتب تو ایک دوسرے کے ساتھ آگے پیچھے بے ترتیب باہم جڑتے ہیں، مگر آخری مرتبہ دونوں میں مشترک ہے، یعنی حدیث ابی سعید میں جن لوگوں کے سب سے آخر میں جہنم سے نکالے جانے کا ذکر ہے، بعینہ ان ہی لوگوں کا ذکر حدیث انس میں بھی ہے (جن کے پاس نہ کوئی عمل اعمال جوارح سے ہوگا نہ کوئی نیکی اعمال قلب سے ہوگی، نہ ثمرات ایمان میں سے کچھ ان کے ساتھ ہوگا، اور ارحم الرحمین ان کو محض اپنے فضل وشان انعام خصوصی سے بلا عمل وخیر کے جنت میں داخل فرمادیں گے۔

شیخ اکبرؒ کی رائے

جن لوگوں کو بلا عمل کے سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا، ان کے بارے میں چونکہ صرف کلمہ طیبہ کا قائل ہونا ذکر ہوا ہے، اس لیے شیخ اکبر نے یہ رائے قائم کی کہ وہ لوگ اہل فترت ہیں جن کو کسی رسول ونبی کا زمانہ نہیں ملا۔ لہذا ان کے لیے ایمان بالرسول کی شرط نہ رہی، صرف توحید ہی نجات کے لیے کافی ہوگئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شیخ اکبرؒ کی رائے مذکور اس موقع پر درست نہیں ہے، کیونکہ وہ لوگ اہل توحید ورسالت ہی ہوں گے، صرف کلمہ کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ کلمہ طیبہ یا کلمہ اخلاص اسلام کا شعار وعنوان بن چکا ہے، پس کلمہ کا ذکر شہادت رسالت کی تصریح سے مستغنی کردیتا ہے، اور فرمایا کہ حدیث قوی اس بارے میں وارد ہے کہ اہل فترت کا محشر میں امتحان لیا جائے گا، اس طرح کہ ان کو حکم ملے گا اپنے آپ کو دوزخ میں ڈال دیں، جو شخص فرمانبرداری کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو انکار کرے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔

اسی طرح جن لوگوں نے اس حدیث سے یہ سمجھا ہے کہ وہ لوگ صرف قائل بالکلمہ ہوں گے، تصدیق باطن ان کے پاس نہ ہوگی انہوں نے بھی غلطی کی ہے، کیونکہ صرف قول بلا تصدیق قلبی کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لہٰذا مراد وہی لوگ ہیں جن کے پاس ایمان اور تصدیق بالشہادتین تو ضرور ہوگی، مگر کوئی عمل نہ ہوگا اور وہ صرف کلمہ توحید کی برکت سے جہنم سے آزاد ہوکر دخول جنت کا شرف حاصل لیں گے۔

امام بخاریؒ کے استدلال پر ایک نظر

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس امر پر سب شارحین کا اتفاق ہے کہ خیر سے مراد دونوں حدیث میں نفس ایمان پر زائد چیز ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ''او کسبت فی ایمانھا خیرا'' وارد ہے، جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خیر سے مراد عمل زائد علی الایمان ہے، ایسے

ہی فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شریرہ بھی اس کی دلیل ہے' لیکن اکثر شراح نے خیر سے مراد وہ عمل لیا ہے' جو جوارح قلب کسی سے بھی صادر ہو۔ اور ہم کہتے ہیں کہ خیر سے مراد اعمال قلبیہ یا آثار ایمان میں اعمال جوارح نہیں ہیں' کیونکہ اعمال جوارح والوں کو تو پہلے ہی نکال لیا جائے گا' اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب ان کو بھی نکال لو جن کے قلب میں کوئی حصہ بھی خیر کا ہو۔

تاہم یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہاں خیر سے مراد سب کے نزدیک امر زائد علی الایمان ہے تو یہاں سے زیادۃ ونقصان ثابت کرنا بھی نفس ایمان میں زیادۃ ونقصان کو ثابت نہ کرے گا' بلکہ خیر میں کرے گا' جو نور ایمان ہے اور زائد علی الایمان' شاید امام بخاری اس نور ایمان کو بھی ایمان ہی کا ایک جز سمجھتے ہیں' جس طرح اعمال وغیرہ کو' مگر یہاں تو اس ایمان سے بحث ہو رہی ہے جو مدار نجات ہے۔ اور جب جہنم سے وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے' جن کے پاس کوئی عمل یا خیر بھی نہ ہوگی تو صاف طور سے واضح ہوا کہ مدار نجات یہی کلمہ اخلاص ہے اور وہی ایمان بھی ہے' جس میں زیادتی ونقصان نہیں ہوتا' جو ائمہ حنفیہ اور دوسرے محققین کی رائے ہے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

نکتہ بدیعہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے بارے میں صرف توحید کا ذکر اور شہادت رسالت کا بیان نہ فرمانا اور ارحم الراحمین جل ذکرہ کا ان کے اخراج کے لیے اختصاص وانفراد اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ صرف اس امت یا کسی دوسری ایک امت کے افراد نہ ہوں گے' بلکہ تمام امتوں میں سے ہوں گے' لہٰذا ان کی صرف جہت عبودیت کی رعایت کی گئی' امتیت کا لحاظ نہیں کیا گیا' جو رسولوں کے اعتبار سے ہوتی ہے' پس مقررہ اصطلاحی کلمہ ذکر کیا گیا یعنی کلمہ توحید کلمہ متبدلہ بابتہ شہادت رسالت حذف کر دیا گیا۔

یہ ایسا ہی ہے' جیسے قول باری تعالیٰ **و ما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون** میں صرف توحید کا ذکر ہوا' حالانکہ وہ سب رسول اپنی اپنی رسالت کا اقرار بھی کرایا کرتے تھے' کیونکہ ایسا کوئی کلمہ مقررہ متعینہ نہیں تھا' جس سے ہر نبی کی رسالت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا۔

پھر یہ اس لیے بھی منقول ہے کہ محشر میں جب انبیاء ملائکہ وصالحین کی شفاعتوں سے نامعلوم تعداد جہنم سے نکالی جا چکے گی تو حق تعالیٰ کی رحمت عامہ کے بعد رحمت خاصہ کا ظہور بھی ہونا چاہیے' جس کا درجہ سب کی شفاعتوں سے اوپر اور وراء الوراء ہے کہ وہ **الرحم الرحمین' ابر البارین' اکرم الاکرمین' واجود الجوادین** ہے' اسی لیے وہ اپنے فضل خاص سے ایسے لوگوں کو جہنم سے نکال کر داخل جنت فرمائے گا جن کا کوئی عمل خیر نہ گا' جس کی وجہ سے کسی کو شفاعت کا موقع مل سکے' چنانچہ پہلے اشارہ بھی ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید والوں کے لیے شفاعت کرنے کا اجازت طلب بھی کریں گے تو حق تعالیٰ شانہ فرمادیں گے کہ یہ آپ کا حق نہیں' غرض اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نکالیں گے' جن کے لیے شافعین کی شفاعت بھی نہیں چل سکتی اور ایسے لوگوں کا نام بھی الگ ہی ہوگا' یعنی عتقاء اللہ (خدا کے آزاد کیے ہوئے) کیونکہ وہ محض اس کی ذات منبع الصفات کے اسم مبارک کی وجہ سے آزاد ہوں گے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں اس نکتہ انوریہ کے ذکر کی برکت سے یہ بات سانح ہوئی کہ جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کو خود ہی ایک مٹھ بھر کر نکالیں گے' تو گو مقدار تو شفاعۃ الشافعین کے ذریعہ نکلنے والوں کی بھی کہیں ذکر نہیں ہوئی وہ خدا ہی کے علم محیط میں ہے' مگر سمجھ میں یہ بات آرہی ہے کہ مقدار ان ''عتقاء اللہ'' کی بھی بہت بڑی ہوگی۔ خدا کی مٹھ کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مگر لفظ بہت بڑا ہے جس کی نسبت سب بڑوں کے بڑے کی طرف ہو رہی ہے' اس لیے کیا عجب ہے کہ یہ تعداد پہلے نکالے جانے والوں سے بھی بڑھ جائے' لہٰذا ''**ورحمتی وسعت کل شیء**''۔ اور **سبقت رحمتی علی غضبی**'' سے فائدہ اٹھانے والے بھی قسمت کے بہت بیٹے

نہیں رہیں گے۔ **و کلنا نر جور حمتک یا ربنا و نخشی عذابک۔ ان عذابک بالکفار ملحق۔**

حضرت شاہ صاحبؒ علاوہ وجہ مذکور کے تین وجوہ اور بھی حدیث میں ذکر کلمہ اخلاص وحذف شہادت رسالت کے متعلق بیان فرماتے تھے ان کو بھی تکمیل فائدہ کے لیے درج کیا جاتا ہے۔

(۲) فرمایا کلمہ اخلاص (لا الا اللہ) شرک فی الذات کی نفی کے لیے نہیں، بلکہ شرک فی العبادۃ کے استیصال کے لیے ہے، جس پر تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت وتبلیغ مبنی ہے، کیونکہ منکرین ربوبیت یا مشرکین فی الذات ہر زمانہ میں بہت ہی کم تعداد میں رہے ہیں، لہٰذا اس کلمہ سے مقصود شرک فی العبادۃ ہی کا رد تھا، حق تعالیٰ نے ان مشرکین کا قول نقل فرمایا "**ما نعبد هم الا لیقربونا الی الله زلفی**" یعنی خدا کو تو واحد مانتے تھے، مگر ساتھ ہی یہ سمجھتے تھے کہ معبودان باطل کی عبادت سے خدا کا تقرب حاصل ہوگا۔ نیز فرمایا" **فاذا رکبوا فی الفلک دعووا الله مخلصین له الدین**" اور فرمایا "**و اذا قیل لهم لا اله الا الله یستکبرون**" معلوم ہوا کہ استکبار تھا، جحود نہیں تھا، یعنی اس کلمہ کا سرے سے انکار نہ تھا، کیونکہ استکبار علم کے بعد ہوتا ہے۔

ایمان وکفر امم سابقہ میں

دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت سے قبل کی امتوں میں صرف ایمان تھا، کفر بالکل نہ تھا، اور آپ سب سے پہلے کفر کے مقابلہ پر مبعوث ہوئے ہیں پھر حضرت ابرہیم علیہ السلام قوم نمرود کے لیے بھیجے گئے۔ وہ لوگ شرک فی العبادۃ میں مبتلا تھے۔ حضرت عیسیٰ موسیٰ علیہما السلام مقابلہ کفر کے لیے مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے، جو اپنی قوم کے اعتبار سے مسلمان تھے کیونکہ وہ سب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں تھے، پھر سب کے بعد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے دینی و علمی آثار محو ہو چکے تھے، کلمہ اخلاص کی اصل وحقیقت بھی لوگوں کے دلوں سے نکل چکی تھی۔ اور اس کو جاننے پہچاننے والے بھی باقی نہ رہے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات وخدمات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سے اس کلمہ طیبہ کا احیاء کیا، لوگوں کے دلوں میں اس کی صحیح معرفت ڈالی اور رب حقیقی کا مکمل تعارف کرایا، کفر وشرک کی ایک ایک جڑ وشاخ کی نشان دہی فرما کر ان کو بیخ وبن سے اکھاڑا، غرض احیاء واعلاء کلمۃ اللہ کی ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ اولیں وآخرین میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی، اور اب جن لوگوں نے بھی اس کلمہ اخلاص کو جانا پہچانا، اور اس کے قائل ہوئے وہ سب حضور اکرم کی بدولت اور آپ ہی کی تقلید واقتداء میں ہے۔ اسی لیے اس کلمہ کا قائل ہونا شہادت رسالت کو بھی مستلزم ہے اور اسی پر مسلم شریف کی مشہور حدیث بھی محمول ہے "**من قال لا اله الا الله دخل الجنة**" کیونکہ بدوں شہادت رسالت کے اس کا کوئی معنی نہیں، بلکہ مقصد یہی ہے کہ جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید واقتداء میں کلمہ کا قائل ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا، جب یہ کلمہ مذکورہ اس تقریب وتعارف سے کہا تو اقرار وشہادت رسالت خود ہی حاصل ہے، اس لیے علماء امت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو شخص اس کلمہ کو بدوں تقلید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہے گا، اس کا ایمان صحیح نہیں، اس تفصیل سے دوسری وجہ حدیث میں حذف شہادت رسالت کی معلوم ہوئی۔

(۳) صیغہ شہادت (**اشهد ان لا اله الا الله**) پر جہت ایمان کا غلبہ ہے اور وہ عام اذکار میں سے نہیں ہے بخلاف کلمہ اخلاص **لا اله الا الله**) کے کہ اس پر جہت ذکر بھی ہے، پس شہادت توحید ورسالت ذکر نہیں بلکہ ایمان ہے۔ اسی شہادت توحید کے ساتھ شہادت رسالت بھی ملائی جاتی ہے، کیونکہ ایمان بدوں اس کے مکمل نہیں ہو سکتا، اور کلمہ اخلاص (بدوں لفظ شہادت) میں دوسرا جز وکم بولا جاتا ہے، کیونکہ وہ اذکار میں شامل ہوتا ہے اور مقصود اصحاب ذکر ہوتے ہیں۔

پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حق تعالیٰ سے کلمہ گو لوگوں کے بارے میں اجازت طلب کی تھی' اس سے بھی مقصود اس ذکر والے تھے' جنھوں نے شہادت توحید و رسالت دی تھی۔ یہاں اصحاب ذکر سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو بطور ورد اس کلمے کو پڑھتے ہیں' کیونکہ وہ اصحاب الاعمال ہیں' غرض قول بالکلمہ مسلمانوں کے لیے بطور عنوان ہے' اور عنوان مشہور بول کر معنون و مصداق مخصوص مراد لیا کرتے ہیں' پھر یہ عنوان یہاں اس لیے بھی اختیار کیا گیا تا کہ ان لوگوں کے جہنم سے بغیر کسی عمل و خیر کے نکلنے کی وجہ کی طرف بھی اشارہ ہو جائے۔

(۴) کلمہ اخلاص (لا الہ الا اللہ) کا دور دورہ ابد الآباد تک باقی رہے گا (کیونکہ اذکار جنت میں بھی رہیں گے) اوپر ذکر ہوا کہ مذکورہ بالا کلمہ میں جہت ذکر بھی ہے' بخلاف ''محمد رسول اللہ'' کے کہ اس میں صرف جہت ایمان ہے' جہت ذکر نہیں ہے' ذکر کی صورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بصورت درود سلام ہے' کلمہ مذکورہ (محمد رسول اللہ) کی صورت میں نہیں ہے' لہٰذا اس کلمہ کا دور بھی اس دنیوی زندگی کے دور کے ساتھ پورا ہو جاتا ہے' اس زندگی کے بعد نہیں رہتا' اور کلمہ توحید کا معاملہ مستقبل میں بھی رہتا ہے۔ غرض جنت میں صرف اذکار رہیں گے اور محمد رسول اللہ اذکار میں سے نہیں ہے۔

چونکہ حدیث میں ذکر محشر کا ہے' اس لیے وہاں کے حسب حال بھی صرف ذکر کلمہ اخلاص ہے' جس کا سکہ اس وقت اور بعد کو بھی چالو رہے گا' اور شہادت رسالت کا ذکر حذف کر دیا گیا کہ نہ وہ اس وقت کے حسب حال ہوگا' نہ بطور ذکر اس کا اجراء ہوگا ''**لمن الملک الیوم۔ للہ الواحد القہار**''

ضروری فائدہ: اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سب سے آخر میں نکالے جانے والے لوگوں کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہوں گے کہ ان کے پاس کوئی عمل خیر نہیں ہے' صرف قائلین توحید ہیں چنانچہ آپ رب العزت سے ان کو نکالنے کی بھی اجازت طلب فرمائیں گے' جس پر اللہ تعالیٰ بوجوہ مفصلہ بالا ''لیس ذلک لک'' (یہ حق آپ کا نہیں ہے) یا (یہ کہ یہ کام آپ کے لیے مقدر نہیں ہے کیونکہ اس کو خود ارحم الراحمین انجام دیں گے) فرمائیں گے اس کے بعد یہ نظریہ قائم کرنا کہ ''ان لوگوں کا ایمان اس قدر مضمحل ہوگا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی عمیق نظر بھی اس کو نہ دیکھ پائے گی درست نہیں معلوم ہوتا۔

اس کے علاوہ یہ کہ گو ظاہر بینوں کی نظریں اعمال جوارح پر پڑتی ہیں' مگر باطن کی نگاہیں تو اعمال قلوب کو دیکھتی ہیں پھر خدا کے نائبین عالی مقام پیغمبران عظام سے ایمان کی روشنی کیونکر چھپ سکتی ہے' اس چیز پر تو ان کی نظر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہوتی ہے' اور ہم یہ تحقیق بھی اہل کشف سے نقل کر چکے ہیں کہ تمام مومنین کے انوار ایمانی' نور معظم مرکز نبوت علی صاحبہا الف الف تحیات و تسلیمات کے اجزاء ہیں' تو کیا باپ یا اصل سے اس کی اولاد فروع چھپ سکتی ہے؟ غرض یہ بات عقلاً و نقلاً درجہ اعتبار سے ساقط ہے اور اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کی نفی پر استدلال کرنا اور بھی زیادہ عجب اور بے محل ہے' البتہ علم غیب کی نفی کے دوسرے دلائل محکمہ موجود ہیں' جو اپنے موقع پر ذکر ہوں گے۔ ان شاء اللہ . و منہ التوفیق السداد الصواب.

تنبیہ مہم: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے جو توجیہات شہادت رسالت کے ذکر نہ کرنے کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں' ان سے یہ بات واضح ہے کہ بغیر شہادت رسالت کے ایمان مکمل نہیں ہوتا اور حدیث ''**من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة**'' کے ضمن میں علماء امت کی یہ تصریح بھی سامنے آ چکی کہ توحید کے ساتھ اقرار رسالت اور ان تمام باتوں پر عقیدہ ضروری ہے جن کا ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے امت کو ضروری طور سے پہنچ گیا ہے' اسی طرح یہ امر بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ادیان انبیاء کی آمد حسب ضرورت وقت و زمانہ ہوتی رہی ہے' اور بعد کے ادیان' سابقہ ادیان کے لیے ناسخ ہوتے آئے ہیں' پھر سب سے آخر میں خاتم الانبیاء علیہم السلام کا سب سے زیادہ مکمل اور آخری دین آیا' جس نے اس سے پہلے کے تمام ادیان کو منسوخ کر دیا اور اعلان کر دیا گیا۔ **الیوم اکملت**

لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا''۔اور **ومن یتبغ غیر الا سلام دینا فلن یقبل منه و هو فی الآخرة من الخاسرین** (جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا اور ایسا شخص آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا) اسی لیے کسی کا یہ خیال کرنا قطعاً غلط اور گمراہ کن ہوگا کہ ''دنیا کے موجودہ دین سب حق پر ہیں' اور اگر ہر دین والا اپنے دین کے صحیح اصولوں پر عمل کرے تو وہ ناجی ہے''۔ اول تو ادیان سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصل حالت پر باقی نہیں رہا' اور بالفرض اگر ہو بھی تو وہ آخری دین خاتم الانبیاء کے ذریعہ منسوخ ہو چکا' پھر اس بات کی کیا قدر و قیمت ہے کہ اپنے اپنے دینوں کی صداقتوں پر عمل کر لینا نجات آخروی کے لیے کافی ہے ایسے ہی غلط نظریات کے تحت شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ''وحدت ادیان'' کا خاکہ بنا کر اس کو عملی منصوبہ بنانے کی سعی ناکام ہوئی تھی۔

ترجمان القرآن کا ذکر

ہمارے زمانہ میں اسی کی ایک شکل کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں آیت ''**اهدنا الصراط المستقیم**'' کے تحت اپنے خاص انداز میں پوری قوت کے ساتھ پیش کیا' جس کو پڑھ کر گاندھی جی نے لکھا تھا کہ ''مجھے مولانا کی تفسیر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ صداقت تمام ادیان میں مشترک ہے' یہی نظریہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے''۔ لیکن چونکہ مولانا آزاد کی اس[1] قسم کی تعبیر اصول و نظریات

---

[1] چند تعبیرات ملاحظہ ہوں:۔ (۱) صفحہ ۱۸۰ (مطبوعہ زمزم کمپنی لاہور) میں ''الهدیٰ'' کے تحت ایک سرخی دی گئی ہے۔
''وحدت دین کی اصل عظیم اور قرآن حکیم'' پھر لکھا:۔ ''یہ اصل عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے' وہ جو کچھ بھی بتلانا چاہتا ہے۔ تمام تر اسی حاصل پر مبنی ہے' اگر اس اصل سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کا تمام کارخانہ دعوت درہم برہم ہو جائے' لیکن تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہئے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا' اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا' حتی کہ کہا جا سکتا ہے آج قرآن کی کوئی بات بھی دنیا کی نظروں سے اس درجہ پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصل عظیم'' سوچا جائے کہ دنیا کے عجائبات تصرفات میں سے مولانا آزاد کا تصرف مذکور ہے یا ہر زمانے کے ان لاکھوں ہزاروں علماء دین کا جنہوں نے وحدت ادیان کی اصل عظیم کو قرآن حکیم کا مدلول و مصداق اس طرح نہیں سمجھا' ہمارے نزدیک فہم قرآن کے لئے سب سے پہلی شرط عربی زبان کی کما حقہ واقفیت ہے' مولانا آزاد نے اپنی مذکورہ بالا تفسیر میں آیت قرآنی ''**والله فضل بعضكم على بعض فی الرزق فما الذین فضلو ابرادی رزقهم علی ما ملکت ایمانهم فهم فیه سواء**'' میں **فهم فیه سواء** کا ترجمہ فا کو حالیہ بنا کر ''حالانکہ وہ برابر ہیں'' کیا ہے' تاکہ ''معاشی مساوات'' قرآن مجید سے بہ صراحت تمام ثابت ہو مگر یہ بھی عجائب تصرفات عالم میں سے ہی ہے کہ نہ کسی مفسر نے اس فا کو حالیہ سمجھا' اور نہ عربی زبان میں فا کا استعمال واو حالیہ کی طرح ہوا ہے' کیا یہ وضعیت کا ذوق نہیں ہے کہ سلف و خلف علماء امت کے خلاف اور عربیت سے بھی آزاد ہو کر نئے معنی وضع کئے جائیں' دوسروں کو وضعیت کا الزام دینا اور خود اس میں اس درجہ استغراق کہاں کا انصاف ہے؟ کیا وضعیت کی کوئی مثال اس سے بڑی مل سکتی ہے؟ ہمارے ایک محترم عالم دین نے بھی اپنی ایک تصنیف میں آیت مذکورہ کا ترجمہ اس طرح کر دیا تھا مگر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بروقت رہنمائی اور اپنی فطری حق پسندی کے باعث انہوں نے کتاب کے دوسرے ایڈیشنوں میں اس غلطی کی اصلاح فرما دی تھی (وللہ الحمد)

(۲) صفحہ ۱/۱۸۳ میں ''ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی'' کا عنوان دے کر لکھا کہ یہ عالمگیر قانون سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے یعنی ایک پروردگار عالم کی پرستش کرتی اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی' اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے۔ دین حقیقی کی تعلیم نہیں ہے''۔

(۳) صفحہ ۱/۱۹۴ میں تحت عنوان ''سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی'' لکھا:۔ قرآن کہتا ہے سچائی اصلاً سب کے پاس ہے' مگر عملاً سب نے کھو دی ہے سب کو ایک ہی دین کی تعلیم دی گئی تھی اور سب کے لئے ایک ہی عالمگیر قانون ہدایت تھا' لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی اور ''الدین'' پر قائم رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں۔''

(۴) صفحہ ۱/۲۰۱ میں بڑی سرخی ''قرآن کی دعوت'' کے تحت دوسری سرخی اس طرح ہے ''سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اس (قرآن) کی دعوت کا اصل اصول ہے''۔ پھر لکھا: اسی لئے اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیان مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے سب خدا کی سچائی کے پیغامبر تھے' سب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت و سعادت کی تنہا راہ ہے۔

(۵) صفحہ ۱/۲۰۸ میں ''الاسلام'' کے تحت لکھا: ''وہ کہتا ہے خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے یہی ہے' اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے وہ انسانی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام کے خلاف تھی، اس کی مفصل تردید رسالہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوگئی تھی پھر ایک ندوی عالم نے ہفتہ وار اخبار "الفتح" مصر میں ایک مضمون عربی میں شائع کیا، جس میں تفسیر مذکور کی ضرورت سے زائد مداح سرائی کی، تو اس کی تلافی کے لیے رفیق محترم حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث وناظم جامعہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی نے مقدمہ مشکلات القرآن میں تفسیر مذکور پر محققانہ تنقید کی، جو عربی زبان میں بہت عرصہ ہوا مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا موصوف نے نہ صرف اس نظریہ کی غلطی پر کافی لکھا تھا بلکہ تفسیر مذکور کی دوسری بہت سی اغلاط کی بھی نشان دہی کردی تھی، جس کو پڑھ کر حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے مولانا بنوری کو تائید وتحسین کے طور پر ایک مکتوب بھی لکھا تھا، اس محققانہ تنقید کا اردو ترجمہ چند سال قبل ایک عالم دین نے رسالہ دارالعلوم دیوبند میں شروع کیا تھا، جس کی اشاعت مولانا آزاد مرحوم نے رکوادی تھی۔ **واللہ اعلم و علمہ اتم واحکم۔**

مولانا آزاد کی سیاسی خدمات

مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں اوپر کی تحریر سے صرف مذہبی وعلمی لحاظ سے "نامعیاری شان" کا اظہار ہوتا ہے، اس کے علاوہ ان کی سیاسی ملکی وقومی خدمات کی نہایت "اعلیٰ معیاری شان" کا انکار کسی طرح نہیں، بلکہ ان کی گراں قدر خدمات کا نہ صرف اعتراف بلکہ زیادہ سے زیادہ ہمارے دل میں قدر ومنزلت بھی ہے۔ حق تعالیٰ ان کی زلات کو معاف فرمائے گاندھی جی کی طرح ہمارے بہت سے مسلمان بھائی بھی خصوصاً کانگریسی تعلیم یافتہ حضرات ان کی شائع شدہ تفسیر وغیرہ سے غلط تاثرات لیتے ہیں اس لیے اتنی صراحت یہاں ذکر کردی گئی، حسب ضرورت آئندہ بھی لکھا جائے گا تاکہ دینی وعلمی تحقیق کا بلند معیار شخصیت کے غلط دباؤ سے آزاد رہے۔ **واللہ الموفق۔**

وزن اعمال

حدیث الباب میں جو ایمان کے وزن وتجسد کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح قرآن مجید میں بھی اعمال کے وزن وتجسد کی طرف اشارات ملتے ہیں، تو اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہاں کے بہت سے اعراض ومعانی محشر میں مجسد ہوکر محسوس کرائے جائیں گے، یا بقدر اعمال ان کو جسم دے دیا جائے گا تاکہ وزن ہوسکے۔

علامہ قسطلانی نے لکھا کہ قیامت میں اعمال کو جواہر کی شکل میں متمثل کیا جائے گا، پس نیکیوں کے پلڑے میں سفید روشن جواہر ہوں گے۔ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں پس اگر تم خدا پرستی اور عمل صالح کی اصل پر، جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے، جمع ہوجاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آجاؤ تو میرا مقصد پورا ہوگیا، میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں؟"

(۶) صفحہ ۱/۲۱۳ میں "خلاصہ بحث" کی سرخی کے بعد لکھا۔ اس (قرآن) نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کردیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروان مذہب سچائی سے منحرف ہوگئے ہیں، اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرنو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہوگیا اور انہوں نے مجھے قبول کرلیا، تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے"۔

(۷) صفحہ ۲۱۸/۱ میں ایک سرخی "صراط مستقیم کے تحت لکھا"۔ ان گروہ بندیوں میں سے کوئی گروہ بندی بھی ایسی ہے، جو اپنے بوجھل عقیدوں، ناقابل فہم عقیدوں اور ناقابل برداشت عملوں کی ایک طویل وطویل فہرست نہ ہو، آگے لکھا کہ عقائد واعمال کی پوری فہرست صرف دو لفظوں میں ختم کردی جاسکتی ہے ایمان اور عمل صالح، اس (قرآن) کے عقائد میں عقل کے لئے کوئی بوجھ نہیں اس کے اعمال میں طبیعت کے لئے کوئی سختی نہیں، ہر طرح کے پیچ وخم سے پاک، ہر معنی میں اعتقاد وعمل کی سیدھی سے سیدھی بات"۔

(۸) آخر میں سورۃ فاتحہ کی تعلیمی روح کے تحت لکھا:۔ "وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں"۔ (صفحہ ۱/۲۵۳)

یہ چند نمونے ہیں، اسلامی عقائد واعمال کے بارے میں مولانا کا ایک خاص نظریہ تھا، جس کی جھلک یہاں دیکھی گئی، اور بعض اہم امور دینی کے متعلق خود راقم الحروف کی مولانا مرحوم سے مکاتبت بھی رہی ہے اور مولانا کی تحریریں محفوظ ہیں، حسب ضرورت ان کی بھی اشاعت ہوسکتی ہے۔ (مؤلف)

برائیوں کے پلڑے میں سیاہ تاریک جواہر ہوں گے یا محض تمثیل کے طور پر ہمیں یہاں سمجھنے کے لیے ایک معیار دیا گیا ہے حقیقۃً وزن بتلانا نہیں ہے، مگر تحقیقی بات وہی ہے جو اوپر ذکر ہوئی ہے، آج سائنس کی ایجادات بھی اس کی تائید کرتی ہیں یورپ میں ہوا بھی تولی جاتی ہے اور ٹائر ٹیوب میں وزن کر کے بھری جاتی ہے اور اسی وزن کے حساب سے اس کی قیمت ہوتی ہے جرمنی میں ایسے کانٹے ایجاد ہوگئے جن میں انسانی اخلاق بھی تولے جاتے ہیں۔

علامہ طنطاویؒ نے اپنی تفسیر صفحہ ۴/ ۱۳۸ میں لکھا کہ حق تعالیٰ نے اس دنیا میں سارا نظام نہایت صحیح وزن و مقدار سے قائم کیا ہے حتیٰ کہ تمام ذرات اور حرکات و سکنات کو بھی وزن کیا ہے؟ اور جس شخص نے علم الفلک، علم طبیعت و علم کیمیا کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ پانی جو آکسیجن اور ہائیڈروجن سے بنتا ہے ان دونوں کے ذرات بھی نہایت ہی صحیح وزن و مقدار کے ساتھ ملائے جاتے ہیں، اگر مقررہ مقدار سے ایک ذرہ بھی دونوں میں سے کم و بیش ہو جائے تو پانی نہیں بن سکتا، اسی طرح سے نباتات و حیوانات وغیرہ کا ترکب بھی خاص متعین مقدار ذرات و عناصر سے ہوتا ہے و **کل شیء عندہٗ بمقدار، عالم الغیب و الشهادة الکبیر المتعال** جس قادر مطلق علیم و خبیر نے باریک ترین ذرات عالم اور حرکات و سکنات تک کا وزن یہاں دنیا میں قائم کیا ہے وہ اشرف المخلوقات'' انسان کے اعمال زندگی کو بھی آخرت میں تولنے کا انتظام فرمادیں گے تو اس کے ماننے میں کیا تامل ہوسکتا ہے؟!

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ محشر میں اچھے اعمال کو اچھی صورت میں اور برے اعمال کو بری صورتوں میں لایا جائے گا اور ان کو ترازو کے پلڑوں میں رکھ دیا جائے گا، علامہ بغوی نے بعض علماء کی رائے نقل کی کہ عمل کرنے والوں کو تولا جائے گا کہ صحیحین میں ایک حدیث ہے قیامت کے روز ایک شخص قد آور خوب موٹا آئے گا مگر خدا کے یہاں اس کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا'' دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ اعمال تولے جائیں گے، لیکن ہر عمل کا وزن خدا کو معلوم ہے، ترمذی و مسند احمد کی روایت ہے کہ'' قیامت کے روز میری امت کے ایک شخص کی گلوخلاصی عجیب طریقہ سے ہوگی، اس کے اعمال بد کے ۹۹ دفتر ہوں گے اور ہر دفتر خوب طویل ہوگا، سب دفتر اس کو کھول کھول کر دکھلائے جائیں گے کہ اچھی طرح دیکھ کر بتلاؤ، کہ یہ سب تمہارے ہی اعمال ہیں یا نہیں؟ اور ہمارے لکھنے والے فرشتوں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ وہ عرض کرے گا! یارب سب صحیح لکھا ہے غلطی کچھ نہیں کی، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ کوئی عذر ہو تو کہہ سکتے ہو! عرض کرے گا یارب! عذر بھی کچھ نہیں ہے۔ اس پر حق تعالیٰ کی رحمت خاصہ اس پر مبذول ہوگی، ایک بطاقہ (کاغذ کا پرزہ) نکالیں گے جس پر کلمہ شہادت لکھا ہوگا جو اس شخص کے ایمان کا وثیقہ ہوگا، حق تعالےٰ کے حکم سے اس بطاقہ کو ترازو کے پلڑے میں اور ان تمام دفتروں کو دوسرے میں رکھ دیا جائے گا، وہ سب دفتر ہلکے ہوں گے اور مذکورہ بطاقہ بھاری ہوگا، اور حق تعالیٰ جل ذکرہ کے اسم مبارک کے مقابلہ میں تو دنیا و مافیہا بھی بھاری نہیں ہو سکتے۔ واضح ہو کہ ہر عمل کا وزن جدا ہوگا، جس کی بڑی وجہ اخلاص کی کمی وزیادتی ہوگی، اور عمل جوارح و عمل قلب میں بھی فرق ہوگا'' **نیة المومن خیر من عمله** اور عمل و ایمان کے وزن میں بھی بڑا فرق ہوگا، جس کو نمایاں کرنے کے لیے اس شخص کے بطاقہ کا وزن کیا جائے گا، اور بظاہر وہ شخص ان ہی لوگوں میں سے ایک ہوگا جو سب سے آخر میں جہنم سے نکالے جائیں گے۔ جن کے پاس کوئی عمل خیر نہ ہوگا، صرف کلمہ اخلاص کے ساتھ رابطہ ہوگا۔ ایمان و عقیدہ صحیح ہوگا، جس کو حدیث میں قول لا الہ الا اللہ کے عنوان سے تعبیر کیا گیا، اور ان کے بطاقہ میں بھی پورا کلمہ شہادت لکھا ہوا ہوگا، ایسے لوگوں کا عمومی اخراج اور جہنم سے آزادی اسی وقت ہوگی، جب ارحم الراحمین کی مشیت ہوگی۔

امام غزالی کا استنباط

امام موصوف نے **اخرجوا من النار من کان فی قلبه** سے استنباط کیا کہ وہ شخص بھی ناجی ہوگا، جو دل سے ایمان لایا مگر کلمہ پڑھنے کا وقت نہ ملا کہ موت آگئی، البتہ جس کو وقت و قدرت کلمہ پڑھنے کی ملی پھر بھی زبان سے اقرار نہ کیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ تارک صلوٰۃ کے حکم میں

رہے کہ مخلد فی النار نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا ایمان ناقص قرار پائے اور نجات نہ پائے' امام غزالیؒ کے علاوہ دوسرے حضرات نے اسی دوسری صورت کو ترجیح دی ہے' منشاء ان دونوں احتمال کا وہی خلاف ہے کہ نطق بالا یمان شطر ایمان ہے یا محض شرط اجراء احکام ہے' جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(۲۲) حدثنا محمد بن عبید اللہ قال ثنا ابراھیم بن سعد عن صالح عن ابن شھاب عن ابی اما مۃ بن حنیف انہ سمع ابا سعد ن الخدری یقول قال رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینا انا نا ئم رایت الناس یعرضون علی و علیھا قمص منھا ما یبلغ الشدی و منھا ما دون ذلک و عرض علی عمر بن الخطاب و علیہ قمیص یجرہ قالو ا فما اولت ذلک یا رسول اللہ قال الدین.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا خواب میں دیکھا لوگ میرے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں' اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں' کسی کا کرتہ سینے تک ہے اور کسی کا اس سے نیچا ہے' (پھر میرے سامنے عمر بن الخطاب لائے گئے' ان کے (بدن) پر (جو) قمیص ہے اسے گھسیٹ رہے ہیں (یعنی زمین تک نیچا ہے) صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر لی؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کا مطلب) دین ہے۔

تشریح: ''یجر قمیصہ'' (اپنا پیراہن زمین پر گھسیٹتے تھے) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ خواب کا واقعہ ہے' اس لیے اس کو بیداری کے مسائل میں نہ گھسیٹنا چاہئے کہ اسبال مکروہ ہے۔

''تاولت'' تاوّل کے معنی سلف میں طلب مال اور اخذ مراد و مصداق کے ہیں' جیسا کہ '' **ھذا تاویل رؤیای**'' میں لہٰذا متاخرین کی اصلاح پر کسی بات کو ظاہر سے پھرانے کا معنی یہاں نہیں ہے۔

''الدین''، یعنی جس طرح قمیص لباس حیا و زینت ہے اور گرمی و سردی سے بچنے کا سبب بھی' اسی طرح دین بھی دنیوی عزت و وقار کا ضامن اور آخرت کے عذاب و عقاب سے بچنے کا سبب ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں لوگوں کی دینی حالت دکھلائی گئی' اور جو لوگ پیش ہوئے' ان میں حضرت عمرؓ کا دین سب سے بڑھا ہوا دیکھا۔

بحث و نظر: امام بخاری کا مقصد دین کے لحاظ سے لوگوں کا باہمی تفاضل و تفاوت بتلانا ہے اور چونکہ دین و ایمان ان کے نزدیک مترادف ہیں' اس لیے گویا ایمان کی زیادتی و نقصان کا ثبوت ہوا۔ لیکن ہم تفصیل سے بتلا آئے کہ دین کا اطلاق ایمان و اسلام کے مجموعہ پر آتا ہے' اس لیے ایمان میں کمی و زیادتی کا ثبوت نہیں ملا۔ اور اعمال کے سبب دین کے تفاضل و تفاوت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

دوسری کسی قدر اہم بحث یہاں یہ ہے کہ حدیث مذکور سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت دوسرے تمام لوگوں پر معلوم ہوتی ہے حالانکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باجماع امت و آثار قطعیہ سب میں افضل ہیں' اس کے بہت سے جوابات دیے گئے ہیں' مگر سب سے بہتر یہ ہے کہ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت جزوی ثابت ہوتی ہے' جو حضرت صدیق اکبرؓ کی فضیلت کلی کے مخالف نہیں جزئی بسا اوقات چھوٹوں کو بڑوں پر حاصل ہو جاتی ہے' جس کی نظائر بکثرت ہیں۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ مجھے ان پر فضیلت مت دو۔ اس سے آپ کا مقصد ان حضرات کے جزوی فضائل کو نمایاں کرنا تھا' ورنہ ظاہر ہے کہ آپ تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت کلی رکھتے ہیں' بلکہ تمام انبیاء اپنے کمالات و فضائل میں آپ سے مستفید ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جس جزوی فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' وہ بعض اکابر کے ارشاد کے موافق آپ کے عہد خلافت کی نمایاں و کثیر اسلامی فتوحات ہیں' اگرچہ ان فتوحات کثیرہ کے لیے بھی بنیادی طور سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نے زمین ہموار کی تھی' اگر وہ اپنے

دور میں فتنہ ارتداد کو اپنی اعلیٰ قابلیت اور نہایت بلند حوصلگی سے روک نہ دیتے تو قریب و بعید ممالک میں اسلامی شوکت کا وہ بے نظیر رعب و دبدبہ قائم نہ ہو سکتا جس سے تمام اعداء اسلام کے پتے پانی ہو گئے' اور سب اپنی اپنی جگہ سہم و ٹھٹک کر رہ گئے' گویا جن قلوب کو حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے مختصر دور خلافت کے دو سال اور چار ماہ میں فتح کر لیا تھا' ان ہی کے ظاہری ہیاکل و متعلقات کو اسلامی لشکروں کی بے پناہ یلغار کے ذریعہ حضرت عمرؓ نے اپنے طول طویل دور خلافت میں فتح کیا' اس لیے دونوں کے کارناموں میں ظاہر و باطن کی نسبت معلوم ہوتی ہے' ایک کا طرۂ امتیاز باطنی فتوحات تھیں تو دوسرا ظاہری فتوحات کی خصوصیت سے نوازا گیا' اور شاید پیراہن سے اسی طرف اشارہ بھی ہو۔ و العلم عند اللہ

بظاہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑے بڑے ممالک اور ایک ہزار سے زائد شہروں کو اسلام کا زیر نگیں کیا' ساری دنیا پر ان کا رعب و جلال چھا گیا مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان سے پہلے اسی نسبت و وسعت کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ساری دنیا کے قلوب و ارواح کو اسلام کی عظمت و شوکت کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا' اس لیے زیادہ گہرائی میں جانے سے معلوم ہوگا کہ اس بارے میں بھی فضیلت کی حقداری دونوں حضرات کو برابر درجہ کی حاصل ہے بلکہ داخلی فتنوں کی روک تھام کا درجہ بیرونی فتنوں کے استیصال سے کئی لحاظ سے بڑھا ہوا بھی ہے' لہٰذا کوئی اشکال ہی یہاں پیدا نہیں ہوتا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

باب الحیآء من الایمان۔ (حیاء ایمان کی علامت ہے)

۲۳۔ حدثنا عبد اللہ بن یوسف قال اخبر نا مالک بن انس عن ابن شھاب عن سالم بن عبد اللہ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر علیٰ رجل من الا نصار و ھو یعظ اخاہ فی الحیآء فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعہ فان الحیآء من الا یمان۔

ترجمہ: حضرت سالم بن عبد اللہ اپنے باپ (عبد اللہ بن عمر) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کی طرف سے گزرے آپ نے دیکھا کہ وہ انصاری اپنے بھائی کو حیاء کے بارے میں کچھ سمجھا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو' کیونکہ حیاء ایمان ہی کا ایک حصہ ہے۔

تشریح: ایک انصاری دوسرے انصاری بھائی کو حیاء و شرم کے بارے میں سمجھا رہا تھا کہ اس کو کم کرو' جس سے تم اس قدر نقصان اٹھا رہے ہو' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ حیاء سے مت روکو' وہ تو ایمان سے ہے' وعظ کے معنی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا ہے' دوسری روایت میں یعظ کی جگہ یعاتب ہے یعنی عتاب کے لہجہ میں سمجھا رہے تھے' انصاری کا مقصد یہ تھا کہ حیاء کا غلبہ اس قدر ٹھیک نہیں کہ جس سے اپنے حقوق بھی وصول نہ کر سکے وغیرہ' مگر نبی رحمت (ارواحنا فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اصول و کلیات پر تھی فرمایا کہ حیاء کے بارے میں کچھ مت کہو وہ تو بہت اچھی خصلت ہے جو انسان کو بہت سی برائیوں اور معاصی سے باز رکھتی ہے' اسی لیے وہ ایمان کی تکمیل کرنے والی چیز ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری چونکہ اعمال کو اجزاء ایمان مانتے ہیں اس لیے من کو یہاں تبعیضیہ لیا ہے کہ حیاء ایمان کا جزو ہے اور ہم کہتے ہیں ابتدائیہ ہے کہ حیاء کا منشاء ایمان ہے' اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حیا امانت کی طرح ایسا وصف حسن ہے جو مقدمہ ایمان بنتا ہے۔ حدیث میں ہے "لا ایمان لمن لا امانة له اسی طرح حیاء بھی ان اخلاق حسنہ میں سے ہے جو ایمان کے لیے بطور مبادی و مقدمات ہیں' پس جس طرح وصف امانت ایمان پر مقدم ہے وصف حیا بھی مقدم ہونی چاہئے"۔ امانت وہ وصف ہے جس کی وجہ سے اس وصف والے پر سب کو اپنے احوال و انفس کے بارے میں اعتماد و اطمینان کلی حاصل ہو اور چونکہ یہ وصف حق تعالیٰ نے صرف انسان کو عطا فرمایا تھا' اسی لیے آسمانوں' زمینوں نے امانت کا بوجھ اٹھانے سے عذر و انکار کیا' کیونکہ وہ ایسے اوصاف کے حامل نہیں تھے اور انسان نے باوجود اپنے ضعف کے بھی ایسے اوصاف کا حامل ہونے کے باعث سبقت کر کے ایمان کا بوجھ اٹھا لیا' دوسری عبارت میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں

کہ ہر چیز کو اپنے محل میں رکھنا اور ہر مستحق کو اس کا پورا حق دے دینا ''امانت'' ہے' اور اس کی ضد ''غش'' ہے' یعنی کسی چیز کو اس کے مرتبے سے گرانا' اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔ **یا بنی! ان قدرت ان تصبح وتمسی و لیس فی قلبک غش لا حد فافعل**'' (برخوردار)! اگر تم ہر صبح وشام اس طرح گذار سکو کہ تمہارے دل میں کسی کے حق ومرتبے کو کم کرنے کا ارادہ و تصور نہ آئے تو ایسا ضرور کرو) اللہ اکبر! یہ تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ نفس کی شان بعثت **لا تمم مکارم الا خلاق** کیا بڑے سے بڑا ولی بھی اس سہل ممتنع اعلیٰ معیار پر اپنی زندگی ڈھال سکتا ہے؟ **الا ما شاء اللہ** ۔

سہل ممتنع کا لفظ اس لیے عرض کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور منعم حقیقی کے فضل وانعام سے ایسے اعلیٰ معیار کے اخلاق جو ہمارے لیے ممتنع ودشوار معلوم ہوتے ہیں' صحابہ کرام کے لیے نہایت آسان ہو گئے تھے اور اسی لیے ان سب کی زندگی ہم سب کے لیے تمثالی ومعیاری بن گئی۔ **و له الحمد و المنة**۔

باب فان تابو ا و ا قاموا الصلوٰة و اتوا الزکوٰة فخلو ا سبیلهم

(اگر وہ لوگ تائب ہو کر نماز وزکوٰۃ کی ادائیگی کریں تو انہیں چھوڑ دو)

۲۴. حدثنا عبد الله بن محمد ن المسندی قال حدثنا ابو روح ن الحرامی بن عمارة قال حدثنا شعبة عن و اقد بن محمد قال سمعت ابی یحدث عن ابن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشهد و آ ان لا اله الا الله و ان محمد ا رسول الله و یقیمو ا الصلوٰة و یؤ توا الزکوٰة فاذا فعلو ا ذلک عصمو ا منی دمآء هم و ا موالهم الا بحق الا سلام و حسا بهم علی لله

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں اس وقت تک کہ وہ اس بات کا اقرار کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دیں' جس وقت وہ یہ کرنے لگیں تو مجھ سے اپنے جان ومال کو محفوظ کرلیں گے سوائے اسلامی حقوق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

تشریح: اسلام دین فطرت ہے' اس لیے اللہ کے نزدیک کسی انسان کے لیے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ اپنے فطری راستے کو چھوڑ کر کسی دوسری غلط راہ پر چلے' دعوت وتبلیغ سے اتمام حجت کرنے کے بعد اب صرف دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا اسلام کی چوکھٹ پر دل جھکے یا سر جھکے دل کی تبدیلی کسی جبر سے نہیں ہوسکتی'' **لا اکراه فی الدین**'' لیکن نظام عالم کی قیادت ورہنمائی اور اجتماعی زندگی پر بہر حال اسلام قبضہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا' اس لیے اگر کسی کا دل اسلام کی حقانیت کا قائل نہیں ہوتا تو نہ ہو مگر بہر صورت اسے اسلامی قوانین کے سامنے سر اطاعت خم کرنا پڑے گا۔

معلوم ہوا کہ اسلامی جہاد وقتال کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام انسانوں کی زندگی پر امن ہوجائے اور فتنہ وفساد یا دنیوی اغراض ومقاصد کے لیے قتل وخونریزی کا پوری طرح سد باب ہوجائے۔

اس مقصد کا یقینی حصول اسی وقت ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین فطرت کو اس کے رسول معظم کے اعتماد واطمینان پر قبول کرلیا جائے۔ ایسا کرنے لینے پر لوگوں کی جان ومال اور عزت دنیا وآخرت دنوں جہان میں محفوظ ومامون ہوگی' نہ یہاں ان کو گزند' نہ وہاں ان کو آنچ۔ سب اپنے دل ٹھنڈے کر کے دنیا میں بھی جنت جیسی زندگی گزار سکتے ہیں۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد کسے رابا کسے کارے نباشد

اس کے بعد اگر کسی سے کوئی غلطی یا خطا بہ تقاضائے بشریت ہوگی تو دنیا میں اس کا ظاہری تدارک مطابق اصول شریعت ہوگا' اور آخرت میں اس کا کامل ومکمل تصفیہ عالم السر والخفی کی بارگاہ سے ہوگا۔

بحث ونظر: علامہ محقق حافظ عینیؒ نے اس حدیث کے تحت "بیان استنباط الا حکام" کی سرخی قائم کرکے بارہ نہایت اہم ومفید مسائل ذکر کئے ہیں۔

(۱) امام نوویؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ تارک صلوٰۃ کوقتل کرنا جائز ہے اور اس کو جمہور کا مذہب بتلایا، حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہ استدلال غلط ہے، کیونکہ حدیث میں قتال کا ذکر ہے، قتل کا نہیں ہے اور دونوں میں بڑا فرق ہے، حدیث ترمذی میں آیا ہے کہ جو شخص نمازی کے سامنے سے گذرے نمازی اس سے قتال کرے، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو فرمایا **اقتالا یا سعد؟** دونوں جگہ قتال سے مراد جدال ونزاع ہے، قتل کردینا مراد نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام نوویؒ نے نماز کے سامنے گذرنے پر قتل کر دینے کا مسئلہ تک لکھ دیا ہے کہ قاتل پر دیت ہوگی یا نہیں، جس سے وہم ہوتا ہے کہ وہاں بھی مقاتلہ سے قتل سمجھ گئے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے، اس لیے ایسے موقع پر غیر متعلق مسائل کا لکھنا ہی مناسب نہیں ہوتا۔

شیخ تقی الدین بن دقیق العید نے بھی یہی تحقیق کی ہے کہ قتال اور قتل الگ الگ ہیں اور شرح العمدہ میں بڑے شد ومد سے اس پر نکیر کی ہے۔ جس نے اس حدیث سے قتل پر استدلال کیا ہے اور فرمایا کہ اباحۃ قتال سے اباحۃ قتل ہرگز لازم نہیں آتی، کیونکہ مقاتلہ باب مفاعلہ سے ہے جو جانبین سے وقوع قتال کو چاہتا ہے، قتل میں یہ صورت نہیں ہے۔ نیز حافظ بیہقی نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا کہ قتال قتل سے الگ ہے، اسی لیے تو بعض مواقع میں قتال جائز ہے مگر قتل جائز نہیں ہوتا۔ (شروح البخاری صفحہ ۱۶۵)

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام محمد سے منقول ہوا کہ امام وخلیفہ وقت ان لوگوں سے بھی قتال کرے جو ختنہ یا اذان کو ترک کردیں اس سے بعض حضرات نے سمجھا کہ اذان، امام محمد کے نزدیک واجب ہے، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ قتال کی وجہ اسلامی شعائر کا ترک ہے، کیونکہ اذان وختنہ شعائر اسلام میں سے ہیں۔

پس جب امام محمد سے ترک اذان وختنہ پر باوجود ان کے سنت ہونے قتال جائز ہوا تو ترک صلوٰہ پر بدرجہ اولیٰ ہوگا امام نوویؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے مانعین صلوۃ وزکوٰۃ وغیرہ واجبات اسلام کے ساتھ قتال کا وجوب ثابت ہوا، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اسی سے امام محمد نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر کسی شہر یا قصبہ کے لوگ سارے آدمی اذان ترک کردیں تو امام وقت ان سے قتال کرے گا اور یہی حکم تمام شعائر اسلام کا ہے، پھر علامہ عینیؒ نے یہ بھی لکھا کہ اس حدیث پر حنفیہ بھی عامل ہیں کیونکہ جب ترک اذان پر قتال کرنا جائز ہوا تو ترک نماز پر بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ محدث نوویؒ مفیدین میں ہیں، محققین میں سے نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ وہ حنفیہ کے بارے میں عدل وانصاف سے کام نہیں لیتے، پھر فرمایا کہ محدثین وفقہاء میں سے جو حضرات اہل طریقہ اور اصحاب باطن ہیں وہ ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرتے ہیں (کیونکہ ان کے نفوس زیادہ مزکی ہوجاتے ہیں) مثلاً شیخ تقی الدین ابن دقیق العید جن کو شافعی ومالکی کہا گیا ہے، بڑے محقق ومصنف دقیق النظر ومتبحر عالم، اہل طریقت میں سے صاحب کرامات باہرہ معتدل المزاج تھے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کے معاصر تھے، حافظ ابن تیمیہ نے ایک مدت مصر میں گزاری ہے اور شیخ مذکور بھی وہاں تھے، لیکن ان دونوں کی ملاقات کا ذکر کہیں نہیں دیکھا، اگر دانستہ ملاقات نہیں کی تو ممکن ہے کہ شیخ نے اس کو پسند نہ کیا ہو، واللہ اعلم، شیخ موصوف باوجودیکہ شافعی ومالکی تھے، جس بات سے حنفیہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہو اس کو قصد وارادہ سے اہتمام کرکے ذکر کرتے ہیں، یہ ان کی منصف مزاجی کی بڑی دلیل ہے، جس طرح حافظ ابن حجر کی غیر منصف مزاجی کی دلیل یہ ہے کہ حنفیہ کے فائدہ کی بات کو جان بوجھ کر موقع سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور کہیں کسی بات سے فائدہ بھی پہنچا ہے تو ان کے بغیر ارادہ کے ایسا ہوا ہے، حالانکہ علم وفضل، تیقظ ومتانت کلام وغیرہ کے لحاظ سے وہ نہایت بلند پایہ محقق ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ شیخ تقی الدین ہی کی طرح ہمارے حنفیہ میں سے محدث شہیر حافظ زیلعی (صاحب نصب الرایہ) بھی ہیں وہ بھی اہل طریقت میں سے تھے، اور وہ بھی سب کے ساتھ نہایت عدل وانصاف کا معاملہ کرتے تھے، اسی طرح دوسرے اہل طریقت علماء کے عدل وانصاف کا تجربہ ہوا ہے

اوران حضرات اہل اللہ سے اس سے بھی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے' پھر فرمایا کہ شیخ ابن ہمام حنفی اہل طریقت میں سے ہیں' اور منصف بھی ہیں' مگر کبھی کبھی اپنے مذہب کی حمایت کے جذبہ میں کچھ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔

پھر فرمایا: مفیدوہ ہے جو کسی مسئلہ میں سب حضرات اہل تحقیق کے اقوال کو بہتر اسلوب سے وضاحت وتفصیل کے ساتھ جمع کر دے۔ اور محقق وہ ہے جو دریائے علم کی غواصی کرے' دقائق معانی ومطالب کا کھوج لگائے' دشوار ترین مسائل کا حل نکالے' اقوال علماء سلف وخلف کی تنقیح کرے' اوران میں سے افراط وتفریط کو الگ الگ نکھاردے' ایسے عالم میرے نزدیک محقق[1] ہیں اور ایسے علماء امت میں بہت کم ہیں۔

حکم تارک صلوٰۃ

اس کے بعد ائمہ اربعہؒ کے اقوال مختلف ہیں' امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ وامام شافعیؒ تینوں کی رائے ہے کہ نماز کے فرض ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوئے' جو شخص عمداً نماز ترک کرے گا وہ کافر نہیں ہوگا' امام احمد کا قول بروایت اکثر اصحاب اور بعض اصحاب امام شافعی کی رائے ہے کہ وہ کافر اور ملت سے خارج ہوگیا لہٰذا اس کا حکم مرتد کا ہوگا کہ اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی' اس کو کفر کی وجہ سے قتل کیا جائے گا' اور مرنے کے بعد نہ اس کو غسل دیں' نہ اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے'' ۔ نہ اس کے مال کا کوئی مسلمان وارث ہوگا۔ دوسرا اختلاف تارک صلوٰۃ کی سزا میں ہے۔ اس بارے میں امام اعظمؒ' آپ کے اصحاب اور امام مزنی شافعی کی رائے یہ ہے کہ اس کو سزا کے طور پر قید کردیں گے' اگر تین دن کے اندر توبہ کر کے نماز شروع نہ کرے تو اس کے جسم کو کوڑوں کی مار سے لہولہان کیا جائے گا۔ حتی کہ نماز شروع کردے۔ اس کی سزا یا حد شرعی قتل نہیں ہے' البتہ امام وقت چاہے تو بطور سیاست وتعزیر اس کو قتل کرسکتا ہے' جس طرح مبتدع کو کرسکتا ہے' امام مالک وامام شافعیؒ وامام احمد تینوں کے نزدیک اس کو قتل کیا جائے گا' فرق اتنا ہے کہ امام احمد اس کا قتل کفراً (یعنی بوجہ کفر وارتد) اور امام مالک وشافعی (بطور حد شرعی[2])

حدامانتے ہیں' پھر قائلین قتل کے اقوال مختلف ہیں۔

(۱) تارک صلوٰۃ کو تین روز کی مہلت دی جائے یا فوراً قتل کیا جائے' یہ آخری قول زیادہ صحیح ہے

(۲) دو یا چار نمازیں عمداً ترک کرنے پر قتل کیا جائے یا صرف ایک نماز چھوڑنے پر بھی جب کہ وقت گزر جائے' ان میں بھی آخری قول زیادہ صحیح ہے

(۳) قتل تلوار سے ہو یا گردن ماردی جائے' یا لکڑی لوہے وغیرہ سے کچوکے دیے جائیں حتیٰ کہ وہ مرجائے

(۴) قتل کے بعد اس کا حکم مقتول حداً کا ہوگا' جیسے زانی محصن رجم کیا ہوا ہوتا ہے کہ غسل کفن نماز جنازہ کے بعد مقابر مسلمین میں دفن ہوگا اور اس کی قبر بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک بالشت زمین سے اونچی ہوگی' اس کی وراثت بھی جاری ہوگی' یہی قول صحیح ہے' دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی تحقیر اور دوسروں کی زجر وتنبیہ کے لیے نہ مقابر میں دفن کیا جائے' نہ اس کی قبر کو ایک بالشت اونچا کیا جائے۔

حکم تارک زکوٰۃ: یہ ہے کہ ترک زکوٰۃ پر اس کو تعزیری سزا دی جائے' اور زکوٰۃ اس سے جبراً وصول کی جائے' اگر انکار کرے تو اس

---

[1] راقم الحروف نے مقدمہ انوار الباری جلد دوم میں بعض علماء کو محقق فاضل لکھا ہے' جس پر ہندوپاک کے بعض احباب اہل علم نے توجہ دلائی' اور اب خود بھی اس بے احتیاطی کا افسوس ہے' خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق مذکورہ بالا کے پیش نظر اگرچہ اس وقت اردو زبان کے عام محاورہ واصطلاح کے لحاظ سے اتنا لکھنا زیادہ بے محل نہ تھا' دوسرے اس خیال سے بھی لکھا تھا کہ آخر بڑی نسبتوں کو اس سے کم کیا لکھا جائے۔

تاہم اپنی غلطی کا اعتراف ہے اور معیار فضل وتحقیق کو گرانا کسی طرح مناسب نہیں اور اس کی خوشی ہے کہ ہمارے ناظرین اور علماء زمانہ میں صحیح علمی اقدار کا جائزہ لینے والے موجود ہیں۔ و کثر اللہ امثالھم (عاجز مؤلف)

[2] حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر حد وتعزیر میں فرق بھی بتلایا کہ حد شرعی کو قاضی اپنی رائے واختیار سے رد نہیں کرسکتا کیونکہ وہ حقوق اللہ میں سے ہے' بخلاف تعزیر کے کہ وہ اس کی رائے پر محمول ہے' واضح ہو کہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ حد وتعزیر میں فرق نہیں کرتے تھے' اسی لیے ان کی رائے تھی کہ سرقہ وزنا کی سزا قطع ید ورجم بھی امام وقت کی رائے پر محمول ہے' اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ چار مرتبہ سے کم ارتکاب سرقہ وزنا پر سزا لازم نہیں ہے۔ وغیر ذلک و لذکرہ محل آخر ان شاء اللہ تعالےٰ۔

سے قتال کیا جائے' حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے یہاں فرمایا ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس صریح حدیث کے حضرت عمرؓ نے قتال مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کیوں اختلاف کیا؟ میں نے اس کا حل اپنے رسالہ ''اکفار الملحدین'' میں پیش کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخین کا اختلاف درحقیقت غرض وسبب منع زکوٰۃ کے باعث تھا' حضرت عمر اس کا سبب بغاوت وسرکشی سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ردۃ کو سمجھتے تھے' اس حیثیت سے کہ ایمان پورے دین کے التزام واختیار کا نام ہے' جس نے نماز وزکوٰۃ میں فرق کیا گویا وہ پورے دین پر ایمان نہیں لایا' اور جو پورے دین پر ایمان نہیں لایا۔ وہ قطعاً کافر ہے۔

نظریہ حنفیہ کی تائید: یہاں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے حنفیہ کے نظریہ کی اصابت وحقیت معلوم ہوتی ہے کہ ایمان زیادہ وکم نہیں ہوتا' کیونکہ التزام مذکور میں کوئی تشکیک نہیں ہے اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یہ بات محقق ہوتی کہ وہ لوگ زکوٰۃ کا بالکل ہی انکار کر رہے ہیں تو وہ بھی ان کی تکفیر ہی کرتے اور ان کے قتال میں کوئی تردد نہ فرماتے۔

نصب الرایہ زیلعی صفحہ ۳/۴۵۲ باب الجزیہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے ارتداد کا یقین نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ لوگ مومن ہیں' مومن بخل مال کے باعث اداء زکوٰۃ سے رک گئے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ خود بھی کہتے ہیں کہ واللہ! ہم اسلام سے نہیں پھرے' بخل مال کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دی مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور قتال کے بعد جو گرفتار ہوئے' ان کو قید کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کے معاملہ پر نظر ثانی فرما کر سب کو رہائی دے دی۔ اسی طرح متدرک حاکم صفحہ ۱/۳۰۳ میں بھی ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ یہ امر محبوب تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں معلوم کر لیتا' اور ان میں سے یہ بات بھی ذکر کی کہ جو لوگ اپنے اموال میں زکوٰۃ فرض ہونے کا اقرار کرتے ہیں لیکن ادا نہیں کرتے کیا ان سے قتال جائز ہے؟

معلوم ہوا کہ وہ لوگ زکوٰۃ سے بالکل منکر نہیں تھے' ورنہ ان کے کفر میں کون شک وتردد کر سکتا تھا' زکوٰۃ ضروریات دین سے ہے' جن کا انکار کفر ہے' ان لوگوں نے سمجھا کہ زکوٰۃ ایک مالی ٹیکس ہے جو بادشاہ اپنی رعایا سے وصول کرتے ہیں لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے زمانے میں ادا کی گئی' اب چونکہ ہم ہی میں سے والی وحاکم ہو گئے ہیں وہ ٹیکس بھی ختم ہو گیا اور دوسرے ٹیکسوں کی طرح والی کی رائے پر محمول ہو گیا' خواہ ہم اس کو دیں یا نہ دیں۔

خلفاء راشدین کا منصب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ خلفاء راشدین کا منصب میرے نزدیک اجتہاد سے اوپر اور تشریع سے نیچے ہے کیونکہ صاحب شریعت نے ہمیں اس کی اقتداء مطلق کا حکم فرمایا ہے اور اسی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نماز جمعہ کے لئے اذان[1] اول کی زیادتی' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کے لئے ایک امام[2] کے پیچھے لوگوں کو جمع کر دینا ہے' لہٰذا ان حضرت کے باہمی اختلاف کو مسائل اصول سے وابستہ کرنا مثلاً کہنا کہ شیخین کا اختلاف حکم میں تعارض عموم وخصوص کے ہے درست نہیں' اور غالباً اس سلسلہ میں ہماری تنقیح مذکور ہی اقرب الی الصواب ہے۔

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے لکھا کہ جن لوگوں نے اس حدیث سے تارک صلوٰۃ کے قتل پر استدلال کیا ہے ان پر اعتراض پڑتا ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ کے لئے قتل کا حکم کیوں نہیں کرتے جب کہ حدیث ایک ہی ہے' علامہ کرمانی نے یہ بھی صراحت کی کہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے تو اگر دونوں کا حکم مقاتلہ ہے تو مسلم اور اگر قتل ہے تو مانع زکوٰۃ کے قتل کا حکم تو شوافع وغیرہم نہیں مانتے دوسرے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ایک اذان خطبہ جمعہ کے وقت ہوتی تھی یہی طریقہ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمرؓ کے پورے دور میں حضرت عثمان غنیؓ کے ابتدائی دور خلافت میں بھی رہا' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اذان اول کا اضافہ فرمایا جو اب تک موجود ہے۔

[2] اس سے قبل الگ الگ پڑھتے تھے' جو نوافل وسنن کا طریقہ ہے اور اذان وجماعت نماز فرض وواجب کے ساتھ خاص ہے اسی لئے فقہاء نے لکھا کہ ''نفل کی جماعت مکروہ ہے' بجز رمضان کے اور اس سے مراد سنن تراویح ہیں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فقہا کی اس عبارت سے جس نے مطلق نوافل رمضان سمجھا' غلطی کی' لہٰذا تہجد کی جماعت تین سے زیادہ کی رمضان میں بھی مکروہ ہوگی۔ اس کی مکمل ومدلل بحث آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

بھی قتال ومقاتلہ ہی منقول ہے یہ کسی نے نہیں لکھا کہ آپ نے مانعین زکوٰۃ میں سے کسی کو قتل کی سزا دی ہے۔

حکم تارک صوم

روزہ نہ رکھنے والے کی سزا یہ ہے کہ اس کو قید کر دیا جائے' اور دن کے اوقات میں اس کو کھانے پینے کے لئے کچھ نہ دیا جائے' کیونکہ بظاہر وہ روزہ کی نیت کر لیگا' جبکہ روزہ کے وجوب وفرضیت کا معتقد ہے۔

(۲) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ واجبات وشعائر اسلام کے ترک پر قتال کرنا واجب ہے۔

(۳) جو شخص اسلام ظاہر کرے اور ارکان کی ادائیگی کرے اس سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہئے۔

(۴) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زندیق کی توبہ قبول ہو سکتی ہے اس کی تفصیل مغازی میں آئے گی اور اصحاب امام شافعیؒ کے اس شخص کے بارے میں پانچ قول ہیں جو اسلام ظاہر کرے اور کفر پوشیدہ رکھے ہو' جس کا علم خود اس کے اقرار یا دوسروں کی شہادت سے ہو جائے۔

(۱) قبول توبہ مطلقاً اور یہی قول امام شافعیؒ سے منقول اور صحیح ہے' جس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول **افلاشقفت قلبہ** ہے

(۲) اس کی توبہ ورجوع الی الاسلام قبول نہیں' البتہ اگر وہ اپنی توبہ میں واقعی سچا ہے تو اس کو عنداللہ نفع ہوگا۔ امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ سے مذکورہ ہر دو قول کے موافق دو روایت ہیں۔ (۳) اگر ایسا شخص اس قسم کی گمراہی کا مبلغ بھی ہے تو اس کی توبہ قبول نہیں' لہذا عوام کی توبہ قبول ہوگی (۴) اگر خود بخود ابتداً ہی تائب ہو کر آئے اور آثار وقرائن بھی اس کی صداقت ظاہر کریں تو اس کی توبہ قبول ہوگی لیکن اگر قتل ہونے کے لئے گرفتار ہو کر آیا اور اس وقت توبہ کی تو قبول نہ ہوگی' یہ قول امام مالک سے بھی منقول ہے۔ (۵) ایک مرتبہ قبول ہوگی' پھر اگر اسی طرح حرکات کفریہ کرے تو نہ ہوگی۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جو حقیقۃً زندیق ہو اور ظاہر اسلام کرے اس سے مرتد کی طرح توبہ کرائی جائے گی۔ امام ابو یوسف (قاضی القضاۃ دولت عباسیہ) کی بھی ایک زمانہ تک یہی رائے رہی' مگر پھر یہ دیکھ کر ملحدین وزنادقہ محض اپنی جان بچانے کے لئے توبہ کر لیتے ہیں اور اسلام ظاہر کرنے کے بعد پھر زندقہ کی باتیں کرنے لگتے ہیں' آپ نے فرمادیا تھا کہ میرے پاس جو زندیق لایا جائے گا اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کروں گا بلکہ ثبوت زندقہ کے بعد حکم قتل کروں گا اس کے بعد اگر اس نے خود ہی توبہ کی (اور قتل سے پہلے اس کی صداقت کا اطمینان ہو گیا' تو اس کو چھوڑ دوں گا' اس کے علاوہ ایک قول امام ابو یوسفؒ کے واسطے سے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کا یہ بھی نقل ہوا ہے کہ چھپا ہوا زندیق قتل کیا جائے' اس کی توبہ قابل اعتماد نہیں۔

(۵) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نجات کے لئے پختہ اعتقاد کافی ہے اور یہی جمہور امت کا مسلک مختار ہے معتزلہ اور بعض متکلمین وامام الحرمین وغیرہ کہتے ہیں کہ صرف اتنا کافی نہیں بلکہ دلائل حقانیت اسلام کا علم حاصل کر کے علی وجہ البصیرت اسلام لانا ضروری ہے امام نووی نے لکھا کہ بکثرت احادیث صحیحہ کے عموم سے علم قطعی اس امر کا حاصل ہو جاتا ہے کہ صرف قطعی تصدیق ہونا کافی ہے۔

(۶) معلوم ہوا کہ حکم اسلام لگانے اور قتال سے بچنے کے لئے زبان سے کلمہ شہادت کہنا ضروری ہے۔

(۷) معلوم ہوا کہ اہل بدعت میں سے اہل شہادت کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(۸) ہر شخص کے ظاہری اعمال اسلام ہی قبول ہوں گے اور ان ہی پر نظر ہوگی۔

(۹) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد ائمہ دین نے ظاہری اعمال پر حکم کیا اور پوشیدہ امور کا فیصلہ حق تعالیٰ جل ذکرہ پر محول کیا' مخلوق کو ان کی کھود کرید کا حق نہیں دیا گیا۔

(۱۰) یہ حدیث ان تمام احادیث مطلقہ کی مقید اور مبین ہے جن میں صرف کلمہ اخلاص پر نجات اخروی وعصمت دنیوی بتلائی گئی ہے مثلاً

مانعین زکوٰۃ سے حضرت صدیقؓ نے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ ان سے قتال کس طرح کر سکتے ہیں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ ''مجھے قتال کا حکم ہوا ہے تا آنکہ لوگ کلمہ اخلاص (لا الہ الا اللہ پڑھیں جو ایسا کریں گے وہ اپنی جان و مال کو محفوظ کرلیں گے) بجز حق اسلام کے اوران کا حساب خدا پر ہے''۔

اس پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ضرور ان لوگوں سے قتال کروں گا جو نماز و زکوٰۃ میں فرق کریں گے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واللہ! اتنا سنتے ہی مجھے اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق کی بات کے لئے شرح صدر کر دیا اور میں جان گیا کہ وہی حق ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ایسا بھی مستبعد نہیں بلکہ واقع ہوا ہے کہ بعض اکابر صحابہ کو کوئی حدیث معلوم نہ ہوئی اور دوسرے صحابہ کو معلوم تھی، انہوں نے روایت کی، جیسے یہی حدیث الباب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھی، اور نہ وہ اس موقع پر حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے مقابلہ میں پیش کرتے، قیاسی استدلال نہ کرتے یا جس طرح جزیہ مجوس یا طاعون والی حدیثیں بعض صحابہؓ سے مخفی رہیں اور بعد کو ان کا علم ہوا ہے، ایک جواب یہ بھی ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے صرف قیاس سے استدلال نہیں کیا، بلکہ یہ جملہ بھی فرمایا تھا کہ زکوٰۃ اسلام کا حق ہے، گویا حدیث کے جملہ **الا بحق الاسلام** سے استدلال فرمایا۔

ایک خدشہ کا جواب

ایک خدشہ یہاں یہ بھی ہے کہ جب اس حدیث الباب کے راوی حضرت ابن عمرؓ ہیں تو انہوں نے حضرت ابوبکر و عمر کے مذکورہ مناظرہ و بحث کے وقت اس حدیث کو کیوں نہیں بتلایا۔ بعض حضرات نے تو اس خدشہ کے تحت اس حدیث ابن عمر کی صحت پر بھی شبہ کیا ہے مگر یہ خدشہ و شبہ بے محل ہے کیونکہ اول تو ممکن ہے حضرت ابن عمر اس موقع پر موجود نہ ہوں، اور بعد کو بتلایا ہو، دوسرے یہ کہ روایت مذکورہ حضرت ابن عمر ہی کی طرح زیادہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(۱۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اقرار شہادتیں اور اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ کے بعد اگرچہ وہ معصوم و محفوظ ہو گیا مگر حقوق الاسلام (قصاص، حد، وغیرہ) کا مواخذہ اس سے ضرور ہوگا۔

(۱۲) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو ان پر قتال کفار واجب ہے، تا آنکہ وہ اسلام قبول کریں یا جزیہ دیں۔

چند سوال و جواب

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے مذکورہ بالا بارہ حدیثی فوائد ذکر فرما کر لکھا کہ اس حدیث سے متعلق چند سوال و جواب بھی ہیں جن میں ایک زیادہ اہم یہ ہے کہ بظاہر حدیث الباب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادتین اور نماز و زکوٰۃ کے بعد قتال کا حکم ختم ہو جائے گا، خواہ وہ شخص باقی تمام ضروریات دین سے منکر و کافر بھی ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اقرار و شہادت رسالت میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں پہنچی ہیں، اس لئے ان سب کی تصدیق بھی ہمیں لازم و ضروری ہے، چنانچہ دوسری حدیث میں ''ویؤمنوا بی وما جئت به'' بھی مروی ہے، دوسرا سوال یہ ہے کہ حکم تو تمام ہی فرائض کا یکساں ہے پھر صرف نماز و زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایک عبادت بدنی اور ایک مالی ذکر کی تا کہ اسی پر دوسری عبادات کو قیاس کر لیا جائے، دوسرے اس لئے بھی کہ یہ دونوں زیادہ اہم ہیں، کیونکہ نماز دین کا ستون ہے اور زکوٰۃ اسلام کا پل ہے تیسرا سوال یہ ہے کہ شہادتین کے بعد تو اسلامی اصول سے قتال ختم ہو جاتا ہے اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا انتظار نہیں کیا جاتا پھر یہاں نماز و زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا اور اس کا فائدہ **الا بحق الاسلام** سے بھی حاصل ہو رہا تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں کا ذکر محض ان کے اہتمام و تعظیم کے لئے کیا گیا اور یہ دکھلانے کے لئے کہ ان کا مرتبہ شہادتین کے قریب ہی

ہے، یا ترک قتال مستمر و مستقل طور سے مراد ہے کہ وہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ شہادتین کے ساتھ سارے واجبات بھی ادا کئے جائیں ترک قتال عارضی طور سے مقصود نہیں جس کا اعادہ ترک صلوٰۃ وزکوٰۃ پر بھی ہو سکتا ہے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۲۱۱ تا ۱/۲۱۴)

تبلیغ دین کی ضرورت اور اس کا کامیاب عملی پروگرام

اوپر بیان ہوا کہ جمہور علماء امت کے نزدیک نجات اخروی کے لئے اعتقاد جازم ضروری وکافی ہے دلائل و براہین کے ساتھ حقانیت اسلام کا یقین ضروری نہیں، تاہم اتنا تو سب ہی کے نزدیک ضروری ہوا کہ عقائد وایمانیات سے پوری طرح واقفیت ہو، صرف شہادتین کا پڑھ لینا بغیر اس کا معنی ومطلب سمجھے ہوئے کافی نہیں ہوگا پھر اگر اس کے ساتھ شریعت کے فرائض وواجبات پر عمل بھی نہ ہو تو وہ نقص در نقص ہوگا۔

لہٰذا نہایت ضروری ہے کہ واقف شریعت حضرات اپنے اپنے قریب کے اس قسم کے مسلمانوں کو عقائد واعمال شریعت سے واقف کریں، اور ان کی تعلیم دین واصطلاح حال کے لیے پوری طرح منظم ہو کر سعی وتوجہ کریں ان کو آخرت کے عذاب وثواب سے آگاہ کریں، یہ اس وقت کے اہم ترین واجبات اسلام میں سے ہے، اس کے لیے طریقہ کار وہی بہتر ہوگا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اختیار کیا تھا کہ سب سے پہلے اپنے کنبہ وقبیلہ میں، پھر محلہ میں پھر اپنی بستی میں تبلیغ واصلاح کا فرض انجام دیا جائے، پھر اپنی قریبی بستیوں تک جا کر یہ خدمت ادا کی جائے، اور اس طرح اگر کچھ عرصہ میں ہم پورے ملک میں تبلیغ واصلاح کا جال پھیلا چکیں تو اس کے بعد دوسرے قریب اور پھر دور کے ممالک میں کام کریں اپنے قریبی حلقوں کو چھوڑ کر اگر دور دراز کے خطوں میں کام کرنے کو ترجیح دی گئی تو اس میں مظاہرہ ونمائش تو زیادہ ہے مگر بہتر کام وکامیابی کی توقعات بہت کم ہیں واللہ اعلم۔

قتال وجہاد

اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ کا بہت بڑا مرتبہ ہے کیونکہ اس کا مقصد وحید خدائے برتر کا بول بالا کرنا ہے جس کو اعلاء کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے، بخاری شریف کی جس حدیث پر یہ بحث چل رہی ہے، اس میں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم ربی ہے، جب تک لوگ خدائے برتر کی وحدانیت، میری رسالت، اور میری لائی ہوئی شریعت سچے دل سے نہ مان لیں اور واجبات اسلام پر عمل نہ کریں، ان سے برسر پیکار رہوں، یعنی تبلیغ کے بہترین رسالتی طرز وطریق سے لے کر جہاد وقتال تک سے بھی اتمام حجت کردوں، رحمت دو عالم، سراپا شفقت ورافت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بتلاتا ہے کہ کسی بڑے مقصد ومفاد کو حاصل کرنے کے لیے نرم وگرم سب ہی وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں جس طرح کسی مریض کے زیادہ خطرناک مرض کے ازالہ کے لیے زیادہ سے زیادہ کڑوی دوائیں، سخت سے سخت پرہیز، اور خطرہ کے وقت آپریشن تک جائز بلکہ مستحسن ہو جاتے ہیں پس اگر کم قیمت اور فنا پذیر اجسام کی صحت کے لیے جسمانی ڈاکٹروں ومعالجوں کے ایسے اقدامات مستحسن ہو جاتے ہیں تو روح جیسی گرانقدر اور ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کے لیے روحانی ڈاکٹر ومعالج انبیاء علیہم السلام کی تجویز وتشخیص اور معالجاتی طریقوں سے توحش کا اظہار کیوں ہو؟ اور یہ حکم قتال بھی رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذات اقدس جل ذکرہ کی طرف سے ملا ہے، جس کے فضل ورحمت کی کوئی حد وانتہا ہی نہیں، دنیا کی ہر چیز اس کی شان رحمت پر گواہ ہے اور اسی نے قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی انسانی جانوں میں سے ایک جان کو بھی بغیر بدلہ جان یا فساد کے ہلاک کردے گا تو اس نے اتنا بڑا جرم عظیم کیا کہ گویا ساری دنیا کے انسانوں کو ہلاک کردیا۔ اور جس نے کوئی ایک معصوم جان بھی بچائی تو گویا ساری دینا کے انسانوں کی جانیں بچادیں، لیکن اگر خدا ہی کے قانون کو دوسرے دنیوی قوانین کے نیچے کردیا گیا ہو اور خدا کے کچھ برگزیدہ بندے، خدا کے حکم سے، اس کے قانون کو اوپر کرنا چاہیں کو کیا ایسے مقدس مقصد کے حصول میں مزاحمت ورخنہ اندازی کرنے والوں کی سرکوبی ضروری نہ ہوگی؟

اس کے بعد امام بخاری دوسری حدیث لائے ہیں، جس میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کونسا عمل سب سے افضل ہے آپ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، سائل نے عرض کیا کہ اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا،

اس نے پھر سوال کیا اس کے بعد؟ تو آپ نے فرمایا حج مبرور۔ اس کے بعد صفحہ ۳۵ پر ایک حدیث **باب الجهاد من الا یمان** کے تحت لائے ہیں اور کتاب الجہاد کا مستقل عنوان قائم کر کے جو احادیث ذکر کریں گے وہ تو گویا اس سلسلہ کی تکمیل ہوگی۔ انشاء اللہ۔

حج پر جہاد کا تقدم

امام نوویؒ نے شرح بخاری میں اس پر بحث کی ہے کہ حج تو فرض عین ہے اس کے مقابلہ میں جہاد کو کیوں مقدم کیا گیا جب کہ وہ فرض کفایہ ہے؟ پھر اس کا جواب یہ دیا کہ جہاد اگرچہ عام حالات میں فرض کفایہ ہوتا ہے مگر بعض مواقع میں فرض عین بھی ہو جاتا ہے پھر کسی وقت بھی فرض کفایہ سے تو اس کا مرتبہ کم ہی نہیں ہوتا جب کہ حج فرض ساری عمر میں صرف ایک بار ہوتا ہے باقی جتنے ادا کرے گا وہ سب نفل ہوں گے اس لیے جہاد کا مرتبہ بڑھ گیا اور اگر صرف حج فرض اور جہاد فرض عین میں مقابلہ کیا جائے تو جہاد اس لیے بڑھے گا کہ اس میں علاوہ فرضیت کے ایک نفع عظیم ساری امت مسلمہ کے لیے ہے۔ اور اس سے ناموس اسلام کی حفاظت ہوتی ہے اور اس میں جان و مال کا گرانقدر ایثار ہوتا ہے۔ وغیر ذلک۔

فرض کفایہ کی اہمیت

امام الحرمین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہر فرض کفایہ فرض عین کے مقابلہ میں اس حیثیت سے افضل ہے کہ کچھ لوگوں کی ادائیگی سے ساری امت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اگر وہ بھی ادا نہ کریں تو امت کے جتنے لوگ بھی اس فریضہ کو ادا کرنے پر قادر ہیں سب ہی گنہگار ہوں گے اور بلا شک ایسی صفت کا فریضہ نہایت عظیم القدر ہے بعض حضرات نے لکھا کہ جہاد کو اس لیے حج پر مقدم کیا کہ ابتداء اسلام میں ہی جہاد کی ضرورت سامنے آگئی تھی اور ظاہر ہے کہ اس سے اسلام کو بڑی قوت حاصل ہوئی اور آخر زمانے تک بھی جہاد کا حکم باقی ہے کہ حدیث میں ہے ''**الجهاد ما ض الی یوم القیامة**'' (جہاد کا حکم روز قیامت تک جاری رہے گا۔)

اسلام جہاد کا مقصد

معلوم ہوا کہ اسلام جہاد کا مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ یا ناموس اسلام کی حفاظت ہے ان اغراض سے ہٹ کر تمام دنیاوی اغراض کے لیے یا محض کسی قومی و ملکی عداوت کے سبب جو جدال و قتال ہوگا وہ اسلامی نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں۔

اسلامی جہاد چونکہ ایک خدائی قانون ہے اس لیے اس کی ادائیگی نہایت اہم شرائط اور کڑی احتیاطوں پر موقوف ہے وہ سب شرائط و احتیاطیں کتب فقہ اسلامی میں موجود ہیں دنیوی لڑائیوں کے لیے کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں بلکہ علم و حکمت سے غافل لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے مگر اسلامی جہاد کے لیے علوم نبوت سے واقفیت 'تزکیہ نفوس' اور کم سے کم واجبات اسلام کی مکمل پابندی اور خشیۃ خداوندی ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہ کرام کے غزوات اور خصوصیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہ کے غزوات و سرایا پر ایک نظر ڈال لی جائے تو ہماری بات بخوبی روشن ہو سکتی ہے۔ ان حضرات کی شان عین میدان جہاد میں بھی یہ ہوتی تھی کہ دن کے وقت مشغول جہاد ہیں تو رات کے وقت مصروف نوافل ہر اسلامی لشکر تقوی و طہارت کا پیکر مجسم ہوتا تھا شام فتح ہوا تو عیسائیوں نے آزمائش کے لیے بازار سجائے اور دوکانوں پر نوجوان خوبصورت لڑکیوں کو بٹھایا تا کہ اسلامی لشکر کا حال معلوم کریں مسلمانوں کو معلوم ہوا تو امیر وقت نے سب کو جمع کر کے سورۂ نور کی آیات غض بصر سنائیں اور نزاکت حال کا بطور احتیاط احساس کرادیا۔ اس کے بعد پورا اسلامی لشکران بازاروں سے گزر گیا اور تاریخ میں ہے کہ کسی ایک سپاہی نے بھی دوکانوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

مکی و مدنی زندگی: یہی وجہ ہے کہ مکی زندگی کے ۱۳ سال مسلمانوں نے سخت سے سخت تکالیف میں گزارے اور بار بار خواہش کی کہ کفار و مشرکین سے قتال و جہاد کی اجازت مل جائے مگر حق تعالے کی طرف سے یہی تاکید ہوتی رہی کہ پہلے اپنے تقوی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو لو اپنی

نمازوں اورزکوٰۃ وغیرہ واجبات کی پوری پابندی کر کے دکھاؤ' اس کے بعد جہاد کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ قال تعالیٰ: **الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ** (کیا آپ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو (جہاد وقتال) سے روکے رہو۔ اور نمازوں کی پوری پابندی اور زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کا اہتمام کرو) مفسرین کے اشارات کچھ اس قسم کے بھی ملتے ہیں کہ دار بدلنا بھی اس جہادی تیاری کا ایک جزو تھا اس لیے ہجرت فرض ہوئی پھر تو فوراً ہی مدنی زندگی میں غزوات وسرایا کا ایک مسلسل وطویل سلسلہ بندھ گیا۔

سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حیرت انگیز فیض تربیت وتزکیہ نفس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار انسان صورت جم غفیر مکمل طور سے فرشتہ سیرت بن چکا تھا' اسی لیے نہایت تھوڑے عرصہ میں سارا عرب انوار الٰہی وعلوم نبوت سے جگمگا اٹھا' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مختصر دور خلافت میں داخلی فتنوں کو پوری کامیابی سے ختم کر دیا گیا' اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور میں بڑے پیمانہ پر بیرونی ممالک میں فتوحات ہوئیں۔ اور اس شان سے کہ مصر کی فتح میں کچھ دیر ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن العاصؓ سپہ سالار جیش کو لکھا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے جب کہ میں نے تمہارے ساتھ ایسے لوگ بھیجے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک آدمی ایک ایک ہزار کے مقابلہ میں کافی ہے' غرض جہاد مع النفس اور واجبات اسلام کے کامل اتباع کی برکت سے روحانی قوت اس قدر قوی ہو جاتی ہے کہ اب بھی اس کے معجزانہ کرشمے دیکھے جا سکتے ہیں' اور تا قیام قیامت جب تک صحیح اسلامی جہاد باقی ہے اس کے نمونے دیکھے جائیں گے۔

فضائل جہاد وشہادت

جہاں اسلامی جہاد کی شرائط سخت اور احکام اس کے اعلیٰ مقصد کے ساتھ بہت اونچے ہیں وہیں اس کے فضائل ومناقب بھی بہت زیادہ ہیں' چند احادیث یہ ہیں'

(۱) جہاد کے وقت ایک رات ساحل بحر پر جاگ کر حراست کرنا اپنے گھر پر ایک ہزار برس کی عبادت سے افضل ہے (جمع الفوائد من الموصلی ملیبین)

(۲) اس کے میدان میں جم کر کھڑا ہونا گھر بیٹھ کر ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے (جمع الفوائد کبیر' اوسط' بزار)

(۳) اس میں جاگنے والی آنکھ پر دوزخ کی آگ حرام ہے (ترمذی)

(۴) خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے حق تعالیٰ نے دو چیزوں کی ذمہ داری لی ہے' اگر شہید ہو گیا تو سیدھا جنت میں پہنچے گا کہ اس کا جنت میں داخلہ دوسروں کا طرح روز جزا پر موقوف نہیں ہے' اور اگر شہادت کی بلندی نہ مل سکی بلکہ گھر واپس آ گیا تو بصورت فتح مال غنیمت واجر اخروی دونوں سے سرفراز ہوگا' اور فتح نہ ہوئی تب بھی اجر جہاد تو ضرور ہی حاصل ہوا (ترمذی)

(۵) بعض روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ شہید حور کی گود میں گرتا ہے

(۶) شہادت کے بعد[1] دن بھر جنت کی سیر وسیاحت اور اس کے پھل کھانے میں گزارتا ہے اور رات کے وقت عرش الٰہی کی قندیلوں میں بسیرا لیتا ہے۔ (ابوداؤد)

(۷) راہ جہاد میں غبار آلود ہونے والے قدم دوزخ کی طرف نہ جائیں گے (بخاری' ترمذی' نسائی)

(۸) خدا کے راستے میں ایک دن ملکی سرحد کی حفاظت ایک ماہ دن کے روزوں اور رات کے قیام سے افضل ہے (مسلم وترمذی)

---

[1] شہیدوں کی زندگی حضرت ابن عباسؓ سے روایت اس طرح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب غزوہ احد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو حق تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے قالب میں ڈال دیا' وہ جنت کی نہروں اور باغات میں سیر کرتیں اور ان کے پھل کھاتیں اور رات کے وقت عرش خداوندی کے طلائی قندیلوں میں بسر کرتیں' جب اس طرح عیش ومسرت کی زندگی پائی تو انہیں تمنا ہوئی کہ ہمارا یہ حال اور جنت کی زندگی ہمارے بھائیوں کو بھی دنیا میں معلوم ہو جائے تا کہ وہ جنت سے بے رغبتی اور میدان جہاد میں بزدلی اختیار نہ کریں اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری اس تمنا کو پورا کریں گے اور قرآن مجید کی یہ آیت **و لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون' فرحین بمآ آتاھم اللہ من فضلہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم** (آل عمران)

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

(۹) جہاد فی سبیل اللہ میں ایک صبح یا ایک شام کا نکلنا دنیا و مافیہا سے افضل ہے (مسلم و نسائی)

(۱۰) میدان جہاد فی سبیل اللہ میں ایک ساعت کھڑا ہونا گھر میں ستر سال نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ پھر فرمایا کہیں تمہیں یہ بات نہایت محبوب و پسندیدہ نہیں کہ خدا تمہاری مغفرت کر کے جنت میں داخل کر دے۔ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں۔ فرمایا خدا کے راستے میں غازی و مرد مجاہد بن کر نکلو جو شخص اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے بقدر فواق[1] ناقہ بھی قتال کرے گا اس کے لیے جنت واجب ہوگئی (ترمذی)

(۱) جو شخص خدا کے رب اسلام کے دین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے سے راضی ہو گیا، جنت اس کا حق ہو گئی۔ راوی حدیث ابوسعید یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا پھر اعادہ کرایا، آپ نے فرمایا ایک عمل اور بھی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ بندے کو ایک سو درجے بلند فرما دیتا ہے، جن کے دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے، عرض کیا وہ کیا ہے؟ فرمایا جہاد فی سبیل اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، تین بار فرمایا (مسلم، نسائی)

(۱۲) جنت تلواروں کے سایہ میں ہے (مسلم نسائی)

(۱۳) جس کو خدا کے راستے میں ایک تیر لگا، وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہوگا (بزار)

(۱۴) حق تعالیٰ ان دو شخصوں کے عجیب حال پر ضحک فرماتے ہیں (کما یلیق بشانہ و لیس کمثلہ شیء) کہ وہ باہم قتال کرتے ہیں، پھر بھی دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں، اس طرح کہ ایک خدا کے راستے میں لڑ کر شہید ہو جاتا ہے، اور دوسرا کافر قاتل توبہ کر کے اسلام قبول کر لیتا ہے اور وہ بھی خدا کے راستے میں جہاد کر کے شہید ہو جاتا ہے (بخاری و مسلم و نسائی)

(۱۵) جو مومن خدا کے وعدوں پر یقین رکھ کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھوڑا پالتا ہے، تو اس گھوڑے کا پیٹ بھرائی چارہ، پانی، اس کی لید و پیشاب بھی اس مومن کا وزن اعمال بڑھانے کے لیے اس کی میزان میں رکھا جائے گا، یعنی حسنات کے قائم مقام ہوگی (بخاری و نسائی)

(۱۶) جو شخص گھر میں رہتے ہوئے، مجاہدین کے مصارف کے واسطے کوئی رقم دے گا، اس کو ہر روپیہ کے عوض سات سو روپیہ صرف کرنے کا اجر ملے گا اور جو شخص خود میدان جہاد میں شرکت کے ساتھ کچھ صرف کرے گا اس کو ہر روپے کے عوض سات لاکھ روپے صرف کرنے کا ثواب ملے گا (جمع الفوائد من القزوینی بمجہول وارسال)

(۱۷) شہادت فی سبیل اللہ سے بجز دین (قرض) کے ہر قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (ترمذی)

(۱۸) ہر شہید اپنے اہل بیت میں سے ۷۰ گناہ گاروں کی شفاعت کر سکے گا۔ (ابوداؤد)

(۱۹) ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے کہ سارے مومن فتنہ قبر سے دوچار ہوں گے بجز شہید کے؟ فرمایا تلواروں کی باڑ کا فتنہ جو اس کے سر پر منڈلا چکا ہے کافی ہو گیا۔ (نسائی)

(۲۰) شہید کو قتل ہونے کے وقت صرف اتنی تکلیف ہوتی ہے جتنی چونٹ لینے یا پسو کے کاٹنے سے ہوتی ہے (ترمذی۔ نسائی) یہ جہاد و قتال کے خوفناک منظر اور اس کی ہیبت دلوں سے کم کرنے کے لیے فرمایا کہ جب شہید کو خدا کے خصوصی فضل و انعام کے باعث قتل کے وقت تکلیف بھی نہیں ہوتی، تو پھر اس سے مرعوب و خوفزدہ ہونا کیسا؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر موت مقدر نہیں تو کتنے ہی میدان کارزار دیکھے گا۔

اور ان کو فاتحانہ سر کرے گا، مگر موت پاس نہ آ سکے گی؛ چنانچہ مشہور عالم، شیر دل، اسلامی جرنیل حضرت خالد بن ولیدؓ نے بیسیوں میدان میں داد شجاعت دی سینکڑوں بلاد اور کتنے ہی ممالک فتح کئے، مگر موت مقدر نہ تھی اور آخر میں آئی تو گھر کے بستر پر، خود ہی موت کے وقت فرمایا میں نے اتنے معرکوں میں شرکت کی اور میرا کوئی عضو نہیں بچا جس میں تلوار اور تیر کے زخم نہ ہوں اور اب مجھے افسوس ہے کہ اپنے بستر پر مر رہا ہوں۔ خدا

[1] دو دفعہ دوہنے کے درمیان کا وقفہ یا دوہنے والے کے ہاتھ کے بند کرنے اور کھولنے کے درمیان کا وقت، مقصود کم سے کم وقفہ ہے (مؤلف)

کرے بزدلوں نامردوں کو کبھی خواب راحت نصیب نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱/۵۲۶) مطلب یہ تھا کہ بزدلی ونامردی اور خوف موت ہی جہاد و قتال سے روکتا ہے' ایسے لوگوں کو میرے حال سے سبق لینا چاہئے' اور اس پر بھی اگر ان سے موت کا بے جا خوف دور نہ ہو سکے تو وہ بدنصیب بددعا کے مستحق ہیں' کچھ اسی ذہن وفطرت کے لوگوں نے میدان جہاد کا رخ کرنا مرادف موت سمجھا تھا تو حق تعالٰے نے تنبیہ فرمائی تھی:۔ **و لا تلقوا بايد يكم الى التهلكة** کہ تم اپنی بزدلی کے باعث غلط خیال میں ہو' درحقیقت جہاد کی تیاری نہ کرنا اور ضرورت کے وقت جہاد سے پہلوتہی کرنا ہی اپنے کو ہلاکت وتباہی' ذلت ونامرادی کے غار میں دھکیلنا ہے' قوموں کی ذراسی غفلت وبزدلی سے دشمن کو بڑے فائدے پہنچ جاتے ہیں' اور اس کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔'' **واعد وا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل تر هبون به عدو الله وعد و كم۔**

جہاد وشہادت کے اقسام

جہاد کا مضمون بہت طویل اور پوری تفصیلات چاہتا ہے' اور یہ جلد اسی مضمون پر ختم ہو رہی' مختصراً چند باتیں اور لکھی جاتی ہیں۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اقدامی جہاد سب سے اعلیٰ اور اونچا درجہ ہے' جس کو انبیاء علیہم السلام کے غزوات اور صحابہ کرام کے مجاہدانہ کارناموں میں پڑھنا چاہئے' اور سمجھ کر اس سے روشنی لینی چاہئے اس کے بعد دفاعی جہاد کا مرتبہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من قتل دون ماله فهو شهيد. من قتل دون دمه فهو شهيد. من قتل دون دينه فهو شهيد. من قتل دون اهله فهو شهيد** (سنن اربعہ) **من قتل دون مظلمة فهو شهيد** (نسائی) یعنی اپنے دین' مال' اہل وعیال' اپنی عزت وحق کی حفاظت کرتے ہوئے مرجائے تو وہ بھی شہید ہے' مگر یہ جب ہی ہے کہ جہاد کی روح اس حالت مظلومی میں بھی فوت نہ ہو' یعنی اپنی سعی وکوشش میں کمی نہ کرے اور بزدلی ونامرادی کا کسی نہج شائبہ نہ آئے اور حق مدافعت ادا کرے' اس کے بعد تیسرا اور آخری درجہ شہادت کا اور بھی ہے کہ اس کو بھی شارع علیہ السلام نے فی الجملہ شہادت کے اعلیٰ مقام سے ربط دے دیا ہے اور بڑے ثواب کا مستحق گردانا ہے' فرمایا (۱) طاعون کی بیماری سے (۲) ہیضہ کی بیماری سے (۳) نمونیہ کی بیماری سے اور عورت نفاس کی حالت میں مرجائے تو شہید ہے' اسی طرح ڈوب کر' جل کر' دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرجائے تو وہ بھی شہید ہے' یہ تیسری قسم گویا جہاد اضطراری ہے اور تیاری ومستعدی تینوں ہی قسم کے جہادوں کے لئے ہونی چاہئے تاکہ جس سے بھی سابقہ پڑے مردانہ وار اس کو انگیز کرے' اور غفلت وناتیاری کی ندامت وخفت اٹھانی نہ پڑے۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

مسئلہ قتال تارکین واجبات اسلام

مذکورہ حدیث الباب میں تارکین صلوٰۃ وزکوٰۃ سے قتال کا وجوب صراحۃً اور دوسرے تارکین واجبات سے اشارۃً معلوم ہوا لیکن ظاہر ہے کہ ایسے احکام کا اجراء دارالسلام ہی میں ہو سکتا ہے' دارالحرب میں جہاں غیر اسلامی احکام کا اجراء ہو کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے بدرجہ مجبوری انفرادی واجتماعی حیثیت سے جتنا بھی زیادہ سے زیادہ اثر ودباؤ قانونی حدود کے اندر رہ کر ان لوگوں پر ڈالا جا سکتا ہو اس سے ضرور کام لینا چاہئے' تاکہ احکام اسلام سے غفلت وبے اعتنائی کا سدباب ہو' اس کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے اسلامی شریعت کی نظر میں جو لوگ مستحق قتال ہیں اور ترک صلوٰۃ عمداً پر تو تمام ائمہ مجتہدین نے قتل وحبس کے سخت ترین احکام جاری کئے ہیں' اسلئے ان کی اصلاح معاشرہ مسلمین کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

لہٰذا ایسے تمام لوگوں کی تادیب واصلاح حال ہر دیندار مسلمان کا فرض ہے خصوصاً اپنے متعلقین اعزہ واحباب کی' **كلكم راع و كلكم مسؤل عن رعيته**'' اس اصلاح کے چند درجات ہیں' سب سے پہلے وعظ وتلقین' ترغیب وترہیب کے ساتھ احکام اسلام کی ضروری تعلیم دی جائے جن لوگوں پر وہ کارگر نہ ہو' ان کا عملی طور سے عمومی مقاطعہ' ترک تعلق وغیرہ کیا جائے تاکہ وہ مجبور ہو کر ترک صلوٰۃ وغیرہ

اور ارتکاب منکرات وفواحش سے باز آئیں' یہ مقاطعہ کی صورت ان کی اصلاح حال کے لئے کم سے کم درجہ کا علاج ہے اور جس کا روزانہ عہد و اقرار ہم دعاءِ قنوت میں بھی کرتے ہیں "ونخلع ونترک من یفجرک" (اے خدا! ہم آپ کے نافرمان بندوں سے بیزاری وقطع تعلق کرتے ہیں' اس طریق کار کی کامیابی کا انحصار ہر شہر وقصبہ کی منظم تبلیغی جماعتوں پر ہوگا۔ ۹ھ میں غزوہ تبوک کے متخلفین کے ساتھ جو مقاطعہ' ترک تعلق وترک کلام کی صورت میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمایا تھا اور اس سے خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ وہ ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے اور موجودہ حالات میں وہ ایک ہی موثر علاج ہے سورہ توبہ کی تفسیر میں اس کا واقعہ تفصیل سے ملتا ہے اور ہم بھی آئندہ کسی موقع پر لکھیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دارالاسلام ودارالحرب کے متعلق علامہ کشمیریؒ کی تحقیق

احکام اسلام کے اجراء وغیر اجراء اور بہت سے مہمات اسلامی کا تعلق ہر دو دار کے اصولی فرق سے وابستہ ہے اس لئے اس کی بھی یہاں بقدر ضرورت شرح وایضاح مناسب ہے' اس کے ضمن میں یہ بات بھی آجائے گی کہ ہمارا ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ محقق عصر حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے اس سلسلہ میں ایک نہایت عمدہ تحقیق بہت مدت ہوئی اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا جمعیت علماء ہند (منعقدہ پشاور) میں لکھی تھی جو شائع شدہ ہے' اس کے بعد ایک مستقل تحریر اسی موضوع پر تحریر فرمائی' جواب تک قلمی یاداشت کی شکل میں "کتب خانہ رحمانی مونگیر" میں محفوظ تھی جس کو چند ماہ قبل محترم ومخدوم جناب مولانا منت اللہ صاحب رحمانی فاضل دیوبند ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند' امیر شریعت بہار واڑیسہ نے نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر فوٹو آفسٹ سے طبع کرا کر شائع کر دیا ہے در حقیقت اس کی اشاعت سے مولانا موصوف نے علمی دنیا پر بہت بڑی منت فرمائی ہے۔ **ولهم الاجر والمنة**۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر فارسی زبان میں ہے' نہایت مفید ہوتا اگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شائع ہو جاتا بہر حال اسی تحریر کا ضروری خلاصہ پیش ہے۔

کسی شہر یا ملک کے دارالسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار محض غلبہ وشوکت پر ہے' اگر وہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے تو وہ دارالاسلام ہے اور کفار ومشرکین کا غلبہ ہے تو دارالحرب "جامع الرموز میں ہے" کہ دارالاسلام وہ ہے' جس میں امام المسلمین کا حکم جاری ہو اور مسلمان وہاں مامون ہوں اور دارالحرب وہ ہے جس میں مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں"۔

اگر کسی جگہ دونوں کے احکام جاری ہوں اور بعض وجوہ سے اہل اسلام کا بھی غلبہ ہو تو اس کو بھی بحکم "**الاسلام يعلو ولا يعلى**" دارالاسلام کہہ سکتے ہیں' مگر صرف اس وجہ سے کہ کسی جگہ مسلمان بھی رہتے ہوں (بغیر کسی غالبانہ حیثیت کے اس کو دارالاسلام[1] نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ جرمنی' فرانس' روس وچین وغیرہ کو بھی دارالاسلام کہا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ایک طویل محققانہ بحث اس امر پر کی ہے کہ ایک دارالاسلام کن صورتوں میں دارالحرب بن جاتا ہے اور امام صاحب وصاحبین کے نظریات کی تنقیح وتوضیح فرمائی ہے جو اہل علم کے لئے بہت قیمتی ہے' پھر فرمایا کہ اجراء احکام اسلام کا مطلب بطور غلبہ اظہار حکم اسلام ہے' محض اداء جماعت وجمعہ مراد نہیں ہے' کیونکہ فقہا نے تصریح کی ہے اور بتلایا ہے کہ اجراء احکام کفر اشتہاراً سے مراد یہ ہے کہ حاکم کفار کے حکم جاری کرے اور وہ لوگ قضاۃ مسلمین کی طرف رجوع نہ کریں' یعنی قضاۃ مسلمین کی کوئی شوکت ووقعت نہ ہو اور جن بلاد میں

---

[1] فقہانے دارالحرب ہی کی ایک قسم دارالامان بھی لکھی ہے' جس کی وضاحت حضرت شاہ صاحبؒ نے خطبہ صدارت مذکورہ میں کی ہے اور اس وقت کے انگریزی دور کو دارالامان قرار دیا تھا اس کے مقابلہ میں دارالخوف ہے جہاں مسلمانوں کو پوری طرح جان' مال' عزت ومذہب کا تحفظ بھی حاصل نہ ہو' اس وضاحت اور فقہاء کرام نیز حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات صاف ہے کہ کسی غیر دارالسلام کو دارالمسلمین' نام دینے کا کوئی محل وموقع نہیں ہے' خصوصاً جبکہ اس اصطلاح کا پہلے سے وجود بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

کفار قابض ہو جائیں اور ان کے احکام نافذ نہ ہوں بلکہ قضاۃ مسلمین ہی کے احکام چلیں تو اس وقت تک ان کو بھی دارالاسلام کہیں گے۔

غرض فقہاء نے سارا مدار نفاذ احکام پر رکھا' اس پر نہیں رکھا کہ اس شہر یا ملک کے لوگ آزادی سے باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں یا نہیں اور نماز جمعہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں وغیرہ' کیونکہ ان امور یا دوسرے شعائر اسلام کی ادائیگی دارالحرب میں بھی کفار کی اجازت سے ہوتی ہے جس طرح دارالاسلام میں اہل ذمہ کفار اپنی تمام مذہبی رسوم آزادی سے ادا کرتے ہیں' مگر ان کی وجہ سے ان کو دارالحرب نہیں کہہ سکتے۔

آخر بحث میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ''اہل فقہ میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اگر ملک کفار میں ان کی اجازت سے مسلمان شعائر اسلام ادا کرتے ہیں تو وہ ملک دارالاسلام بن جاتا ہے' حاشا وکلا: یہ بات تفقہ سے بہت دور ہے اور جب یہ بات منقح ہو گئی تو ہندوستان کے بارے میں خود ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے' ظاہر ہے کہ یہاں کفار نصاریٰ کے اجراء احکام کا اس درجہ غلبہ ہے کہ اگر ایک ادنیٰ حاکم ضلع بھی حکم جاری کر دے کہ مساجد میں نماز جماعت ادا نہ کی جائے تو کسی غریب یا امیر مسلمان کی طاقت وقوت نہیں ہے کہ مسجد میں جا کر نماز ادا کر سکے۔

اسی طرح یہاں جو جمعہ وعیدین کی ادائیگی ہوتی ہے یا عدالت میں بھی بعض قوانین فقہ پر عمل ہوتا ہے وہ بھی محض کفار کے اس حکم کے تحت ہے کہ جس سے ہر شخص کو اپنے دین کے موافق عمل کرنے کی اجازت دی گئی ہے (یعنی جب چاہیں وہ اس حکم کو منسوخ بھی کر سکتے ہیں' رہی یہ دلیل کہ ہم لوگ ابھی تک اسی سابق امن سلاطین اسلام کے تحت امان میں ہیں' یہ بھی غلط ہے کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ جو امن شاہ عالم نے عطا کیا تھا ہم اسی کی وجہ سے اسوقت مامون بیٹھے ہوئے ہیں' بلکہ ظاہر ہے کفار نصاریٰ کے جدید امن سے ہمیں موجودہ امان ملا ہوا ہے' رہی دارالحرب کی یہ شرط کہ وہ کسی طرف سے کسی دارالاسلام کے حصہ سے ملحق ومتصل نہ ہو' وہ شرط بلا دوقری کے اندر ہے ممالک واقالیم میں نہیں ہے۔ کیونکہ ایک شہر وقریہ کے لوگ اپنے قریبی شہر وقریہ والوں کی مدد کر سکتے ہیں مگر ممالک میں یہ بات دشوار ہے کون کہہ سکتا ہے کہ افغانستان ہندوستان سے ملحق ہے تو اس کے لوگ یہاں آ کر کفار کو ملک سے نکال سکتے ہیں' حاشا وکلا۔ بلکہ ان کا نکالنا نہایت دشوار ہے۔ بہر حال! ہندوستان پر کفار کا تسلط اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی اس سے زیادہ مستحکم تسلط وغلبہ کفار کو کسی دارالحرب میں نہیں ہوا۔ اور مسلمانوں کی مراسم اسلام کی ادائیگی محض ان کی اجازت پر ہے' مسلمانوں سے زیادہ عاجز ترین رعایا کوئی نہیں ہے' ہنود کو بھی اس سے زیادہ رسوخ حاصل ہے البتہ رام پورہ' ٹونک' بھوپال وغیرہ (اسلامی ریاستوں) میں باوجود کفار کے ماتحت ہونے کے چونکہ مسلمان نواب کی طرف سے احکام اسلام جاری ہیں' ان کو ''دارالاسلام'' کہہ سکتے ہیں جیسا کہ ردالمختار کی روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ **واللہ اعلم و علمہ احکم**

میں مولانا منت اللہ صاحب کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے ارشادات گرامی کا مذکورہ بالا خلاصہ پیش کر سکا۔ **سبحانک لاعلم لنا الاما علمتنا' انک انت السمیع العلیم۔**

ختم شد

معذرت: مقدمہ انوارالباری کے دونوں حصوں میں صرف ان محدثین کے تذکرے لکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا جن کی علم حدیث میں کوئی تصنیف یا نمایاں درس ہو' تاہم بہت سے قابل ذکر حضرات اس لئے رہ گئے کہ بوقت تالیف ان کے حالات کا علم نہ ہو سکا' کتاب کے دونوں حصے شائع ہو چکے تو بہت سے بزرگوں اور احباب کے خطوط آئے' جس میں باقی ماندہ حضرات کی نشاندہی کی گئی ان میں واقعی بڑے بڑے حضرات ایسے ہیں' جن کے ذکر سے مقدمہ مذکور کا خالی ہونا' طبیعت پر بہت بار ہے' اس لئے ارادہ کیا ہے کہ ایسے حضرات کا ذکر کسی جلد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر کے پورا کیا جائے گا' یا حجم زیادہ ہونے کی صورت میں ایک جلد ہی مستقل شائع کر دی جائیگی۔

جن حضرات نے ایسے محدثین کے حالات ناقص بھیجے ہیں وہ کسی وقت ان کی تکمیل بھی فرما دیں میں ان سب حضرات کی توجہ وکرم کا نہایت ممنون ہوں کہ میری کوتاہی پر متنبہ کیا۔ **وعند اللہ فی ذاک الجزاء**'' ''مولف''

مکاتیب گرامی حضرات اکابر وافاضل دامت فیوضہم

''مبارک خواب'' مقدمہ انوار الباری جلد دوم کے آخر میں ایک خواب کا ذکر ہو چکا ہے' جس میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی منامی زیارت وتاثرات کا بیان ہوا ہے' انوار الباری کے افتتاح مبارک پر ایک نہایت مبارک خواب جو ایک مدارسی بزرگ نے دیکھا اور محترم ومخلصم مولانا ذاکر حسن صاحب پھلتی دامت برکاتہم نے لکھ کر' راقم الحروف کو بھیجا' یہاں درج کیا جا رہا ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا' عاجز راقم ان برکات کی اہلیت اپنے اندر نہیں دیکھتا' جو کچھ سامنے ہے' وہ سب محض خدائے تعالیٰ جل ذکرہ کا فضل وانعام ہے' اور صرف بطور تحدیث نعمت ان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکا (و ما بکم من نعمة فمن الله)

پہلا مکتوب

وہ عظیم الشان خوشخبری یہ ہے کہ میرے ایک دوست وشریک حلقہ تفسیر جناب عبد الرشید صاحب نہایت متقی پرہیزگار آدمی ہیں' اگرچہ علوم عربیہ سے عامی ہیں۔ مگر علم وعلماء سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں' آپ کی مؤلفہ کتاب انوار الباری شرح بخاری شریف کے ممبر خریداری بھی ہیں (جن کا نام فہرست مرسلہ میں جا چکا ہے' اور احقر کی ترغیب پر ممبر بنانے کے لیے بڑے ساعی ہیں چنانچہ کئی ممبر وہ اپنے حلقہ احباب سے بنا چکے ہیں) اس اثناء میں جب کہ بندہ کتاب مذکورہ کی جلدوں کی پیشگی قیمت وصول کرنے کی تحریک کر رہا تھا اور وہ ممبر سازی میں ساعی تھے' انہوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا ہے جو اگرچہ دلیل قطعی نہیں مگر انوار الباری کی مقبولیت عند اللہ کے قرائن میں سے ضرور ہے۔

رویاء صالحہ کی کیفیت یہ ہے کہ نماز فجر کے وقت سے ذرا پہلے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ''میں چند ساتھیوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچا اور مسجد نبوی میں جا قیام کیا' اس وقت ٹھیک نماز کا وقت تھا' غالباً نماز عصر کا' میں نے وضوء کی تیاری کی' ہاتھ میں مسواک تھی پشت قبلہ کی طرف تھی اور سامنے حوض تھا جس کے کنارہ پر ایک بزرگ ہستی مسواک لیے ہوئے وضو کر رہے تھے' اسی وقت کچھ لوگوں نے مجھ سے باہر چلنے پر اصرار کیا اور میں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ نماز کا وقت ہے اور کہا کہ سامنے یہ جو بزرگ شخصیت ہے' وہ ہمارے آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اتنا سننا تھا کہ وہ حضرت میری نظروں سے غائب ہو گئے' پھر دیکھا کہ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس میں انوار الباری کے ممبروں کی فہرست تھی اور میں مسجد کے راستے میں تھا مسجد کے راستہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ یہ میری دوسری نظر تھی' حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ فہرست مجھ سے طلب فرمائی' میں نے پیش کر دی۔ ساتھ ہی کتاب کا ایڈریس بھی دیا' پھر دیکھا کہ ہم نماز سے فارغ ہوئے تو ایک اعرابی مجھے مہمان بنا کر اپنے گھر لے گیا' جہاں بہت سی پوشاک لٹکی ہوئی تھیں انہوں نے مجھے سو روپیہ بھی دیئے' میں نے لیے پھر نہ معلوم کیوں میں روپیہ واپس کرنے گیا (غالباً اس خیال سے کہ ان کو تکلیف دینا مناسب نہیں) تو انہوں نے صرف آدھی رقم مجھ سے یہ کہہ کر لے لی کہ میں مسجد ہی میں پہچان گیا تھا کہ تم پریشان حال ہو انتہیٰ بلفظہ واضح ہو کہ یہ صاحب پہلے بھی کئی بار زیارۃ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو چکے ہیں' اس منام میں انوار الباری کے ممبروں کی فہرست طلب فرمانا ممبران کے لیے عموماً اور جناب کی مؤلفہ کتاب کے لیے خصوصاً مقبولیت بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرائن ہیں اور یہ وہ بشارت ہے' جس پر آپ جس قدر بھی خوشی محسوس فرمائیں کم ہے' دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔ احقر ذاکر حسن عفی عنہ

دوسرا مکتوب گرامی

آج صبح ایک لفافہ مشتمل بر بشارۃ عظمیٰ لکھ چکا ہوں جس میں ایک گوشہ رہ گیا تھا' شام کو صاحب رویاء سے مل کر اس کی تشریح دریافت کی' اور اطلاع کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں وہ یہ کہ رائی نے دیکھا کہ حضور نے فہرست طلب فرمائی اور ایڈریس بھی' میں نے فہرست مع ایڈریس پیش کی' اس ایڈریس (پتہ) سے مراد آپ کا پتہ ہے یعنی کتاب انوار الباری ملنے کا پتہ بھی حضور نے طلب فرمایا پس مبارک ہو اور پھر مبارک ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گویا آپ سے یہ کتاب طلب فرمانا چاہتے ہیں اور کتاب ملنے کا پتہ طلب فرمارہے ہیں' اور بندہ نے کتاب کا پتہ آپ کے اسم گرامی کے ساتھ سب کو دیا ہے نہ صرف مکتبہ کا' کیا اس تصریح کے بعد بھی آپ کی خدمات اور انوار الباری کی قبولیت بارگاہ نبوی میں کوئی ریب باقی رہ سکتا ہے۔ پس کمر ہمت باندھیں اور عوائق و موانع سے مقابلہ کی ٹھان کر اس کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کا عزم بالجزم کریں اور یقین کریں کہ ان شاء اللہ آپ کی یہ خدمت آپ کو دنیا اور آخرۃ میں نافع اور تجارۃ لن تبور ثابت ہوگی احقر ذاکر حسن عفی عنہ۔

مکتوب گرامی حضرت شیخ الحدیث مولانا العلام محمد زکریا سہارنپوری رحمہ اللہ

چند روز ہوئے ہدیہ سینہ مرسلہ سامی ایسے وقت پہنچا کہ میں اس وقت بہت مشغول تھا' مگر اس کے باوجود اس کی مجمل نظر اور ورق گردانی تو اسی وقت شروع کر دی تھی' دوسرے ہی دن رسید و شکریہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر حضرت اقدس رائپوری کے سفر پاکستان کی وجہ سے بے ارادہ رائپور جانا پڑ گیا' اس لیے عریضہ میں تاخیر ہوئی حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل و کرم سے دارین میں اس کی جزائے خیر اپنے شایان شان عطا فرمائے اور اس کے ذریعے سے دین و دنیا کے منافع سے تمتع عطا فرمائے' سرسری نظر میں جتنی اب تک دیکھی اس میں تو صرف ایک ہی چیز گراں ہوئی' اس میں کوئی مبالغہ یا تصنع نہیں ہے کہ اس ناکارہ کا ذکر اس میں بے محل تھا' نیز یہ بھی درخواست ہے کہ آئندہ جلدوں میں ہدایا کا سلسلہ ختم فرما کر ہر جلد بے تکلف قیمتاً ارسال فرمادیا کریں کہ اس طرح ہدایا میں تو اس سلسلہ لمبا ہو جائے گا۔ اور اس ناکارہ کو قیمتاً خریدنا بار نہیں ہے۔ (زکریا مظاہر علوم ۲۹ ذیعقدہ ۸۱ھ)

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا المفتی سید محمد مہدی حسن شاہ جہانپوری رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست آخر آمد زپس پردۂ تقدیر ید ید

محترم بندہ زادت افاداتہم' عرصہ سے دل و دماغ میں یہ امر جاگزیں تھا کہ اردو زبان میں حدیث کی کسی کتاب کی خصوصاً صحیح بخاری کی شرح حنفی مکتب خیال کی طرف سے ہوتی تو بہت ہی مفید ہوتی' کتب متداولہ حدیث کے ترجمے اور شروح اردو میں دوسرے حضرات نے کئے ہیں جو آج موجود ہیں' لیکن پھر ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ کرتا۔ قابل صد مبارکباد ہیں۔

کہ آپ نے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کی سعی فرمائی' اور صحیح بخاری جیسی اہم کتاب کی اردو میں شرح لکھنی شروع کی خصوصاً امام العصر حضرت رئیس المحدثین فی عصرہ مولانا السید انور شاہ صاحب قدس سرہ کے افادات کو پیش کرنے کا قصد فرمایا ہے تا کہ مجھ جیسے نااہل طلبا کو بھی استفادہ کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے' خدائے وحدہ لاشریک کا شکر ہے کہ آپ نے انوار الباری شرح صحیح البخاری کا مقدمہ جو دو حصوں میں پیش کیا ہے اور جو اس میں کاوش کی ہے اس کی داد نہ دینا مستقل ظلم ہے' برسہا برس سے جو امور زاویہ خمول اور پردۂ گمنامی میں پڑے تھے یا ڈال دیے گئے تھے' ان سے پردہ ہٹا دیا ہے' مقدمہ کے دونوں حصوں کو پڑھا اور زبان سے یہ نکلتا رہا ہے ع "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" دونوں حصوں میں علم فقہ

وحدیث اور فقہا ومحدثین خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اوران کے تلامذہ اور تدوین فقہ اور حدیث دانی کی مکمل ومختصر تاریخ پیش کردی اور بڑی جانکاہی اور کاوش سے ان امور سے پردہ اٹھادیا جواب تک پردہ خفا میں تھے مقدمہ بہت قیمتی اور بیش بہا معلومات پر مشتمل ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ مقدمہ اردودان طبقہ کے لیے ہی نہیں بلکہ طلبائے علم حدیث اور علماء کے لیے بھی مفید اور نادر تحفہ ہے اب تک امام صاحب اوران کے تلامذہ اور حنفی مذہب کے خلاف اوراہل الرائے ہونے کا جو پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے' اس مقدمہ نے اس کی اصلی صورت پیش کردی اوراس کے پردوں کو چاک کردیا' شواہد ونظائر پیش کر کے ان توہمات وشبہات اوراعتراضات کو دور کردیا' جن پر اغیار نے بنیادیں کھڑی کررکھی ہیں۔ جزاکم اللہ عنا و عن جمیع الاحناف دلی مسرت ومبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہو کہ انوارالباری کی تکمیل اسی کوشش وکاوش کے ساتھ ہوجائے کہ علمی طبقہ اس سے مستفید ہو' آمین۔ مقدمہ نایاب تحفہ ہے اور کافی مواد کا جامع' اوہام کا دافع اوراعتراض وغلط پروپیگنڈے کا قاطع وقالع ہے' مسلسل بیماری کی حالت آپ نے دیکھی ہے' انہیں امراض میں مبتلا ہوں' پھر بھی مقدمہ کو پڑھتا رہا اور مستفید ہوتا رہا۔ والسلام۔

سید مهدی حسن مفتی دار العلوم دیو بند

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا المفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ

کرم فرما محترم مولانا احمد رضا صاحب دام فضلہ'

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی قرین عافیت ہوگا' سب سے پہلے تو یہ معذرت پیش کرنا ہے کہ آپ کے دوگرامی نامے اس عرصہ میں وصول ہوئے ہیں کسی کا بھی جواب نہ دے سکا کیونکہ سرسری دیکھ کر کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھا' تفصیلی مطالعہ کے انتظار وفرصت میں وقت گذرتا رہا اب کچھ وقت ملا تو سطور ذیل لکھ رہا ہوں۔

انوارالباری شرح اردو صحیح بخاری کا پہلے اشتہار نظر پڑا اس کا شاندار مقدمہ جلد اول مرسلہ آں محترم پہنچا' اشتہار دیکھ کر ایسی مسرت ہوئی کہ جیسے کسی کی دیرینہ آرزو پوری ہوجائے' میرے نزدیک یہ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ صحیح بخاری کی شرح معتدل اور مناسب انداز میں اردو زبان میں آجائے' استاذ محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ نے اپنے آخری درس بخاری کی تقریر کو بڑے اہتمام سے ضبط کرا کر اوراس پر نظر ثانی فرما کر اسی مقصد کے لیے تیار کرایا تھا کہ اس کے ذریعہ ایک حد تک یہ مقصد پورا ہوسکے گا' مگر افسوس کہ وہ مسودہ ہی باہمی اختلافات کی نذر ہوکر رہ گیا۔

آپ نے اس کام کو شروع کیا' حضرت استاذ العلامہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے آپ کی خصوصیت اور مجلس علمی کی خدمات پہلے سے معلوم تھیں اس لیے بہت ہی مسرت ہوئی کہ یہ کام باحسن اسلوب انجام پاجائے گا اور دعا ہے کہ حسب مراد نافع ومقبول صورت میں انجام پائے' مقدمہ کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں آپ نے ماشاءاللہ کافی محنت کر کے معلومات کا بہت بڑا مواد کتب حدیث سے جمع فرمادیا ہے۔

دوسرے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا:۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ پھر مقدمہ انوارالباری جلد ثانی وصول ہوئی ابھی تک تفصیلی مطالعہ کا وقت نہیں ملا' سرسری انداز میں نظر ڈالی ماشاءاللہ ہر حیثیت سے بہتر نظر آئی' آپ نے بڑی محنت شاقہ برداشت فرمائی' اللہ تعالیٰ جزاخیر عطا فرمائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر اس پر مرکوز رہے کہ اس زمانے کا فتنہ اہل حدیث نہیں بلکہ منکرین حدیث ہیں اساطین امت اکابر محدثین کو کسی ایسے انداز سے پیش کرنا جس کی بناء پر منکرین حدیث کو نفس حدیث پر جرح کرنے میں بہانہ مل جائے' اس تصنیف میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت کا سب سے بڑا خطرہ اہلحدیث کی

مخالفت اور حنفیت پر اعتراض کو سمجھ کر اسی کی مدافعت پر زور دیا گیا ہے حالانکہ اس وقت دنیائے اسلام کو دوسرے فتنوں نے گھیر رکھا ہے، ہمارے کسی حرف سے ان فتنوں کو سہارا ملنا ایک مصیبت ہے، بس اس کا خیال ہر قدم پر رکھا جائے، نفس حدیث کی خدمت اس کے ذریعے موجودہ دور کے فتنوں کی مدافعت کو بحث وتحقیق کا اصل محور قرار دینا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق مزید عطا فرمائے، یہ ناکارہ خلائق تو اب کسی کام کا رہا نہیں، آپ حضرات کی مساعی جمیلہ کو دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔

والسلام بندہ محمد شفیع عفاعنہ ۲۹، ۱۱، ۸۱ھ

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا ابوالوفا افغانی مدیر احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن

زبدۃ الخلان واخلص الاخوان سیادت مآب مولانا سید احمد رضا صاحب دام مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۵ ذی الحجہ کو مکتوب مبارک شرف صدور لایا موجب مسرت ہوا، اس کے قبل مقدمہ انوار الباری کا حصہ ثانیہ بھی وصول ہوا، دیکھ کر آنکھوں کے لیے نور و دل کے لیے سرور ہوا و ای سرور لا یمکن تعبیرہ سچ ہے کم ترک الاول للآخر جلد اول کے مطالعہ سے میں فارغ ہوا، طباعت کی غلطیوں پر نشانات کرتا گیا، نیز جہاں کچھ کلام تھا، اس پر بھی نشانات کرتا گیا، لیکن اب فرصت بھی کہاں کہ دوبارہ مراجعت کرکے اپنے تاثرات کی اطلاع دے سکوں، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ صرف آپ ہی کے لیے مقدر کہ اتنا کام کیا، اس کے قبل کسی بڑے سے بڑے عالم سے نہ ہوسکا البتہ تراجم کی ترتیب جیسے چاہئے نہ ہوسکی، مکررات بھی ہوئے، اگرچہ اس کے بھی وجوہات ہیں، لیکن حروف معجم یا طبقات پر اسماء کو مرتب کرنا چاہئے تھا، دوسرے حصہ کا مطالعہ تو ابھی شروع نہیں کیا، کیونکہ مواقع موجود ہیں، لیکن نشان زدہ مقامات کے کئی تراجم کا مطالعہ کر چکا ہوں، بخاریؒ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے زائد لکھنے کا حق تھا، جو بھی لکھا ہے بہت ہی احتیاط سے لکھا ہے، ہاں ان ہی بزرگوں کی وجہ سے ہم کو ہمیشہ شکست ہی ہوتی رہی، ان کو تو گالیاں سننے ہی میں مزہ آتا ہے اور السن بالسن و الجروح قصاص کو بھول گئے ہیں، آپ سے کوئی تیزی نہیں ہوئی قال ابو عبد اللہ خالف رسول اللہ واجاز الخداع بین المسلمین دیکھ کر سر نیچے کرکے گزرنے سے ہی تیزی دفع ہوتی ہے اور بخاری کے متعلق کچھ نہ کہنا چاہئے کیونکہ وہ تو معصوم ہیں، آپ تو بہت سے واقعات سے چشم پوشی کرکے گذر گئے، سحقاً سحقاً کی روایت تو کی ہی نہیں، نہ اس کا ذکر آیا، بخارا سے اخراج کے کیا اسباب تھے، اس کا بھی ذکر کہاں کیا، نسائی سے امام صاحب کی روایت کے اخراج کا قیاس صحیح نہیں، سنن کے رواۃ کے اختلاف کی بناء پر ایسا ہوا ہے، ابوعلی السیوطی اور مغاربہ کی روایت میں امام صاحب کی روایت ہے، حمزہ بن سنی اور ابن حیوۃ کی روایت میں نہیں، رواۃ کتاب کی وجہ سے زیادتی کمی کتب میں ہوا ہی کرتی ہے۔ موطا کو لیجئے، سنن ابوداؤد کو لیجئے، ضرورت اس کی ہے کہ متعدد نسخ کو جمع کرکے اختلافات جمع کرکے اس کی اشاعت ہونا چاہئے تو تمام روایات ظہور میں آجاتی ہیں، جیسے بخاری و ابوداؤد کے لیے اہتمام کیا گیا ہے، ابن تیمیہ کے متعلق بھی آپ نے بہت ہی نرمی سے کام لیا ہے، مولوی نذیر حسین دہلوی کو ترکی حکومت کی جانب سے مکہ مکرمہ میں تائب کیا گیا اور انہوں نے اقرار کیا کہ میں حنفی ہوں اس کا ذکر بھی کرنا چاہئے تھا، توبہ نامہ اسی وقت ان کے دستخط سے مکہ میں شائع ہوا تھا، نیز شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے متعلق بھی بہت کم لکھا گیا، حنفی مذہب پر جتنی ان کی کاری ضربیں ہیں کچھ کم نہیں، کیا مولانا اسماعیل دہلوی حنفی تھے، ان کے اقوال وافعال حنفیت کی ضد کے حامل نہیں؟ نہ معلوم ان کی حنفیت کی کون سی دلیل موجود ہے؟ پشاور کے علماء سے ان کی حنفیت کی تصدیق کرانا چاہئے، مولوی نذیر حسین کا قول ہدایہ پڑھاتے وقت وہ ابوحنیفہ کو گولی لگی وہ ابویوسف کو وہ محمد کو وہ زفر کو، مالک کو شافعی کو گولی لگی سن کر ان بعض بزرگوں کو بڑی خوشی ہوئی ہوگی، صدیق حسن نے تو احناف کے گھر پر قبضہ کرکے ان کے مال سے ان کے خلاف اس میں دکان لگائی تھی، لیکن اللہ جل شانہ کے فیصلوں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، ایسا مٹا دیا کہ لاکھوں روپیہ جو صرف ہوئے تھے دریا برد ہوگئے کانہ لم یکن شیئا

مذکورا۔غرضیکہ آپ نے جو بھی کچھ لکھا ہے حق لکھا ہے، اس میں کسی کی پروانہیں کرنا چاہئے، زبانی جمع وخرچ مجالس میں رہ جائے گا، اور آپ کی کتاب صدیوں یادگار زمانہ ہوگی، ان شاء اللہ یہ فضیلت آپ ہی کے لیے لکھی گئی تھی ع ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں، احناف بزرگوں کو صدیوں سے گالیاں کھاتے کھاتے سننے کی عادت ہوگئی، اس میں لذت محسوس کرتے ہیں اس لیے ان کو ناگوار ہے کہ سب وشتم کرنے والے کو دبی زبان سے بھی جواب دیا جائے، منکرین حدیث تو اس سے پہلے بھی آپ کے جوابات دینے سے فائدہ اٹھائے ہوئے ہیں آپ کے اقوال کو پیش کرتے رہتے ہیں اس کا کیا جواب ہے کوئی نئی بات نہیں، مسلم نے بخاری کے متعلق کیسے الفاظ استعمال کئے ہیں، حاکم نے تو دونوں پر ایسا مواخذہ کیا کہ ایک بڑی کتاب ہی ان کی فروگذاشت میں لکھ ڈالی، ابوحاتم نے تو بخاری کی تاریخ پر تاریخ اس لیے مرتب کی کہ اس میں ان کی غلطیاں اور فروگذاشتیں بتلائیں، ان پر کیوں نگاہ نہیں ہوئی پھر فقہاء احناف ہمیشہ ان کی تردیدیں کرتے ہی رہے ہیں، ابوبکر رازی، ابوبکر سرخسی، ابوالحسین قدوری، عینی ابن ہمام، امیر کاتب اتقانی اگر منکرین حدیث ان کے اقوال سے استدلال کریں تو اس کا کیا جواب ہوگا، خود امام احمد رحمہ اللہ نے امام مالک واہل مدینہ پر کچھ کم نہیں لکھا، پھر امام شافعی نے کیا کمی کی، ابن حزم نے کسے چھوڑا، احناف نے تو اب تک مدافعت ہی کی ہے۔

حالانکہ کتب رجال ان کے ہاتھ میں ہیں۔اس سے لے کر خود ان کی گالی کا رخ ان ہی طرف پھیرنا چاہئے تھا، جارحانہ کارروائی ان کی جانب سے ہو تو سر تسلیم خم ہے لیکن ہمارے جانب سے گناہ کبیرہ ہے میں اب دوسری جلد کا تھوڑا تھوڑا مطالعہ کروں گا اس کے بعد لکھوں گا، لیکن اب بھی فہرست کو دیکھ کر بہت سے مقامات کا مطالعہ کر چکا ہوں، آپ نے کہیں بھی تجاوز نہیں کیا، یہ اللہ کا فضل ہے آپ پر اور حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا فیض صحبت ہے۔ابوالوفا

تبصرۂ گرامی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

جیسا کہ اس کتاب کی جلد اول کے تعارف میں ان صفحات میں آچکا ہے، اصل کتاب صحیح بخاری کی شرح انوارالباری ہے جو حافظ حدیث علامہ شیخ انور کاشمیری دیوبندی کے افادات کا مجموعہ ہوگی اور یہ ابھی اس کا مفصل دلچسپ اور بصیرت افروز مقدمہ ہے جو دوسری جلد میں ختم ہوا ہے، اور اس میں علاوہ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی وغیرہ ائمہ حدیث کے چھوٹے بڑوں پچاسوں (بلکہ شاید سینکڑوں، علمائے حدیث کا تذکرہ آ گیا ہے کتاب کے مرتب مولانا بجنوری علاوہ اپنے جلالت علم کے بڑے اچھے اہل قلم بھی ہیں اس لیے سارے فنی مباحث کے باوجود ان کے بیان میں خشکی کہیں سے نہیں آنے پائی ہے اور کتاب طلبہ فن اور عام شائقین دونوں کے ہاتھوں میں جانے کے قابل ہے۔

ایک بڑی اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ ان کے قلم میں توازن ہے وہ احترام ائمہ حدیث وائمہ فقہ دونوں کا پورا ملحوظ رکھتے ہیں اور پھر بھی ان میں سے کسی کی بھی عصمت ومعصومیت کے قائل نہیں "سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی معصوم عن الخطاء نہیں، ائمہ صحاح وائمہ متبوعین کو بھی معصوم نہیں کہہ سکتے" (صفحہ ۲/۴۷)

اس مضمون کے فقرے جابجا ملتے ہیں، اور فاضل مرتب نے اسے عملاً بھی خوب بنایا ہے، اس دور میں حدیث کی یہ خدمت حدیث ہی کی نہیں، بلکہ کل علم دین کی ایک اہم وقابل قدر خدمت ہے۔

مکتوب گرامی جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی (صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

محب محترم ومکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل قاری رضوان اللہ صاحب سے انوارالباری کا حصہ دوم آپ کے والا نامہ کے ساتھ موصول ہوا، فرط اشتیاق میں اسی وقت ادھر ادھر سے پڑھنا شروع کیا، جی باغ باغ ہوگیا، خدا آپ کو خوش رکھے، ماشاء اللہ خوب کام کر رہے ہیں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی شاگردی اور ذات

گرامی کے ساتھ شرف انتساب کا حق ادا کردیا۔ ''ایں کارازتو آید ومرداں چنیں کنند''

جی ہاں! واقعی تبصرہ میں کافی دیر ہوگئی' میں خود بھی شرمسار ہوں' مگر اول تو کتب برائے تبصرہ کا انبار اس کا عام سبب ہے اور دوسری خاص وجہ یہ ہے کہ میں اس کتاب کے بعض مباحث اور خصوصاً امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں امام بخاری کی ناانصافیوں اور ان پر آپ کے تبصرہ پر خالص علمی رنگ میں کسی قدر تفصیل سے کلام کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکا ہوں' کیونکہ سرکاری اور دفتری گوناگوں مصروفیتوں کے علاوہ اپنی ایک ضخیم کتاب کی تالیف وتسوید میں بھی مشغول ہوں' بہرحال اب زیادہ تاخیر نہ ہوگی' یا تو مئی کے برہان میں ورنہ جون میں یقیناً دونوں حصوں پر ایک ساتھ تبصرہ آجائے گا۔

آپ نے غالباً ابن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ کی کتاب'' **بیان خطاء محمد بن اسماعیل البخاری فی تاریخه**''نہیں دیکھی ورنہ امام بخاری کی تاریخ دانی پر تبصرہ میں اس سے بھی کافی مدد مل سکتی تھی' یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں آپ نے اس نابکار وسیاہ اعمال کا بھی تذکرہ فرمایا ہے' اپنی علمی اور عملی ہیچ میرزی کے باعث اس آفتاب علم وطہارت نفس سے اپنی نسبت کا اعلان کرتے ہوئے سخت ندامت اور شرم محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ یقین کیجئے' جب میں نے اپنی نسبت آپ کی سطور پڑھیں تو شرم سے پانی ہوہوگیا۔ **وفقنا الله لما یحبه و یرضاه**

والسلام:۔ مخلص سعید احمد ۱۹ اپریل ۶۲ء

مکتوب گرامی محترم مولانا عزیز احمد صاحب بہاری دامت فیوضہم

استاد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اس دفعہ طباعت وکتابت' کاغذ' تصحیح کا ماشاء اللہ اچھا اہتمام رہا' مضامین تو ماشاء اللہ نور علی نور بہت ہی دلپسند ہیں اور طرز بہت اچھا ہے۔ دفاع عن الحنفیہ نہایت ہی ابلغ اور اوضح پیرایہ میں ہے' ادب واحترام کا لحاظ تو بہت ہی قابل داد ہے' الامن ظلم والی صورت سے استفادہ کیا جاسکتا تھا' مگر اللہ تعالےٰ نے بڑی ہی نوازش فرمائی ہے کہ قلم بے باک نہیں ہوا' واقعۃً ہر حیثیت سے محنت اور کتاب مستحق صدستائش ہے۔ والسلام عزیز احمد غفرلہٗ۔

مکتوب گرامی محترم مولانا امتیاز علی صاحب عرشی رضا لائبریری رامپور

صدیق مکرم ومحترم' علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مقدمہ انوار الباری کا تحفۂ ثمینہ اور دو کرم نامہ مل چکے ہیں' میں نے مقدمہ کو از اول تا آخر پڑھ بھی لیا ہے اس میں دو تین جگہ نشان بھی بنائے ہیں ان شاءاللہ ذرا فرصت ملے تو لکھوں گا۔

مجموعی طور پر آپ نے بے حد دلسوزی اور تحقیق سے کام کیا ہے' جی چاہتا ہے کہ انوار الباری کو دیکھنے کی بھی سعادت نصیب ہوجائے۔

کاش! امام طحاوی کے بعد بھی احناف نے احادیث پر کام کیا ہوتا' اور مشکوٰۃ سے پہلے کوئی کتاب استعمال میں آنے لگی ہوتی' اب بہت دیر میں ہمیں' ادھر توجہ ہوئی ہے' بہرحال ابھی وقت بہت ہے' خدا آپ کو صحت عطا فرمائے اور فراغ خاطر بھی۔ والسلام۔ مخلص عرشی۔

مکتوب گرامی محترم مولانا محمد ایوب صاحب قادری رحمۃ اللہ

جناب محترم مولانا محمد عبدالرشید نعمانی صاحب کے یہاں بخاری کا مقدمہ دو جلدوں میں دیکھا بے اختیار زبان سے تحسین وآفریں کی صدا نکلی' اللہ تعالےٰ آپ کو دارین میں جزائے خیر دے' اور آپ کے مراتب بلند فرمائے۔ خاکسار کی کتاب (ترجمہ تذکرہ علماء ہند) کے جو اکثر

جگہ حوالے ہیں' اس کے لیے دل سے شکر گذار ہوں میں خواہش مند ہوں کہ اس کی دونوں جلدیں انتہائی رعائتی قیمت پر مجھے بھیج دی جائیں۔ پاکستان میں قیمت ادا کردوں گا۔امید ہے کہ جواب سے مشرف فرمایا جاؤں۔

فقط والسلام:۔خاکسار محمد ایوب قادری کراچی نمبر ۵ ۱۳۱ اگست ۱۹۶۲ء۔

مکتوب گرامی شیخ التفسیر مولانا ذاکر حسن صاحب پھلتی بنگلور (مدارس) دام فضلہم و فیوضہم

مقدمہ انوارالباری ہر دو جلد بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد میرے قلبی تاثرات حسب ذیل ہیں۔

۱۔تدوین فقہ کے وقت امام اعظمؒ کے پاس ذخیرہ حدیث کی قلت کے گمان کی تردید کس قدر واضح طور پر سیدنا امام بخاری کے ان حالات میں اس حقیقت سے ہورہی ہے کہ انہوں نے طلب علم حدیث میں متعدد بلاد کا متعدد مرتبہ سفر کیا لیکن کوفہ اور بغداد کا سفر اتنی بار فرمایا جس کی کوئی تعداد معین نہیں ہوسکی' یہ اس امر کی بین شہادت ہے کہ امام بخاری کے وجود سے پہلے ہی عراق مرکز علم حدیث بن چکا تھا اور یہی وہ مرکز ہے جس میں امام اعظم اور آپ کے اصحاب نے فقہ و اصول فقہ کے علوم مدون فرمائے۔

متاخرین کی تضعیف کے بارے میں مقدمہ صفحہ ۲۱/۴ پر جو آپ نے علامہ ابن امیر الحاج کا قول نقل فرمایا ہے وہ درایۃً اور واقعۃً بڑا وزن رکھتا ہے اور اس سے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی حقیقت واضح ہو جاتی' تاریخ حدیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ مذہب اربعہ کی بنیاد صحاح ستہ پر ہر گز نہیں ہے بلکہ اس عظیم ذخیرہ احادیث پر تھی' جس کا کچھ حصہ بروایت صحہ وضعیفہ از متقدمین اصحاب صحاح ستہ کو بھی بعد میں نصیب ہوا' اور کچھ فوت بھی ہوگیا جس کی وجہ سے متاخرین اہل حدیث کو متقدمین سے الگ راہ اختیار کرنی پڑی اور انہوں نے اپنی بساط بھر جو ذخیرہ حدیث جمع کیا تھا اسی پر ان کو اپنے اجتہاد کی اساس قائم کرنی پڑی۔

(۲) آپ کی عمیق تحقیقات سے جلیل القدر محدثین کا محدثین احناف کے ساتھ خطرناک حد تک تعصّبات کا برتاؤ طشت از بام ہوا ہے جو بہت زیادہ قابل تحسین ولائق صد شکر ہے' عوام تو کیا اکثر علماء بھی محدثین کی جلالت سے اس قدر مرعوب ہیں کہ ان کے بعض لچر ملفوظات کو بھی عموماً قبول کرتے رہتے ہیں' اور پھر اپنی مذہبی تحقیقات کے بارے میں متردد ہو جاتے ہیں اس تردد کی جھلک ہندوستان کے بعض بڑے بڑے علماء کی تحریرات میں بھی پائی جاتی ہے' جزاک اللہ کہ آپ نے اس تردد کے رفع ہو جانے کا پورا سامان اس طرح مہیا فرمادیا ہے' امیر المومنین فی الحدیث علامہ ابن مبارکؒ کا تلمذ امام اعظمؒ سے اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ کوئی عالم حدیث اس سے ناواقف نہیں رہ سکتا اس کے باوجود ترجمہ ابن مبارکؒ مندرجہ تہذیب میں ان کا اس سے سکوت لاعلمی پر کسی طرح بھی محمول نہیں کیا جاسکتا جب کہ وہ مسلم ماہر علم اسماء رجال ہیں' پھر ان کا یہ سکوت جس امر کی غمازی کررہا ہے اس کو زبان قلم پر لایا نہیں جاسکتا ہر شخص خود اپنے ضمیر سے دریافت کرسکتا ہے۔

۳۔مقدمہ صفحہ ۲/۱۶ پر مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی کی یہ لغزش کہ انہوں نے تعلیقات بخاریؒ کو ایسے عظیم ذخیرہ سے ماخوذ بتایا جس میں سے بعض ذخائر کا وجود بھی امام بخاری کے زمانے میں نہ تھا' بڑی عجیب بات ہے' شاید وہ مدعی سست گواہ چست والا مقولہ ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا ہے۔

۴۔تاریخ کبیر میں سیدنا امام بخاری کے قول دربارہ ارجاء امام اعظمؒ ومسکت الناس عنه و عن رائيه و حديثه۔کو علامہ کوثری کے جوابات نے ہباءً منثورا کردیا ہے اور آپ کے نقد کا لہجہ اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک تیز ہو لیکن احقر اس میں آپ کو بالکل معذور سمجھتا ہے کیونکہ ان کا یہ قول واقعہ کے بالکل خلاف ہے' جب کہ امت کا دوثلث حصہ ان کے فقہ کو تسلیم کرتا ہے اور سینکڑوں اولیاء کرامؒ نے من جانب اللہ حق مانا ہے' شاید سیدنا امام بخاریؒ کے تنقیح کردہ شرائط ان کے ذہن میں روایت عن الرسول تک محدود تھے باقی افراد امت کے بارہ میں وہ ہر کہ ومہ کی روایت قبول کرنا جائز خیال فرماتے ہوں گے مگر یہ اصول محل نظر ہے جب کہ قرآنی آیت کریمہ يايها الذين امنوا ان جاء کم فاسق

بنباء فتبینوا الایة۔ یہ سب کے نزدیک اپنے عموم پر ہے واقعی بلامرعوبیت و برعایت حسن ادب' ان حقائق کو آپ نے درج فرما کر ہم جیسوں کم علموں پر بڑا احسان فرمایا ہے ان تحقیقات کو پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر طویل وتوفیق کار ہائے جلیل عطا فرمائے۔

۵- جہمیہ کی اتالیقی اور اسمٰعیل بن عرعرہ کی روایت از امام اعظمؒ اور پھر ان سے امام اعظمؒ کی تضعیف و تنقیص اور جہمیت مفروضہ پر استدلال جو تاریخ صغیر کے محترم مؤلفؒ نے اختیار فرمایا ہے تحقیق وریسرچ کا وہ عجیب شاہکار ہے' جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ تار عنکبوت بھی شاید اس سے زیادہ قوی ہو' حمیدی کی روایت متعلق سنن حجامت کا جواب علامہ کوثریؒ نے اور روایت سفیان بطریق نعیم بن حماد کا جواب آپ نے خوب دیا ہے۔ کتاب الضعفاء الصغیر میں تضعیف امام ابویوسفؒ کا جواب آپ نے خوب دیا ہے' عقل حیران ہے کہ ایسے جلیل القدر محدثین کے ان مسامحات کی آخر کیا تاویل کی جائے' ایسے ہی شیخ حمیدی کے الزامات کی حقیقت جو آپ نے واضح فرمائی ہے۔ جزء القراءۃ خلف الامام میں حضرت امام اعظمؒ پر بے بنیاد الزامات دربارہ جواز خزیر بحری وریی السیف علی الامۃ کے لئے حقیقت الزام کا جو جواب آپ نے دیا ہے بڑا مسکت ہے' جزء رفع الیدین میں اڑتے والی روایت از ابن مبارکؒ کے مزاحیہ واقعہ کو استدلال میں پیش کرنا اور وہ بھی ایسے مسلم امام امت کی ضلالت پر' نعوذ باللہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح حبک الشیء یعمی ویصم۔ صحیح ہے اسی طرح بغضک الشیء یعمی ویصم۔ بھی امر واقعی ہے۔

غرض ترجمہ سیدنا امام بخاری کے ذیل میں آپ نے بڑے غور وفکر اور تدبر سے کام لیا ہے اور دفاع عن الاحناف کا حق ادا کر دیا ہے' این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

۶- مقدمہ صفحہ ۲/۳۰ اور اس کے بعد کے صفحات میں آپ نے جو حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات ذکر فرمائے ہیں بہت ہی قیمتی ہیں جن سے سیدنا امام بخاریؒ کے بارے میں بڑی بصیرت حاصل ہوئی' اوہام امام بخاریؒ کے عنوان میں بہت سے حقائق کا انکشاف ہوا' جن تک ہم جیسے ناکارہ لوگوں کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کیونکہ اگر ان پر غور کا ارادہ بھی کیا جائے تو حضرت امام بخاری کا تقدس جو ہم سب کے قلوب میں راسخ ہو چکا ہے مانع ...... ہے' مگر حقیقت پھر حقیقت ہے' جس کو واضح ہونا ہی چاہئے۔ سیدنا امام بخاریؒ اور ائمہ متبوعین کے درمیان جو فرق مراتب ہے گو وہ محققین کے نزدیک ظاہر ہے لیکن عوام پر بالکل مخفی ہے اچھا ہوا کہ آپ نے اس کی خوب وضاحت فرما دی' اوہام امام بخاریؒ کا ذکر اور پھر اس پر آپ کا محاکمہ دونوں اہم اور قابل لحاظ دلائق مطالعہ ہیں۔

۷- مقدمہ صفحہ ۲/ ۴۷' ۴۸ پر جو آپ نے چند ضروری امور کی تنقیح نہایت مختصر طور پر کر دی ہے' وہ بڑی ضروری تھی' مثلاً علو احادیث بخاری پر دیگر احادیث پر ان صلاح کے دعوے کی رکاکت اور دعوائے قطعیت احادیث بخاری کی حقیقت وغیرہ۔

۸- امام طحاویؒ کی غباوۃ پر جو روایت عموماً دیکھی گئی ہے۔ آپ نے اس کی خوب قلعی کھول دی ہے اور ان کا اپنے ماموں سے ترک تلمذ اور شیخ کی طرف رجوع کی اصل وجہ صحیح تحریر فرما کر اس عظیم مغالطہ کو رفع فرما دیا۔

۹- توافق امام ترمذیؒ بمذہب امام اعظم کی جو چند مثالیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔ وہ احناف کے لئے اطمینان قلبی کا باعث ہیں' لیکن اگر استقصار کر دیا جاتا تو زیادہ مفید تھا' شاید بخوف طوالت چند امثلہ پر اکتفا فرمایا گیا ہے۔

۱۰- امام اعظم کے بارہ میں امام نسائی کی تضعیف کا بڑا دنداں شکن جواب دیا ہے۔

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو!

۱۱- امام محمد بن شجاع ثلجی پر ابن جوزی وابن عدی کے حملوں کا علامہ کوثریؒ نے جو رد فرمایا ہے اس میں واقعی حق دفاع ادا کر دیا ہے۔

۱۲- ابن حزمؒ کی وسعت علمی کا رعب ان کی کتب کے ناظرین پر بہت زبردست پڑتا ہے' لیکن حافظ ذہبیؒ وابن حجرؒ نے اس کی خوب قلعی کھول دی ہے اور ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ نے ان کے تعصب از احناف کو خوب واشگاف فرمایا' جس کے مطالعے کے بعد ان کی متعصبانہ رائے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

۱۳-مقدمہ صفحہ۲/ ۹۷ امام بیہقیؒ کے خلافیات پر جو آپ نے حضرت علامہ کشمیریؒ کا ریمارک تحریر فرمایا ہے اسے دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی بڑا قیمتی ریمارک ہے' یاران عصبیت نے حنفیہ پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں' اللہ اکبر دیکھ کر تعجب وحیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

۱۴--مقدمہ صفحہ۲/ ۱۲۴ پر علامہ ابن تیمیہؒ کے طرز تحقیق واستدلال پر حضرت شاہ صاحبؒ نے جو نقد فرمایا ہے بڑا عجیب ہے تاوقتیکہ ان کے لٹریچر کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے' عام اذہان اس کو نہیں پا سکتے' خصوصاً وہ جو ان کی وسعت علمی سے مرعوب ہوں اس ریمارک اور دوسرے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود بے پایاں وسعت علمی کے ان کی نظر جذباتی زیادہ تھی' جو ایک مجاہد کی شان ہے' لیکن تحقیقی میدان ایک دوسری چیز ہے۔ یہاں معتدل فکر ونظر کی ضرورت ہے' جذباتی رائے کا ہر قول قابل استدلال نہیں ہوتا لیکن ہمارے مہربان غیر مقلدین ان کے ہر قول کو مستدل سمجھتے ہیں اور ہماری تنقید ان کے تمام اقوال کے قابل استناد ہونے نہ ہونے تک ہے' ورنہ ان کی جلالت علمی سبھی کو مسلم ہے' احقر کا خیال ہے کہ علامہ میں جذباتی ابھار بدعات کے بکثرت شیوع کی وجہ سے بطور ردعمل پیدا ہوا ہوگا۔ جس میں آپ معذور تھے' یہ معلوم ہو کر کہ علامہ کے اساتذہ میں جلیل القدر احناف محدثین بھی تھے۔ ان کے مقلدین کے اس طعن پر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ احناف میں محدثین نہیں ہیں' بہرحال علامہؒ کے محاسن ان کی زلات سے زیادہ ہیں' لہٰذا قابل صد احترام اور ان ہستیوں میں سے ہیں جن کا وجود امت کے لئے معتنمات سے شمار ہوتا ہے' رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

۱۵-مقدمہ صفحہ۲ ۱۳۰ پر حافظ ابن قیمؒ کا ترجمہ آپ نے نہایت اعتدال ہے ان کا امام اعظمؒ کی طرف سے دفاع قابل صد شکر ہے زیارۃ قبور وغیرہ مسائل میں امحاء بدعات واستاذ گرامی کی محبت وخدمت کے جذبات میں انہوں نے اپنے استاد کی حمایت فرمائی' لیکن اگر وہ صرف دلائل سے فیصلہ فرماتے تو امت کے لئے بہت بہتر ہوتا' بہرحال ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف ہمارا فرض ہے۔

۱۶-صفحہ۲ ۱۴۴ پر حافظ ابن حجر کے ترجمہ میں طبقہ علماء کو ان کے تعصبات سے آپ نے آگاہ فرما کر بڑا احسان فرمایا ہے کیونکہ آج متداول کتب رجال انہیں کی ہیں' جن پر عموماً اعتماد کیا جاتا ہے ایک شخص کے تعصب مزاجی کی وجہ سے امت کی ایک عظیم جماعت کا گرایا جانا ایسا عظیم مغالطہ ہے جس کی جواب دہی آخرت میں سخت مشکل ہے اور یہ ایک ایسا فتنہ ہے جس کا تدارک سوائے ان کے تعصبات کو اجاگر کرنے کے اور کسی طرح نہیں کیا جاسکتا لیکن اس موقعہ پر آپ کے اختصار نے تشنگی باقی چھوڑ دی' کاش مزید امثلہ دی جاتیں۔

۱۷-صفحہ۲/ ۱۲۹ پر حافظ عینیؒ کے ترجمہ اور ان کی عمدۃ القاری کے مزایا وفضائل سے احقر بہت ہی محظوظ ہوا
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

۱۸-صفحہ۲/ ۱۵۳ پر علامہ قاسم بن قطلو بغا مصریؒ کا ترجمہ جس انداز سے آپ نے کیا ہے' آج تک نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ایسے جلیل القدر محدث سے دوسرے تو کیا خود عامۂ احناف بھی اکثر ناواقف ہیں' ان کی جلالت شان کی شہادت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ کوئی حنفی نہیں بلکہ حنبلی محدث صاحب شذرات نے ان کو حسنات الدہر میں شمار فرمایا ہے۔ **فالحمد للہ و جزاکم اللہ خیراً۔**

۱۹-صفحہ۲/ ۱۷۸ پر محدثین کی صفت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ترجمہ ایک عمدہ اور ضروری اضافہ ہے' جس کا سہرا آپ کے سر ہے ورنہ عموماً لوگ ایک شیخ طریقت کی حیثیت سے آپ کو پہچانتے ہیں اس سلسلہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور مولانا سیالکوٹی کی مخالفت کا اصلی سبب جو آپ نے واضح فرمایا بہت خوب ہے ذکر مخالفت تو سب نے کیا ہے مگر اسباب کی تہہ تک پہنچنے کی بہت کم سعی کی گئی ہے۔

۲۰-صفحہ۲/ ۱۹۳ پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ترجمہ میں ان کی ابتدائی وانتہائی تحقیق کا فصل آپ نے واضح کر کے اس تردد کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے جو ان کی ابتدائی تصانیف عقد الجید وغیرہ کے مطالعہ سے ناظرین کو پیدا ہوتا ہے' واقعی شیخ ابوطاہر کردی کی صحبت وتلمذ کا اثر ان تالیفات میں نمایاں ہے اور ایسا تاثر فطری چیز ہے' لیکن ہر محقق کی آخری رائے ہی قابل اعتماد ہوتی ہے جو فیوض الحرمین نے واضح کر دی ہے اور پھر خود حضرت شاہ صاحب موصوف کی تحریر اکتفی عملاً نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے' آپ کی یہ تلاش وجستجو اور ان کے ترجمہ میں اس کا

اضافہ بڑا قیمتی ہے،جس کی جس قدر بھی قدر کی جائے کم ہے،بندہ اس سے بہت زیادہ محظوظ ہوا۔

۲۱-صفحہ۲/۲۱۲ پر حضرت شاہ عبدالغنی مجددی حنفیؒ کے ترجمہ میں یہ حقیقت آپ نے خوب واشگاف کی کہ مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ جن کی محدثیت کا ڈنکا بجایا جارہا ہے ان کو شیخ الکل حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ سے علم حدیث میں باقاعدہ تلمذ حاصل نہ تھا اوران کی سند برکت تھی نہ اجازت پھر صاحب تحفتہ الاحوذی وغایت المقصود کے ڈھول کا پول کو خوب واضح کیا ہے۔تعجب ہے کہ یہ حضرات عمل بالحدیث کے مدعی ہوکر اس قدر غلط بیانی اور کذب صریح سے کیسے کام لیتے ہیں۔

گرہمیں مکتب وہمیں ملاالخ اور مقدمہ صفحہ۲/۲۲۴ پر خود ان کے ترجمہ میں ان کے اساتذہ کا پتہ خوب دیا ہے نیز ان کی اہل وطن کے خلاف انگریزوں سے وفاداری کا راز بھی معلوم ہوا جس کی تصدیق کمشنر دہلی کا سفارشی خط اور شمس العلماء کا خطاب اور حطام دنیا کا انعام کررہا ہے اور کمال یہ کہ یہ سب بھی خود الحیاۃ بعد المماۃ (سوانح صاحب موصوف) کے مصنف کے قلم سے سبحان اللہ واقعی صاحب موصوف کے یہ کمالات ان کی ولایت ومحدثیت کے ایسے معجزات وخوارق ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔تاہم حضرت امام اعظم کے ساتھ ان کے حسن ادب آج کل کے مدعیان اجتہاد کے لئے قابل صد عبرت ہے۔

۲۲-صفحہ۲/ ۲۵۹ پر علامہ مبارک پوری کے ترجمہ میں ان کی جلالت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے تعصبات کی جو چند مثالیں آپ نے دی ہیں ان سے ان حضرات کے معیار تحقیق کا خوب اندازہ ہوتا ہے ان مثالوں اور دیگر امثلہ کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ واقعی حنفیہ مظلوم ہیں، ظالم ماخوذ اور مظلوم انشاءاللہ منصور ہیں اور ناصر مظلوم ماجور باجر عظیم ہوگا۔

۲۳-صفحہ۲/۲۳۲ پر حضرت علامہ حجتہ اللہ فی الارض انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ کے ترجمہ میں اگرچہ آپ نے ان کی خصوصیات وفضائل دوتین صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن احقر کے نزدیک یہ تذکرہ حضرت والا کی شان تقدس وعلم کو واضح کرنے میں ناکافی ہے، ذرا زیادہ وضاحت فرمادیتے تو بہتر ہوتا۔تاہم تراجم سے جس قدر تعارف کرایا جاسکتا ہے اس کے لئے اس قدر بھی کافی ہے، حقیقۃً حضرت والاؒ کی عظیم شخصیت سے تعارف کرانے کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باہمت بزرگ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔(انوارالباری میں حضرتؒ کے علوم وتحقیقات کا بہ کثرت ذکر اسی کمی کا تدارک کرے گا ان شاءاللہ۔

۲۴-احناف محدثین کا جس قدر آپ نے استقصار فرمایا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔خصوصاً اس سے اور بھی زیادہ مسرت ہوئی کہ اکثر محدثین ہند کا ذکر بلا تفریق وجماعتی تعصب درج فرمایا گیا ہے، بیشک اہل حق کا مسلک بھی یہی ہونا چاہئے کہ تمام اہل کمال کا اعتراف کیا جائے۔**فجزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔**

۲۵-تراجم محدثین کے بالاستیعاب مطالعہ سے ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ بہ نسبت دیگر محدثین کے حنفی محدثین کی اکثریت صاحب زہد وقناعت مشتغل لعبادۃ فائز بمراتب قرب وولایت منقطع عن الدنیا اور راغب الی اللہ تعالیٰ نظر آئی جو جماعت حنفیہ کے لئے باعث صد افتخار ہے اور یہ وہ آثار مبارکہ ہیں جن سے حنفی مسلک کے مقبول عنداللہ ہونے پر استشہاد کیا جاسکتا ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

نوٹ:۔یوں تو مجموعی حیثیت سے جلد ثانی جلد اول کی طرح ساری ہی سینکڑوں عجائب ونوادر علمیہ وتحقیقات عالیہ سے مملو ہے جس کا صحیح اندازہ پورے مطالعہ کے بعد ہر شخص کرسکتا ہے، فقیر نے صرف چند مقامات کے بارہ میں اپنے تاثرات عرض کئے ہیں، ورنہ ایک مستقل رسالہ اس جلد کے محاسن پر لکھا جاسکتا ہے۔

مکتوب گرامی مولانا حکیم محمد یوسف صاحب قاسمی بنارسی دامت فیوضہم

انوارالباری حصہ اول کے بعد حصہ دوم نظر افروز' نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ الحمدللہ جس طرح محاسن ظاہری سے آراستہ ہے اس سے بڑھ کر معنوی خوبیوں کا حامل ہے' مطالعہ سے مجھ ایسے ہیچمدان کو بیش بہا اور گراں قدر فوائد حاصل ہوئے' مولف محترم کے لیے ہر بن مو سے دعا نکلی کہ باری تعالےٰ ان کی حیات نافعہ کو اس خدمت جلیلہ کے لیے باقی رکھے تا کہ یہ خدمت اتمام تک پہنچے' اور اس تالیف کو حسن قبول سے نوازے اور باعث نجات ورفع درجات فرمائے' اور ان کے سینہ کو علوم ومعارف کے لیے کھول دے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اسلاف کرام یعنی ہندی علماء کی خدمات پر جن میں اشاعت متون احادیث و تالیف شروح ہے ہمیشہ فخر کیا ہے' اب تک تمام خدمات عربی یا فارسی زبان میں ہوئی ہیں' قسام ازل نے اردو ایسی شستہ اور مقبول عام زبان میں بخاری شریف کی ایک نہایت ہی محققانہ اور بے نظیر شرح کے لیے (جو متقدمین کی تحقیقات عالیہ اور اکابر متاخرین کے افادات نادرہ پر مشتمل ہوگی ابھی ایک ہندوستانی عالم محبّ محترم حضرت مولانا الحاج سید احمد رضا عافاہ اللہ وابقاہ کو منتخب فرمایا' جو باعث صد ناز وافتخار ہے مقدمہ ہی سے اصل شرح کی افادیت کا اندازہ ہوگا۔

حضرت مصنف تمام احناف کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حنفی مسلک کی تائید وتقویت کے لیے ہمت فرمائی اور قلم اٹھایا ہے' اللہ تعالےٰ ان کے عزم وہمت میں برکت عطا فرمائے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگ اس کی اشاعت میں کوشش کریں تا کہ پوری کتاب جلد از جلد منصۂ شہود پر ظاہر ہو' اس وقت حضرت مؤلف کی یہی قدردانی ہے' نہ صرف زبانی تحسین وتوصیف:

وانا العبد الضعیف

محمد یوسف قاسمی غفرلہٗ

انوار الباری ۴

اردو شرح

صحیح البخاری

بسم الله الرحمٰن الرحيم

مُقَدّمہ

نحمده ونصلي علىٰ رسوله الكريم

مقدمہ انوارالباری کی دوجلدوں میں اکابر محدثین کے حالات وعلمی خدمات کا مختصر تعارف کرایا گیا تھا اور جلد دوم کی ابتداء میں امام بخاریؒ کے حالات ۴۰ صفحات میں دیے گئے ہیں اس کے بعد انوارالباری جلد اول کے شروع میں بھی کچھ تذکرہ ہوا اور اسی کی تکمیل اس وقت پیش نظر ہے ہم کئی بار پوری صراحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ جہاں تک امام بخاریؒ کی فن حدیث میں خذاقت وجلالتِ قدر کا سوال ہے یا ان کی صحیح بخاری کی مزیت وفضیلت دونوں امر بے شک مسلم اور تنقید سے بالاتر ہیں۔

اس مرحلہ سے گزر کر دوسرے امور زیر بحث آتے ہیں اور ہمارے نزدیک جس طرح پہلی دونوں باتوں کو زیر بحث لانا علم وانصاف سے بعید ہے اسی طرح دوسری جوانب سے صرف نظر کرنا بھی علم وتحقیق اور عدل وانصاف کے مقام سے نازل ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ حدیث کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ جہاں وہ معانیِ حدیث اور شرحِ احکام فقہیہ پر سیر حاصل کلام فرماتے تھے رجالِ سند اور محدثین کے صحیح حالات، عادات اور طرز تحقیق وغیرہ پر بھی تبصرہ فرماتے تھے اور اس بارے میں کسی بڑے سے بڑے کی رو رعایت نہیں فرماتے تھے ہماری دانست میں آپ نے اپنے تیس پینتیس سالہ طویل دور درس حدیث میں کسی وقت بھی کوئی بات عدل وانصاف کے معیار سے نازل ہو کر نہیں فرمائی۔ سارے آئمہ اجتہاد، سارے محدثین وفقہا کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، تمام مذاہب کو حدیث صحیح اور تعامل وآثارِ صحابہ وسلف کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، اسی لیے اگر چند مسائل میں آئمہ حنفیہ کی کمزوری دیکھی تو اس کا بھی برملا اقرار کیا اگر حافظ ابن حجر ایسے حضرات کی بے انصافی کو کھول کر بیان کیا تو اکابر حنفیہ میں سے شیخ ابن ہمام وغیرہ کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا۔ اس طرز تحقیق کا درسِ حدیث، حضرت شاہ صاحبؒ کے سوا ہمارے علم میں نہیں اور چونکہ تالیفی صورت سے ایسی جامع کوئی اور کتاب موجود نہیں ہے۔ ابتداء ہماری ذکر کردہ تشریحات وابحاث کچھ لوگوں کو غیر مانوس بھی محسوس ہوں گی، خصوصاً ان لوگوں کو جن کی نظر قدماء محدثین کی طویل علمی ابحاث پر نہیں یا جنہیں حضرت شاہ صاحبؒ کے بلند ترین علمی پایہ کے ساتھ اپنی کوتاہ نظری یا کمی علم ومطالعہ کے باعث کوئی مناسبت نہیں، ہمیں معلوم ہے کہ جس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب کے طرز تحقیق اور درسِ حدیث کے خصوصی امتیازات کی شہرت ہوئی تو کچھ قاصر الہمت اساتذہ حدیث پر یہ بات گراں گزری تھی کیونکہ وہ اپنے علم ومطالعہ کی کمی کے باعث اس طرز تحقیق کو نہیں چلا سکتے تھے۔ حالانکہ غیر مقلدین کے جارحانہ اقدامات نے بھی حضرت شاہ صاحب کے تحقیقی درسِ

حدیث کی ضرورت کوواضح تر کر دیا تھااور یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اگر علامہ شوق نیمویؒ حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ ایسے محدثین کی خدمات حدیث رونمانہ ہوتیں تو علم حدیث کے میدان میں ہمیں بڑی پسپائی سے دوچار ہونا پڑتا۔

ان سب اکابر کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے طلب وتحقیق اور وسعتِ مطالعہ میں نہایت بلند اور غیر معمولی مقام حاصل کیا اور تیرہ سو سال کے علمی دفاتر کھنگال ڈالے اور یہ صرف ان ہی کا حق تھا کہ امام بخاریؒ، حافظ ابنِ تیمیہؒ، حافظ ابن حجرؒ، حافظ ابن ہمام ایسے بلند پایہ محققین پر نقد ونظر کر گئے جب کہ نہ صرف ان حضراتِ اکابر کی جلالتِ قدر اور عظمت ووجاہت عنداللہ کے پوری طرح معترف تھے اور منہ بھر کر ان کی مدح وثنا فرمایا کرتے تھے بلکہ ہر مخالف ومعاند کے بھی جائز فضل وشرف اور علمی ودینی قدر ومنزلت کا کھلے دل سے اظہار واعتراف فرمایا کرتے تھے یہاں ہمیں ضرورت ومناسبتِ مقام کے لحاظ سے کچھ چیزیں حضرت امام بخاریؒ کے بارے میں ہی لکھنی ہیں۔

حضرت امام بخاریؒ خود مجتہد تھے اور ان کی فقہی عظمت تراجم ابواب سے ظاہر ہے جن میں فقہ، اصول فقہ اور کلام وغیرہ سب علوم سمائے ہوئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس فقہی جانب کو وہ اختیار کرتے ہیں تو دوسری جانب کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں اور اس کی کوئی دلیل بھی ذکر نہیں کرتے نہ حدیث لاتے ہیں اگر چہ وہ ان کی شرط ہی پر ہو اور خود صحیح بخاریؒ میں بھی دوسری جگہ ہو لیکن اس باب میں نہیں لاتے دوسرے باب میں دوسرے مسئلہ پر استشہاد کرنے کے لیے ذکر کریں گے۔ بخلاف امام ترمذی وامام داؤد نسائی کے کہ وہ ہر دو جانب موافق ومخالف کے باب باندھتے ہیں اور دونوں کی احادیث بھی ذکر کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو نیل الفرقدین ص ۱۸، کشف الستر ص ۳۹، ص ۵۰، ص ۹۵ ومقدمہ فیض الباری ص ۴۰ وفیض الباری ص ۱/۲۰۳ وص ۲/۲۶۰)

اسی طرح امام بخاری نے خود تو بہ کثرت قیاس کا استعمال کیا ہے، مگر قائلین قیاس پر بہت کچھ نکیر کی ہے جس کی توجیہ حضرت شاہ صاحب یہ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری تنقیح مناط پر عمل کرتے ہیں، جو بچند وجوہ قیاس سے الگ ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام بخاری کے مختارات کسی کتاب میں جمع نہیں کئے گئے، جس طرح دوسرے آئمہ مجتہدین کے مختارات مستقل کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں۔ (فیض ص ۱/۲۳۵)۔

امام بخاریؒ کے مختارات وہ بھی ہیں جو دوسرے آئمہ مجتہدین کی آراء ومسائل کے موافق ہیں اور وہ بھی جو سب سے الگ ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے تھی کہ بحیثیت مجموعی آئمہ حنفیہ کی موافقت زیادہ ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ قال بعض الناس میں امام صاحب ہی مراد ہوں یا ہر جگہ اس کلمہ سے مخالفت ہی مقصود ہو، بلکہ موافقت کے مواقع میں بھی لکھا ہے، مثلاً باب اذا وقف او اوصی لاتاربہ کے تحت ص ۳۸۵ بخاری میں لکھا وقال **بعضهم اذا اوصى لقرابته فهو الى آبائه في اسلام** یہاں بعض سے مراد امام ابو یوسف ہیں اور بظاہر امام بخاریؒ نے ان کی موافقت بھی کی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے اکثر مسائل وقف میں امام اعظم کے صاحبین کی موافقت کی ہے کیونکہ اس بارے میں انہوں نے محمد بن عبداللہ انصاری کی کتاب الوقف پر اعتماد کیا ہے اور وہ حضرت امام زفرؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ان کے نزدیک روپیہ کا وقف بھی جائز تھا کہ اصل رقم محفوظ رہے اور اس کے منافع مصارف خیر میں خرچ ہوتے رہیں اور اس پر عمل بھی قسطنطنیہ میں رہا ہے (کمال عالمگیریہ عن الانصاری)

امام بخاریؒ نے شئ موقوفہ سے انتفاع کے جواز میں بھی ہماری موافقت کی ہے مگر وہ اس باب کے تحت حدیث رکوب الہدی کو لائے ہیں، حالانکہ ہدی اور وقف میں فرق ہے، کیونکہ امام بخاری ایسے دقیق فروق کی پروانہیں کرتے اور معمولی مناسبتوں سے ایک باب کی احادیث دوسرے باب میں ذکر کر دیتے ہیں۔

جن مسائل میں امام بخاریؒ نے دوسرے آئمہ مجتہدین سے الگ راہ اختیار کی ہے، وہ بھی بڑی تعداد میں ہیں، مثلاً آئمہ حنفیہ کے نزدیک نماز جماعت میں حدیث الامام ضامن کی وجہ سے تضمن کی رعایت بدرجہ غایت ہے، یعنی امام کی نماز نماز مقتدی کو اپنے ضمن میں لینے

والی ہےاوراسی لئے نماز مقتدی کی صحت وفساد نماز امام پر موقوف ہے‘ شوافع نے اس بارے میں توسع اختیار کیا اور کہا کہ امام کی نماز کا فساد وغیرہ نماز مقتدی پر اثر انداز نہیں ہوتا‘ نہ اقتداء کی زیادہ شرائط ہیں‘ اسی لئے ان کے یہاں فرض نماز نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے بھی صحیح ہے بلکہ امام ایک وقت کی نماز پڑھا رہا ہو تو اس کے پیچھے دوسرے وقت کی نماز والے بھی اقتداء کر سکتے ہیں۔ لیکن امام بخاریؒ توسع میں شوافع سے بھی آگے بڑھ گئے اور فرمایا کہ مقتدی کی تحریمہ اگر امام کی تحریمہ سے مقدم بھی ہو جائے تو اقتداء درست ہے (فیض الباری ص ۲/۱)

امام بخاریؒ کے نزدیک حیض والی عورت اور جنبی شخص کو قرآن مجید کی قرأت جائز ہے اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ ان کے یہاں مس مصحف کا معاملہ بھی ہلکا ہے‘ امام بخاریؒ کا یہ مسلک جمہور کے خلاف ہے امام بخاری کا استدلال چند آثار سے ہے اور جمہور نے احادیث مرفوعہ سے استدلال کیا ہے‘ جن میں ممانعت ہے اور ان کو اصحاب سنن نے روایت کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام بخاریؒ جب کسی فقہی مسئلہ کو اختیار فرما لیتے تھے تو پھر آثار غیر مرفوعہ کے مقابلہ میں احادیث مرفوعہ کی تاویل کرتے تھے (حضرت شاہ صاحبؒ ایسے مواقع میں فرمایا کرتے کہ اس کی فقہ حدیث تک سرائت کر گئی‘ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ حدیث فقہ میں سرایت کرے۔ حضرتؒ کا یہ جملہ نہایت بیش قیمت ہے اور اس کی تفصیل پھر کسی وقت کی جائے گی یا کہا جائے کہ وہ احادیث ان کو نہیں پہنچیں جو امر مستبعد ہے‘ اس قسم کے مسائل بہت ہیں جن میں امام بخاریؒ کی فقہی رائے جمہور یا آئمہ مجتہدین مشہورین کے خلاف ہے اور ہم نے چند اور مسائل بھی یہاں ذکر کرنے کا قصد کیا تھا مگر بطور مثال یہ بھی کافی ہیں‘ یہاں قلت گنجائش کے باوجود اتنی بات اور عرض کرنی ہے کہ امام بخاری نے جہاں تنقید رجال میں بے ضرورت شدت اختیار کی ہے‘ وہاں مسائل میں بھی ان کی شدت نمایاں ہے‘ مثلاً قرأۃ فاتحہ اور رفع یدین کے مسائل میں ان کے مستقل رسالے موجود ہیں‘ ان پر مستقل تنقیدی ابحاث تو انوارالباری میں اپنے موقع پر آئیں گی اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے ان ہی مسائل پر اپنے مستقل رسائل میں بہترین محدثانہ کلام کیا ہے مگر یہاں چند اشارات کئے جاتے ہیں۔

قرأۃ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں امام بخاریؒ کا تشدد شوافع سے بھی بڑھ گیا‘ کیونکہ ایک متواتر طور سے ثابت شدہ مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص امام کو رکوع میں پائے اس کی وہ رکعت ہو جاتی ہے‘ مگر امام بخاریؒ نے فرمایا کہ فاتحہ نہ پڑھنے کے سبب وہ رکعت اس کو نہیں ملی (دیکھو جز القرأۃ للبخاری) دوسری بات یہ کہ امام بخاریؒ نے موقع ملنے پر ایسے مقتدی کو رکوع میں بھی قرأت فاتحہ کی اجازت دی ہے حالانکہ مسلم شریف میں حدیث موجود ہے‘ جس سے رکوع وسجود کے اندر قرآن مجید پڑھنے کی ممانعت ثابت ہے‘ امام بخاریؒ نے اس حدیث کا کچھ خیال نہیں کیا۔ (فیض الباری ص ۲/۲۷۴)

امام بخاریؒ کے اس مسئلہ کی تاویل کرنی پڑی ہے‘ بعض حضرات نے کہا کہ امام بخاری نے مقتدی کے لئے مجبور ہو کر اور بادل نخواستہ یہ اجازت دی ہے کہ کیونکہ حدیث کے خلاف ہے‘ بعض نے کہا کہ ان کی یہ اجازت بطور رخصت ہے بطور عزیمت نہیں ہے وغیرہ‘ اسی طرح امام بخاری نے رفع یدین کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہے حتیٰ کہ رسالہ رفع یدین میں یہ بھی فرما دیا کہ کسی ایک صحابی سے بھی عدم رفع ثابت نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے نیل الفرقدین ص ۵۲‘ ۶۷‘ ۸۶ میں اس پر عمدہ بحث کی ہے اور ص ۱۴۲ میں ”مصنف“ سے امام وکیع‘ ابو اسامہ عن شعبہ عن ابی اسحاق روایت نقل کی ہے کہ اصحاب عبداللہ بن مسعود واصحاب علی رضی اللہ عنہم صرف شروع نماز کے وقت رفع یدین کرتے تھے‘ پھر نہیں کرتے تھے اور امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث ترک رفع یدین نقل کر کے لکھا ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین وغیرہ میں سے بہت سے اہل علم کا مذہب ترک رفع ہے اور یہی قول حضرت سفیان اور اہل کوفہ کا ہے۔ امام بخاری کے آئمہ حنفیہ کے خلاف زیادہ تشدد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے مسائل حنفیہ کے بارے میں ان کو مغالطہ ہوا اور غلط بات پر اعتماد کر لیا‘ حالانکہ وہ ہمارا مسلک نہیں تھا‘ ہم نے اس کی طرف اشارہ حضرت شاہ صاحب کے ملفوظات عالیہ سے بھی کیا ہے اور مفصل ابحاث اپنے مواقع پر آئیں گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

ومنہ التوفیق للصواب والسداد (مؤلف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب: من قال ان الایمان هو العمل لقول الله تعالیٰ وتلک الجنة التی اورثتموها بما کنتم تعملون وقال عدة من اهل العلم فی قوله تعالیٰ فوربک لنسئلنهم اجمعین عما کانوا یعملون عن قول لااله الا الله وقال لمثل هذا فلیعمل العاملون.

۲۵- حدثنا احمد بن یونس و موسیٰ بن اسمعیل قالا حدثنا ابراهیم بن سعد قال حدثنا ابن شهاب عن سعید بن المسیب عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم سئل ای العمل افضل فقال ایمان بالله و رسوله قیل ثمه ماذاقال الجهاد فی سبیل الله قیل ثمه ماذاقال حج مبرور.

باب ''جس نے کہا کہ ایمان عمل (کا نام) ہے'، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' اور یہ جنت ہے جس کے وارث تم اپنے اعمال کے بدلہ میں ہوئے ہو اور یہ کہ ارباب علم ارشاد باری فوربک الخ (اس آیت کی تفسیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہاں عمل سے مراد لا الہ الا اللہ کہنا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عمل کرنے والوں کو اسی جیسا عمل کرنا چاہئے۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا ''اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا''۔ کہا گیا اس کے بعد کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا'' کہا گیا پھر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ''حج مبرور''۔

تشریح: پہلے ابواب میں امام بخاریؒ بتلا چکے ہیں کہ اعمال کی ایمان میں خاص حیثیت ہے اور یہ تو سب ہی کو تسلیم ہے کہ اعمال ہی سے ایمان کی حفاظت و ترقی ہوتی ہے اور ترک اعمال واجبہ وارتکاب کبائر سے ایمان کمزور ہوتا ہے' نور ایمان کو ظلمت عصیان گھیر لیتی ہے' یہاں امام بخاریؒ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان عمل ہی ہے اور ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو ایمان کے ساتھ اعمال کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے' جیسے مرجۂ' کرامیہ' لیکن اگر امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہو کہ اعمال کو اجزاء ایمان ثابت کریں تو یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی، چنانچہ علامہ قسطلانیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے آیت **لمثل هذا فلیعمل العاملون** سے اگر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ عمل اجزاء ایمان سے ہے تو یہ استدلال درست نہیں کیونکہ عمل کا لفظ آیت میں عام ہے' اس سے مراد ایمان لینا دعویٰ تخصیص بلا برہان ہے جو مقبول نہیں' لہٰذا اس سے ان لوگوں کی تردید نہیں ہو سکتی جو اعمال کی اہمیت تو مانتے ہیں مگر ان کو داخل ماہیت ایمان نہیں کہتے البتہ اگر مراد یہ ہے کہ آیت میں عمل کا اطلاق ایمان پر ہوا ہے تو یہ اس حیثیت سے درست ہے کہ ایمان عمل قلب ہے جو تصدیق ہے اور اس بات میں کوئی نزاع نہیں ہے لہٰذا امام بخاریؒ کی غرض اس باب سے یا دوسرے اس قسم کے ابواب سے جزئیت اعمال کا ثبوت نامکمل و ناتمام ہے۔ (کمالا یخفی) (شروح البخاری ۱/۱۶۸)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کا مقصد یہاں یہ بتلانا ہے کہ ایمان عمل قلب ہے' جس طرح پہلے ایک باب میں معرفت کو فعل قلب کہا تھا اور آیات واحادیث میں جو عمل کا ایمان پر اطلاق ہوا ہے وہ بھی اسی حیثیت سے ہے کہ ایمان اکبر اعمال ہے یہ مقصد نہیں کہ ''بما تعلمون'' میں عمل کو منحصر سمجھ لیا جائے ایمان میں' اسی طرح جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اعمال کے بارے میں سوال کیا گیا اور آپ نے جواب ''ایمان'' سے دیا تو یہی بات واضح ہوئی کہ ایمان عمل ہے''۔ حدیث الباب میں سب سے افضل عمل تصدیق قلبی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق ہے' اس کے بعد سب سے افضل اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا اور پھر حج مبرور فرمایا۔

حج مبرور کے متعدد معانی منقول ہیں۔ (۱) پورے ارکان کے ساتھ صحیح صحیح ادا کرنا (۲) ایسا حج جس میں رفث' فسوق' جدال اور دوسرے گناہ شامل نہ ہوں۔ (۳) ایسا حج جس میں ریا و نمود شہرت و بڑائی مقصود نہ ہو (۴) ایسا حج جو عند اللہ مقبول ہو' پھر عند اللہ مقبولیت کی

علامت علماء نے یہ لکھی ہے کہ حج کے بعد حج کرنے والے کی دینی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے اس سے معلوم ہوا کہ اگر خدانخواستہ دینی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جائے تو وہ حج کی نامقبولیت کی بڑی علامت ہے اور وہ کسی بڑی غلطی اور گناہ کا نتیجہ ہے' خدا محفوظ رکھے' اس لئے اتنی بڑی عظیم الشان عبادت کی توفیق اگر مل جائے تو ارادہ سفر حج سے وقت واپسی تک نہایت زیادہ تصحیح نیت' مال کی پاکیزگی' تمام دوسرے اعمال واخلاق کی درستی' معاملات کی صحت وصفائی' حقوق العباد کی پوری ادائیگی وغیرہ کی طرف توجہ کی جائے یہ سفر غلامی کا پٹکا کمر سے باندھ کر' سراپا عجز ونیاز ہو کر اپنے آقا ومولا رب کریم جل مجدہ کے باجبروت دربار کی حاضری اور محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوچوں کی خاک چھاننے کے لئے ہے اس لئے جہاں یہ زندگی کی سب سے بڑی سعادت اور فلاح وکامرانی کی بہت بڑی ضمانت ہے وہاں معمولی غفلت' کوتاہی یا غلطی بھی بعض اوقات بہت بڑی بدبختی کا سروسامان بن سکتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حج کی عبادت باطن کے کھوٹ یا کھرے پن کو نمایاں کر دیتی ہے' یعنی اگر پہلے سے دینی و اخلاقی خرابیاں موجود ہیں اور ان کی اصلاح نہیں کی تو وہ فاسد مادہ اور ابھر جاتا ہے اور اگر بہتر ملکات وحالات پہلے سے ہیں اور اصلاح حال کی مزید فکر رہتی ہے تو اس مقدس عبادت کی برکت سے ان میں ترقی ونشو ونما ہوتا ہے معلوم ہوا کہ سفر حج سے قبل اپنی اصلاح حال کی فکر بہت زیادہ کرنی چاہئے تاکہ اپنے حال وقال ظاہر وباطن کو بہتر سے بہتر بنا کر وہاں کی حاضری دی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضی کے موافق عبادات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بحث ونظر: افاضل اعمال کی تعیین وترتیب مختلف صورتوں سے وارد ہوئی ہے' حدیث الباب میں ایمان کے بعد جہاد پھر حج ہے حدیث ابی ذرؓ میں حج کا ذکر نہیں' عتق کا ذکر ہے' حدیث ابن مسعود میں پہلے نماز پھر بر والدین پھر جہاد ہے اور ایک حدیث میں ہاتھ وزبان کی سلامتی کا ذکر ہے۔ یہ سب احادیث صحیح ہیں' پھر اختلاف کیوں ہے؟

جواب یہ ہے کہ جوابوں کا اختلاف سوال کرنے والے اشخاص اور ان کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے ہے' جس کو اس کے حسب حال وضرورت جس عمل کی رغبت دلانی مقصود تھی وہی ذکر فرمایا۔ دوسرے یہ کہ افضلیت من کل الوجوہ کا بیان مقصود نہیں ہوتا اور بعض اوقات کسی وقتی ضرورت واہمیت کے باعث بھی کسی عمل کی اہمیت وافضلیت قائم ہو جاتی ہے اس لئے اصولی بات یہی ہے کہ جس وقت کسی عمل کی زیادہ احتیاج وضرورت ہو۔ اس وقت وہی عمل زیادہ افضل ہے۔

یہاں امام بخاریؒ نے جو آیت سورہ زخرف کی پیش کی ہے **تلک الجنة التی اورثتموھا بما کنتم تعملون** میں مومنین کے لئے جنت کا حصول بطور وراثت اور بعوض اعمال بتلایا گیا ہے اور آیت سورہ توبہ میں **ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنة** سے صرف بطور عوض اعمال مفہوم ہوتا ہے اس لئے یہاں وراثت کا مطلب معلوم ہونا چاہئے۔ کیونکہ وراثت کا عام مفہوم کسی میت کے چھوڑے ہوئے مال کا مالک ہونا ہے جو حق تعالیٰ جل ذکرہ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

اس اشکال کو پیش کر کے علامہ محقق حافظ عینیؒ نے جواب دیا کہ یہ باب تشبیہ سے ہے' زمخشری نے کہا جس طرح میت کا باقی مال ورثہ کی ملکیت میں آ کر ان کے پاس آ کر اپنے ذاتی اموال کی طرح باقی رہتا ہے اور کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔ یہاں بھی جنت مومنوں کے پاس ہمیشہ رہے گی تو گویا بقا کے اندر تشبیہ ہوئی اور باتوں میں نہیں' دوسرا جواب یہ ہے کہ مورث کا فر کو قرار[۱] دیا جائے۔

---

[۱] کیونکہ ہر شخص کے لئے دو ٹھکانے آخرت میں بنائے گئے ہیں' ایک جنت میں' دوسرا جہنم میں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر اہل جنت کو اس کا ٹھکانہ جہنم کا بھی دکھایا جائے گا۔ جس پر وہ شکر خدا بجالائے گا اور کہے گا کہ اگر خدا مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں جہنم میں جاتا' اسی طرح اہل نار کو اس کا ٹھکانہ جنت کا دکھایا جائے گا جس پر وہ حسرت کرے گا' کاش! خداوند تعالیٰ مجھے بھی ہدایت دیتا (نسائی وابن مردویہ تفسیر ابن کثیر ص ۲/۲۱۵)

چونکہ اس کا حصہ جنت میں تھا، جس سے وہ کفر کی وجہ سے محروم ہو گیا، اس لئے اس کا حصہ بھی منتقل ہو کر مومن کو مل گیا اور بطور وراثت ملنے کی صورت ہو گئی تیسرا جواب یہ کہ مورث خدائے تعالیٰ ہی کو کہا جائے اور بطور مجاز کے وراثت کو بمعنی عطا لیا جائے، گویا عطاء کو (تحقق استحقاق کے اندر) ایراث کے ساتھ تشبیہ دی گئی (عمدۃ القاری ص ۲۱۵)

محقق بیضاویؒ نے یہ توجیہ کی کہ جزاء عمل کو میراث سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ جس طرح میراث مورث کے بعد رہ جاتی ہے، عمل کرنے والے کے بعد اس کے عمل کی جزاء پیچھے رہ جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

اوپر کی وضاحت و تفصیل کے بعد یہ بات صاف ہو گئی کہ جنت کا حصول بطور جزا و عوض ہوگا، جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت اشترا سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس کے تفسیری فوائد (مؤلفہ حضرت علامہ عثمانیؒ) سے مستفید ہو کر اپنے ایمان کو تازہ کیجئے۔

''اس سے زیادہ سود مند تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیر سی جانوں اور فانی اموال کا خداوند قدوس خریدار بنا، ہماری جان و مال کو جو فی الحقیقت اسی کی مخلوق و مملوک ہے۔ محض ادنے ملابست سے ہماری طرف نسبت کر کے ''مبیع'' قرار دیا جو عقد بیع میں مقصود بالذات ہوتی ہے اور جنت جیسے اعلیٰ ترین مقام (یا بہترین دولت لازوال) کو اس کا ''ثمن'' (قیمت) بتلایا، جو مبیع (خریدنی چیز) کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جنت میں نعمتیں ہوں گی جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال و خطرہ گزرا''۔ اب خیال کرو کہ جان و مال جو برائے نام ہمارے کہلاتے ہیں انہیں جنت کی قیمت و ثمن نہیں بتایا۔ نہ اس طرح کیا کہ حق تعالیٰ بائع ہوتے، ہم مشتری ہوتے، یہ حق تعالیٰ کے لطف و کرم کی حد ہے کہ ذرا سی حقیر چیز کے معاوضہ میں جنت جیسی لازوال و قیمتی چیز کو ہمارے لئے مخصوص کر دیا، جیسا کہ بالجنۃ کی جگہ بان لھم الجنۃ فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نیم جان بستاند و صد جاں دہد آنکہ در وہمت نیاید آں دہد

جاں دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر یہ نہیں کہ ہمارے جان و مال خرید لئے گئے تو فوراً ہمارے قبضہ سے نکال لئے جائیں بلکہ صرف اتنا مقصود ہے کہ جب کبھی موقع و ضرورت پیش آئے جان و مال خدا کے راستہ میں پیش کرنے کو تیار رہیں[1] دینے سے بخل نہ کریں، خواہ وہ لیں، یا نہ لیں، اسی کے پاس چھوڑے رکھیں، اسی لئے فرمایا **''یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون''**۔ یعنی مقصود خدا کی راہ میں جان و مال حاضر کر دینا ہے، اس کے بعد ماریں[2] یا مارے جائیں، دونوں صورتوں میں عقد بیع پورا ہو گیا اور یقینی طور پر قیمت کے مستحق ٹھہر گئے''۔

---

[1] گویا دنیا کے تمام مسلمان مرد و عورت خدا کی ریز روڈ فوج ہے، نماز ان کی فوجی پریڈ ہے جو اپنے آقا و شہنشاہ کی بندگی و اطاعت و وفاداری و فرمانبرداری کا ضروری نشان و شعار ہے۔ (**سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود**) جو کسی وقت اور کسی حال میں نہیں چھوڑا جا سکتا، حزب اللہ و حزب الشیطان میں یہی خط فاصل ہے، صحابہ کرام کا ارشاد ہے کہ ہم مسلمان و غیر مسلمان کا فرق نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے ہی سے کرتے تھے۔ دنیوی فوجوں کی پریڈ قوائے جسم و بدن کی ترقی کے لئے ہے لیکن اسلامی پریڈ کا واحد مقصد قوائے روحانی کی ترقی ہے، کیونکہ نماز ساری عبادات اسلامی کی سرتاج، تمام روحانی کمالات کا سرچشمہ اور وصول و تعلق مع اللہ کی بڑی ضمانت ہے، اس کا نورانی جز و صرف خدا کی عبادت و اطاعت کا اقرار، صرف اسی سے ہر قسم کی مدد و نصرت حاصل کرنے کا عہد اور اس کے ہر نافرمان و غیر مطیع بندے سے قطع تعلق کا اعلان ہے۔ اگر یہ سب چیزیں نماز کی پابندی پر بھی حاصل نہیں تو وہ نماز اپنی حقیقت و مغز سے خالی ہے، غرض صحیح طور سے نماز پڑھنے والے مسلمان حزب اللہ (خدائی فوج) ہیں جو ہمہ وقت خدائی احکام کی تعمیل کے لئے دست بستہ مستعد و تیار ہیں۔

[2] یعنی یہ ضروری نہیں کہ میدان جہاد میں جا کر مارے ہی جائیں، یہ بھی بیشتر ہوتا ہے کہ فاتح و منصور ہو کر اپنی جانیں سلامت لے کر واپس آ جاتے اور جتنا مال راہ خدا میں صرف کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ بطور غنیمت لے آتے ہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس سے پہلی جلد میں گزر چکا ہے، بیسیوں میدان جنگ میں شریک ہوئے، جسم میں کوئی جگہ باقی نہ تھی جہاں تیر و تلوار کے زخم نہ ہوں مگر آپ کی وفات بستر پر ہوئی۔

جب یہ تشریح سامنے آ گئی کہ دخول جنت بعوض اعمال ہوگا تو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ بسبب اعمال نہ ہوگا کیونکہ ہماری معرفت حق معرفت سے نازل تر اور اعمال حق اعمال سے قاصر در قاصر ہیں، کوئی بڑے سے بڑا ولی مقرب بھی خیال نہیں کر سکتا کہ اس کی معرفت وعبادت حق تعالیٰ کی شان بے چون و بے چگوں کے لائق ہے اس لئے ایمان واعمال کو دخول جنت کا سبب حقیقی بنانا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ اول تو زلات ومعاصی کی سد سکندری ہمارے اور جنت کے درمیان بہت بڑی حائل و فاصل ہے۔ اس کو وہ اپنی شان کریمی سے ہٹا دیں اور مغفرت سے نواز دیں، پھر ہماری ناقص معرفت وعبادت کو محض اپنے فضل وانعام سے شرف قبول بھی عطا فرما دیں تو وہ اس لائق کہاں کہ ان کے عوض حق تعالیٰ اپنی جنت نعیم، اپنے رضوان عمیم اور دیدار عظیم جیسے انعامات احسانات وتشریفات سے نوازیں ۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم　　وز ہر چہ گفتہ ایم وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اسی لئے بہت سے عارفین کاملین نے تو حمد ونعت کی سلسبیل صافی کی شناوری کو بھی احتیاط سے بالاتر قرار دیا کہ مبادا کوئی غلطی وخطا سرزد ہو جائے اور نیکی برباد گناہ لازم ہو۔ انہوں نے کہا ۔

زلاف حمد ونعت اولی است برخاک ادب خفتن　　ثنائے مے تواں گفتن، درودے می تواں سفتن

(سیدھے سیدھے ثنا، ودرود پڑھو، بہت زیادہ خیالی گھوڑے مت دوڑاؤ)

اس سے معلوم ہوا ہے کہ حدیث الباب اس حدیث کے خلاف نہیں جس میں آیا ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ؟ فرمایا میں بھی نہیں، بجز اس کے کہ خدائے برتر مجھ کو اپنی رحمت کی نوازشوں سے ڈھانک دے جب افضل خائف، حقیقۃ الحقائق، فخر انبیاء وامم (ارواحنا فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں ایسا فرمائیں تو دوسروں کا حال معلوم۔ وجہ وہی ہے کہ اعمال میں خود صلاحیت، دخول جنت کے سبب حقیقی بننے کی نہیں ہے، اس کے لئے اس کی رحمت، قبولیت اور خصوصی فضل وانعام ہی درکار ہے۔

اس ساری بحث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جب اعمال پر مدار نہیں، محض اس کے فضل وکرم پر ہے، تو ہم اصلاح اعمال، تکمیل اخلاق اور واجبات اسلام کی ادائیگی میں تساہل برتنے لگیں، کیونکہ ہم سے مطالبہ پوری پوری طرح اطاعت وفرمانبرداری کا ہے۔ **یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ** (بقرہ) اے ایمان والو! اسلام کو پورا پورا قبول کرو۔ یعنی ظاہر وباطن، عقیدہ وعمل میں تمام احکام اسلام کا اتباع کرو۔ **یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون** (آل عمران) اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے جیسا اس سے ڈرنا چاہئے اور تمہاری موت بہرحال اسلام ہی پر آنی چاہئے۔ **ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم الایۃ** (بقرہ) کیا تم نے سمجھ لیا کہ یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم سے سخت سخت امتحان پہلے مسلمانوں جیسے نہ لئے جائیں گے، **و اما الذین سعد وا ففی الجنۃ** (ہود) جنت میں نیک بخت لوگ جائیں گے، **تلک الجنۃ التی نورث من عبادنا من کان تقیا الذین سعد وا ففی الجنۃ** (مریم) ہم اپنی جنت کا وارث و مستحق اپنے بندوں میں سے صرف ان کو بنائیں گے جو متقی و پرہیزگار ہوں گے۔ **للذین اتقوا عند ربھم جنات آلایۃ** (آل عمران) صرف متقی پرہیزگاروں ہی کے لئے خدا کے یہاں جنتیں ہیں، **فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ فقد فاز** (آل عمران) وہی شخص حقیقت میں کامیاب ہوا جس نے اپنے اعمال وکردار کے ذریعے دوزخ سے دوری اور جنت کے دخول کی سعادت حاصل کر لی پھر بیسیوں آیات میں اہل جنت کے اعمال واوصاف اور مستحقین جہنم کے افعال وخصال بتلائے ہیں، راقم الحروف نے ایسی بہت آیات یکجا جمع کی ہیں مگر یہاں بخوف طوالت ذکر نہیں کی گئیں۔

امام بخاریؒ نے اپنے استدلال کے لئے دوسری آیت پیش کی **فو ربک لنسئلنھم اجمعین عما کانوا یعملون** کہ بہت سے اہل

علم نے یہاں عمل سے مراد قول لاالہ الا اللہ سمجھا ہے یعنی ایمان' اس پر حافظ عینیؒ نے امام نووی کا قول پیش کیا کہ اس آیت میں دوسری وجہ بھی ہے اور وہی مختار و پسندیدہ بھی ہے یعنی ہم ان سے تمام اعمال تکلیفیہ کے بارے میں سوال کریں گے اور جس نے اس کو کلمہ توحید کے ساتھ خاص کیا' اس کا دعویٰ تخصیص بلا دلیل ہے لہٰذا مقبول نہیں' پھر پہلے لوگوں کو متدل حدیث ترمذی نقل کر کے اس کی تضعیف کی۔ (عمدہ ص ۱/۲۱۵)

اس کے بعد حافظ عینی نے امام بخاریؒ کے تیسرے استدلال آیت **لمثل هذا فليعمل العاملون** پر لکھا کہ یہاں بھی استدلال جب صحیح ہو سکتا ہے کہ عمل کو بمعنی ایمان لیا جائے حالانکہ یہ بھی دعوائے تخصیص بے دلیل و غیر مقبول ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ

گذشتہ حدیث کی بحث و نظر میں جہاد و قتال پر حسب ضرورت لکھا جا چکا ہے' اس حدیث میں ایمان کے بعد افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ کو فرمایا ہے' جس کی غرض صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہوتی ہے اور جیسا کہ پہلے بھی وضاحت کی گئی جو قتال یا جنگ کسی دنیاوی غرض' ملکی فتوحات' مذہبی عصبیت یا جذبہ انتقام کے سبب ہو تو وہ اسلامی شریعت کی نظر میں نہ مطلوب ہے نہ مجموعہ پھر اسلامی جہاد کو بعض لوگوں نے صرف دفاعی جہاد میں محدود کیا ہے' مثلاً مولوی چراغ علی مرحوم نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ "تحقیق الجہاد کے نام سے مدت ہوئی شائع ہوا تھا۔ انہوں نے پورا زور اس پر صرف کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جتنے غزوات و سرایا ہوئے' وہ سب دفاعی[1] تھے۔ اور آیات جہاد و قتال میں بھی ترجموں کے اندر بریکٹ لگا کر سب کا رخ دفاع کی طرف پھیر دیا احادیث سے تعرض نہیں کیا' فقہاء و محدثین کی تو ان کے یہاں کوئی وقت ہی نہیں' پھر ان کی بات کو کیا اہمیت دیتے' جگہ جگہ ان حضرات پر طنز کئے ہیں اور جہاں بڑے بڑے محدثین و فقہا کے اقوال کو نقل کیا ہے تو بے توقیری کے ساتھ' جس کی ترجمانی ان کے مترجم نے بھی ضروری سمجھی ہوگی کہ فلاں یہ کہتا ہے' فلاں یہ لکھتا ہے' حالانکہ متشرقین یورپ کی تحریفات ذکر کرتے ہوئے بھی ہر جگہ ان کا ادب کیا ہے کہ فلاں مسٹر یہ لکھتے ہیں' یہ کہتے ہیں' دلائل میں کوئی جان نہیں مگر ابتدا میں ایک تبصرہ نگار محقق نے یہاں تک لکھ دیا کہ "آئندہ اسلام پر جو کچھ لکھا جائے گا وہ زیادہ تر مولوی چراغ علی مرحوم کی خوشہ چینی ہوگی' خواہ کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے' خواہ ان کی کتابوں کا حوالہ دے یا نہ دے"۔

ہمارے ہندوستان کے اندر وہ دور بھی عجیب گزرا ہے کہ مصنف تحقیق الجہاد جیسے چند محققین پیدا ہوئے جنہوں نے علماء سلف و خلف کو جاہل و کم علم سمجھا اور کسی ایک دو عالم میں کوئی اخلاقی کمزوری دیکھی تو سارے علماء عصر پر منظوم تبرا لکھ دیا۔ انتہائی ذاتی علم عربیت کا بھی کامل نہیں مگر قرآن مجید کی تفسیریں تک لکھ ڈالیں' واللہ المستعان۔

جہاد کے موضوع پر ایک اچھی قابل قدر ضخیم کتاب "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شائع ہوئی تھی' اس میں اسلامی و غیر اسلامی جہاد کی پوری تفصیل آ گئی ہے' اسلامی جہاد کی دفاعی و اقدامی ہر دو قسم کی تحقیقی طرز سے واضح کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے جہادی نظریات و مقاصد' دنیا کی مشہور جنگوں کی ضروری تاریخ سے واقف کیا ہے۔

اسلامی اصول و قوانین جنگ کا تقابل بھی دنیا کی سابقہ و موجودہ متمدن قوموں کے اصول و قوانین سے خوب واضح کیا ہے اور اسلامی جہاد کی برتری' ضرورت و اہمیت کو دل نشین انداز میں پیش کیا ہے' غرض یہ کتاب ہر طرح مکمل اور نہایت گرانقدر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ جزی اللہ المولف خیر الجزاء' یہ کتاب بہت عرصہ کے بعد دوبارہ شائع ہوئی ہے مگر اسی طویل مدت میں جدید معلومات کا اضافہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ یہ بڑی کمی محسوس کی گئی۔

---

[1] اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سارے غزوات و سرایا دفاعی تھی اور اقدامی جہاد ایسا ہی شجرہ ممنوعہ تھا تو دور خلافت راشدہ کے جہادی کارناموں کو کیا کہا جائے گا کیا وہ بھی سب دفاعی تھے؟ کیا خلفاء راشدین کا اقدام خلاف سنت و شریعت تھا؟ جب کہ وہ سب کامل طور پر متبع سنت ہونے ہی کی وجہ سے شارع علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق مقتدائے امت قرار دیئے گئے تھے' اس کی مکمل بحث آئندہ کسی موقع پر آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

باب...... اذالم يكن الاسلام عى الحقيقة وكان على الاستسلام اوالخوف من القتل لقوله تعالیٰ قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوآ اسلمنا فاذاكان على الحقيقة فهو علیٰ قوله جل ذكره ان الدين عندالله الاسلام الاية.

۲۶...... حدثنا ابو اليمان قال اخبرنا شعيب عن الزهرى قال اخبرنى عامر بن سعد ابن ابى وقاص عن سعد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اعطیٰ رهطاو سعد جالس فترک رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلاً هوا عجبهم الى فقلت يا رسول الله مالک عن فلان فوالله انى لاراه مؤمناً فقال اومسلماً فسكت قليلاً ثم غلبنى مآ اعلم منه فعدت لمقالتى و عاد رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال ياسعد انى لاعطى الرجل وغيره احب الى منه خشية ان يكبه الله فى النار' رواه يونس و صالح و معمر و ابن اخى الزهرى عن الزهرى.

باب: ''اگر کوئی حقیقت میں اسلام پر نہ ہو محض ظاہری طور سے اطاعت گزار ہو یا جان کے خوف سے (اسلام کا نام لیتا ہو) تو وہ (بظاہر) مسلم کہلائے گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ دیہاتی کہتے ہیں کہ ''ہم ایمان لائے' تم کہہ دو کہ نہیں! تم ایمان نہیں لائے' ہاں (یوں) کہو کہ مسلمان ہو گئے'' تو اگر کوئی (شخص) فی الواقع اسلام لایا ہو تو اللہ کے نزدیک وہ (مومن) ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اللہ کے نزدیک (اصل) دین اسلام ہی ہے''۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کو کچھ عطا فرمایا اور سعد بھی وہاں بیٹھے تھے (یہ کہتے ہیں کہ آپ نے ان میں سے ایک شخص کو نظر انداز کر دیا جو مجھے ان سب سے پسند تھا' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے کس وجہ سے فلاں آدمی کو چھوڑ دیا' خدا کی قسم! میں تو اسے مومن سمجھتا ہوں' آپ نے فرمایا کہ مومن یا مسلمان؟ کچھ دیر میں خاموش رہا۔ اس کے بعد اس شخص کے متعلق جو مجھے معلومات تھیں انہوں نے مجھے مجبور کیا اور میں نے دوبارہ وہی بات عرض کی کہ خدا کی قسم! میں تو اسے مومن سمجھتا ہوں' حضور نے فرمایا کہ مومن یا مسلم؟ میں پھر کچھ دیر چپ رہا اور پھر جو کچھ مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم تھا' اس نے تقاضا کیا۔ میں نے پھر وہی بات عرض کی۔ حضور علیہ السلام نے پھر اپنا جملہ دہرایا۔ اس کے بعد فرمایا اے سعد اس کے باوجود کہ ایک شخص مجھے زیادہ عزیز ہے میں دوسرے کو اس خوف کی وجہ سے (مال) دیتا ہوں کہ کہیں (وہ اپنے افلاس یا کچے پن کی وجہ سے اسلام سے نہ پھر جائے اور) اللہ اسے آگ میں اوندھا نہ ڈال دے' اس حدیث کو یونسؒ صالحؒ معمر اور زہری کے بھتیجے (محمد بن عبداللہ) نے زہری سے روایت کیا۔

تشریح: معلوم ہوا کہ آدمی کو جس بات کے صحیح ہونے کا یقین ہو' اس پر قسم کھا سکتا ہے' دوسرے یہ کہ سفارش کرنا جائز ہے اور سفارش کو قبول کرنا یا رد کرنا دونوں جائز ہیں۔ تیسری یہ کہ جنت کسی کے لئے یقینی نہیں' سوائے عشرہ مبشرہ کے' چوتھے یہ کہ مومن بننے کے لئے محض زبانی اقرار کافی نہیں' قلبی اعتقاد بھی ضروری ہے پانچویں یہ کہ تالیف قلب کے لئے نومسلموں پر روپیہ صرف کرنا درست ہے۔

بحث ونظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کا مقصد ترجمۃ الباب سے یہ ہے کہ معتبر وغیر معتبر اسلام کا فرق بتلا دیں' اس طرح کہ جو اسلام دل کی گہرائی اور صدق نیت کے ساتھ ہے' وہی عند اللہ معتبر ہے اور وہی موجب نجات بھی ہے' جس کو فرمایا ''ان الدين عندالله الاسلام'' اسلام کو اپنا پسندیدہ دین بتلایا اور جو اسلام صرف اسمی ورسمی یا نقلی و دکھاوٹی ہو کہ نفس الامر وواقع میں اس کی کوئی حقیقت و وجود نہ ہو تو وہ غیر معتبر ہے۔

عام طور پر شراح نے بظاہر آیت ''قالت الاعراب امنا'' ذکر کرنے سے یہ نہ سمجھا ہے کہ امام بخاری یہاں معترضین کے اس اعتراض کا جواب دے رہے ہیں کہ جب آپ کے نزدیک' ایمان واسلام ایک ہی چیز ہیں تو آیت قالت الاعراب امنا میں ایمان واسلام کی تفریق کیوں ہے؟ تو اس کے جواب میں امام بخاری نے یہاں بتلایا کہ اسلام لغوی بمعنی ظاہری تابعداری بغیر تصدیق قلبی کے معتبر ہی نہیں ہے' تو اس کے ایمان کے ساتھ اتحاد کا سوال بھی غلط ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے ہے کہ یہ شرح اس لئے بھی مناسب نہیں کہ اعتراض پوری طرح دفع بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ حق تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لئے اگرچہ ایمان کی نفی کی ہے مگر اسلمنا کہنے کی اجازت تو دے ہی دی ہے، خواہ وہ اسلام واقعی ہو یا غیر واقعی۔

لہٰذا اس جگہ امام بخاریؒ نے مسئلہ اتحاد اسلام وایمان سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ اگلے ترجمہ میں اس کو لیا ہے، یہاں امام بخاریؒ کے نظریہ اتحاد ایمان واسلام کی وجہ سے یہ خیال ہوگیا کہ جواب سوال دے رہے ہیں۔

خوف قتل کی وجہ سے اسلام لانا

ایسے اسلام کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ جبر واکراہ سے اسلام لائے اور دل میں اسلام سے نفرت ہو، وہ تو قطعاً کافر ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے نزدیک سب دین برابر ہوں اور ہر دین کو اختیار کر لینا جائز سمجھتا ہو اور اسلام قبول کرلے تو چونکہ اس نے بھی محض اسلام کو دین حق سمجھ کر قبول نہیں کیا ہے وہ بھی کافر ہی ہے اور بظاہر یہ دونوں صورتیں امام بخاریؒ نے یہاں مراد لی ہیں، تیسری صورت یہ ہے کہ اسلام تو کسی جبر واکراہ ہی سے اختیار کیا تھا مگر پھر اس پر راضی ہوگیا، گویا خوف قتل سے ظاہری اسلام کے ساتھ اس نے اپنے قلب کو بھی اعتقاد وتصدیق پر آمادہ کرلیا تو وہ بالاتفاق مومن ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جس نے ظاہری الفاظ ترجمۃ الباب پر نظر کر کے یہ خیال کیا کہ امام بخاریؒ اس کو بھی مومن قرار نہیں دیتے اس نے بہت غلط سمجھا۔

استسلام کی صورت

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ استسلام، سلم بمعنی صلح سے ہے یعنی بطریق مصالحت مجبوراً اسلام لایا اور صرف زبان سے کہا دل میں کچھ نہیں، تو ایسا اسلام بھی معتبر نہیں ہے کیونکہ باب استفعال کے خواص سے یہ بھی ہے کہ کوئی کام بغیر رغبت قلب کے، کسی مجبوری یا دل کی ناخوشی کے ساتھ کیا جائے، فرمایا یہ معنی اس باب سے بہت جگہ نکلتا ہے، اگرچہ علماء صرف نے ذکر نہیں کیا، جیسے لفظ استحفاظ آیت **بما استحفظوا من کتاب اللہ و کانوا علیہ شھداء** (مائدہ) یعنی احبار یہود نے کتاب اللہ کی حفاظت بطوع ورغبت نہیں کی بلکہ ان پر خلاف طبیعت اس کی حفاظت کا بوجھ ڈال دیا گیا یا استیسار) کے معنی اپنے کو مجبوراً اسیر سمجھ لینا یا استنسار بمعنی خواہ مخواہ گدھ بن جانا، اسی طرح استسلام بھی ہے کہ مسلمان نہیں مگر کسی مجبوری سے اسلام ظاہر کر رہا ہے۔

اُری اور اَریٰ کا فرق

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تمام ائمہ لغت نے بالاتفاق کہا ہے کہ صیغہ معروف بمعنی یقین اور مجہول بمعنی بمعنی شک ہوتا ہے، شاید اس لئے کہ اول رویت (بصری) سے اور دوسرا رائے سے ہے۔

شیخ ابن ہمام نے بھی باب الصیام میں یہی لکھا ہے یہاں صیغہ مجہول اولیٰ معلوم ہوا ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یقین وجزم کے ساتھ کوئی بات کہنا سوئے ادب ہے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ قسم کے لحاظ سے معروف بہتر ہے کہ حضرت سعدؓ نے قسم کھا کر کہا میں اس کو مومن سمجھتا ہوں، قسم کے لئے شک کی بات موزوں نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ بات اس لئے کمزور ہے کہ **واللہ لاظنہ کذا** کہا جاتا ہے، یعنی قسم بخدا میں فلاں کو ایسا گمان کرتا ہوں، اگر قسم کے لئے صرف یقینی بات ضروری ہوتی تو ظن وگمان پر قسم جائز نہ ہوتی، حالانکہ وہ قطعاً جائز ہے۔

اومسلما کا مطلب

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا کہ او یہاں (بسکون واؤ) تقسیم وتنویع یا شک کے لئے ہے اور جس نے او (بفتح واؤ) کہا

اس نے لفظی غلطی و معنوی پیچیدگی پیدا کی۔ مقصد شارع یہ ہے کہ دونوں لفظ کہے جائیں۔ اس میں احتیاط ہے کہ کسی کے ایمان کے بارے میں (جو باطن کی چیز ہے) کوئی قطعی حکم نہ لگایا جائے بعض نے او کو بمعنی بل کہا ہے' گویا پہلی بات سے ہٹا کر تلقین فرمائی کہ مومن نہیں مسلم کہو' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کے ایمان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شک تھا بلکہ حدیث میں انہی کے متعلق حضورؐ نے بڑی مدح فرمائی ہے۔

جعیل بن سراقہ کی مدح

وہ بڑے جلیل القدر صحابی تھے' پورا نام جعیل بن سراقہ ضمریؓ ہے' ان کی بڑی منقبت یہ ہے کہ ایک روز فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا "تم جعیل کو کیسا سمجھتا ہو؟" عرض کیا جیسے اور عام مہاجرین ہیں" فرمایا اچھا فلاں شخص کو کیسا خیال کرتے ہو؟ عرض کیا" وہ تو سرداروں میں سے ایک سردار ہیں" اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا (سن لو!) تمہارے ممدوح سردار جیسے لوگوں سے اگر ساری زمین بھر جائے تو ان سب سے یہ جعیل افضل ہیں"۔

اس پر عرض کیا کہ وہ فلاں شخص ایسا ہے تو حضورؐ آپ کے ساتھ خصوصی احسان کا معاملہ کیوں فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ اپنی قوم کا سردار ہے' میں اس کے ذریعہ ان سب کی تالیف قلب کرتا ہوں"۔ (مسند محمد بن ہارون الرویانی وغیرہ باسناد صحیح)

ایک اشکال وجواب

پھر یہ اشکال رہتا ہے کہ جب وہ ایسے تھے' تو ان کے بارے میں آپ نے حضرت سعد کو مومن کہنے پر کیوں ٹوکا۔ جواب یہ ہے کہ بیشک ان کے بارے میں اسلام وایمان کے متعلق کوئی شک وتردد نہیں تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور اصلاح' تنبیہ وتادیب اس اصول کی طرف رہنمائی فرمائی کہ کسی کے باطن یا کسی کے مرتبہ عنداللہ کے لئے وثوق وجزم کی بات اور وہ بھی پیغمبر کی موجودگی میں کچھ کہنا مناسب نہیں' چنانچہ اسی طرح جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک انصاری کے بچہ کی وفات پر فرمایا کہ وہ خوش قسمت تو جنت کی ایک چڑیا ہے' حضور نے ان کو بھی ٹوکا کہ ایسی بات مت کہو' حالانکہ یہ بات معلوم تھی کہ وہ ایک مسلمان کا بچہ تھا اور مسلمانوں کی نابالغ اولاد سب جنت میں جائے گی جو کچھ اختلاف ہے اولاد مشرکین میں ہے' غرض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھی ایک اصولی بات کے پیش نظر اصلاح فرمائی خاص جزی کسی جگہ مقصود نہ تھی' اصولی بات یہی ہے کہ امور غیب کے متعلق قبل از علم کوئی حتمی بات کہہ دینا مناسب نہیں' خصوصی صاحب شریعت کی موجودگی میں کہ وہ ان سب میں زیادہ علم والا ہے لہٰذا ہر بات کے اندر اس کی رہنمائی کا انتظار کرنا چاہئے نہ یہ کہ اپنی طرف سے پیش قدمی کر کے کچھ کہا جائے۔ اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جب کسی بات کا سوال کیا جاتا تھا تو ان کا اکثری جواب "اللہ ورسولہ اعلم" ہوا کرتا تھا یعنی خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔

حدیث سے ترجمہ کی مطابقت

امام بخاریؒ نے ترجمہ وعنوانِ باب یہی رکھا تھا کہ جب اسلام حقیقت ونفس الامر کے لحاظ سے صحیح نہ ہو تو وہ معتبر نہیں تو حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایسا اسلام ایمان سے مغایر ہوگا دوسرے یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے درس کے وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک آیت **ولکن قولوا اسلمنا** منافقین کے بارے میں ہے جیسا کہ انہوں نے کتاب التفسیر میں اس کی تصریح بھی کی ہے تو اس نظریہ سے مزید مطابقت ہوگئی اگرچہ تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ لوگ منافق نہ تھے بلکہ وہ سب مسلمان ہی تھے لیکن ابھی تک ایمان ان کے دلوں میں مستحکم نہ ہوا تھا چنانچہ حافظ ابن کثیر نے بھی آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہی تحقیق درج کی انہوں نے لکھا:۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اومسلما فرما کر) مومن ومسلم کے مفہوم میں تفریق کی اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اخص ہے اسلام سے" اور اسی کو ہم نے شرح کتاب الایمان بخاری کے اوّل میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے **وللہ الحمد والمنتہ** نیز حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ شخص مسلم تھا منافق نہ تھا جس کو آپ نے اس کے اسلام ہی پر بھروسہ کر کے امداد وعطیہ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

نیز یہ معلوم ہوا کہ جن اعراب کا ذکر آیت میں ہوا ہے وہ بھی منافق نہ تھے بلکہ مسلمان ہی تھے البتہ ایمان نے ان کے دلوں میں ابھی جڑ نہیں پکڑی تھی اور انہوں نے ایسی ہی حالت میں اپنے لیے ایسے اعلیٰ مقام کا دعویٰ کر دیا جس پر ابھی نہ پہنچے تھے اس لیے حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ و تادیب ہوئی یہی رائے حضرت ابن عباس، ابراہیم نخعی و قتادہ کی ہے اور ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

یہ وضاحت ہم نے اس لیے کی کہ امام بخاریؒ کی رائے یہ ہے کہ وہ لوگ منافق تھے اسلام ظاہر کرتے تھے مگر حقیقت میں مسلمان نہ تھے اور سعید بن جبیر مجاہد و ابن زید سے "ولکن قولو ا اسلمنا" کے بارے میں یہ معنی نقل ہوئے کہ ہم نے بادلِ نخواستہ خوفِ قتل و قید کے سبب اسلام قبول کیا ہے۔

پھر ان میں سے مجاہد نے کہا کہ یہ آیت بن اسد کے بارے میں اتری ہے اور قتادہ نے ان لوگوں کے بارے میں بتلائی جنہوں نے اپنے ایمان کا احسان رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جتلایا تھا مگر صحیح قول اوّل ہی ہے کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے لیے مقامِ ایمان پر وصول کا دعویٰ کیا تھا حالانکہ وہ مقام اس وقت تک ان کو حاصل نہ ہوا تھا لہٰذا ان کو ادب سکھایا گیا اور خبردار کیا گیا کہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان کی حلاوت نہیں اتری ہے اور اگر وہ منافق ہوتے (جیسا کہ امام بخاریؒ نے سمجھا) تو ان کی زجر و فضیحت کا طریقہ وہ ہوتا جو سورۃ براءۃ میں منافقین کے لیے اختیار ہوا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۱۹ ج ۴ طبع مصطفیٰ محمد مصر)

ایک سوال یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا قول حضرت جعیلؓ کے بارے میں کیوں قبول نہیں فرمایا۔ جواب یہ ہے کہ ان کا قول بطور شہادت کے نہ تھا بلکہ بطورِ مدح تھا تا کہ اس سے ان کے لیے کچھ طلب کریں اسی لیے ان کی ضرورت کا خیال و فکر کر کے بار بار عرض و معروض کرتے رہے۔

دوسرے یہ کہ ایک لحاظ سے اس کو قبول بھی فرمایا اسی لیے حضور نے ان کے احب ہونے کی طرف اشارہ فرمایا اور عدم عطا کی حکمت بھی ظاہر فرمائی (عمدۃ القاری ۱/ ۲۲۷)

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے اس حدیث الباب کے نہایت اہم گیارہ فوائد ذکر کیے ہیں جو بغرضِ افادۂ ہدیہ ناظرین ہیں۔

۱۔ ولاۃ حکام وغیرہ کے یہاں کسی کے لیے سفارش کرنا جائز ہے۔

۲۔ ایک ہی معاملہ میں ضرورت ہو تو بار بار سفارش کی جا سکتی ہے بشرطیکہ کوئی مفسدہ اس میں نہ ہو۔

۳۔ جب تک کوئی بات کسی کے متعلق قطعی طور سے معلوم نہ ہو کوئی قطعی رائے ظاہر کرنے میں جلد بازی نہ کرنی چاہئے۔

۴۔ امام وقت کو چاہئے کہ مصالح مسلمین میں صرف اموال کے وقت الاہم فالاہم کا اصول اختیار کرے۔

۵۔ جس سے سفارش کی گئی ہے اگر وہ اس سفارش کو خلاف مصلحت ہونے کی وجہ سے رد کر دے تو اس پر عتاب یا ملامت نہ چاہئے۔

۶۔ البتہ اس کو چاہئے کہ سفارش کرنے والے سے معذرت کر دے اور جو عذر و مصلحت ہو اس کو بھی ظاہر کر دے۔

۷۔ سفارش کرنے والا بھی اپنی پیش نظر مصلحت کو اس حاکم وغیرہ پر ظاہر کر دے تا کہ وہ بھی اس میں غور و تامل کر سکے۔

۸۔ کسی شخص کیلئے جنتی ہونے کا یقینی فیصلہ نہ کرنا چاہئے ہاں جن کا جنتی ہونا نص شرعی سے معلوم ہو جائے وہ دوسری بات ہے جیسے صحابہ میں سے عشرہ مبشرہ۔

۹۔ صرف اقرار باللسان کافی نہیں جب تک کہ اعتقاد قلبی نہ ہو اور اس پر اجماع ہے اسی لئے منافقوں کو کافر قرار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ علماء نے کہا کہ اس سے ظن و گمان کے مطابق حلف اٹھانے کا جواز معلوم ہوا جس کو یمین لغو کہا جائے گا یہ (۱) قول امام مالکؒ اور جمہور کا ہے، میں کہتا ہوں کہ یمین لغو میں امام مالک کے قول مذکور کے علاوہ پانچ اقوال اور ہیں (۲) امام شافعیؒ کا قول ہے کہ بغیر ارادہ کے سبقت لسانی سے یمین کا کلمہ کہہ دیا جائے جیسے بعض لوگ لا واللہ اور بلی واللہ کہہ دیا کرتے ہیں ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کے قول سے ہے جو مرفوعاً نقل ہوا ہے کہ لا واللہ اور بلی واللہ کہنا یمین لغو ہے ایک روایت میں یہی رائے امام محمدؒ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نقل کی ہے لیکن

ہمارے اصحاب کی (۳) مشہور رائے یہ ہے کہ لغو یمین کسی بات پر اپنے علم کے مطابق حلف اٹھانا ہے جبکہ واقع میں وہ بات اسی طرح نہ ہو مثلاً زمانہ گذشتہ کے بارے میں کہے کہ واللہ میں فلاں جگہ گیا تھا اور دل میں یہی خیال ویقین بھی ہے مگر واقع میں گیا نہیں تھا یا برعکس ہو یا موجودہ زمانہ میں اس طرح ہو کہ ایک شخص کو آتے دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ وہ زید ہے واللہ انہ لزید کہہ دیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ عمرو ہے۔ وغیرہ۔

۱۱...... قاضی عیاض نے فرمایا کہ یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح دلیل اس امر کی ہے کہ اسلام وایمان میں فرق ہے ایمان باطن اور عمل قلب سے ہے اور اسلام ظاہر وعمل جوارح سے ہے لیکن ایسا نہ ہوگا کہ کوئی مومن تو ہو اور مسلم نہ ہو البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلم ہو مگر مومن نہ ہو۔ حدیث کے الفاظ سے یہی بات معلوم ہو رہی ہے۔

خطابی نے فرمایا کہ اس حدیث کے ظاہر سے ایمان واسلام میں فرق کرنا ضروری ہو گیا' ایک شخص کو مسلم یا مستسلم کہہ سکتے ہیں مگر مومن نہیں کہہ سکتے اور کبھی دونوں بھی ایک ساتھ ہو سکتے ہیں کہ مومن مسلم بھی ہو اور مسلم مومن' اس کی زیادہ تحقیق اول کتاب الایمان میں گزر چکی ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۱/ ۲۲۸)

باب: افشآء السلام من الاسلام وقال عمار ثلث من جمعهن فقد جمع الایمان الانصاف من نفسک وبذل السلام للعالم والانفاق من الاقتار.

۲۷- حدثنا قتیبة قال حدثنا اللیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الخیر عن عبداللہ ابن عمرو ان رجلاً سال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ای الاسلام خیر قال تطعم الطعام وتقرء السلام علیٰ من عرفت ومن لم تعرف.

باب: (سلام کا رواج اسلام میں داخل ہے اور حضرت عمار نے فرمایا کہ تین باتیں جس میں اکٹھی ہو جائیں اس نے گویا پورے پورے ایمان کو جمع کر لیا' اپنے نفس سے انصاف' سب لوگوں کو سلام کرنا اور تنگدستی میں (اپنی ضرورت کے باوجود راہ خدا میں) خرچ کرنا)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا اسلام بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا کھانا کھلاؤ اور ہر واقف وناواقف شخص کو سلام کرو۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہی حدیث پہلے بھی روایت کی تھی جو نمبر ۱۱ پر گزری ہے' رواۃ حدیث بھی لیث سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص تک ایک ہی ہیں' صرف ایک راوی عمرو بن خالد کی جگہ یہاں قتیبہ ہیں' امام بخاریؒ کے ان دونوں شیوخ نے حدیث مذکور کو الگ الگ عنوان سے پیش کیا تھا' اس لئے امام بخاری نے بھی ان کی پیروی کی ہے۔

وہاں اطعام طعام کے تحت لائے تھے' یہاں افشاء سلام کے ذیل میں' ترجمۃ الباب میں حضرت عمار[1] رضی اللہ عنہ کا قول ذکر ہوا ہے اور یہ قول بطریق حدیث مرفوع بھی حضرت عمار سے شرح السنۃ بغوی میں روایت ہوا ہے۔

حضرت عمار نے جن تین باتوں کا ذکر فرمایا ہے علماء نے لکھا کہ وہ مدار اسلام اور جامع خیرات وحسنات ہیں کیونکہ جس نے اپنی ذات

---

[1] حضرت عمار مشہور صحابی ہیں جن کے مناقب وفضائل کثیر ہیں' ان کے والد یاسر' والدہ سمیہ تھیں۔ تینوں ابتدائی دور کے مسلمان ہیں' حضرت سمیہ کو ابوجہل نے اسلام لانے ہی کے باعث قتل کیا تھا' اور وہ دور اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ تھیں' ان تینوں کو کفار قریش سخت سخت تکالیف وعذاب میں مبتلا کیا کرتے تھے تا کہ اسلام سے باز آ جائیں مگر نہایت پامردی سے اسلام پر قائم رہے۔ مکی زندگی میں بسا اوقات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ان کے پاس سے ہوتا تھا جب کہ کفار ومشرکین ان کو طرح طرح کے عذاب دیتے ہوتے تھے' آپ ان سے فرماتے کہ اے آل یاسر! صبر کرو یقیناً تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

حضرت عمار بدر وغیرہ تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے ہیں' پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ طیبہ کی طرف آپ ہی کے بارے میں آیت "الامن اکرہ و قلبه مطمئن بالایمان" نازل ہوئی تھی' آپ سے ۶۲ حدیثیں مروی ہیں آپ نے حسب پیشگوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "ویح عمار تقتله الفئة الباغیة" صفین کے میدان میں ۳۷ھ میں بعمر ۷۳ یا ۷۴ سال شہادت پائی واللہ اعلم۔ آپ کی شہادت پر ایک علمی لطیفہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

سے "فیما بیناہ و بین اللہ"۔ اوراسی طرح مخلوق سے حق وانصاف کا معاملہ کیااورخدا' مخلوق نیز اپنے حقوق میں سے کسی کا کوئی حق ضائع نہ ہونے دیاتو اس نے طاعت کا حق ادا کردیا۔

دوسری چیز سلام کو عالم میں پھیلانا' یعنی بجز مانع شرعی کے ہرایک پر سلام پیش کرنا یہ بھی مکارم اخلاق کے بہت اونچے درجات میں سے ہے' جس کے اندر دو باتیں خود بخود آجاتی ہیں' تواضع یعنی عدم ترفع وبڑائی اور کسی کو حقیر نہ سمجھنا' دوسرے اپنے مخلوق کے تعلقات کی اصلاح' اس طرح کہ کسی سے بغض وکینہ نہ ہو' جو سلام سے رکاوٹ بنا کرتا ہے' تیسری چیز باوجود تنگ دستی وافلاس کے دوسروں کی امداد ودستگیری کرنا ہے یہ بھی جودوکرم کا اعلیٰ مرتبہ ہے اوراس میں تمام ہی نفقات ومصارف شامل ہیں' مثلاً مصارف اہل وعیال' مصارف مہمانان' سائل کو دادودہش وغیرہ۔

غرض حق تعالیٰ کی طاعت کے طور پر تمام نفقات ومصارف ادا کرنا اس کی دلیل ہے کہ خدا پر مکمل بھروسہ ہے' دنیا سے بے رغبتی' بہت سی لمبی چوڑی امیدیں باندھنے سے احتراز موجود ہے' یہ سب آخرت کے اہم طرق میں سے ہے۔ **نسال اللہ التوفیق لسائر وجوہ الخیر لنا ولاحبابنا ولسائر المسملین**۔ آمین۔

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس ارشاد میں ایمان کی تمام خصلتیں آگئی ہیں۔ اس لئے کہ وہ مالی ہوں گی یا بدنی' بدنی کی دوقسم ہیں۔ ایک کا تعلق خالق سے ہے' دوسری کا مخلوق سے' **انفاق من الاقتار** سے مالی خصلت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مال کو دوسروں پر جب ہی خرچ کرے گا کہ اس کو خدا کی ذات پر پورا اعتماد ہواور جو صرف مال کو باعث افلاس وفخر نہ سمجھے بلکہ ترقی وبرکت کا سبب جانے۔

اپنے نفس سے انصاف اس سے حق تعالیٰ کے تمام اوامرونواہی کی بجاآوری کی طرف اشارہ ہے' کیونکہ جو شخص اپنے نفس سے محاسبہ کرے گا' یا خود اپنے نفس کو انصاف کا خوگر کرے گا' وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد سب ادا کرسکے گا' اسی طرح افشا اسلام سے حسن اخلاق ومعاشرت کی طرف اشارہ ہے۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اعمال کی اہمیت تکمیل ایمان کے لئے بہت زیادہ ہے ان کو بے حیثیت سمجھنا بڑی غلطی ہے۔

امام نوویؒ نے اپنی کتاب' **الاذکار المنتجة من کلام سید الابرار**' میں "سلام" کے مستقل عنوان کے تحت کئی ورق میں اس کے متعلق مسائل کی تفصیل کی ہے' جو بہت اہم وقابل مطالعہ ہے' اس سے چند چیزیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ مسنون طریقہ بغیر ہاتھ کے اشارہ کے ہر ملنے والے کو "السلام علیکم" کہنا ہے اس کے ساتھ اگر ورحمۃ وبرکاتہٗ ومغفرتہٗ زیادہ کرے گا تو ہر کلمہ پر دس نیکیوں کا اضافہ ہوگا۔ گویا ان چاروں کلمات ادا کرنے والے کو چالیس نیکیاں ملیں گے۔

(السلام علیکم کی جگہ سلام علیکم یا علیک السلام وغیرہ کہنا یا خطوط میں سلام مسنون کا لفظ لکھنے سے پوری سنت ادا نہ ہوگی۔ ترمذی ونسائی میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے علیک السلام یارسول اللہ! حضور نے ارشاد فرمایا' یہ مردوں کا سلام وتحیہ ہے' تم آپس میں السلام علیکم کہا کرو)۔

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسن واکمل طریقہ کی طرف رہنمائی فرمائی۔ یہ غرض نہیں کہ سلام ہی نہیں ہے۔ اس لئے جواب اس کا بھی واجب ہوگا۔

(۲) دوروالے آدمی کو سلام یا اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ بھی کرسکتے ہیں' مگر صرف اشارہ سلام نہیں ہے۔

(۳) سلام اس طرح کرنا چاہئے کہ سننے والا اچھی طرح سے سن لے اور جواب میں اس کا مزید اہتمام کرنا چاہئے اس لئے کہ جواب سلام واجب ہے اوراس لئے بھی کہ سلام کرنے والے کی یہ سمجھ کر دل شکنی نہ ہو کہ میرا جواب نہیں دیا۔

(۴) سلام اوراس کے جواب کا طریقہ حاضر کی طرح غائب کے لئے بھی مشروع ہے' اس لئے زبانی پیام یا خط میں بھی اس کو رواج دینا چاہئے اور ہر بات سے مقدم سلام ہی کو کرنا چاہئے' زبانی سلام کے جواب میں علیہ وعلیکم السلام کہے' اور خط میں پڑھ کر وعلیہ السلام کہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری ومسلم میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ یہ جبرائیل تم کو سلام کہتے ہیں'

میں نے یہ سن کر وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا' حضرت عائشہؓ کی بڑی منقبت ہے کہ حضرت جبرائیل نے سلام پیش کیا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی منقبت وفضیلت اس سے بھی زیادہ آئی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ خدیجہ آپ کے پاس آ رہی ہیں' ان کو حق تعالیٰ کا سلام پہنچائے گا۔ یہ واقعہ غار حرا مکہ معظمہ کا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک اجنبی عورت کو بھی سلام کہلا سکتے ہیں جبکہ ہر دو طرف صلاح وتقویٰ کی شرط پوری ہو اور کسی فتنہ ومفسدہ کا خطرہ نہ ہو ورنہ اس کی وجہ سے یہ مشروع چیز ممنوع ہوگی۔

(۵) سلام کا جواب اسی وقت دینا چاہئے' اگر دیر کے بعد دیا تو ادا نہ ہوگا اور ترک واجب کا گناہ ہوگا۔

(۶) اگر ایک جماعت کو سلام کہا گیا اور ان میں سے صرف ایک نابالغ لڑکے نے جواب دیا تو بعض علماء کی رائے ہے کہ جواب سب کی طرف سے ادا نہیں ہوا جس طرح ایک نابالغ کسی جنازے کی نماز پڑھ دے تو نماز کفایہ ادا نہیں ہوئی دوسرے علماء نے کہا کہ ادا ہو گیا' جس طرح نابالغ کی اذان صحیح ہو جاتی ہے۔

(۷) اگر ایک دفعہ کسی سے ملاقات ہو کر سلام وجواب ہو گیا' پھر جدا ہو کر درمیان میں کوئی دیوار' درخت یا پتھر وغیرہ حائل ہوا' دوبارہ ملے تو پھر سلام کہنا سنت اور جواب واجب ہے' اسی طرح جتنی دفعہ ملیں گے سلام کرنا چاہئے یہی طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جاری تھا۔

(۸) جس طرح مردوں' بچوں میں سلام کا رواج عام ہونا چاہئے' عورتوں میں بھی اس کی تلقین کر کے عادت ڈالنی چاہئے۔

(۹) حدیث سے ثابت ہے کہ ابتداء بالسلام افضل ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سلام کرنے والے کو دونوں میں سے بہتر فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ خدا سے وہ شخص زیادہ قریب ہے جو سلام کی ابتدا کرے۔

(۱۰) اکثر حالات میں سلام کرنے کی تاکید ہے اور ان میں زندوں اور مردوں دونوں کے لئے سلام کی تاکید ہے' یعنی جب قبروں سے گزر ہو تو مردوں کو بھی سلام کر کے گزرنا چاہئے۔ اگرچہ ان کے لئے سلام کے الفاظ الگ ہیں۔ مگر بعض حالات میں زندوں پر سلام کہنے کی کراہت بھی وارد ہے مثلاً حالت بول وبراز میں' سونے والے پر' کھانا کھانے والے پر (البتہ بھوکا ہو تو کر سکتا ہے) نماز پڑھنے والے پر' اذان دینے کی حالت میں' اقامت صلوٰۃ کہنے کے وقت' خطبہ جمعہ پڑھنے کے وقت' قرآن مجید تلاوت کرنے والے پر' وغیرہ ایسے لوگوں کو اگر کوئی سلام کہے تو ان پر جواب دینا واجب نہیں ہے البتہ وہ جواب دیں تو تبرع واستحباب ہے' بجز مشغول بول وبراز یا نماز پڑھنے والے کے کہ وہ اس حالت میں جواب نہ دیں' فاسق وبدعتی کو بھی ابتدأ سلام نہ کرنا چاہئے کہ اس میں دین کی اہانت ہے وہ کرے تو جواب دیا جائے۔

(۱۱) کفار ومشرکین کو اسلامی سلام نہ کہنا چاہئے' البتہ اخلاق ومروت کے طریقہ پر دوسرے مناسب الفاظ ملاقات کے وقت کہے جا سکتے ہیں' جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل (شہنشاہ روم) کے نام مکتوب گرامی میں **السلام علی من اتبع الھدی** لکھوایا تھا۔

(۱۲) اگر بااقتدار فساق فجار بے دینوں' یا ظالم حاکموں کی مضرت سے بچنے کے خیال سے ابتدأ سلام کہنے کی ضرورت ہو تو کہہ سکتے ہیں' علماء نے لکھا کہ اس میں اس طرح نیت کرے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال واحوال پر واقف ہے کیونکہ سلام خدا کا نام بھی ہے اس طرح ان کے لئے دعاء خیر وبرکت وسلامتی نہ ہوگی جو اسلامی سلام کا مقصد ہے۔

(۱۳) بخاری ومسلم کی احادیث سے ثابت ہے کہ سوار' پیادہ پر' چلنے والا بیٹھنے والے پر اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں پر اور چھوٹے بڑوں پر سلام کہیں' اس میں تواضع کا اظہار اور ان لوگوں کا اکرام وتعظیم ہے' سنت یہی ہے تاہم اگر اس کا برعکس ہو تب بھی مکروہ نہیں ہے اور آنے والے کو بہر صورت ابتدا کرنی چاہئے۔

(۱۴) اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں پر سلام کہنا سنت ہے اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تب بھی سلام کہے اس طرح **السلام علینا و**

علی عباداللہ الصالحین اگر مسجد میں جائے یا کسی دوسرے کے گھر میں جس میں کوئی نہ ہو تو اس طرح کہے۔ **السلام علینا و علی عباداللہ الصالحین، السلام علیکم اہل البیت و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔**

(۱۵) کسی شخص سے ملاقات کے بعد واپسی کے وقت بھی سلام کرنا سنت ہے۔

(۱۶) کسی کے گھر پر جاؤ تو دروازہ پر سلام استیذان کرو۔ **السلام علیکم ادخل؟** یعنی تم پر سلامتی ہو کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ بعد اندر جا کر ملاقات کا سلام ہوگا۔ یہ بھی مسئلہ ہے یہ سلام استیذان تین بار کہہ سکتا ہے اگر اندر سے جواب نہ آئے تو واپس ہو جانا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

بحث ونظر: اوپر ذکر ہوا کہ سلام کی ابتدا سنت ہے اور جواب واجب ہے اور یہ بھی حدیث ہی سے ثابت ہے کہ ابتدا کرنے والا افضل ہے اور اس کو نیکیاں بھی ۹۰ ملتی ہیں اور جواب دینے والا مفضول ہے اور اس کو نیکیاں بھی صرف دس ملتی ہیں، حالانکہ شرعی اصول یہ ہے کہ کسی سنت کا ثواب فرض و واجب کے برابر بھی نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ اس سے اتنا بڑھ جائے، جواب یہ ہے کہ بے شک اصول یہی ہے اور یہ صحیح ہے کہ ہزار رکعت یا زیادہ نفل کا ثواب بھی ایک فرض رکعت کے برابر نہیں ہوسکتا، اسی طرح ایک ہزار یا زیادہ روپے بھی مثلاً صدقہ نافلہ کے طور پر دیئے جائیں تو ایک روپیہ فرض زکوٰۃ یا واجب صدقہ فطر وغیرہ کے برابر نہیں ہوسکتے، اسی لئے رمضان شریف کے بڑے فضائل میں سے یہ بات ہے کہ اس میں نفل کا ثواب فرض کے برابر ہو جاتا ہے اور ایک فرض کا ثواب ستر گنا کر دیا جاتا ہے مگر اس قاعدہ سے تین چیزیں مستثنیٰ ہیں، جن کو علماء نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

الفرض افضل من تطوع عابد　　حتی ولوقد جاء منہ باکثر

الا التطہر قبل وقت وا ابتدا　　ع بالسلام، کذاک ابراء معسر

ایک فرض کی افضلیت کتنے ہی زیادہ نفلوں سے بڑھی ہوئی ہے، مگر وقت نماز شروع ہونے سے قبل باوضو ہو جانا وقت آنے کے بعد وضو کرنے سے افضل ہے، حالانکہ پہلا وضو مستحب اور دوسرا فرض و واجب ہے، اسی طرح اسلام کی ابتداء کہ وہ سنت ہے مگر جواب سے افضل ہے جو واجب ہے تیسری چیز تنگدست بدحال مقروض کو قرض سے بری کر دینا کہ یہ مستحب ہے مگر واجب سے بڑھ کر ہے کہ ایسے شخص کو مہلت دینا واجب ہے اور سختی کر کے مطالبہ کرنا ناجائز ہے اس کو یاد رکھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب...... کفران العشیر وکفردون کفر فیہ عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۸ ...... حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار عن ابن عباس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اریت النار فاذاا کثر اہلہا النسآء یکفرن قیل ایکفرن باللہ قال یکفرن العشیر ویکفرن الاحسان لو احسنت الی احدھن الدھر ثم رأت منک شیئاقالت مارأیت منک خیراقط.

باب...... (خاوند کی ناشکری کا بیان اور ایک کفر کا (مراتب میں) دوسرے کفر سے کم ہونے کا بیان اور اس میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی (ایک روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے دوزخ دکھلائی گئی تو اس میں میں نے زیادہ تر عورتوں کو پایا (کیونکہ) وہ کفر کرتی ہیں آپ سے پوچھا گیا کیا وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں۔ آپ نے فرمایا (نہیں) شوہر کے ساتھ کفر کرتی ہیں اور (اس کا) احسان نہیں مانتیں (ان کی عادت یہ ہے کہ) اگر تم مدت تک کسی عورت پر احسان کرتے رہو (اور) پھر تمہاری طرف سے کوئی (ناگوار) بات پیش آ جائے تو (یہی) کہے گی میں نے تمہاری طرف سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جہنم دکھلائی گئی میں نے دیکھا کہ اس میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی کیونکہ ان

میں مادۂ کفر زیادہ ہے اور جس کے ساتھ مادۂ کفر زیادہ ہوگا وہ جہنم سے زیادہ قریب ہوگا عرض کیا گیا کہ کیا وہ خدا کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اپنے شوہروں کے ساتھ کفر کرتی ہیں اور ایک معنیٰ یہ بھی ہیں کہ ہر تعلق نیل والے سے کفر کرتی ہیں۔ کسی کا احسان نہیں مانتیں بلکہ جہاں کوئی بات خلافِ طبع پیش آئی تمام کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہیں اور جس نے ایک مدت تک احسان کیا ہو اس کو بھی برملا کہہ دیتی ہیں کہ میں نے تم سے کبھی بھی کوئی بھلائی کی بات نہیں دیکھی اسی عام عادتِ ناشکری و بے قدری کے سبب جہنم کا زیادہ حصہ ان سے بھرا جائے گا۔

شوہر کے حقوق

طبرانی میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ترغیب دلائی اور اس کے دینی و دنیاوی فوائد بتلائے تو ایک عورت آپ کی خدمت میں آکر کہنے لگی کہ آپ مجھے شوہر کے حقوق بتلائیں اگر میں وہ حقوق ادا کرسکوں گی تو نکاح کروں گی؟ آپ نے فرمایا شوہر کے حقوق اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر اس کا جسم پھوڑوں سے پک رہا ہو اور عورت اسے اپنی زبان سے چاٹے تب بھی حق ادا نہ ہوگا وہ عورت یہ سن کر گھبرا گئی۔

دوسری حدیث میں ہے کہ شوہر کی اطاعت اس درجہ میں ہے کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو بیوی کو حکم دیا جاتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

شوہر کی اطاعت بڑی عبادت ہے اور اس کو ناراض کرنا بہت بڑا گناہ ہے حدیث میں ہے کہ جب تک وہ ناراض رہے گا خدا کے فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں یہ بھی حدیث میں ہے کہ جب کوئی بیوی اپنے شوہر کو ستاتی ہے تو جو حور اس کو جنت میں ملنے والی ہے وہ کہتی ہے کہ خدا تیرا ناس کرے تو اس کو مت ستا یہ تو تیرے پاس مہمان ہے تھوڑے دن بعد تجھ کو چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے گا۔

اگر مرد بیوی کو حکم دے کہ اس پہاڑ کے پتھر اٹھا کر اس پہاڑ تک لیجائے اور اس کے پتھر اٹھا کر تیسرے پہاڑ تک لے جائے تو اس کو یہ بھی کرنا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کی نہ نماز قبول ہوتی ہے اور نہ کوئی دوسری نیکی، ایک تو وہ باندی یا غلام جو اپنے مالک سے بھاگ جائے، دوسری وہ عورت جس کا شوہر ناراض ہو، تیسرے وہ شخص جو نشہ میں مست ہو، کسی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! سب سے اچھی عورت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا وہ عورت کہ جب اس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو خوش کردے اور جب کچھ کہے تو کہا مانے اور اپنی جان و مال میں کچھ اس کے خلاف نہ کرے اور اطاعت گزار بیوی کے لیے بڑی بشارت آئی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو عورت پانچوں وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی آبرو کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو اس کو اختیار ہوگا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو مطلب یہ ہے کہ جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس دروازے سے اس کا جی چاہے گا جنت میں بے روک ٹوک چلی جائے گی اور یہ بھی ایک حدیث میں ہے کہ جس عورت کی موت ایسی حالت میں آجائے کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو وہ عورت جنتی ہے۔

بقیہ تشریح حدیث الباب

مسلم شریف کے باب العیدین میں یہ تفصیل بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے روز بغیر اذان و اقامت کے نمازِ عید پڑھائی، پھر خطبہ دیا جس میں تقویٰ کی ترغیب دی خدا کی اطاعت کی طرف بلایا اور مردوں کو وعظ و تذکیر کے بعد عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے ان کو بھی وعظ و تذکیر کی پھر فرمایا تمہیں صدقہ و خیرات زیادہ کرنی چاہیے کیونکہ تم میں سے زیادہ تعداد جہنم کا ایندھن ہے۔

یہ سن کر مجمع کے درمیان سے ایک عورت کھڑی ہوئی جس کا نام اسماء بنت یزید تھا اور وہ خطیبۃ النساء مشہور تھیں ایک روایت خود ان سے بھی مروی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ''(میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں بے تکلفی اور بے باکی سے بات کرسکتی تھی اس لیے میں درمیان سے بول پڑی اور بلند آواز سے سوال کربیٹھی۔''

عرض کیا کہ یارسول اللہ ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا ''اس لیے کہ تم شکوہ شکایت کے دفتر بہت کھولتی ہو اور اپنے شوہروں و محسنوں کی ناشکری کرتی ہو۔'' اِس پر سب عورتیں اپنے زیوروں میں سے کوئی نہ کوئی زیور صدقہ کی نیت سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جھولی میں

ڈالنے لگیں کسی نے ہاتھ کی انگوٹھی، کسی نے کان کی بالی دی وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ یہ صدقہ فطر نہیں تھا بلکہ دوسرا صدقہ نافلہ تھا کہ جس سے جو ہوا سو دیا تا کہ حق تعالیٰ کے غضب وعتاب سے بچنے کا ذریعہ ہو اور جہنم سے پناہ ملے، حضرت عطاء راویِ حدیث نے بھی یہی بتلایا کہ یہ صدقہ فطر نہیں تھا۔

محدثین نے لکھا ہے کہ "تکفرن العشیر بیان ہے تکثرن الشکاۃ" کا کہ اپنے شوہروں کی شکائتیں بیان کرتی ہیں اور ان کے احسانات کو چھپاتی ہیں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے وہ عورت مبغوض ہے جو اپنے گھر سے چادر گھسیٹتے ہوئے نکلتی اور شوہر کی شکایات دوسروں تک پہنچاتی ہے۔

ایک حدیث میں یہ جملہ بھی مروی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے عورتوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا جوان سے زیادہ کسی عقلمند پختہ کار آدمی کی عقل کو خراب کرنے والا ہو باوجود اس کے کہ خود ان کی عقل و دین دونوں ناقص ہیں عورتوں میں سے کسی نے سوال کیا کہ ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ نے فرمایا، کیا ہر مہینہ کے ایک معتد بہ حصہ میں تم نماز وروزہ کے ادائیگی سے محروم نہیں ہو؟ یہی دین کا نقصان ہے، عرض کیا کہ عقل کا نقصان کیا ہے؟ فرمایا کیا تم میں سے دو کی شہادت ایک مرد کے برابر نہیں؟ یہ بات نقصانِ عقل ہی کے سبب تو ہے۔

فوائد علمیہ: علامہ عینیؒ نے حدیث الباب سے چند فوائد کا استنباط کیا ہے ان میں سے چند ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱)......حقوق ونعمتوں کی ناشکری حرام ہے کیونکہ بغیر ارتکابِ حرام کے دخولِ جہنم نہ ہوگا، امام نووی نے لکھا کہ شوہر اور احسان کی ناشکری پر دخولِ نار کی وعید سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں باتیں گناہِ کبیرہ ہیں۔

ابن بطال نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندوں کو احسان ونعمت کی ناشکری پر عذاب ہوگا اور کہا گیا ہے کہ شکرِ نعمت واجب ہے۔

(۲) حدیث سے شوہر کے حق کی عظمت ظاہر ہوئی کیونکہ اس کی ناشکری کو اقسام معاصی سے شمار کیا گیا اور اس سے زیادہ یہ کہ شوہر کے حق کو حق تعالیٰ کے حق کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا چنانچہ فرمایا گیا اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم کرتا تو بیوی کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے اسی لیے خاص طور پر دوسرے سب معاصی میں سے عورتوں کی اس خاص معصیت کا بیان فرمایا پس اگر اس کے باوجود کوئی عورت اپنے شوہر کی ناشکری وشکایت کر کے اس کی حق تلفی کرے گی تو یہ اس امر کا ثبوت ہوگا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے حقوق میں بھی لاپرواہی ہو گی، لہٰذا اس پر کفر کا اطلاق بھی درست ہوگا، فرق یہ ہوگا کہ اس کفر کی وجہ سے وہ ملت سے خارج نہ ہوگی۔

(۳) معلوم ہوا کہ جہنم اس وقت بھی مخلوق وموجود ہے جو اہلِ سنت کا مذہب ہے۔

(۴) معلوم ہوا کہ انکارِ حق وناشکری پر کفر کا اطلاق کر سکتے ہیں۔

(۵) ثابت ہوا کہ معاصی سے ایمان میں نقص آتا ہے لیکن وہ مستلزم کفر نہیں ہے جو دخولِ نار کا سبب ہوتا ہے کیونکہ صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ وہ خدا کے ساتھ کفر کرتی ہیں، آپ نے فرمایا نہیں بلکہ وہ شوہر کے ساتھ کفر کرتی ہیں۔ (عمدۃ القاری ص ۱/۲۳۷)

بحث ونظر: حدیث الباب کے تمام راوی مدنی ہیں، سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اور انہوں نے بھی مدینہ منورہ میں اقامت فرمائی تھی دوسرے یہ کہ تمام راوی جلیل القدر ائمہ کبار ہیں۔

کل تعداد احادیث بخاری شریف

علامہ عینیؒ نے اس موقع پر بھی لکھا کہ امام بخاریؒ نے یہاں حدیث کا ایک ٹکڑا بیان کیا ہے اور دوسری جگہ اسی اسناد سے پوری حدیث لائے ہیں تو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے لانے سے امام بخاریؒ کا مقصد مختلف قسم کے تراجم وعنوانات قائم کرنا ہوتا ہے اور ان کا اس طرح کرنا اس لئے قابل اعتراض نہیں کہ وہ ایسے ٹکڑے نہیں کرتے، جن سے معنی میں کوئی خرابی یا فساد آئے' پھر لکھا کہ اس طرح ٹکڑوں کی وجہ سے

بعض شمار کرنے والوں نے کل احادیث صحیح بخاری کی تعداد بغیر تکرار کے کم وبیش چار ہزار بتلائی ہے‘ ابن صلاح‘ نووی اور بعد کے لوگوں نے اسی طرح کیا ہے‘ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور بغیر تکرار کے کل تعداد ۲۵۱۳ سے زیادہ نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۱/ ۲۳۵)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک صحیح امام بخاریؒ کا یہ ترجمہ کفران العشیر وکفر دون کفر مشکل تراجم میں سے ہے اور دوسرا جملہ کفر دون کفر مرفوع حکائی ہے‘ اس لئے کہ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کا قول ہے‘ دیکھو تفسیر ابن کثیر ذیل تفسیر آیت **و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون** (ص ۹۱/۲) اور وہاں یہی رائے حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل ہوئی ہے‘ یعنی کفر دون کفر والی‘ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے ذیل میں تو صرف عطاء کی طرف اس کو منسوب کیا ہے‘ دیکھو فتح ص ۱/ ۶۳ مگر آگے دوسرے باب ظلم دون ظلم میں اس رائے کو حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی منسوب کیا ہے (ملاحظہ ہو فتح ص ۱/ ۶۵)

اس سے معلوم ہوا کہ اس بات کی اصل حضرت ابن عباسؓ سے ہے اور حضرت عطاء نے بھی غالباً آپ سے ہی اس کو لیا ہے کیونکہ وہ آپ کے تلمیذ ہیں۔

ایک بحث یہ ہے کہ "**کفر دون کفر**" میں **دون** کے معنی کیا ہیں؟ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ دون بمعنی اقرب ہے اور مجھے یہی معنی پسند ہے‘ بعض نے بمعنی غیر لیا ہے‘ یہ میرے نزدیک مرجوح قول ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے بمعنی غیر والا معنی پسند ہے‘ پھر حافظ نے اس کی شرح قاضی ابوبکر بن العربی کی طرح کی ہے‘ جو حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق سے مطابقت رکھتی ہے‘ اس کا حاصل یہ ہے کہ ایمان چونکہ مرکب ہے تو ممکن ہے کہ ایک مومن کے اندر بعض اشیاء کفر کی ہوں اور ایک کافر میں کچھ باتیں ایمان کی موجود ہوں جیسے کبر کہ وہ اصاف کفر میں سے ہے مگر کبھی کسی مسلمان میں بھی ہوتا ہے یا حیا کہ وہ اصاف ایمان میں سے ہے‘ مگر کبھی کافر میں بھی ہوتی ہے پس اسلام کا دائرہ بہت طویل وعریض ہے اس کا اعلیٰ درجہ لا الہ الا اللہ ہے اور ادنیٰ درجہ راستہ سے گزرنے والوں کو تکلیف سے بچانے کی نیت سے تکلیف دہ چیزیں ہٹانا دونوں کے درمیان محصور مراتب ہیں۔

اسی طرح کفر کا دائرہ بہت وسیع ہے‘ پس جس طرح نجات کا باعث وموجب مرتبہ اخیرہ کا ایمان ہے۔ ایسے ہی کفر مہلک کا حال بھی ہے کہ وہ بھی اسی مرتبہ میں ہوگا‘ پھر ادنیٰ واعلیٰ کفر کے درمیان غیر محصور مراتب ہیں۔

اس کی نظیر ہمارے سمجھنے کے لئے صحت ومرض ہے کہ ایک تندرست آدمی میں بعض اوقات کچھ امراض بھی ہوتے ہیں اور مریض میں کچھ وجوہ صحت کے بھی ہوتے ہیں مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ تقریر محدثین ومفسرین کے طرز تحقیق کے مناسب ہے متکلمین وفقہا کے طور تدقیق پر موزوں نہیں کیونکہ ان کی دقیق نظر ایک نقطہ مدار نجات پر مرکوز ہے جو صرف ایک مرتبہ محفوظ اخیرہ ہی ہوسکتا ہے‘ دوسرے مراتب نہیں ہوسکتے‘ لہٰذا ان کے یہاں ایمان وکفر کا اجتماع بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔

اس اختلاف مذکور کی مثال ایسی ہے جیسے اطباء میں اختلاف ہوا ہے کہ جالینوس نے تین احوال مانے ہیں‘ صحت مرض اور درمیانی حالت‘ ابن سینا نے صرف دو حالتیں مانیں‘ صحت‘ یا مرض‘ درمیانی حالت کا انکار کیا‘ اس طرح اندھے کو جالینوس کے نظریہ پر نہ تندرست کہہ سکتے ہیں (کہ حاسہ بصر سے محروم ہے) اور نہ مریض (کیونکہ باقی اعضا صحیح ہیں) ابن سینا کی تحقیق پر وہ مریض ہی کہلائے گا۔

اس تفصیل کے بعد ان سب احادیث کا حل بغیر کسی تاویل کے نکل آیا‘ جن میں کبائر معاصی پر کفر کا اطلاق ہوا ہے جیسے **من ترک الصلوٰۃ متعمد افقد کفر**[1] وغیرہ۔

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس حدیث میں لفظ کفر کی چار تاویل کی گئی ہیں۔ (۱) کفر بمعنی قرب الکفر ہے کہ کفر کے قریب پہنچ گیا‘ لہٰذا حکم کفر نہیں ہے لیکن یہ تاویل بے معنی ہے کیونکہ حدیث میں نماز ترک کرنے والے کی موجودہ حالت بیان ہورہی ہے اور اسی پر کفر عائد کیا جارہا ہے‘ کسی دوسری حالت پر نظر نہیں ہے (۲) من ترک الصلوٰۃ مستحلا مراد ہے یعنی جو شخص ترک الصلوٰۃ کی طرح جائز سمجھے گا‘ کافر ہوجائے گا (۳) مراد فعل فعل الکفر ہے‘ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حافظ ابن حجر کی رائے پر تنقید

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے ترجمۃ الباب اور اس کے بعد کے ایک ترجمہ **باب ظلم دون ظلم** دونوں کا مقصد ایک ہی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ امام بخاری نے جس طرح اسلام کے مراتب قائم کئے تھے ضروری تھا کہ کفر کے بھی مراتب بتلاتے اور دون بمعنی اقرب ہے اس سے بھی مراتب ہی کی طرف اشارہ ہے لہٰذا کفر ایک نوع ہے جس کے تحت بہت سے مراتب ہیں کوئی شدید کوئی خفیف مگر میری رائے ہے کہ دون بمعنی اقرب نہیں بلکہ بمعنی غیر ہے کیونکہ امام بخاریؒ نے اور بھی کئی جگہ یہ لفظ استعمال کیا ہے اور وہاں قطعاً بمعنی غیر ہی ہے مثلاً باب من خص **قوما دون قوم بالعلم** ای **سوی قوم** اور خود حدیث الباب بھی اسی طرف مشیر ہے کیونکہ اس میں کفر کی دو نوع بتلائیں ایک کفر باللہ دوسری کفران بالعشیر گویا دونوں قسم کو متعلقات کے تغایر سے الگ الگ بتلایا ایک ہی قسم کے مراتب نہیں بتلائے جیسے ایک تصور ہے دوسرا تصور معہ حکم کہ دونوں نوع ہیں علم کی پس کفر و غیر کفر کی صورت متعین ہوگئی اور قاضی ابوبکر بن العربی کی تحقیق کو بھی اسی پر محمول کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ الگ الگ انواع میں بھی مراتب قائم ہوسکتے ہیں بلکہ یہ اس سے بہتر ہے کہ کفر کو ایک ہی نوع مان کر اس کے افراد کے لئے احکام مختلفہ ثابت کئے جائیں۔ یہ بات مستبعد ہے البتہ مختلف انواع کے افراد کے واسطے احکام کا ہونا معقول بھی ہے پس یہاں ایک نوع کو موجب خلود نار اور دوسری کو موجب فسق قرار دیں گے اور اس میں کوئی بعد نہ ہوگا دون کا بمعنی غیر ہونا اور بمعنی اقرب نہ ہونا آیت **ویغفر مادون ذلک لمن یشاء** سے بھی پوری طرح واضح ہے۔ غرض ان سب قرائن سے میں نے یہاں حدیث میں بھی دون کو بمعنی غیر لینا قطعی قرار دیا اور قاضی ابن عربی کی تحقیق کو بھی اسی سے مطابق سمجھا اور یہ فیصلہ کیا کہ امام بخاری کی غرض بھی یہاں تقارب **کفر بالکفر** کا بیان نہیں ہے اور نہ ان احادیث کی شرح مقصود ہے جن میں کفر کا اطلاق معصیت پر ہوا ہے جس کو قاضی ابن عربی کی تحقیق سمجھا گیا۔

حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق

حافظ ابن تیمیہؒ کی تحقیق بھی اگرچہ بہت جید ہے لیکن امام بخاریؒ کے مقصد پر منطبق نہیں ہے کیونکہ امام بخاریؒ تو بظاہر کفر کے تنوع ہی کو بیان کرنا چاہ رہے ہیں اور اس کی مزید تائید دوسرے نسخہ بخاری سے بھی ہوتی ہے جس کو حافظ عینیؒ نے نقل کیا ہے۔ "**و کفر بعد کفر**"

اہم نکتہ: ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر امام بخاری کو تحقیق مذکور مقصود ہوتی تو وہ ایسی کوئی حدیث مثلاً "قتالہ کفر" کسی باب میں ضرور لاتے جس میں کفر کا اطلاق معاصی یا کافر کا عاصی پر ہوا ہے حالانکہ انہوں نے کسی جگہ بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا اور نہ کفر کو شئی واحد اور ایسا طویل وعریض دکھلایا کہ اس کے تحت بہت سے مختلف افراد ہیں بلکہ اسی امر کی طرف اشارہ کیا کہ کفر کئی قسم کے ہیں اور ایک کفر دوسرے کفر کے مبائن ہوتا ہے۔

شبہ وجواب: اگر کہا جائے کہ امام بخاریؒ نے حدیث کفران العشیر تو ذکر کی ہے جواب یہ ہے کہ کفران یہاں بمعنی لغوی ہے یعنی حق ناشناسی" جس کا اطلاق کبھی ایسے امر پر بھی ہوتا ہے جو معصیت بھی نہیں ہوتا۔

دوسرا شبہ وجواب: اگر کہا جائے کہ امام بخاری نے حدیث قتالہ کفر اگلے باب میں روایت کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ لائے ہیں وہاں باب کا عنوان کفر دون کفر قائم نہیں کیا ہے غرض جہاں ایسا ترجمہ قائم کیا ہے کہ اس سے اشارہ حافظ ابن تیمیہ والی تحقیق کی طرف نکل سکتا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس نے کفر کا کام کیا یہ تاویل قابل قبول ہے (۴) **فقد کفر بکفر دون کفر** ایسا کفر نہیں ہوا جو سبب خلود نار ہو بلکہ ایسا ہوا کہ جس نے اس کے اسلام کی بڑی خوبی کو زائل کردیا اور کفر کی برائی کے داغ سے اس کو داغدار بنادیا یہ تاویل حافظ ابن تیمیہ وغیرہ کی ہے جو سب سے بہتر ہے اور اس تحقیق پر لفظ کافر کا اطلاق عاصی پر جائز ہے کیونکہ مبداء کفر کا اس میں پایا گیا تاہم مجھے زیادہ پسند یہ ہے کہ ایسے شخص پر کفر کا اطلاق نہ ہو اگرچہ بظاہر صحیح بھی ہو کیونکہ اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہوں گے پہلے حنفیہ کا نظریہ وضاحت سے بیان ہوچکا ہے کہ وہ ایمان کو ایک خاص مرتبہ محفوظ اخیرہ پر منحصر رکھتے ہیں اس لئے اس آخری تاویل یا تحقیق کو بھی انہوں نے اختیار نہیں کیا۔

وہاں کوئی ایسی حدیث ذکرنہیں کی جس میں کفر کا اطلاق معصیت پر ہوا ہو اور جس جگہ ایسی حدیث لائے ہیں وہاں معہود ترجمہ نہیں باندھا۔

امام بخاریؒ وحافظ ابن تیمیہؒ کے نقاطِ نظر کا اختلاف

اگر امام بخاری کا مقصود وہی تحقیق ہوتی جو حافظ ابن تیمیہؒ کی ہے تو ہمارے نزدیک حسبِ ذیل چند امور بطور قرائن اس کے مؤید ہوتے ہیں۔ (۱) ایک ہی مقام میں ترجمہ وحدیث اس کے مطابق لاتے (۲) اگلے باب میں عاصی پر اطلاقِ کفر سے نہ روکتے حالانکہ بجز شرک کے ہر صورت میں اس کے اطلاق سے روک رہے ہیں۔ (۳) بجائے ولا یکفر کے ویکفر صاحبھا کہتے۔ (۴) ولا یکفر صاحبھا کو کسی قید سے مثلاً کفر باللہ وغیرہ سے مقید کرتے تاکہ وہ مراد پوری ظاہر ہوتی ہمارا خیال نہیں کہ ایسے اہم مواضع میں امام بخاریؒ ناقص عبادت ذکر کرتے۔ (۵) قتل وقتال پر اصرار سے نہ ڈراتے جیسا کہ "باب خوف المومن ان یحبط عملہ وخشیۃ اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی انفسھم النفاق" میں کیا ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ "ایسا مومن فی الحال کافر نہیں ہوا البتہ اس کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے خدا ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے اور ہمارا خاتمہ ملت بیضاء محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوات وتحیات پر کرے۔

پس وہاں کفر کا اطلاق فی الحال نہیں ہے بخلاف تحقیق حافظ ابن تیمیہؒ کے کہ اس کے لحاظ فی الحال کفر کا اطلاق درست ہوتا بکفر دون کفر اس سے معلوم ہوا کہ باب زیر بحث کے ساتھ اگلے دونوں باب لا یکفر صاحبھا والا اور تحذیر مذکور والا ملانے سے امام بخاری کا مقصد پوری طرح وضاحت میں آجاتا ہے اور تحقیق مذکور کو شرح تراجم مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں ہے دوسرے ہمارا غالب خیال یہ ہے کہ امام بخاری نے کفر دون کفر کا عنوان بھی صرف حدیث کے مخصوص الفاظ کی رعایت ولحاظ سے قائم کیا ہے کیونکہ حدیث میں ایک ہی فعل کو اللہ تعالیٰ اور عشیر دونوں کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس سے کفر مختلف قسم کا مفہوم ہوا اسی طرح دوسرے بہت سے مواضع میں بھی امام بخاریؒ نے خصوص الفاظِ حدیث کی رعایت سے تراجم لگائے ہیں۔

امام بخاریؒ کا بلند پایہ علمی مقام

امام بخاریؒ چونکہ علم کے بہت اونچے مقام پر فائز ہیں اس لیے ہم جیسے قلیل البضاعت لوگوں کی رعایت کر کے ہندی کی چندی نہیں کر سکتے نہ انہیں اس کی ضرورت وہ تو اپنے علم کے مقامِ رفیع کے مطابق ہی کلام[1] کریں گے خواہ اس کی وجہ سے محققین حیرت میں پڑیں یا کوتاہ نظروں کو اعتراض کا موقع ہاتھ آئے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تراجم بخاری کا حق جیسا چاہیے آج تک کسی سے ادا نہیں ہو سکا اور وہ بدستور اب تک چیستانوں کی طرح ہیں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک اہم ملفوظ گرامی: یاد آیا کہ زمانہ قیام ڈابھیل میں چند بار بعض آیات مشکلہ قرآن مجید کا حل فرماتے ہوئے جب حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ محسوس کیا کہ مخاطبین اس حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان آیات میں اس قدر دقیق ومشکل اسلوب کیوں اختیار فرمایا اور سہل اسلوب میں کیوں بیان نہ فرمایا تو فرمایا کہ "مولوی صاحب! کوئی کہاں تک اترے؟" بعینہ یہی الفاظ تھے جن پر مجھے ایسا یقین ہے کہ گویا اب ہی سن رہا ہوں حالانکہ تقریباً تیس (۳۰) سال گزر چکے ہیں مقصد یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل وانعام سے سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ہمیں اپنے کلام وبلاغت نظام سے استفادہ کا شرف بخشا اس میں جہاں بیشتر حصہ اوامر ونواہی وتذکیر کا ہے وہ ہر شخص کے لیے سہل الحصول ہے اس کے ساتھ کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن کے سمجھنے کے لیے بڑے علم وبصیرت کی ضرورت ہے ان کے مضامین بہت ادق ہونے کی وجہ سے غیر معمولی غور وفکر کے طالب ہیں حضرت شاہ کا منشا یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر چیز کو ہر شخص سمجھ لے اور حق تعالیٰ کی بے نیاز ذات کو کیا ضرورت تھی کہ وہ قلیل البضاعت لوگوں کی رعایت فرما کر مضامین عالیہ دقیقہ کو بھی ہر شخص کی سمجھ کے لائق اتارتے سلاطینِ دنیا بھی اپنے مرتبے سے اتر کر بات نہیں کرتے تو شہنشاہوں کے شہنشاہ رب العالمین سے اس کی توقع کیوں کی جائے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ کچھ ایسی ہی شان ہمارے حضرت شاہ صاحب کے علم کی بھی تھی کہ وہ ہر ایک عالم کی دسترس سے باہر تھا بلکہ حضرتؒ کی تحقیقاتِ عالیہ کو بہت سے اساتذہ فن بھی بعض اوقات سمجھنے سے قاصر رہتے تھے وجہ یہی تھی کہ "کوئی کہاں تک اترے؟" اللھم انفعنا بعلومہ.

ایک اشکال اور اس کا حل

یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جہنم دکھلائی گئی جس میں اکثریت عورتوں کی تھی مگر دوسری حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ہر جنتی کو جنت میں دو بیویاں ملیں گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ان کی کثرت ہوگی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب نہ دے سکے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دو دو بیویاں حوران بہشت ہوں گی جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "لکل امری زوجتان من الحور العین" اور ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہنم دکھلائی گئی اس وقت تک ان کی اکثریت ہی تھی وہ دور ابتداء اسلام کا تھا عورتیں نئی نئی اسلام میں داخل ہوئی تھیں زمانہ جاہلیت میں کوئی روک ٹوک نہ تھی اس لیے وہ بہ کثرت لعن طعن وغیبت میں مبتلا تھیں اور آپ نے عورتوں کی اکثریت جہنم میں دیکھی پھر اسلام کی تعلیم سے ان کے حالات میں انقلاب پیدا ہوا وہ بہ نسبت مردوں کے زیادہ رقیق القلب ہوتی ہیں اور اچھی باتوں کا اثر بھی جلد لیتی ہیں اس لیے جتنی زیادہ پہلے سے برائیوں میں مبتلا تھیں اسی قدر اسلام کے بعد برائیوں سے دور اور اچھائیوں سے قریب تر بھی ہو گئیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

خلاصہ کلام: کفرانِ عشیر بھی ایک قسم کا کفر ہی ہے مگر یہ کفر، کفر باللہ کے مقابلہ میں کم درجہ کا ہے کفر باللہ خلود نار کا موجب ہے اور کفرانِ عشیر ایک معصیت کبیرہ ہے جس طرح حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ہے علامہ نووی وغیرہ نے بھی یہاں کفر کے بہت سے اقسام ذکر کئے ہیں علامہ نووی نے لکھا کہ علماء نے کفر کی چار قسم لکھی ہیں (۱) کفرِ انکار کو قلب ولسان سے خدا کا منکر ہو اور خدا کی معرفت وتوحید سے کوئی واسطہ نہ رکھے (۲) کفرِ جحود کہ دل سے اقراری ہو مگر زبان سے اقرار نہ کرے جیسے ابلیس وغیرہ کا کفر (۳) کفرِ معاندہ کہ دل کی معرفت اور زبان سے اقرار دونوں ہوں مگر پھر قبول ایمان بالتوحید نہ کرے جیسے ابو طالب وغیرہ کا کفر (۴) کفرِ نفاق کہ زبان سے اقرار کرے مگر دل سے انکار ہو۔ جیسے منافقین کا کفر ہوتا ہے۔

علامہ ازہری نے کہا ایک کفرِ براۃ بھی ہے جیسے شیطان قیامت کے روز کہے گا انی کفرت بما اشر کتمونی یعنی تمہارے شرک سے میں بری ہوں اور اس سے کم درجہ کفر کا یہ ہے کہ وحدانیت، نبوت وغیرہ سب امور کا عقیدہ واقرار ہو مگر کبائر معاصی کا مرتکب ہو جیسے قتل، سعی فی الارض بالفساد، منازعۃ اولی الامر شق عصا المومنین وغیرہ ہذا کلام الازہری۔

اس کے بعد علامہ نووی نے لکھا ہے کہ شریعت نے مذکورہ بالا چار اقسام کفر کے علاوہ بھی کفر کا اطلاق کیا ہے اور وہ کفرانِ حقوق ونعم ہے اور اس کا بیان اس حدیث الباب میں ہے اور اسی قسم کی حدیث اذاابق العبد من موالیہ فقد کفر (مسلم) اور حدیث لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض. وغیرہ ہیں اور یہی مراد بخاری کی ہے کفر دون کفر اسے اور بعض نسخے میں کفر بعد کفر ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں (شروح اربعہ ص ۱۷۹) علامہ کرمانی نے بھی اس موقع پر انواع کفر کی تشریح مذکورہ بالا طریقہ پر کی حافظ عینیؒ نے بھی ازہری سے انواع کفر نقل کی ہیں البتہ قسطلانی نے وہی مراتب قائم کرنے کی صورت ذکر کی ہے۔

معلوم ہوا کہ امام نووی وکرمانی بھی وہی تحقیق سمجھے ہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ نے متعین فرمائی ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد

اس کے بعد حضرت گنگوہی قدس سرہ کا ارشاد ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ باب کفر دون کفر الخ سے حنفیہ کی کھلی تائید نکلی ہے کہ اعمال اصلِ ایمان میں داخل نہیں ہیں کیونکہ ایسا ہوتا تو کفر دون کفر صحیح نہ ہوتا بلکہ تارکِ حسنات اور مرتکبِ سیئات کافر ہوتا اس لیے کہ ایمان کے کچھ اجزاء اس سے منتفی ہو گئے پھر فرمایا کہ امام بخاریؒ کی غرض اس باب سے معتزلہ کا رد کرنا ہے جو مرتکبِ کبیرہ کو ایمان سے خارج کرتے ہیں (لامع الدراری ص ۲۶/۱)

امام بخاری کا مقصد

امام بخاریؒ نے پہلے ابواب میں ''من الایمان'' وغیرہ کے اشارات سے مرجئہ اہل بدعت کی تردید کی تھی کہ وہ اعمال کو ایمان کے ساتھ کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اب کفر دون کفر اور اس کے بعد کے چند ابواب میں ان کا مقصد معتزلہ وخوارج کی تردید ہے اور یہ بتلانا ہے کہ کفر کے بہت سے اقسام ہیں معاصی والا کفر، کفر باللہ سے مبائن ومغائر ہے اس لیے اس کی وجہ سے ایمان سے خارج کرنا یا خلود نار کا مستحق قرار دینا غلط ہے، واللہ اعلم بالصواب، والیہ المرجع والمآب.

ایک اہم مغالطہ اور اس کا ازالہ

اوپر کا مضمون اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق لکھنے کے بعد ایضاح البخاری دیکھی تو اس میں باب کفر دون کفر کے بعید باب **المعاصی من امر الجاھلیۃ** کے تحت محترم صاحبِ ایضاح دامت برکاتہم نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق کو اپنے لیے ناقابلِ فہم بتلایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا شاید مولف فیض الباری سے تسامح ہو گیا ہو اور یہ تشریح خود ان کی طبع زاد ہو (ص ۳۱۹)

اگر اس کا منشا یہ ہے کہ حضرتِ محترم دامت برکاتہم نے اپنے استاذ حضرت شاہ صاحب سے ایسی تحقیق نہیں سنی تو اس کے دو بڑے سبب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ آپ نے ۲۶ھ ۲۷ھ میں دورہ پڑھا تھا اور اس وقت بھی حضرت شاہ صاحب سے ترمذی و بخاری پڑھنے کا موقع نہیں ہوا جس سے حضرت شاہ صاحبؒ سے تمام مباحث ترمذی و بخاری سننے کا موقع ملتا یہ اور بات ہے کہ آپ نے مجموعی طور پر بہت سے اہم مباحث میں حضرتؒ کی رائے ضرور معلوم کی ہو گی اس لیے یہ فیصلہ کرنا مناسب نہیں کہ ہم نے یہ تحقیق شاہ صاحب سے نہیں سنی تو اس کی نسبت ہی کو مشکوک قرار دے دیا جائے اس وقت میرے سامنے محترم مولانا محمد چراغ صاحب مولف العرف الشذی کی تقریر درسِ بخاری شریف زمانہ دیوبند کی موجود ہے اور اس مقام پر حضرت شاہ صاحب کی یہی تحقیق اختصار کے ساتھ درج ہے پھر اس کی نسبت کو مشکوک کرنا کیسے درست ہو گا؟ دوسرا سبب یہ ہے کہ ۲۷ھ سے ۵۱ھ تک بڑا طویل زمانہ ہے حضرت شاہ صاحب کا مطالعہ کسی وقت موقوف نہیں ہوا بلکہ برابر بڑھتا رہا اس لیے معلومات وتحقیقات میں بھی اضافے دراضافے ہوئے اس لیے جدید افادات یا نئی قسم کی تحقیقات کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا کیونکر صحیح ہو گا؟

اس کے بعد عرض ہے کہ راقم الحروف نے زمانہ قیام ڈابھیل میں دو سال حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ بخاری شریف میں شرکت کی دونوں سال درس کی تقریریں لکھیں اور یوں بھی ہر وقت قرب کا شرف حاصل ہوا میری یادداشتوں میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق موجود ہے جس کو اوپر لکھ چکا ہوں اور اس کی تحقیق کی تائید امام نووی وکرمانی حافظ عینی وازہری سے بھی نقل کر چکا ہوں پھر بھی یہ دعویٰ نہ مولف فیض الباری نے کیا اور نہ میں کر سکتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات عالیہ کو بے کم وکاست پوری طرح لکھ دیا ہے نہ یہ ہماری وسعت میں تھا نہ استطاعت میں، **ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا**، اس لیے یہ بھی اعتراف ہے کہ محترم صاحبِ ایضاح البخاری دام ظلہم، یا محترم مولفِ فتح الملہمؒ ایسے محقق حضرت شاہ صاحب کے آخری سالوں کے درس کی تقریریں قلمبند کرتے تو یقیناً وہ ہماری جہد المقل سے کہیں زیادہ مکمل اور بہتر ہوتیں مگر اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی طرف نسبتِ مضامین میں شک وشبہ کی اتنی فراوانی موزوں نہیں جس کی مثال اوپر دی گئی ہے۔ **واللہ المستعان**.

یہاں مناسب ہو گا کہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے کلمات بھی نقل کر دوں میرا طریقہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ بعینہ اسی

طرح اردو کے قلم بند کرلیا کرتا تھا دوسرے یہ کہ حضرتؒ کی خاص رائے لکھنے کا اہتمام بھی زیادہ کیا کرتا تھا۔ "پھر دون بمعنی اسفل ہے یا بمعنی غیر ہے اول کو حافظ نے فتح الباری میں ترجیح دی ہے یعنی مراتب بیان ہوئے ہیں اور ایک جماعت[1] نے دوسرے کو راجح قرار دیا ہے اور بعض شارحین نے اس کو مرجوح کہا ہے مگر میرے نزدیک یہی درست ہے اور مقصد انواع کا بیان ہے عینیؒ[2] میں ثابت کیا ہے کہ بخاری کے ایک نسخہ میں لفظ غیر موجود ہے آگے دون کا لفظ آئے گا اور وہاں بھی یہی جھگڑا ہے اور وہاں بھی میرے نزدیک بمعنی غیر کو ترجیح ہے اور غیر یہاں وصفی ہے استثنائی نہیں ہے علی درهم غير دانق اور علی درهم غیر دانق کا فرق یاد کرو۔"

اس کے بعد آگے دوسرے دون پر باب ظلم دون ظلم میں فرمایا:۔

"خطابی نے کہا کہ ظلم سے مراد ظلم قلب ہے اور ظلم دون ظلم سے مراد ظلم غیر ظلم ہے اور مقصد بیانِ انواع ہے اس کو حافظ نے نقل کر کے پسند نہیں کیا لیکن میرے نزدیک خطابی کی رائے صحیح ہے۔"

غالباً اتنی تفصیل کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے وتحقیق پوری روشنی میں آچکی ہے اور نسبت کا شک رفع ہونے کے ساتھ شاید اب نا قابلِ فہم والی بات بھی نظر ثانی کی محتاج سمجھی جائے گی۔

باب المعاصی من امر الجاهلية ولايكفر صاحبها بارتكابها الا بالشرك لقول النبی صلی الله علیه وسلم انک امرو فيک جاهلية وقول الله تعالىٰ ان الله لايغفران يشرک به ويغفر ما دون ذلک لمن يشآء وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما فسما هم المؤمنين.

(۲۹) حدثنا عبدالرحمٰن بن المبارک قال ثنا حماد بن زيد قال ثنا ايوب و يونس عن الحسن عن الاحنف بن قيس قال ذهبت لانصرهٰذا الرجل فلقينی ابوبکره فقال این ترید؟ قلت انصرهٰذا الرجل قال ارجع فانی سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اذاالتقى المسلمان بسيفهما فالقاتل والمقتول في النار قلت يارسول الله هذاالقاتل فما بال المقتول قال انه كان حريصاً علیٰ قتل صاحبه.

باب "تمام معاصی دور جاہلیت کی یادگار ہیں، تاہم ان کے ارتکاب کرنے والے کو بجز شرک کے کافر نہ کہا جائے گا' اس لئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو) فرمایا تھا' تمہارے اندر جاہلیت کا اثر ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا شرک کو نہیں بخشیں گے' اس کے سوا جس کے گناہوں کو چاہیں بخشیں گے اور فرمایا اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کرا دو' اس میں دونوں قتال کرنے والوں کو مسلمان فرمایا"۔

---

[1] راقم الحروف نے علامہ نووی (۱)، محقق کرمانی (۲)، حافظ عینی (۳) اور علامہ ازہری (۴) کے اقوال سے بیانِ انواع کی تائید نقل کی ہے اور محقق خطابی (۵) کی بھی یہی رائے ہے اب بعض شارحین اس کو مرجوع کہنے والے حافظ وقسطلانی (۶) رہ جاتے ہیں۔

[2] تقریباً اسی طرح کا جملہ حضرت شاہ صاحبؒ سے مولانا عبدالعزیز استاذ جامعہ ڈابھیل اور حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحبؒ کی یادداشت میں بھی ملا ہے۔ جس کا حوالہ فیض الباری ص ۱/۱۱۶ کے حاشیہ میں ہے مگر عمدۃ القاری میں یہ حوالہ ابھی تک نہیں مل سکا البتہ یہ جملے ملتے ہیں:۔ اس باب میں اشارہ انواع ظلم کی طرف مذکور ہے کیونکہ ظلم دون ظلم کہا ہے" پھر آگے لکھا:۔ "لفظ دون یا بمعنی غیر ہے یعنی انواع ظلم مختلف ومتغائر ہیں یا بمعنی ادنے ہے یعنی بعض انواع اشد ہیں ظلمیت اور سوء عاقبت کے لحاظ سے۔" پھر آگے فرمایا:۔ مطابقت حدیث کی ترجمہ سے بایں طور ہے کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ ظلم کی بہت سی انواع ہیں اور ان میں بعض انواع کفر ہیں اور بعض کفر نہیں ہیں تو اس سے بداہتہً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض انواع کم درجے کی ہیں بعض سے۔ (عمدۃ ص ۱/۲۴۸)

محقق عینیؒ کے ہر جملہ کا زور بیانِ انواع پر معلوم ہو رہا ہے اور ایک نوع کے مراتب والی بات کو نظر انداز کر رہے ہیں بلکہ دون بمعنی ادنی والی صورت کو بھی انواع کے ساتھ لگا کر ان انواع کی اونچ نیچ دکھلانا چاہتے ہیں ایک ہی نوع کے مراتب قرار نہیں دیتے۔ والله اعلم

ترجمہ: حسن احنف بن قیس سے روایت کرتے ہیں کہ (جنگ میں) میں اس مرد (حضرت علیؓ) کی مدد کرنے کو چلا' تو مجھے ابوبکرہ مل گئے' کہنے لگے کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا' اس شخص (علیؓ) کی مدد کروں گا (اس پر) انہوں نے کہا کہ لوٹ جاؤ' کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ فرماتے تھے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر (آپس میں) بھڑ جائیں تو بس مرنے اور مارنے والا دونوں دوزخی ہیں' میں نے عرض کیا' یا رسول اللہ یہ تو قاتل ہے (ٹھیک ہے) مگر مقتول کا کیا قصور؟ آپ نے جواب دیا کیونکہ وہ مقتول بھی اپنے (مسلمان) بھائی کو قتل کرنے کا خواہشمند تھا۔

تشریح: اس باب کا منشا یہ ہے کہ گناہ کسی قسم کا ہو' چھوٹا یا بڑا بہر حال وہ اسلام کی ضد ہے اور جاہلیت کی بات ہے لیکن اس کے باوجود شرک کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے گناہ کے ارتکاب سے آدمی کافر نہیں بن جاتا۔ حدیث کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان لڑائی اسلام اور ایمان کے تقاضے کے خلاف تھی' اسی بنا پر ابوبکرہ نے احنف بن قیس کو روکا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد انہوں نے نقل کیا اس کا تعلق اس لڑائی سے ہے جو محض ذاتی اور نفسانی اغراض کے تحت ہو اور حضرات صحابہؓ کی باہمی جنگ غلط فہمیوں اور اجتماعی اور دینی مصالح کی بناء پر واقع ہوئی تھی اس لئے قاتل اور مقتول والی مذکورہ حدیث کا اطلاق اس جنگ کے شرکاء پر نہ ہوگا' چنانچہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ احنف بن قیس نے ابوبکرہ کا مشورہ رد کر دیا اور وہ باقاعدہ حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے' یہ جنگ بہر حال اجتہادی امور سے متعلق تھی' اس میں ایک فریق کا اجتہاد صحیح نہ تھا اور رائے کی اس غلطی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی گرفت نہیں' صحابہؓ کا معاملہ یہی تھا۔

جنگ جمل و جنگ صفین

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے کی جنگ جمل و جنگ صفین کی بڑی شہرت ہے' یہ تاریخ اسلام کا اہم باب ہے اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا تھا ہمارے اکابر اساتذہ دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ مشاجرات صحابہؓ پڑھنے سے ایمان قوی ہوتا ہے کیونکہ ان کے صحیح واقعات و اسباب پر نظر ہو تو سب کا مقصد محض دینی و اجتماعی اصلاح معلوم ہوتا ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ عہد صحابہؓ کی جنگیں نہ ہوتیں تو "باب البغاة'' ہم پر مخفی رہتا' حضرات صحابہ کے زمانے میں اس قسم کے مسائل مختلف فیہا رہے ہیں مگر فقہاء و ائمہ مجتہدین کے زمانے میں نکھر گئے' یہ امت محمدیہ کی خصوصی منقبت و فضیلت ہے کہ اس کے مصائب و ابتلاؤں سے بھی بعد کے لوگوں کو بڑے بڑے دینی و علمی فوائد حاصل ہوئے۔

بہت سی غلط فہمیاں مؤرخین کی بے احتیاطی اور بے جا طومار بندی کے سبب پیدا ہوئیں' اس لئے یہاں صحیح واقعات کی طرف مختصر اشارات کئے جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں داخلی فتنے سر نہ اٹھا سکے تھے' جن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی نرمی طبع' رعایت و مروت' حیاء و سماحت نفس کے سبب ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا' جس کا سب سے پہلا نقصان خود ان کی ذات کو اور پھر بعد کے لوگوں کو پہنچا' حضرت علی رضی اللہ عنہ' آپ کے جانشین ہوئے تو لوگوں نے سب سے پہلا مطالبہ قاتلین عثمان سے قصاص لینے کا کھڑا کر دیا۔ بات چونکہ چلنے والی تھی خوب چلی' بڑے بڑے صحابہؓ نے اس مطالبہ کی حمایت کی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ فوری طور پر اس مطالبہ کو پورا کرنے سے قاصر تھے کیونکہ اول قاتلین عثمانؓ کی تعیین و شرعی ثبوت ضروری تھا' پھر ان شر پسند لوگوں کا منظم گروہ تھا' ان پر بغیر پورے اقتدار خلافت کے ہاتھ ڈالنا بہت دشوار تھا اور اگرچہ آپ کی بیعت خلافت' حجاز' عراق و مصر میں عام طور سے ہو گئی تھی' مگر شام میں نہ ہو سکی تھی بلکہ گورنر شام حضرت معاویہؓ وغیرہ نے بھی قبول نہیں کی تھی' ادھر اکابر حجاز میں سے ام المومنین حضرت عائشہؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ نیز عراق میں سے کوفہ و بصرہ کے لوگ بھی باوجود بیعت علیؓ کے بغیر قاتلین عثمانؓ کا قصاص لئے ان کی امارت و خلافت عملی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

حضرت عائشہؓ و حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے بصرہ جا کر قیام کیا اور کوفہ و بصرہ کے لوگوں سے مل کر اس مطالبہ میں قوت پیدا کی' حضرت علی رضی

اللہ عنہ ان سب کو معاملات کی نزاکت سمجھا کر مطمئن کرنے کے خیال سے بصرہ تشریف لے گئے۔ گفتگوئیں ہوئیں اور بڑی حد تک اصلاح حال کی توقع ہوگئی، مگر شر پسند عناصر نے جنگ کی صورت ناگزیر بنادی، تاہم یہ جنگ بصرہ کے باہر میدان میں صرف ایک دن رہی اور ختم ہوگئی۔

حضرت علیؓ کے سمجھانے پر حضرت زبیرؓ تو پہلے ہی جنگ سے دستبردار ہوگئے تھے، سالار جیش حضرت طلحہؓ اس معرکہ میں مروان کے تیر سے زخمی ہوکر شہید ہوئے، یہ معرکہ صبح سے زوال کے وقت تک رہا تھا، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت اور حضرت عائشہؓ کی موجودگی میں شام تک دوسرا معرکہ ہوا اور حضرت علیؓ کی فتح پر ختم ہوگیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہایت احترام کے ساتھ چند لوگوں کی حفاظت میں مدینہ طیبہ واپس کردیا اور خود بصرہ و کوفہ کے حالات درست کرنے کے بعد شام کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رخصت ہوتے وقت اہل بصرہ سے فرمایا ''ان کے اور حضرت علیؓ کے درمیان اس سے زیادہ کچھ نہ تھا جو ایک عورت اور اس کے شوہر کے بھائی کے درمیان ہوتا ہے'' حضرت علیؓ نے بھی سب کے سامنے اس کی تصدیق و تائید کی۔

دونوں طرف کے جلیل القدر صحابہؓ بہترین فقہا و علماء اس جنگ میں شہید ہوئے، جس کا رنج و ملال حضرت علی و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کو ہمیشہ رہا اور دونوں اپنے کئے پر نادم ہوئے، حضرت عائشہؓ قرآن مجید کی آیت **وقرن في بيوتكن** (ازواج مطہرات کو ارشاد خداوندی ہوا تھا کہ تم سب اپنے گھروں میں گڑی رہنا، باہر نکلنے کا نام نہ لینا) تلاوت فرما کر اتنا رویا کرتی تھیں کہ دوپٹہ تر ہوجاتا اور فرماتیں کاش! مجھے آج سے بیس سال پہلے موت آجاتی، کبھی فرماتیں ''بخدا یوم جمل سے اگر میں بیٹھ رہتی تو مجھے'' اس سے زیادہ خوشی ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے دس لڑکے پیدا ہوتے''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح فرمایا کرتے تھے کہ کاش! آج سے بیس سال قبل مجھے موت آچکی ہوتی اور فرماتے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نوبت یہاں تک پہنچے گی تو میں اس میں حصہ ہی نہ لیتا''۔

یہ تو جنگ جمل کی سرگزشت تھی، اب جنگ صفین کا حال سنئے۔ حضرت معاویہؓ اپنے چچازاد بھائی مظلوم خلیفہ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ قاتلین سے لینے کا تہیہ کرچکے تھے اور ان کو یہ غلط فہمی تھی کہ حضرت علیؓ باوجود قدرت کے اور قاتلین عثمان کو متعین طور سے جانتے ہوئے قصاص نہیں لے رہے ہیں، چنانچہ خط میں حضرت علیؓ کو لکھا۔

''حضرت عثمان کے وارث آپ پر الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے ان کے قاتلوں کو پناہ دے رکھی ہے، اگر آپ اپنے کو واقعی حضرت عثمانؓ کے خون سے بری بتلانے میں سچے ہیں تو قاتلوں کو ہمارے حوالے کریں، ہم ان سے قصاص لیں گے اور پھر آپ کے پاس (بیعت خلافت کے لئے) دوڑتے ہوئے آئیں گے''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب لکھا۔

''میں باوجود تلاش کے اب تک حضرت عثمانؓ کے مقرر قاتلوں کا پتہ نہیں لگا سکا ہوں اور مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ جن لوگوں پر تم قتل کی تہمت لگاتے ہو اور جن پر گمان کرتے ہو، ان کو بھیج دوں''۔

ماہ ذی الحجہ ۳۶ھ کے آخری عشرہ میں صفین کے مقام پر نہر فرات کے کنارہ پر دونوں طرف کے لشکر جمع ہوکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں لڑے، اس کے بعد محرم کے مہینہ میں جنگ بندی رہی، ماہ صفر کے آخری تین دن گھمسان کی لڑائی ہوئی اور آخر میں شامیوں کی شکست کے آثار نمودار ہوئے تو انہوں نے نیزوں پر قرآن مجید اٹھا کر جنگ بندی کا اعلان کردیا۔

دونوں طرف سے حکم مقرر ہوئے ''جنگ بندی کا معاہدہ ہوگیا'' دونوں حکم کا فیصلہ میزان عدل پر پورا نہ اترا اور اختلاف بڑھ گیا حضرت

علیؓ کو خوارج وغیرہ کے فتنوں کی طرف متوجہ ہونا پڑااوران کی طاقت کمزور ہوتی گئی۔حضرت معاویہؓ شام کو مضبوطی سے سنبھالے رہے اور مصر پر بھی قبضہ کرلیا' اس طرح اسلامی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی' مغربی حصہ شام ومصراورافریقہ کے علاقے حضرت معاویہؓ کے تحت ہوگئے' مشرقی حصہ عراق' جزیرۃ العرب اور فارس کے مفتوحہ علاقے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام دور خلافت میں منہاج نبوت پر قائم رہے' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوسرے طریقے استعمال کئے' زمانہ اور زمانے کے لوگوں کے حالات تیزی کے ساتھ خرابی کی طرف بڑھ رہے تھے۔اس لئے خلافت علی منہاج النبوت'' سے زیادہ کامیابی دنیوی سیاست کے لئے مقدر ہو چکی تھی' حضرت علی رضی اللہ عنہ آخر عمر تک دین اور دینی سیاست کو کامیاب بنانے کی جان توڑ مساعی میں مشغول رہے۔ان پر ہر اگلا دور پچھلے دور سے زیادہ سخت اور صبر آزما آیا' مگر وہ کوہ استقامت بنے ہوئے' مصائب وآلام کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔

آپ نے ایک روز اہل کوفہ کے سامنے دل ہلا دینے والا خطبہ دیا۔جو ساتھیوں سے آپ کی انتہائی مایوسی اور ناسازگار حالات وماحول پر آپ کے غیر معمولی رنج وغم کی سراپا تصویر تھا' اس کے چند جملے یہ ہیں۔

''جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جس نے بیزار ہو کر اس کو چھوڑ دیا' اللہ تعالیٰ اس کو حقیروں' ذلیلوں اور کمینہ خصلت لوگوں کے ہاتھوں ذلت وخواری کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ میں نے تم کو ان لوگوں سے لڑنے کی دن رات دعوت دی' مخفی طور سے بھی سمجھایا' علانیہ بھی کہا کہ دشمنوں کے حملہ کرنے سے پہلے تم مقابلہ پر آجاؤ خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے' جس قوم کے گھر پر حریف چڑھ کر لڑنے آئے' وہ ذلیل ہوگی۔تم لوٹے جارہے ہو' تمہارے مرد' عورتیں اور بچے قتل کئے جاتے ہیں اور وہ حملہ کرنے والے تمہاری سرزمین سے صحیح وسلامت واپس چلے جاتے ہیں۔حیرت اور سخت حیرت کی اور دلوں کو مردہ' دماغوں کو حیران اور غموں کو بڑھا دینے والی بات ہے کہ وہ اپنے باطل پر اس طرح متحد اور جمے ہوئے ہیں اور تم حق پر ہو کہ بھی اس طرح ناکام ونامراد ہو' تم گرمی وسردی کی شدت سے ڈرتے ہو تو بخدا! تلواروں کے سامنے تمہاری گرد بھی نہ ہوگی' اے مردنما لوگو! اے خواب کے بندو! اے پردہ نشینوں کی عقلو! خدا کی قسم تم نے اپنی نافرمانی سے میری تدبیریں غلط کردیں اور مجھے غصہ سے بھر دیا' اتنا کہ قریش نے میرے متعلق کہا ''ابوطالب کا بیٹا بہادر ضرور ہے لیکن لڑائی میں صاحب تدبیر نہیں'' ان نکتہ چینیوں کے کیا کہنے! مجھ سے زیادہ لڑائی کا ماہر اور مرد میدان کون ہوگا؟ بخدا! میری عمر ابھی بیس سال کی بھی نہ تھی کہ میدان جہاد میں کود پڑا اور آج ساٹھ سال سے آگے ہوں' لیکن جس کا حکم نہیں چلتا اس کی رہنمائی کیا؟''

بحث ونظر: ہم نے یہاں جنگ جمل وجنگ صفین کا حال اس لئے بھی لکھا ہے کہ حدیث الباب کا جنگ صفین سے تعلق ہے' کیونکہ احنف[1] بن قیس نے فرمایا' میں اس شخص (حضرت علیؓ) کی مدد کے لیے گھر سے نکلا اور ابوبکرہ نے مجھے روکا پھر یہ حدیث سنائی۔''ایضاح البخاری'' میں اس

---

[1] آپ کا نام ضحاک' کنیت ابو بحر' عرفی نام احنف ہے۔شیخین کے دور خلافت میں اسلام لائے بنی تمیم قبیلہ کے سرداروں میں سے اور جلیل القدر تابعی تھے' آپ کی غائبانہ تعریف سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے دعاء مغفرت فرمائی تھی۔نقل ہے کہ جب ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا فرمانے کی خبر ملی تو سجدہ میں گر گئے۔حسن بصری نے فرمایا کہ میں نے کسی سردار قوم کو احنف سے افضل نہیں پایا۔عہد فاروقی میں اپنے وطن بصرہ سے مدینہ طیبہ آئے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی تمیم کے ساتھ سوءظن تھا۔اس لئے اکثر اس کی مذمت کیا کرتے تھے' ایک دفعہ احنف کی موجودگی میں بنی تمیم کا ذکر آگیا اور حضرت عمرؓ نے حسب معمول اس کی مذمت کی' احنف نے کھڑے ہو کر کچھ عرض کرنے کی اجازت طلب کی' حضرت عمرؓ نے اجازت دی تو کہا آپ نے بلا استثناء پورے قبیلہ بنی تمیم کی برائی کی حالانکہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح ہیں' ان میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہیں۔حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے سچ کہا اور پھر ذکر خیر سے گذشتہ مذمت کی تلافی فرمائی' حتات تمیمی نے بھی کچھ عرض کرنا چاہا مگر حضرت عمرؓ نے روک دیا کہ تم بیٹھ جاؤ! تمہاری جانب سے تمہارے سردار فرض ادا کر چکے۔
اس کے بعد حضرت عمرؓ نے احنف کو ایک سال تک ساتھ رکھا' پھر فرمایا کہ مجھ کو تم میں بھلائی کے سوا کوئی قابل اعتراض (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

واقعہ کا تعلق جنگ جمل سے لکھا ہے مگر حقیقت میں اس کا تعلق جنگ صفین سے ہے اور یہی رائے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی ہے، حضرت مدنی قدس سرہ، نے درس بخاری شریف میں فرمایا: "احنف بن قیس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں میں سے تھے، تلوار لے کر ان کی حمایت کے لیے جارہے ہیں حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگ کا زمانہ ہے۔" (مطبوعہ تقریر بخاری ص ۱/۱۴۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا۔ قاتل و مقتول کے جہنمی ہونے کی حدیث کو حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگ کے بارے میں پیش کرنا بے محل ہے کیونکہ حدیث میں اس قاتل و مقتول کا ذکر ہے جو ظلم و جور کی راہ میں لڑتے ہوں اور ان دونوں حضرات کی جنگ دینی واجتماعی مصالح کے تحت تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے کو حق پر سمجھتے تھے اسی لیے اکثر صحابہ کرام

(بقیہ فوائد صفحہ سابقہ) بات نظر نہیں آئی، تمہارا ظاہر اچھا ہے، امید ہے باطن بھی اچھا ہوگا، میں نے یہ اس لئے کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو ڈرایا تھا کہ اس امت کی ہلاکت باخبر منافقوں کے ہاتھوں ہوگی۔ بصرہ واپس ہو کر ۱۷ھ میں فارس کی مہم میں شرکت کی۔ بڑے عاقل و مدبر تھے، قومی و ملکی مہمات میں ان کا نام سب سے پہلے ہوتا تھا، پھر اہواز کی فتح کے بعد مشہور ایرانی افسر ہرمزان کو (جس نے خورستان کی مہم میں سپر ڈال دی تھی) لے کر مدینہ طیبہ گئے، اس وقت تک عراق فتح ہو چکا تھا، مگر ایران پر عام فوج کشی نہ ہوئی تھی اور مفتوحہ علاقے بار بار باغی ہو جاتے تھے، حضرت عمرؓ سے احنف نے عرض کیا کہ ایران کے اندر عام فوج کشی کے بغیر وہاں کی شورشیں ختم نہ ہوں گی، اس پر حضرت عمرؓ نے وسیع پیمانے پر فوجی انتظامات شروع کئے اور ایران کے ہر ہر صوبے کے لئے علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کیں۔ خراسان کی مہم احنف کے سپرد ہوئی، جہاں یزدگرد مقیم تھا، ۲۲ھ میں احنف ادھر بڑھے، ہرات فتح کر کے آگے بڑھتے رہے اور یزدگرد ہر جگہ سے فرار ہوتا رہا اور آپ نے تمام خراسان میں فوجیں پھیلا دیں اور نیشاپور سے طخارستان تک پورا علاقہ صلحاً فتح کر لیا، یزدگرد مجبور ہو کر دریا پار خاقان چین کے پاس چلا گیا، احنف اور بھی آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر حضرت عمرؓ فتوحات کا دائرہ ایران سے آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے اس لئے دریا پار کی پیش قدمی سے ان کو روک دیا۔ یزدگرد کے حدود چین میں داخل ہونے کے بعد خاقان چین نے اس کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا اور خود ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کی مدد کے لئے خراسان پہنچا، سیدھا بلخ کی طرف بڑھا، بلخ کی اسلامی فوجیں احنف کے ساتھ مروالرود واپس جا چکی تھیں، اس لئے یزدگرد اور خاقان چین دونوں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بلخ ہوتے ہوئے مرو کی طرف بڑھے، احنف نے دامن کوہ میں صف آرائی کی، پہلے صبح و شام دونوں طرف کی فوجوں میں معمولی جھڑپ ہوتی رہی۔ ایک دن احنف خود میدان میں نکلے، خاقان کی فوج سے ایک بہادر ترک طبل و دمامہ بجاتا ہوا مقابل آیا، احنف نے اس کا فوراً کام تمام کر دیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو بہادر اور مقابلہ میں آئے، احنف کی تلوار نے ان کا بھی خاتمہ کیا، پھر ترکوں کا پورا لشکر آگے بڑھا، خاقان چین کی نظر لاشوں پر پڑی۔ اس نے فال بدلی، یزدگرد کی حمایت میں اس کو کچھ فائدہ نظر نہ آیا اور مسلمانوں کو شکست دینا بھی مشکل معلوم ہوا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے بہت دن ہو گئے، ہمارے بہت سے نامور سپاہی قتل ہو چکے ہیں، یہ کہہ کر اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا، خاقان کے مع فوج واپس ہونے سے یزدگرد کی ہمت پھر ٹوٹ گئی اور اس نے اپنا خزانہ لے کر ترکستان جانا چاہا، ایرانیوں نے ملکی خزانہ لے جانے سے روکا اور لڑ بھڑ کر خزانہ اس سے چھین لیا، مسلمانوں نے صلح کر لی اور سارا خزانہ بھی ان کے حوالہ کر دیا، احنف نے ان کے ساتھ ایسا شریفانہ برتاؤ کیا کہ انہیں اس کا افسوس ہوا کہ وہ اب تک مسلمانوں کی حکومت سے کیوں محروم رہے، یزدگرد ترکستان چلا گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ تک خاقان چین کے پاس مقیم رہا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایران میں بغاوت ہوئی اور خراسان مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا تو پھر احنف ہی نے فوج کشی کر کے دوبارہ اس پر قبضہ کر لیا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر)

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اندرونی خلفشار ہوئے تو احنف نے اپنی تلوار میان میں کر لی چنانچہ جب حضرت علی اور حضرت عائشہؓ میں اختلاف ہوا تو احنف نے جو اس وقت مکہ معظمہ میں تھے حضرت علی کے ہاتھوں پر بیعت کر لی لیکن جنگ جمل میں کسی جانب سے حصہ نہیں لیا البتہ جب حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں جنگ صفین چھڑی اس وقت وہ صبر نہ کر سکے اور حضرت علیؓ کی حمایت میں نہایت پر جوش حصہ لیا اور اہل بصرہ کو بھی ان کی حمایت و امداد پر آمادہ کیا اس کے بعد حضرت علی نے خوارج پر فوج کشی کی تو اس وقت بھی ان کا ساتھ دیا اور کئی ہزار اہل بصرہ کو آپ کی امداد کے لیے لے گئے حضرت احنف رضی اللہ عنہ نے اجلہ صحابہؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوذرؓ وغیرہ سے حدیث حاصل کی، ثقہ، مامون، قلیل الحدیث تھے (تہذیب ص ۱/۱۹۱) اور آپ کے تلامذہ میں حسن بصری طلق بن حبیب، ابوالعلاء بن شخیر وغیرہ لائق ذکر ہیں۔

علم کے علاوہ غیر معمولی عقل و دانش، تدبر کے ساتھ زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت میں ممتاز تھے اور حلیم یعنی ضبط و تحمل میں فرد تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا کہ ان کے مناقب بکثرت ہیں ان کا حلم ضرب المثل تھا لیکن خود ہمیشہ بطور انکسار فرمایا کرتے تھے کہ میں حقیقتاً حلیم نہیں ہوں البتہ اپنے کو حلیم دکھانا چاہتا ہوں (تہذیب و ابن سعد)

ان کا ارشاد تھا کہ میں تین کاموں میں زیادہ جلدی کرتا ہوں نماز پڑھنے میں جب کہ اس کا وقت آجائے، جنازہ دفن کرنے میں اور لڑکی کی شادی میں جب کہ اس کی نسبت ہو جائے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور میرے علم میں انصار تو سب ہی ان کے ساتھ مہاجرین میں سے زیادہ حضرت علیؓ کے ساتھ اور کم حضرت معاویہؓ کے ساتھ اور بہت سے متردد یا ساکت رہے جیسے حضرت ابن عمرؓ کہ انہوں نے کسی کا ساتھ نہیں دیا پھر فرمایا کہ حضراتِ صحابہؓ کے تقوے وصفاء قلب کا ادراک کرنے سے عقل عاجز ہے کہ باوجود اس کے بھی کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت علی کی حمایت نہیں کی حضرت علیؓ کا یہ حال تھا کہ حضرت ابنِ عمر کے لیے مدحیہ کلمات استعمال فرماتے تھے اور حضرت ابن عمرؓ پر جب حق واضح ہوا تو نادم ہوئے اور وفات کے وقت تو اس بات کو یاد کر کے روتے تھے کہ حضرت علیؓ کا ساتھ کیوں نہ دیا ہمارے زمانے کے اندر ایسا قصہ ہو جائے تو ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں اور غیبت وبرائیوں سے دل ٹھنڈا کریں اس کے بعد فرمایا کہ آیت **وان طائفتان من المومنین اقتتلوا** کا شانِ نزول جیسا کہ بخاری (باب الصلح) اور عامہ کتب تفسیر سے معلوم ہوتا یہ ہے کہ قباء میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں صحابہؓ میں باہم لڑائی ہوئی تھی جس میں قتال تو نہیں ہوا صرف مار پٹائی ہوئی تھی حضور نے صلح کرادی پس اقتتال کے لفظ سے کبیرہ کے ارتکاب کے بعد مومن رہنے پر استدلال صحیح نہ ہوگا کیونکہ مار پیٹ کا کبیرہ ہونا بحث طلب ہے لہٰذا امام بخاریؒ نے صرف اقتتال کے لفظ سے فائدہ اٹھایا ہے ہم نے حضرت احنفؒ کے مختصر حالات زندگی میں حاشیہ میں لکھ دیے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ تابعین مجاہدین اسلام اور علماء وفقہا کے حالات موقع بموقع لکھتے رہیں تاکہ ناظرین غذائے روح حاصل کرتے رہیں مگر طوالت کا خوف مانع ہو جاتا ہے حضرت احنفؒ کے حالات میں یہ بات تاریخی حقیقت بن کر سامنے آگئی کہ انہوں نے جنگِ جمل میں کوئی حصہ نہیں لیا البتہ جنگِ صفین میں خوب بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دی ہے اس لیے حدیث الباب میں ''**ذهبت الانصر هذا الرجل**'' سے جنگِ جمل میں حضرت علیؓ کی امداد کے لیے نکلنے کی بات صحیح نہیں ہے واللہ اعلم۔

معاصی سے مراد کبائر ہیں

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ **المعاصی من امر الجاهلية** میں معاصی سے مراد کبائر ہیں کیونکہ صغائر کا معاملہ زیادہ سنگین نہیں حتیٰ کہ حسنات بھی کفارہ سیئات بن جاتی ہیں اور **لا یکفر صاحبها** سے مذہب جمہور کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک دلِ وزبان سے شہادتین کا یقین واقرار باقی ہے۔ ارتکابِ کبیرہ کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔ بخلاف معتزلہ کے جن کے نزدیک ایسا شخص نہ مومن باقی رہا نہ کافر ہوا وہ ایک درمیانی مرتبے کے قائل ہوئے ہیں۔

ایک اشکال اور جواب

اشکال یہ ہے کہ جب امام بخاریؒ کفر دون کفر کے قائل ہیں تو ان کے نزدیک تو اطلاقِ کفر کا جواز ہونا چاہیے تھا پھر انہوں نے لا یکفر کیوں کہا؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ امام بخاری اپنی جانب سے کسی مرتکب کبیرہ کی تکفیر نہ کرنیکی خبر دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ صرف ان مواقع میں اکفار ہونا چاہیے جہاں قرآن وحدیث میں وارد ہوا ہے جیسے شریعت نے لعنت کرنے

(باقی حاشیہ صفحہ سابقہ) آپ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کے معتمد ومشیر رہے، حضرت علیؓ کے زمانہ میں ان کے بھی معتمد اور دستِ راست رہے پھر حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ کی خلافت تسلیم کرلی تھی لیکن حضرت معاویہؓ کے نادرست افعال پر بے جھجک تنقید کرتے تھے، امیر معاویہؓ نے جب یزید کی ولی عہدی کے لیے تمام ممالک محروسہ سے وفود طلب کیے تو احنف بھی بصرہ کے وفد کے ساتھ آئے امیر معاویہ نے ان سے بھی یزید کی ولی عہدی کے بارے میں پوچھا، انہوں نے کہا: ''امیر المومنین! آپ یزید کے شبانہ روز کے مشاغل اس کے ظاہر ومخفی حالات اور اس کے آنے جانے کے مقامات سے اچھی طرح واقف ہیں اگر اس واقفیت کے بعد بھی آپ اس کو خدا اور امتِ محمدیہ کے لیے بہتر سمجھتے ہیں تو اس میں مشورہ کی ضرورت نہیں اور اگر بہتر نہیں تو ایسی حالت میں کہ آپ کو عنقریب آخرت کا سفر پیش آنے والا ہے یزید کو دنیا کا توشہ نہ دیجئے ورنہ یوں ہمارا فرض ہے کہ آپ جو کچھ فرمائیں ہم اس کو بجالائیں (ابن کثیر ص ۴۲۱/۳) آپ کی وفات ۶۷ھ یا ۷۲ھ میں ہوئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

یزید کے بارے میں اگر اس قسم کا پورا مواد احتیاط سے یکجا کرلیا جائے تو صحیح پوزیشن زیادہ واضح ہوسکتی ہے، واللہ اعلم۔

سے روکا تو کسی کو جائز نہیں کہ دوسرے کو اپنی طرف سے لعنت کا مستحق ٹھہرائے امام بخاری نے مضارع کا صیغہ ذکر کیا ہے اشارہ اس طرف ہوا کہ آئندہ ہم خود سے کسی کو کافر کہنے کا فیصلہ نہیں کر سکتے، اس سے محل بے محل تکفیر کا دروازہ کھلتا ہے، لہٰذا جو اطلاق شریعت کی طرف سے سابق میں ہو چکے ہیں۔ اسی حد تک ہم بھی اطلاق کر سکتے ہیں۔

دوسری شرح اس جملے کی یہ ہے کہ چونکہ عام مشہور معنی کفر کے کفرِ خلود کے ہوتے ہیں تو لفظِ کفر کو مرتکبِ کبیرہ پر اطلاق کرنے سے روک رہے ہیں تا کہ مطلق لفظ سے کوئی کفرِ خلود نہ سمجھ لے۔

تیسری شرح یہ ہے کہ مرتکبِ کبیرہ سے کفر کی بات سرزد ہونے پر بھی اس کو کافر نہیں کہیں گے کیونکہ شیخ ھیثمی نے مجمع الزوائد میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ آپ نے چند چیزیں ذکر کیں پھر فرمایا کہ جوان کو ترک کرے گا اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ اس میں کفر ہے مگر یہ نہ کہیں گے کہ وہ کافر ہے۔

اسی طرح کا قول حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے مگر اس روایت میں ایک راوی جھوٹا ہے محدثِ شہیر امام دارمیؒ سے بھی یہی بات منقول ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کو کافر نہ کہنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ صیغہ اسم فاعل کا اطلاق ایسے شخص پر جس سے کوئی فعل صرف ایک بار صادر ہوا ہو عرف میں نامانوس ہے اگرچہ عقلاً درست ہے اگر کہا جائے کہ قرآن مجید میں تو لفظِ کافر کا بھی اطلاق ہوا ہے مثلاً **ومن لم یحکم بماانزل اللہ فاولئک هم الکافرون** جواب یہ ہے کہ یہ اطلاق ایک فرقہ و جماعت پر ہوا ہے ایک شخص وفرد پر نہیں ہے اور یہاں اسی سے بحث ہے چنانچہ لعنت کرنا بھی مثلاً جھوٹوں پر جائز ہے مگر کسی ایک شخص کو خواہ وہ جھوٹا ہی ہو یہ نہ کہیں گے کہ تجھ پر لعنت ہے۔

غرض امام بخاری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن امور پر شریعت میں کفر کا اطلاق ہوا ہے وہ تو باب کفر دون کفر میں بیان کر چکے مثل **کفران العشیر** اب ان کے علاوہ جو معاصی ہیں ان کو بتلانا چاہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی کا کفر کا اطلاق نہ کیا جائے گا اسی لیے اس باب میں حدیث **انک امرء فیک جاهلیة** اور قتالہ کفر والی حدیث ذکر نہیں کی۔

اصل مقصد ترجمہ بخاری

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ وضاحتِ مذکورہ تو امام بخاریؒ کی اس مراد کے تحت ہے جو بعض شراح نے سمجھی ہے مگر میں نے جو ان کی دوسری مراد پہلے باب میں تفصیل سے بتلائی ہے اس کی روشنی میں امام بخاری کی غرض یہاں یہ بتلانے کے ساتھ کہ معاصی پر کفر کا اطلاق صحیح نہیں یہ بھی صراحت کرنی ہے کہ بابِ سابق میں کفر سے مراد وہ عام و وسیع معنی نہیں ہیں جن کے تحت مختلف قسم کے افراد داخل ہوں کیونکہ اگر وہ معنی مقصود ہوتے تو ان کے نزدیک یہ اطلاق ضرور جائز و صحیح ہوتا لہٰذا الا یکفر کہہ کر گویا اسی وسیع معنی سے بچنا چاہتے ہیں۔ **واللہ اعلم بحقیقة الحال.**

تائید حق

قولہ تعالی "ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اہل سنت والجماعت کا مسلک حق ہونے پر صریح دلیل ہے اور زمخشری کو اس میں تاویل کرنی پڑی۔

شرک وکفر میں فرق

شرک کے معنی کفر مع **عبادة غیر اللہ** ہیں لہٰذا وہ تمام انواع کفر و معاصی سے زیادہ قبیح ہے اور کفر اس سے عام ہے لیکن یہاں آیت میں شرک سے مراد کفر ہی ہے کیونکہ ایک شخص اگر عبادتِ غیر اللہ نہیں کرتا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے منکر ہے تو بے شک و بے خلافت وہ کافر ہے اور اس کی مغفرت نہ ہوگی لہٰذا آیت میں شرک کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ اکثر لوگ فی العبادۃ کرتے تھے ان ہی کو زجر و توبیخ زیادہ کرنی تھی۔

اس کے بعد امام بخاری نے دوسری آیت بھی بطور استشہاد پیش کی "وان طائفتان من المومنین اقتتلوا" کیونکہ اس میں بھی مومن کا اطلاق عاصی پر ہوا ہے کہ اقتتال معصیت ہے البتہ اتنی بات رہتی ہے کہ اقتتال مذکورہ آیت معصیت کبیرہ ہونا چاہیے تا کہ اس پر کفر کا اطلاق ہوسکتا ہو اور پھر اطلاقِ مومن کا شخص مذکورہ پر کفر دون کفر کے قاعدے سے صحیح ماننا پڑے حالانکہ پہلے آیت مذکورہ کے شانِ نزول میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ اقتتال معصیت کبیرہ نہیں تھا۔

اس کا حل حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ یہاں امام بخاری کی غرض صرف یہ بتلانا ہے کہ مومن کا اطلاق اس پر بھی ہوا جس میں جاہلیت تھی اور اس میں شک نہیں کہ اقتتال امورِ جاہلیت میں سے ہے لہٰذا یہاں اقتتال کو معصیت کبیرہ ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک اہم اشکال اور جواب

حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں یہ اس حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "السیف محاء الذنوب (تلوار گناہوں کو محو کر دیتی ہے) حالانکہ یہ حدیث صحیح و قوی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ جواب یہ ہے کہ اس محوِ ذنوب والی حدیث میں وہ مقتول و شہید مراد ہے جس نے قاتل کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا پس وہ ہر طرح مظلوم و شہید ہے اور اس کے سارے گناہ شہادت کے ساتھ ڈھل گئے اور یہی صورت ہابیل و قابیل کے قصہ میں پیش آئی ہے اور ہابیل نے جو قابیل سے "انی ارید ان تبوء باثمی واثمک فتکون من اصحاب النار:۔" کہا تھا اس کی تفسیر بھی اس شرح کے تحت آجاتی ہے یعنی میں اس امر پر راضی ہوں کہ تو اپنے گناہ (قتل) کی وجہ سے مستحق جہنم بنے اور میرے گناہ تیری تلوار کے سبب محو ہو جائیں۔" کیونکہ تلوار محاء الذنوب ہے گویا جب اس کی تلوار سے اس کے گناہ محو ہوئے تو وہی اس کے گناہ لے جانے والا ہو گیا نہ یہ کہ اس کے گناہ اس پر ڈال دیے گئے کیونکہ ایسا سمجھنا آیت لا تزر وازرة وزرا خری" کے خلاف ہوگا۔

پھر اس عنوان سے ذکر کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ کسی کو ظلماً قتل کرنے کی غیر معمولی قباحت اور برائی ظاہر کرنی ہے تا کہ ایسے گناہ سے سخت احتراز کیا جائے۔

ایک اہم علمی و دینی فائدہ

حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنوں کے وقت بھی قتال یا دفاع سے باز رہنا چاہیے اس لیے یہاں اس کے متعلق بھی ضروری تصریحات ذکر کی جاتی ہیں علامہ محقق حافظ عینیؒ نے اسی حدیث کے تحت عمدۃ القاری ص ۱/ ۲۴۷ میں اور علامہ نوویؒ نے شرح مسلم شریف کی کتاب الفتن ص ۱/ ۳۸۹ مطبوعہ انصاری دہلی میں جو کچھ لکھا ہے اس کو بغرضِ افادہ پیش کرتے ہیں۔

باہم مسلمانوں کے کسی اختلاف و فتنہ کے وقت قتال و جنگ میں شرکت کرنے کے متعلق علماء امت کا اختلاف ہے۔

(۱)..... بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس میں شرکت نہ کی جائے بلکہ اگر وہ لوگ کسی کے گھر میں گھس آئیں اور اس کو شرکت پر مجبور کریں تو شرکت نہ کرے حتیٰ کہ اگر وہ اس کو قتل بھی کر دیں تو اس کو مدافعت بھی نہ کرنی چاہیے کیونکہ وہ لوگ متاول ہیں یعنی کسی دینی و اجتماعی غرض و مقاصد کو سامنے رکھ کر قتال کر رہے ہیں یہ مذہب صحابہ میں سے ابوبکرہؓ وغیرہ کا ہے اور طبقات ابن سعد میں حضرت ابوسعید خدریؓ کا بھی یہی مذہب نقل ہوا ہے۔

(۲)..... صحابہؓ میں سے حضرت ابن عمر عمران بن حصین وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے کہ ایسے قتال میں شرکت نہ کرے مگر اپنے نفس سے مدافعت کا حق اس کو حاصل ہے' قتال سے روکنے والوں کا استدلال اسی حدیث الباب سے ہے' نیز دوسری حدیث طویل سے ہے' جو ابی بکرہؓ ہی سے صحیح مسلم باب الفتن میں مروی ہے' جس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "ایک وقت ایسے فتنوں اور آزمائش کا آئے گا اور ضرور آئے گا کہ اس میں ایک جگہ پر بیٹھ جانے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا اس کی طرف دوڑنے والے سے بہتر ہوگا' دیکھو جب ایسا وقت

آئے تو جس کے پاس اونٹ ہوں وہ ان کے ساتھ وقت گزار دے اور جس کے پاس بکریاں ہوں ان کے گلہ میں رہے اور جس کے پاس کوئی زمین ہو تو وہاں جا کر یکسوئی سے وقت کاٹ دے'' ایک شخص نے عرض کیا کہ حضورؐ! جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہو؟ (یعنی بستی میں محنت مزدوری یا دوسرے وسائل معاش کے سبب سب کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو) فرمایا اپنی تلوار کی دھار پتھر پر مار کر کند کر دے (تاکہ شرکت قتال کے لائق ہی نہ رہے) پھر جہاں تک ممکن ہو اس قتال سے دور دور رہے پھر آپ نے تین بار یہ کلمہ دہرایا۔ اے اللہ! کیا میں نے پوری بات پہنچا دی؟ ایک شخص نے سوال کیا کہ اگر مجھے لوگ مجبور کر دیں اور کھینچ تان کر میدان قتال میں لے جائیں اور وہاں مجھے کوئی اپنی تلوار سے قتل کر دے یا کسی کے تیر سے مر جاؤں؟ فرمایا وہ قاتل تیرے اور اپنے گناہ کے ساتھ لوٹے گا اور اصحاب النار سے ہوگا۔ (یہاں حدیث میں بھی "**یبوء باثمه واثمک**" وارد ہے، جس کی بہت بہتر شرح اوپر حضرت شاہ صاحبؒ سے نقل کی جا چکی ہے، اس کے بعد جمہور علماء اسلام کا مذہب ملاحظہ کیجئے۔

(۳)...... اکثر صحابہ، تابعین اور جمہور اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ ایسے وقت حق کی امداد اور باغیوں سے قتال واجب ہے، یعنی جو شخص یا جماعت حق پر ہو اس کی ہر طرح کی نصرت اور اس کے ساتھ ہو کر باغی جماعت سے جنگ کرنی ضروری اور دینی فریضہ ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ **فقاتلوا التی تبغی الآیۃ** یعنی بغاوت کرنے والے شر پسند مسلمانوں سے جنگ کرو تا آنکہ وہ خدا کے امر حق کی طرف لوٹ آئیں۔ علامہ عینی اور علامہ نووی نے لکھا کہ یہی مذہب صحیح ہے اور احادیث منع مذکورہ کا مصداق وہ ہیں جن پر حق واضح نہیں کہ کس طرف ہے، یا مراد دو گروہ ہیں جو دونوں ظالم ہوں، یعنی کسی کے پاس صحیح دینی مقصد نہ ہو اور اگر وہ بات صحیح ہو جو اوپر کے دونوں مذہب والوں نے کہی ہے تو بغاوت کرنے والے اور فسادی شر پسند غالب ہو کر راہ حق کو مسدود کر دیں گے اور ان کی رسی دراز ہو جائے گی۔

مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم

علامہ عینیؒ نے یہ بھی لکھا کہ اہل سنت کے نزدیک حق یہ ہے کہ مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں سکوت کیا جائے، ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے، ان کے افعال کی اچھی تاویل کی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ وہ سب مجتہد تھے، اپنے کردار و اعمال کے صحیح دینی مقاصد پر ہی ان کی نظر تھی، انہوں نے کسی معصیت یا دنیوی غرض و جاہ کا قصد نہیں کیا تھا۔

لہٰذا جو ان میں سے خطا پر تھے، ان کی بھی فروعی غلطیوں سے خدا کے یہاں مجتہد ہونے کے سبب درگزر رہے اور جو حق و صواب پر تھے، ان کے لئے خدا نے ڈبل اجر و ثواب مقرر کیا ہے۔

حضرت علیؓ اور خلافت

اس کے بعد یہ امر کہ حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما میں سے کون حق پر تھا؟ اس کے بارے میں محقق طبری وغیرہ نے تو سکوت کیا ہے لیکن جمہور علماء و محققین نے فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حق پر تھے، کیونکہ وہی اس وقت تمام صحابہ میں خلافت کے زیادہ احق و اہل تھے اور اس زمانے کے ساری دنیا کے لوگوں سے زیادہ افضل و اشرف بھی وہی تھے (عمدۃ القاری ص ۱/۲۴۷)

تکمیل بحث

حدیث ''**القاتل و المقتول فی النار**'' پر کافی بحث ہو چکی ہے، مگر علامہ محقق محدث عبداللہ بن ابی جمرہ اندلسیؒ نے بہجۃ النفوس (شرح البخاری) میں چند فوائد نہایت قیمتی تحریر فرمائے ہیں، ان کو ذکر کئے بغیر حدیث مذکور کی شرح کو ختم کر دینا مناسب نہیں، انہوں نے سب سے پہلی وضاحت تو یہ کہ ''حدیث مذکور کا مفہوم عام مراد نہیں'' کیونکہ قتال بعض سلف (جس میں دونوں فریق کے لئے استحقاق جنت کی شہادت

مل چکی تھی) یا قتل خطا' یا قتال بغرض تعلم طریق جنگ اور اس قسم کے بہت سے قتال ضرور مستثنیٰ ہیں' لہٰذا حدیث کا مصداق یہ ہے کہ قتال کرنے والوں میں سے ہر شخص کا ارادہ دوسرے کو قتل کرنے کا بطور ظلم وعدوان بغیر تاویل حسن بلا کسی شبہ کے اور ناحق ہو۔

لہٰذا اگر کسی کے پاس چور آیا یا ڈاکو چڑھ آئے کہ اس کو قتل کریں یا مال لوٹ لیں تو اس کو چاہئے کہ اس آنے والے سے اس نیت سے قتال ومقابلہ نہ کرے کہ اس کا خون بہائے بلکہ اس نیت سے قتال کرے کہ وہ اپنے مال وجان یا آبرو کی حفاظت ومدافعت کر رہا ہے' پھر اگر اس مدافعت وحفاظت خود اختیاری کے اندر وہ مقابل مارا جائے تو وہ بدترین مقتول اور یہ مارا جائے تو شہید ہوگا کیونکہ حدیث میں وارد ہے' جو شخص اپنے مال' (جان یا آبرو) کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جائے' وہ شہید ہے' البتہ فقہاء نے ایسے موقع پر اتنی احتیاط مزید لکھی ہے کہ ہو سکے تو اس کو خدا کی قسم دے کر ایسے اقدام سے روک دے' پھر اگر مجبور ہو کر مندرجہ بالا صحیح نیت سے مدافعت کے لئے نکلا اور اس حملہ آور کو زخمی کر دیا (کہ وہ حملہ کرنے کے قابل نہ رہا' تو اور زخم پہنچا کر اس کو بالکل مار نہ ڈالے اور اگر وہ بھاگے تو اس کا پیچھا نہ کرے اور اگر اس کی سبقت سے اس چور کو ایسی ضرب لگی کہ وہ مر گیا تو اس کا ذاتی سامان نہ لے"۔

یہ سب تفصیل اس صورت میں ہے کہ حملہ کرنے والا یا چور مسلمان ہو اور اگر کافر ہو تو اتنی احتیاط وقیود نہیں ہیں کیونکہ اس نے ایسا اقدام کر کے خود ہی اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا ہے۔' البتہ ذمی کافر کے احکام دار السلام میں مسلمان ہی جیسے ہیں۔

دوسری بحث علامہ موصوف نے یہ کی ہے کہ قاتل ومقتول دونوں کا گناہ برابر ہے' یا الگ الگ ہے؟ جس طرح مومن عاصی اور کافر دونوں جہنم میں جائیں گے مگر دونوں کا جہنم میں جانا یکساں نہ ہوگا تو اس حدیث سے دونوں کا معاملہ یکساں معلوم ہوتا ہے اور قرآن مجید میں ہابیل وقابیل کے واقعہ سے دونوں کا فرق معلوم ہوتا ہے' اسی لئے صحابہؓ کو اشکال پیش آیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا' آپ نے جواب میں تنبیہ فرمائی کہ مقتول بھی چونکہ دوسرے کو قتل کرنے پر حریص تھا' اس لئے اس کی نیت بھی فاسد تھی' پس دونوں فساد نیت میں برابر ہو گئے' بشری قدرت میں جتنا تھا وہ دونوں کر چکے کسی کو باقی رکھنا یا کسی کو فنا کر دینا یہ اس کی قدرت سے باہر ہے' گویا حرص قتل مسلم کو ہی اس کی عمر ختم کرنے کے قائم مقام کر دیا گیا' کیونکہ شریعت نے قتل نفس کے بارے میں نہایت سختی اختیار کی ہے' چنانچہ اس کا فیصلہ ہے اگر ایک جماعت مشورہ کر کے کسی ایک شخص کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لے اور ان میں سے صرف ایک شخص قتل کرے اور باقی لوگ صرف موقع پر موجود رہیں تو وہ سب ہی لوگ قاتل قرار پائیں گے اور شریعت سے سب ہی کو قتل کی سزا ملے گی۔

جب صرف اس موقع کی موجودگی پر یہ حکم ہے تو جو شخص موجود بھی ہو' قتل پر حریص بھی ہو کوشش بھی کرے' اس کا حکم معلوم ہے بلکہ شریعت میں اس سے بھی سخت احکام ہیں' مثلاً یہ کہ اگر کسی مسلم کے قتل میں کوئی اعانت کرے خواہ ایک چھوٹی بات سے ہی ہو' وہ قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کی پیشانی پر آیس من رحمۃ اللہ لکھا ہوگا' یعنی خدا کی رحمت سے مایوس۔

ظلم وقتل کا فرق

محدث ابن ابی جمرہؒ نے یہ تحقیق بھی کی کہ کیا ظالم ومظلوم بھی قاتل ومقتول کی طرح گناہ میں برابر ہیں یا نہیں؟ جبکہ ہر ایک نے دوسرے پر ظلم کا ارادہ کیا ہو' آپ نے لکھا کہ ظلم وقتل میں باہم ہر جہت سے مشابہت نہیں ہے کیونکہ ظلم کی دو قسم ہیں۔ حسی ومعنوی' حسی کا تحقق دماء' اموال واعراض میں ہوتا ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ ایک دوسرے کے دماء اموال واعراض کی نگہداشت واحترام فرض وواجب ہے اور اس میں رخنہ اندازی حرام ہے دماء کے اندر ظلم کی صورت قاتل ومقتول والی حدیث کی شرح میں گزر چکی ظلم فی الاموال کی صورت ظلم فی الدماء سے اس لئے الگ ہے کہ جوابی طور ظلم کرنے کو ہم صرف تجنیس کے طور پر ظلم کہتے ہیں حقیقتاً

نہیں جس طرح **جزاء سیئة سیئة مثلها** میں ہے کہ دوسری سیئہ حقیقت میں برائی نہیں ہے وہ تو بطور قصاص ہے۔

ظلم معنوی، جس کی بحث اس موقع کے لئے زیادہ مناسب ہے، اس کی دو قسم ہیں۔ نیت بغیر عمل و تسبب کے اور نیت مع عمل یا تسبب کے اول کی مثال حسد، بغض وغیرہ، بری اور مذموم نیات ہیں، حدیث میں ہے **لاتحاسدوا ولا تباغضوا ولاتدابروا وکونوا عباد الله اخوانا** (نہ آپس میں حسد کرو، نہ بغض رکھو، نہ ایک دوسرے سے اعراض کر کے پیٹھ پھیرو اور سب خدا کے نیک بندے، بھائی بھائی بنے رہو)۔

پس یہ سب نیات اور دل کے اعمال اعراض و اموال کی طرح نہیں ہیں کہ ان کا حساب ہو جائے جس کی زیادتی نظر آئے اس سے مکافات کرائی جا سکے، بلکہ یہ قاتل و مقتول کی طرح ہیں کہ دونوں کو عذاب برابر ہوگا، کسی کا دوسرے سے کم نہ ہوگا، کیونکہ امور باطن کی برائی اچھائی بہ نسبت امور ظاہر کے زیادہ سنگین ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **ان فی الجسد المضغة اذا اصلحت صلح الجسد کله واذا فسدت، فسد الجسد کله، الا وهی القلب** (جسم انسانی میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، جب وہ صحت مند ہوتا ہے تو سارا جسم تنومند ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ قلب ہے) قلب سے مراد وہ جسمانی عضو نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کی کیفیت و حالت مراد ہے، کیونکہ حضرت ابن عباسؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اگر تم سے ہو سکے کہ صبح و شام اس طرح گزار دو کہ تمہارے دل میں کسی ایک شخص کی طرف سے بھی دل میں کدورت نہ ہو تو ضرور ایسا ہی کرو، پھر فرمایا کہ اے بیٹے! یہ میری سنت ہے، جو میری سنت کو اپنے عمل سے زندہ رکھے گا گویا وہ مجھے زندہ رکھے گا اور مجھے اس طرح زندہ رکھے گا، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا، دوسری حدیث میں فرمایا جو شخص اس طرح صبح و شام گزارے کہ کسی پر ظلم و زیادتی کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے، اس کے کئے ہوئے سب گناہ بخش دیئے جائیں گے، نیز فرمایا جو ہم میں سے کسی کے ساتھ کھوٹ اور دھوکا کا معاملہ کرے وہ ہم میں سے نہیں، جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے، خدا اس کو نقصان پہنچائے گا جو کسی مسلمان کے ساتھ مکر و حیلہ کرے، خدا اس کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرے گا، وغیرہ، اس بارے میں آیات و احادیث بکثرت ہیں۔

دوسرا وہ ظلم ہے جو نیت و عمل کے ساتھ سے ہو جیسے قطیعہ رحم کیونکہ جب دو قریبی رحم کے ناتے والے ایک دوسرے کا مقاطعہ کریں گے تو قطع رحم والی وعید و سزا کے دونوں مستحق ہوں گے اور اس میں کسی کے لئے یہ عذر صحیح نہ ہوگا کہ دوسرے نے پہلے قطع رحم کا معاملہ کیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، تمہیں اس کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرنی ہے جو تم سے قطع تعلق کرے اور اس کو بھی امداد پیش کرنی ہے جو تمہیں منع کر کے محروم کر دے، نیز آپ نے خبر دی کہ جب حق تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو رحم نے عرض کیا کہ اے رب! یہ ناچیز آپ کی بارگاہ ذوالجلال میں قطع رحم سے پناہ لینے والے کی جگہ کھڑا ہے۔ حضرت رب العزت جل ذکرہ نے فرمایا کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ جو تمہیں ملائے گا، میں اس کو اپنے ساتھ ملاؤں گا اور جو تمہیں قطع کرے گا میں اس کو اپنے سے قطع کر دوں گا؟ رحم نے عرض کیا کیوں نہیں یا رب؟ میں ضرور اس بات سے راضی ہوں حق تعالیٰ نے فرمایا، اچھا تمہارے لئے ایسا ہی ہوگا۔

تیسرا وہ ظلم ہے جو نیت اور تسبب سے ہوگا، جیسے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش، دھوکہ، مکر وغیرہ کے ذریعہ کرے، خواہ دوسرے کو ضرر و اذیت پہنچے یا نہ پہنچے، کیونکہ اس کی فاسد نیت اور ایک مسلم کے لئے سبب اذیت بننے میں تو کمی نہیں کی، یہ دوسری بات ہے کہ وہ نقصان اس کو کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا چونکہ اس طرح نیت فاسد اور سبب اذیت بننا بھی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے یہ بھی پہلے کی طرح ہوگا کہ دونوں کا گناہ برابر ہوگا، کسی کا کم و بیش نہیں۔

علامہ ابن ابی جمرہؒ نے اس کے بعد فرمایا کہ اسی لئے فضلائے اہل علم و عمل جن کو نور بصیرت عطا ہوا ہے، کبھی اہل معاصی و کبائر سے بھی ان کی شخصیات سے بغض نہیں رکھتے، البتہ ان کے افعال مذمومہ خلاف شرع سے بغض و نفرت کرتے ہیں بلکہ ان پر ایک طرح سے رحم کھاتے ہیں کہ

وہ تقدیری طور سے مبتلائے معاصی ہوئے اور ساتھ ہی خدا سے ڈرتے ہیں کہیں ان جیسے نہ ہو جائیں گویا ایک طرف ان کی بداعمالیوں سے بغض و نفرت کرتے ہیں، دوسری طرف ان کی افتادِ طبع کی مجبوری پر رحم کھاتے ہیں، تیسری طرف اس امکان سے کہ خدا کہیں ہمیں بھی ان جیسا نہ کردے ڈرتے بھی رہتے ہیں اور ایسی ہی صورت میں حق تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے۔ ولا تاخذ کم بھما رافة فی دین اللہ کہ کہیں تم ایمانی رشتہ کے تحت اپنی جبلی رافت و شفقت کے سبب اس پر مجبور نہ ہو جاؤ کہ ان پر حدود شرعیہ بھی جاری نہ کرسکو۔ واللہ الموفق (بہجۃ النفوس ص ۱/۶۰)

۳۰ حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا شعبة عن واصل الاحدب عن المعرور قال لقیت اباذر بالربذة وعلیه حلة وعلی غلامه حلة فسالته عن ذلک فقال انی سابیت رجلاً فغیرته بامه فقال لی النبی صلی اللہ علیه وسلم یا اباذر عیرته بامه انک امرء فیک جاهلیة اخوانکم خولکم جعلهم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یا کل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفو هم ما یغلبهم فان کلفتموهم فاعینو هم.

ترجمہ: حضرت معرور سے نقل کیا گیا وہ کہتے کہ میں ربذہ کے مقام پر حضرت ابوذرؓ سے ملا ان کے بدن پر جیسا جوڑا تھا ویسا ہی ان کے غلام کے جسم پر بھی تھا میں نے اس (حیرت انگیز بات) کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے میں نے ایک شخص (یعنی غلام کو برا بھلا کہا، پھر میں نے اسے ماں کی غیرت دلائی یعنی ماں کی گالی دی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ حال معلوم کرکے) مجھ سے فرمایا کہ اے ابوذر! تم نے اسے ماں (کے نام) سے غیرت دلائی) بے شک تم میں ابھی کچھ جاہلیت کا اثر ہے تمہارے ماتحت لوگ تمہارے بھائی ہیں اللہ نے (اپنی مصلحت کی وجہ سے) انہیں تمہارے قبضے میں دے رکھا ہے تو جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو تو اس کو بھی وہی کھلائے جو آپ کھائے اور وہی پہنائے جو آپ پہنے اور ان کو اتنے کام کی تکلیف نہ دو کہ ان پر بار ہو جائے اور ان پر اگر کوئی ایسا سخت کام ڈالو تو تم خود بھی) ان کی مدد کرو۔

تشریح: معرور بیان فرماتے ہیں کہ میں ربذہ[1] جا کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ملا دیکھا کہ ایک حلہ[2] (چادر و تہمد کا سوٹ) وہ پہنے ہوئے تھے اور اسی جیسا ایک حلہ ان کے غلام پر تھا میں نے اس بارے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا یہاں سوال کی نوعیت ذکر نہیں ہے مگر امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں اس طرح نقل کیا ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت کے پاس ایک چادر ہے اور غلام کے پاس دوسری تو میں نے عرض کیا کہ اگر وہ (غلام والی) چادر آپ لے لیتے تو آپ کا سوٹ ہو جاتا۔ اس پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پورا قصہ سنایا جس سے ان کے استعجاب کا جواب ہو گیا۔

ابوداؤدؒ کی روایت میں اس طرح ہے کہ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ وہ غلام والی چادر لے لیتے اور اپنی چادر کے ساتھ ملا کر پہنتے تو حلہ (سوٹ ہو جاتا)

مقصد سوالِ معرور اور عربوں کا حال

بظاہر معرور اس مساوات کو دیکھ کر کہ آقا و غلام دونوں کا لباس یکساں ہے متعجب ہوئے پھر دوسرا تعجب اس سے کہ بے جوڑ سوٹ بنایا ہے۔ گویا آقا نے ظاہری زینت و فیشن کا بھی خیال نہیں کیا یہ دونوں باتیں نہ صرف حضرت معرور کے لیے وجہ حیرت و تعجب تھیں بلکہ جس طرح دوسری روایت ابی داؤد سے معلوم ہوا کہ سب ہی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالتی تھیں کیونکہ عرب والے بڑی ناک والے تھے ان کی بڑی آن بان تھی ان میں سے ہر شخص شاہی مزاج رکھتا تھا بڑی غیرت و حمیت والے تھے۔ غلاموں کو برابری کا درجہ دینا تو بڑی بات تھی وہ اپنی بیویوں کے جواب تک برداشت نہ کر سکتے تھے۔

---

[1] ربذہ مدینہ منورہ سے تین منزل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوجی چھاؤنی بنائی تھی۔ وہاں ان کے دورِ خلافت میں تیس ہزار گھوڑے ہروقت تیار رہتے تھے، جو اسلامی عساکر میں بھیجے جاتے تھے۔ کذا افادہ الشیخ الانور۔ [2] حلہ ایک ہی قسم کے اور نئے لباس کو کہتے ہیں اگر ایک چادر ایک کپڑے کی اور تہمد دوسرے کا ہو تو اس کو حلہ نہیں کہتے اس لیے یہاں راوی سے حلہ کہنے میں تسامح ہوا ہے جیسا کہ دوسری روایات سے ظاہر ہے۔

زمانہ رسالت کے چند حالات

چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو کر ایک ماہ کے لیے سب سے الگ تھلگ ہو کر مسجدِ نبوی سے متصل ایک بالاخانہ میں فروکش ہو گئے تھے اور یہ بھی عام شہرت ہو گئی تھی کہ آپ نے ان سب کو طلاق دیدی ہے حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر آپ کا رنج واثر کم کرنے کے لیے عرض کیا:۔ یا رسول اللہ ہم قریش خاندان کے لوگوں کا عورتوں پر مکہ معظمہ کے زمانے میں بڑا رعب داب تھا وہاں ان کی مجال نہ تھی کہ ہماری کسی بات کا پلٹ کر جواب بھی دے سکیں۔ مگر جب ہم لوگ مدینہ طیبہ آئے تو یہاں دوسرا رنگ دیکھا کہ عورتیں مردوں پر غالب تھیں اس کا یہ اثر ہوا کہ ہماری عورتوں نے بھی ان کی باتیں سیکھ لیں ایک روز ایسا ہوا کہ میں اپنی بیوی پر ناراض ہوا کچھ برا بھلا کہا تو اس نے پلٹ کر مجھے جواب دے دیا مجھے یہ بات نہایت ناگوار ہوئی اس پر وہ کہنے لگی:۔ آپ کو میرا جواب دینا ناگوار ہوا! واللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نہ صرف حضور کو جواب دیتی ہیں بلکہ کوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پورا پورا دن بات تک نہیں کرتی میں نے اس سے کہا کہ اگر یہ بات درست ہے تو ایسا کرنے والی ضرور تباہ و برباد ہوئی ان میں سے کون اس امر پر اطمینان حاصل کر سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب وغصہ کی وجہ سے اس پر خدائے برتر جل ذکرہ کا غضب نازل نہ ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا تو اس کی ہلاکت میں کیا شک رہا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا میری اتنی بات سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک سے رنج والم کے آثار دور ہوئے اور آپ نے تبسم فرمایا

اس کے بعد میں (اپنی بیٹی) حفصہ کے پاس گیا وہاں جا کر دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی رو رہی تھی میں نے پوچھا کیا تمہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی ہے؟ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں پھر میں نے کہا:۔ کیا یہ بات صحیح ہے کہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیتی ہے؟ اس نے کہا ہاں! میں نے کہا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تم میں سے کسی بات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رات تک بات نہیں کرتی؟ اس نے کہا ہاں! ''ایسا بھی ہوتا ہے'' میں نے کہا بڑی خرابی! بڑے خسارہ کی بات ہے اس میں خدا کے غضب کا بڑا خطرہ ہے میں تمہیں خاص طور سے ہدایت کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر کبھی ایک لفظ جواب کا زبان سے نہ نکالنا اور نہ کبھی آپ سے کسی چیز کا سوال کرنا بلکہ جب کبھی کوئی ضرورت پیش آئے تو مجھ سے طلب کرنا اور دیکھو! اپنی سوکن (عائشہؓ) کی وجہ سے سے دھوکہ میں نہ پڑ جانا، (کہ تم بھی اسی کی دیکھا دیکھی نازنخرے کرنے لگو) وہ تم سے زیادہ خوبصورت بھی ہے اور حضور کو اس سے محبت بھی زیادہ ہے یہ سن کر حضور نے دوبارہ تبسم فرمایا اس کے بعد میں نے مزید بیٹھنے کی اجازت طلب کی آپ نے اجازت مرحمت فرمائی۔

میں نے اس کمرے میں چاروں طرف دیکھا تو سارے کمرے میں بجز آپ کے بیٹھنے کی جگہ کے سامان کے کچھ نظر نہ آیا (جو صرف ایک گرد آلود بوریا تھا) جس پر لیٹنے سے حضور کے پہلوئے مبارک پر نشانات پڑ گئے تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ دعا فرمائیں کہ آپ کی امت میں بھی ایسا ہی خوشحالی آجائے جیسی روم وفارس کے لوگوں میں ہے حالانکہ وہ لوگ اللہ کے عبادت گزار بھی نہیں ہیں۔ یہ سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا! ابن الخطاب! کیا تم اب تک کسی شک وشبہ میں مبتلا ہو؟ ان لوگوں کے واسطے ساری عیش وراحت دنیا ہی کی زندگی میں دیدی گئی ہے (کیونکہ آخرت میں پوری طرح محروم ہوں گے) میں نے عرض کیا:۔ یا رسول اللہ! میرے لیے اللہ سے مغفرت طلب فرمایئے! (مجھ سے غلطی ہوئی) یہ روایت بخاری ومسلم، ترمذی ونسائی کی ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تخییر بھی کی، جس کا واقعہ مشہور ہے۔ نیز ایک مرتبہ حضرت ابوبکر وعمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ کے دروازے پر لوگوں کا اجتماع تھا یہ دونوں حضرات اجازت

لے کر اندر گئے تو دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں خاموش بیٹھے ہیں اور آپ کے گرد ازواج مطہرات ہیں جو نفقہ طلب کر رہی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابھی کچھ دیر پہلے کا قصہ ہے کہ زید کی بیٹی نے (اپنی بیوی کے متعلق کہا) مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کیا تھا' میں نے اس کی گردن پر ایک مکا مارا' اس پر حضرت کو خوب ہنسی آئی' پھر فرمایا کہ یہ سب بھی اسی لئے جمع ہیں' حضرت ابوبکر اٹھے اور (اپنی بیٹی) عائشہ کو مارنے کے لئے کھڑے ہوئے' اسی طرح حضرت عمرؓ نے (اپنی بیٹی) حفصہ کو مارنے کا ارادہ کیا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو روک دیا' ان دونوں نے اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور فرمایا کہ یہ کیسی نازیبا بات ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی چیزیں مانگتی ہو جو ان کے پاس نہیں ہیں وہ سب بولیں۔ واللہ! ہم آئندہ ہرگز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا سوال کر کے تنگ نہیں کریں گی۔

غرض اس قسم کے واقعات سے یہ بات نمایاں ہے کہ عرب کے لوگوں کا اصل مزاج کیا تھا اور پھر اس میں اسلام کی روشنی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت' تربیت و تزکیہ سے کیا کچھ کایا پلٹ ہوئی۔

فیض رسالت

غلاموں کے بارے میں بھی وہ مواسات یا مساوات کا برتاؤ کیسے کر سکتے تھے لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خصوصی ہدایات دیں' جیسا خود کھائیں' ان کو کھلائیں' جیسا خود پہنیں ان کو پہنائیں ان پر وسعت سے زیادہ کسی کام کا بوجھ نہ ڈالیں اگر ایسی ضرورت پیش آئے تو اس کام میں خود بھی ہاتھ بٹائیں۔ وغیرہ

حضرت ابوذرؓ کا مقام رفیع

پھر تمام صحابہ میں سے بھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی شان بالکل الگ تھی۔ انہوں نے اپنے حبشی غلام کو تحقیر کے طور پر یا ابن سوداء (او کالی کے بیٹے) کہا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت بلال حبشیؓ کو ایسا کہہ دیا تھا' انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی' آپ نے حضرت ابوذر کو بلا کر تنبیہ فرمائی کہ اسلام کے بعد بھی ایسی جاہلیت کی بات کرتے ہو؟ غلاموں' نوکروں کو اپنے خاندانی بھائیوں کے برابر سمجھو۔

وہ ان کو ایسی ہدایت ملی کہ پھر تو غلاموں کے ساتھ وہ سلوک کر کے دکھایا کہ دوسروں کو ان سے سبق ملا اور ان کی نقل کرنی دشوار ہوگئی۔ حضرت معرور کے سوال میں کئی باتیں نکل سکتی ہیں' مثلاً یہ کہ آقا و غلام کے لباس میں مساوات کیسی؟ اچھی چادر غلام کو نہ دے کر دونوں ایک قسم کی عمدہ چادر پہنتے' سوٹ ہو جاتا' گھٹیا قسم کی چادر خود رکھ کر دونوں ایک قسم کی عمدہ چادریں غلام کو دے دیتے وہ بھی سوٹ ہو جاتا اور خود بھی گھٹیا سوٹ پہن لیتے حضرت ابوذرؓ نے جواب میں وہ عام ضروری بات بتلائی جس کا پہنچانا ان کا خاص مشن و مقصد زندگی بن چکا تھا' وہ چاہتے کہ غلاموں' زیر دستوں' کمزوروں' ضعیفوں اور حاجت مندوں کے معاملہ میں جو پیغمبرانہ ہدایت ان کو حاصل ہوئی ہے اس سے سب ہی استفادہ کریں۔ اسی لئے سوال کے جس جزو کو معرور یا دوسرے لوگوں نے بظاہر نظر انداز کر دیا تھا اور جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بات سب کو معلوم تھی کہ آپ غلاموں سے مساویانہ سلوک کے عادی ہیں' آپ نے اسی کا جواب دیا کہ اصل سوال اور قابل جواب بنیادی بات وہی تھی' اس کے ساتھ دوسری بات کا جواب خود ہی آ گیا کہ خود عمدہ چادریں دونوں لے لیتے تو مساوات کے خلاف تھا اور تیسری بات اس لئے نظر انداز فرمائی کہ ظاہر ہے غلام اس صورت کو ہرگز برداشت نہ کرتا اور ممکن ہے عملاً ایسا ہوا بھی ہو اور غلام نے انکار کیا ہو ورنہ ابوذرؓ نے تو اپنی افتاد طبع سے اسی کو زیادہ پسند کیا ہوگا پھر جواب میں اس لئے بھی اس کو ظاہر نہ کیا ہوگا کہ اس سے اپنے مستور اور بہت بلند مقام کا اظہار ہوتا' نیز لوگوں کے لئے وہ صورت بظاہر قابل عمل بھی نہ تھی۔

یہ بات ہم نے اس لئے لکھی کہ حضرت ابوذرؓ نے اپنا معمول یہ بھی بنا لیا تھا کہ سائل و ضرورت مند کو وہ چیز دی جائے جو اپنے پاس سب سے اچھی ہو چنانچہ ایک شخص کو اس کے نہایت اصرار پر اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت اس شرط پر دی تھی کہ جب کوئی سائل آئے تو اس کو میرے مال میں سے سب

سے اعلیٰ قسم کی چیز دی جائے اور گھٹیا قسم کی اپنے لئے روک لی جائے اور ایک دفعہ اس کے خلاف کرنے پر نہایت ناراض ہوئے تھے۔ واللہ اعلم۔

حدیث کی شرح میں یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو تنبیہ مذکور فرمائی تو آپ فوراً زمین پر گر گئے اور فرمایا کہ جب تک وہ غلام (یا حضرت بلالؓ) میرے چہرہ کو اپنا پاؤں نہ لگائیں' میں زمین سے سر نہ اٹھاؤں گا چنانچہ وہ آئے اور آپ کے رخسار کو اپنا پیر لگایا تب ہی اٹھے' رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

بحث ونظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث میں اگرچہ مواسات (ہمدردی) کا مطالبہ ہے' مساوات (برابر کرنے کا) نہیں مگر حضرت ابوذرؓ نے اس کا مفاد مساوات ہی قرار دیا تاکہ اپنے نفس کی اصلاح زیادہ تشدد وسختی سے کریں۔

سب صحابہ کا مسئلہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں تفصیل منقول ہے' ایک قول ہے کہ تمام صحابہؓ کے لئے نامناسب کلمہ کہنا فسق ہے' بعض نے کہا کہ سب شیخین (ابوبکر وعمرؓ) کفر ہے' لیکن محقق بات یہ ہے کہ تمام صحابہ یا اکثر کے بارے میں سب یعنی برا بھلا قول کفر ہے' کسی ایک یا دو صحابی کے متعلق ایسا کرنا فسق ہے اور صحابہ کا باہم ایک دوسرے کو سب کرنا فسق نہیں ہے کیونکہ ایسا جہاں ہوا بھی ہے تو وہ کسی داعیہ کے تحت ہوا ہے' محض اپنے (ناروا) غضب وغصہ کو ٹھنڈا کرنا مقصود نہ تھا بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے بعد میں سب صحابہؓ کیا کہ وہ کسی سبب صحیح کے تحت نہیں ہے بلکہ محض غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اور بوجہ نفسانیت ہے کیونکہ وہ لوگ دنیا سے جا چکے اور ان کا کوئی معاملہ یہاں کے لوگوں سے باقی نہیں رہا۔ اب ان کو مطعون کرنا یا ان کی برائیاں نکال کر ظاہر کرنا محض ان سے بغض رکھنے کے سبب ہوسکتا ہے۔

حکم روافض

اس میں اختلاف ہے کہ روافض کی تکفیر کی جائے یا نہیں؟ علامہ شامیؒ کے رائے تکفیر کی نہیں ہے لیکن حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی نے تکفیر کی ہے اور فرمایا کہ تکفیر نہ کرنے کا سبب ان کے عقائد سے ناواقفیت ہے (کذا افادالشیخ الانور) واللہ اعلم

حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک

آپ بڑے جلیل القدر صحابی اور مشہور عابد وزاہد تھے' آپ کا مسلک تھا کہ حاجت سے زیادہ جو مال جمع کیا جائے وہ کنز ہے' جس پر قرآن مجید میں عذاب کی وعید آئی ہے۔ جمہور صحابہ' تابعین اور دوسرے علماء امت کے نزدیک کنز سے مراد وہ جمع کیا ہوا مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور یہاں حدیث میں جو حکم مواسات ہے وہ بھی استحبابی ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے' قاضی عیاض نے اسی مسئلہ کو اجماعی مسئلہ لکھا ہے۔ علامہ محقق عینی نے اس کو عمدۃ القاری ص ۱/۲۴۳ میں نقل کیا ہے' حجۃ الاسلام حافظ حدیث مفسر شہیر ابوبکر جصاص رازی حنفی نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں اس مسئلہ پر مفصل ومدلل بحث کی ہے اور حضرت ابوذرؓ کے موافق احادیث وآثار کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ ان کا تعلق ابتدا اسلام کے اس دور سے تھا جب لوگ شدید حاجت وتنگی عیش میں مبتلا تھے اور اس وقت باہمی مواسات واجب کے درجہ میں تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی رائے

پھر لکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے کہ یہ احادیث وآثار آیت خذمن اموالھم صدقۃ تطھرھم سے منسوخ ہوگئے نیز احادیث مشہورہ سے دوسو درم اور بیس دینار میں نصف دینار بطور زکوٰۃ واجب ہونا معلوم ہوا ہے' کل مال دینے کا وجوب ثابت نہیں ہوا' پس اگر تمام مال دینا واجب ہوتا تو مذکورہ نصاب بتلانے کی ضرورت نہ تھی پھر یہ کہ صحابہ کرامؓ میں سے بھی بہت لوگ مالدار تھے' جیسے کہ حضرت عثمان غنیؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف

وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس امر کو جانتے تھے مگر ان کو تمام مال صدقہ کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ تمام مال کا صدقہ کرنا فرض وواجب نہیں ہے اور فرض صرف زکوٰۃ ہی ہے البتہ کسی وقت ایسے حالات پیش آجائیں جن کے باعث مواسات واجب ہوجائے' مثلاً کوئی بھوکا حالت اضطرار میں ہو یا کسی کے پاس کپڑے نہ ہوں یا کسی میت لاوارث کے کفن دفن کی ضرورت لاحق ہو تو اس وقت اس ضرورت کو پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ایسے ہی موقع کے لئے ہے۔ فی المال حق سوی الزکوۃ (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے)

اس کے بعد محقق بصاص نے لکھا کہ آیت میں ولاینفقونہا سے مراد ولاینفقون منہا ہے' گویا من محذوف ہے جس کی تائید آیت خذمن اموالهم صدقة سے ہوتی ہے کیونکہ بعض مال لینے کا حکم فرمایا' تمام کا نہیں اس طرح دوسری آیت کو پہلی آیت کے لئے ناسخ ماننے کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور دونوں کا مفاد ایک ہی ہوجاتا ہے۔

کنز سے کیا مراد ہے

دوسرے یہ کہ کنز سے شریعت کی اصطلاح میں وہ مال مراد ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو' حضرت عمرؓ' ابن عباسؓ' ابن عمرؓ' حسنؒ' عامر اور سدیؒ سے یہی تفسیر مروی ہے لہٰذا آیت کنز سے صرف وجوب زکوٰۃ ہی مفہوم ہوا اور اس کی تائید حدیث ابن عباسؓ سے بھی ہوتا ہے کہ جب وہ کنز والی آیت اتری تو مسلمانوں کو بڑی فکر لاحق ہوئی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تمہارا فکر وتردد رفع کروں گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ! یہ آیت آپ کے اصحاب پر بھاری ہوگئی ہے' آپ نے فرمایا حق تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے فرض کی ہے کہ تمہارے پاس کے باقی اموال طیب ہوجائیں اور وراثت کا حق اس لئے قائم کیا ہے کہ تمہارے بعد کے لوگوں کو فائدہ پہنچے یہ سن کر حضرت عمرؓ نے (خوشی سے) تکبیر کہی۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ آدمی کا سب[1] سے بہترین کنز وخزینہ اس کی نیک بیوی ہے ایسی کہ جب اس کو دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے' جب اس کو کسی بات کا حکم کرے تو اطاعت کرے اور جب کہیں سفر کو جائے تو اس کے مال وآبرو کی حفاظت کرے' ایک حدیث ابن لہیعہ نے ابوسعیدؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کردی تو جو حق تم پر واجب تھا وہ پورا کردیا معلوم ہوا کہ مال میں جتنا حق واجب الادا ہے وہ زکوٰۃ ہی ہے (احکام القرآن للجصاص طبع المطبعۃ البہیۃ المصریہ ص ۱۳۲/۳)

تحقیق صاحب روح المعانی

محقق آلوسی صاحب روح المعانی نے بھی کنز والی آیت کے تحت احادیث وآثار ذکر کئے ہیں اور طبرانی وبیہقی سے حضرت ابن عمرؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ماادی زکاة فلیس بکنز" (جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی گئی وہ کنز نہیں ہے) یعنی وہ کنز جس پر وعید آئی ہے اس صورت میں ہے کہ حکم کے موافق صرف نہ کیا جائے' جن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مال جمع کر کے بالکل نہ رکھا جائے ورنہ مستحق عذاب ہوگا' اس سے مراد وہی صورت ہے کہ اس کا حق واجب ادا نہ کیا جائے اور بعض نے کہا کہ وہ سب روایات فرضیت زکوٰۃ سے پہلے زمانے کی ہیں۔ مثلاً وہ روایت طبرانی کہ ایک شخص کی اہل صفہ میں سے وفات ہوئی اور اس کے تہمد میں ایک دینار ملا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک داغ ہے اور دوسرے کی وفات پر دو دینار نکلے تو فرمایا دو داغ ہیں بعض نے کہا کہ اہل صفہ کے

---

[1] نسائی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے اس طرح مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا' کون سی عورت سب سے بہتر ہے فرمایا جو دیکھنے سے خوش کرے' حکم کی اطاعت کرے اور اپنے جان ومال میں شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کرے قزوینی واوسط میں حضرت ابوہریرہ وابوامامہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تقویٰ الٰہی کے بعد ایک مومن کو اس سے بہتر کوئی خیر ونعمت نہیں ملی کہ اس کی بیوی صالحہ ہو جب اس کو حکم کرے اطاعت گزار ہو اس کو دیکھے تو دل خوش کرے اگر اس پر کسی معاملہ میں بھروسہ کرکے قسم کھالے (کہ واللہ وہ ضرور ایسا کرے گی) تو اس کی قسم کو پورا کردے) اگر سفر میں چلا جائے تو اپنے تن بدن اور اس کے مال میں خیر خواہی کرے۔

لئے ایسا موزوں نہ تھا' وغیرہ پھر محقق آلوسی نے لکھا کہ ظاہر آیت پر نظر کر کے حضرت ابوذرؓ نے ضرورت سے زائد سب مال کو صرف کر دینا واجب قرار دیا ہے اور وہ اس رائے پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی نظریہ منوانا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں ان کی سب سے پہلی نوک جھونک یزید بن معاویہ سے ہوئی' یزید بن معاویہ کی کمان میں لشکر اسلام روم پر فوج کشی کے لئے گیا تھا' حضرت ابوذرؓ بھی اسی میں تھے' جب مال غنیمت کی تقسیم شروع ہوئی تو انہوں نے اس کو کنز بتلایا' یزید نے حضرت معاویہؓ کو خبر دی' آپ نے ان کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے' حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کو لکھا اور حضرت ابوذر کو بھی ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ حضرت عثمانؓ سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد بھی اپنی رائے پر مصر رہے۔ اتفاق سے اس وقت مدینہ طیبہ میں بھی کہیں سے بہت سا مال آیا ہوا تھا۔ اس لئے حضرت ابوذرؓ سب لوگوں سے جھگڑتے رہے حتیٰ کہ کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ملت حنیفہ تمام ملتوں سے زیادہ سہل اور عادل تر ہے اور جب کہ کل مال کا خرچ کر دینا ملت یہودیہ میں بھی فرض نہیں ہوا حالانکہ اس میں سب ملتوں سے زیادہ تنگی وشدت ہے' تو ملت حنیفیہ میں کیونکر ہوسکتا ہے؟ اس پر حضرت ابوذرؓ کو سخت غصہ آ گیا اور حضرت کعبؓ کو مارنے کے لئے لاٹھی اٹھا کر کہا کہ اے یہودی! تجھے ان مسائل میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ کعبؓ بھاگے اور ابوذرؓ پیچھے ہوئے انہوں نے حضرت عثمانؓ کی پیٹھ پیچھے چھپ کر پناہ لی۔ مگر حضرت ابوذرؓ ان کو بغیر مارے نہیں مانے ایک روایت یہ بھی ہے کہ کچھ چوٹ حضرت عثمانؓ پر بھی پڑی۔

حضرت ابوذرؓ کی رائے دوسرے صحابہؓ کی نظر میں

غرض حضرت ابوذرؓ کے اس خیال پر بہ کثرت صحابہ نے اعتراضات کئے اور وہ حضرات آیات وراثت پڑھ کر سمجھانے کی سعی کرتے تھے کہ اگر کل مال کا صرف کر دینا واجب ہوتا تو ان آیات کا فائدہ رہا؟ لوگ ان کے پاس جمع ہوتے تھے جہاں وہ پہنچتے اژدھام کرتے تھے اور ان کے خیالات پر حیرت واستعجاب کرتے تھے اس سے تنگ آ کر حضرت ابوذرؓ نے سب سے علیحدگی ویکسوئی اختیار کر لی تھی' حضرت عثمانؓ سے مشورہ کیا کہ کہاں جاؤں؟ آپ نے زبدہ جا کر اقامت کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ وہ وہیں جا کر رہنے لگے تھے' صرف جمعہ کے دن مدینہ طیبہ آیا کرتے تھے۔

زبدہ میں ان کے ساتھ صرف ان کی رفیقہ حیات اور غلام تھا وہیں ان کی وفات ہوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ خدا ابوذرؓ پر رحم فرمائے' تنہا رہے گا اور سب سے دور الگ اس کی وفات ہوگی ایسا ہی ہوا۔ (مرنے کے بعد ایک راہگزر قافلہ کے لوگوں نے خلاف توقع موقع پر پہنچ کر آپ کی تجہیز وتکفین کی اور نماز پڑھ کر دفن کیا۔

واقعہ ابی ذر اور شیعی تحریف

محقق آلوسی نے لکھا کہ قابل اعتماد واقعہ صرف اتنا ہی ہے مگر شیعی حضرات نے ایسی طرح نقل کیا ہے جس سے حضرت ذی النورین عثمان رضی اللہ عنہ کو مطعون کیا جا سکے' ان کی غرض نور عثمانی کو کم کرنے کی ہے اور خدا ان کے نور کو ضرور پورا اور کامل کرے گا۔ (روح المعانی ص ۳/۸۸ طبع منیریہ مصر)

اسلام کا معاشی نظام

اس موضوع پر حسب ضرورت ومطالبہ وقت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہمارے دور میں چونکہ اس مسئلہ کی اہمیت بہت سی وجوہ اسباب سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے ضرورت بھی زیادہ توسع کے ساتھ لکھنے کی تھی لیکن لکھنے والوں کے بہت سے قلم افراط وتفریط سے بھی دوچار ہوئے ہیں۔ خصوصاً اسلامی نظریہ کی ترجمانی میں' اس لئے ہم اپنے مقصد شرح حدیث کی رعایت سے اسی کی ترجمانی زیادہ صحت وبسط کے ساتھ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ پھر دوسرے موجودہ آئندہ دنیوی اختراعی نظام ہائے معاشی کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ کی برتری خود بخود سمجھ

میں آ جائے گی۔انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہ بات پہلے بتائی جا چکی کہ دور رسالت میں جب تک لوگوں کے معاشی حالات اچھے نہ تھے تو مال کا جمع کرنا جائز نہ تھا' اس کے بعد زکوٰۃ کا حکم آیا اور جمع مال کی بھی اجازت بشرط اداز کوٰۃ دی گئی' لیکن ساتھ ہی دوسری ہدایات قرآن وحدیث سے یہ بھی دی گئیں کہ صرف مال بوجہ اللہ اور محض زکوٰۃ پر مقتصر نہیں رہے گا بلکہ دوسرے حقوق بھی جمع شدہ مال میں علاوہ زکوٰۃ کے ہیں۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ **لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الآخر والملآئکۃ والکتاب والنبیین واٰتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسآئلین و فی الرقاب و اقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ الایۃ**

''بڑی نیکی جو مغفرت وہدایت کے لئے کافی ہو یہ نہیں کہ تم صرف اپنا منہ نماز میں مشرق یا مغرب کی طرف کرلیا کرو اور عقائد واعمال ضروریہ کی پروا بھی نہ کرو بلکہ نیکی و بھلائی جو اثر ہدایت وسبب مغفرت ہے یہ ہے کہ اللہ روز قیامت تمام ملائکہ' کتب آسمانی اور انبیاء علیہم السلام پر دل سے ایمان لائے اور ان پر یقین کرے' نیز باوجود رغبت ومحبت مال کے' اس کے علاوہ زکوٰۃ کے قریبوں' یتیموں' غریبوں' مسافروں اور ضرورت مند سائلوں پر صرف کرے' اسی طرح گردن چھڑانے (یعنی مسلمانوں کو کفار نے ظلماً قید کرلیا ہوتو ان کو رہا کرانے) میں یا مقروض کو قرض خواہوں سے چھڑانے میں یا غلام کو آزاد کرانے میں یا غلام مکاتب کو خلاصی دلانے میں خرچ کرے'' اور نماز کو خوب درستی کے ساتھ ادا کرے اور چاندی سونے اور جملہ اموال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرے۔ الخ (فوائد حضرت علامہ عثمانی ص ۳۴)

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں آیت فی الرقاب تک تلاوت فرمائی تھی' ہم نے زیادہ وضاحت کے لئے آیت کا اگلا جملہ لکھا ہے تاکہ زکوٰۃ کا حکم الگ معلوم ہو' یہ روایت ابن کثیر میں ترمذی وابن ماجہ وغیرہ سے نقل ہوئی ہے (ابن کثیر ص ۱/ ۲۰۸ طبی ومرقاۃ (شرح مشکوٰۃ) میں اس کی تفصیل میں کچھ مثالیں بھی لکھی ہیں کہ سائل کو اور قرض مانگنے والے کو محروم نہ کرے' برتنے کی چیز مانگی جائے تو دینے سے انکار نہ کرے' پانی' نمک' آگ وغیرہ کم قیمت چیزیں ویسے ہی دے دے۔ آیت مذکورہ کے علاوہ جس کا حوالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی دیا' دوسری آیات بھی ہیں۔ مثلاً۔

(۱) پارہ سیقول میں ہے (۱) اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو (۲) کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر (یعنی اخلاص کے ساتھ)

(۲) پارۂ لن تنالوا میں ہے (۱) تم کامل خیر وبھلائی کو جب ہی حاصل کرسکو گے کہ اپنی محبوب چیزوں کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے (۲) جنت ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور جو فراغت وتنگی ہر حال میں صرف خیر کرتے ہیں۔

(۳) پارہ یعتذرون میں ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اور اس کے عوض میں ان کو جنت دیں گے (۲) جو کچھ کم وبیش انہوں نے صرف کیا اور جتنے میدان اللہ کی راہ میں ان کو طے کرنے پڑے وہ سب کچھ ان کے نام پر لکھا گیا۔

(۴) پارہ سبحٰن الذی میں ہے کہ قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج ومسافر کو بھی۔

(۵) پارۂ ومن یقنت میں ہے۔ جو چیز بھی تم خرچ کرو گے اس سب کا عوض اللہ کے یہاں ملے گا۔

(۶) پارۂ تبارک الذی، سورۂ دہر میں ہے۔ وہ لوگ اللہ کی محبت میں غریب، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں زکوٰۃ کی قید نہیں ہے اور دوسرے نیک کاموں میں صرف کرنے کی ترغیب ہے۔

اس کے بعد اسی سلسلہ کی چند دوسری احادیث ملاحظہ کریں۔

(ا)نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''اے آدم کے بیٹے!تو(نیک کام میں)خرچ کر میں تجھ پرخرچ کرونگا (بخاری ومسلم)

(۲) فرمایا:۔حرص (حبِ مال) سے بچواس نے پہلے لوگوں کو برباد کردیا تھا (مسلم)

(۳)فرمایا:۔اپنی زندگی میں خودایک درم خیرات کردے یہ اس سے بہتر ہے کہ مرنے کے وقت اسکی طرف سے ایک سودرم خرچ کئے جائیں۔ (ابوداؤد)

(۴) فرمایا:۔خیرات کرنے میں جلدی کیا کرو کیونکہ بلااس سے آگے نہیں بڑھنے پاتی (یعنی رک جاتی ہے) (رزین)

(۵) فرمایا:۔ جوشخص ایک کھجور کے برابر پاک کمائی سے خیرات کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے پھراس کو بڑھاتا ہے جیسے تم بچھیرے کو پالتے ہو یہاں تک کہ وہ پہاڑ کے برابر ہوجاتا ہے (بخاری ومسلم)

(۶) فرمایا:۔خیرات کرنا مال کو کم نہیں ہونے دیتا خواہ آمدنی بڑھ جائے یا برکت بڑھ جائے خواہ ثواب بڑھتا رہے (مسلم)

(۷) فرمایا:۔اچھا صدقہ یہ ہے کہ کسی کو دودھ والی اونٹنی یا بکری دودھ پینے کے لیے دیدی جائے جوایک برتن صبح کو بھردے اور ایک برتن شام کو بھردے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دودھ پیتا رہے اور جب دودھ نہ رہے تو مالک کو لوٹادے (بخاری ومسلم)

(۸) فرمایا:۔ جومسلمان کوئی درخت لگادے یا کھیتی بووے پھراس میں سے کوئی انسان یا پرندہ یا چرندہ جانور کھائے تو وہ بھی اس کے لیے صدقہ ہوگا (بخاری ومسلم) مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اگراس میں سے چوری ہوجائے تو اس سے بھی اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔

(۹) حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا:۔ یارسول اللہ! میری والدہ کی وفات ہوگئی ہے کون سا صدقہ سب سے افضل ہے؟ (جس کا ثواب ان کو بخشوں) فرمایا پانی! انہوں نے کنواں کھدوادیا اور لکھ دیا کہ یہ ام سعد کے لیے ہے (ابوداؤد ونسائی)

(۱۰) فرمایا:۔سات چیزوں کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے:۔

(ا)علم دین سکھانا (۲) نہر کھودنا (۳) کنواں کھودنا (۴) درخت لگانا (۵) مسجد بنانا (۶) قرآن مجید تلاوت کیلئے چھوڑنا (۷) اولاد جواس کیلئے مرنے کے بعد دعاء مغفرت کرے (بزار وابونعیم) ابن ماجہ میں بجائے درخت وکنویں کے صدقہ جاریہ اور مسافرخانہ کا ذکر ہے۔

ان سب آیات واحادیث مذکورہ بالا سے علاوہ زکوٰۃ کے مال کے دوسرے مصارف پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ اسلامی کی نظر میں تمام انسانی ضروریات کا تکفل درجہ بدرجہ مالداروں پر لازم ہے اور اگرچہ تمام افراد میں مساوات کو اسلام ضروری نہیں قرار دیتا مگر مواسات اور باہمی ہمدردی کو نہایت ضروری سمجھتا ہے اسلامی تعلیم کی رو سے کسی شہر یا قصبہ کے مالدار آدمی کا اچھا کھا پہن کر زندگی گزارتا جب کہ دوسرے بہت سے لوگ خوراک و پوشاک کو ترستے ہوں خدا کو کسی طرح محبوب نہیں اس لیے جہاں اسلامی بیت المال ایسے لوگوں کی کفالت کے لیے موجود نہ ہو۔ وہاں مسلمانوں کو اپنا نجی بیت المال قائم کرکے لوگوں کی امداد کرنی چاہیے اوراس سے پہلو تہی کرنے والے مالدار سب ہی گنہگار رہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانی معاشرہ کی بہت سی جائز آزادیوں کو عملاً سلب کرکے جو معاشی مساوات کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اس کی حیثیت ووقعت اس سے زیادہ نہیں کہ جانوروں وچوپایوں کی طرح صرف ان کے ظاہری ڈھانچہ اور پیٹ کا حق تو تسلیم کیا جائے مگران کی اعلیٰ صلاحیتوں اور باطنی کمالات پر مہر لگادی جائے۔

معاشی مساوات

اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت اوپر ہوچکی جس سے معلوم ہوا کہ غربا ومساکین وزیردستوں کی اہم ضروریات زندگی کا پورا کرنا امراء ومالداروں کے ذمہ ہے اوران کے ساتھ مواسات وہمدردی کا برتاؤ بھی نہایت ضروری مگر سب انسانوں کی معیشت برابر درجہ کی ہوجائے یا سب مال وجاہ میں یکساں درجہ کے ہوجائیں یہ اسلام کا مطالبہ نہیں اس لیے جن حضرات نے معیشت واسبابِ معیشت کے اندر سب انسانوں

کے حقوق برابر قرار دیئے ہیں یا درجات کی اونچ نیچ کو غیر فطری یا غیر اسلامی سمجھا ہے وہ صحیح نہیں اسی طرح جن لوگوں نے افرادی ملکیت کا انکار کر کے صرف اجتماعی ملکیت کو مانا ہے وہ بھی درست نہیں حق تعالیٰ نے دنیا کو مجمع الاضداد بنایا ہے نور وظلمت، خیر وشر، صحت ومرض، اعلیٰ وادنی، تریاق وزہر، پھر ہر قسم مخلوق میں باہمی عظیم درجاتِ تفاوت اسی لیے پیدا کیے کہ اپنی ہمہ قدرتی شان کا مظاہر کریں انسانوں میں ظاہری شکل وصورت کے غیر معمولی تفاوت کے ساتھ ان کے باطنی اخلاق، ملکات، علمی وعملی صلاحیتوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ہر شخص کی ضرورتیں الگ الگ ہوتی ہیں تو سب کو ایک ہی پیمانے سے ناپنا یا سب کو ایک ہی درجہ میں رکھنا یقیناً ایک غیر فطری وغیر معقول عمل ہوگا۔

اسی کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام مبین اور وحیِ مستبین میں انسانوں کے تفاوتِ فضل وکمال وتفاوت فی الرزق وغیرہ کی طرف اشاروں سے نمایاں کیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رزق میں تفاوت کی مصلحت ایک خاص قسم کی آزمائش پر مبنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ایک طرف غنی کو صاحبِ ثروت بنا کر اس سے یہ مطالبہ فرماتے ہیں کہ وہ خدا کی نعمتوں[1] پر شکر کرے اور اپنی ثروت سے صرف خود ہی نفع اندوز نہ ہو بلکہ غرباء ومساکین اور ضعفاء وزیردستوں کی ضروریات کا تکفل بھی بطیبِ خاطر کرے کیونکہ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور انسانی ہمدردی انسانیت کا جزوِ اعظم ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو یہاں تک ہے کہ ہر جاندار کو کھلانے پلانے کا بھی بڑا اجر وثواب ہے اور گزر چکا کہ کسی کی کھیتی یا درخت کا غلہ وپھل کسی انسان یا حیوان نے کھا لیا تو وہ بھی صدقہ ہوا۔ دوسری طرف غرباء مساکین کو حکم ہے کہ وہ اپنے افلاس وقلتِ مال کے باوجود صبر وشکر کریں تکالیف ومشقتوں کو انگیز اور برداشت کرنے کی عادت وحوصلہ کریں دولت وثروت اللہ کے حکم سے چلتی پھرتی ہے آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے پاس ہوتی ہے اس پر انسانی سعادت وشقاوت کا مدار نہیں ہے اس کا مدار صرف خدا کی بھیجی ہوئی شریعت پر عمل کرنے نہ کرنے پر ہے دنیوی زندگی کے نشیب وفراز ہرگز قابل لحاظ نہیں لہٰذا نہ آپس میں کسی اونچ نیچ یا دوسرے اسباب کے تحت بغض وعداوت رکھو نہ ایک دوسرے پر مال وجاہ کی کمی بیشی کے سبب حسد کرو نہ آپس کے میل جول وتعلقات میں فرق آنے دو بلکہ سب ایک اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو''

تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

''لاتباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباداللہ اخوانا'' (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

قرآن وسنت کے احکام کا خلاصہ ہم نے پیش کر دیا اس سے آگے بڑھ کر جن لوگوں نے بعض آیات سے موجودہ دور کی اشتراکیت یا معاشی مساوات ثابت کرنے کی سعی کی ہے وہ حد سے تجاوز ہے مثلاً آیتِ سورۂ نحل میں **فھم فیه سواء** کا ترجمہ حالانکہ وہ برابر ہیں کرنا اور فا کو واوٗ حالیہ کا درجہ دینا جو عربیت کے بھی خلاف ہے یا **سواء للسائلین** (حم سجدہ[2]) کا مطلب یہ لینا کہ سب حاجت مندوں کے لیے رزق وروزی برابر پیدا کی گئی ہے یا آیت **خلق لکم[3] مافی الارض جمیعا** (بقرہ) کا ایسا مطلب سمجھنا جو انفرادی ملکیت کی شرعی قطعیت پر اثر

---

[1] حسن بصریؒ سے منقول ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو تحریر فرمایا:۔ **واقنع برزقک من الدنیا فان الرحمن فضل بعض عبادہ علی بعض فی الرزق بلاء یبتلی به کلا فیبتلی من بسطلیه کیف شکرہ للہ واداء الحق الذی افترض علیه فیما رزقه وخوله. رواہ ابن حاتم** (تفسیر ابن کثیر ص ۳ / ۵۷۷) ''دنیا میں جو کچھ رزق تمہیں ملا ہے اس پر قناعت کرو کیونکہ رحمٰن نے ہر ایک کا امتحان کرنے کے لیے رزق کے اندر بعض بندوں کو بعض پر فضیلت دی ہے (چنانچہ مسکین نادار کا امتحان تو ظاہر ہے مال دار کا امتحان یہ ہے کہ وہ خدا کا شکر کس طرح ادا کرتا ہے اور اپنے مال ودولت میں سے حقوقِ واجبہ بھی ادا کرتا ہے یا نہیں۔'' [2] حضرت شیخ الہندؒ نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ ''اور ٹھیرائیں اس (زمین) میں خوراکیں اس کی چار دن میں پورا ہوا پوچھنے والوں کو حضرت علامہ عثمانیؒ نے حاشیہ میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ارشاد نقل کیا یعنی پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا دوسرے مفسرین نے بھی یہی سمجھا اور لکھا ہے معاشی مساوات کسی نے اس سے ثابت نہیں کی۔'' [3] حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ اس طرح کیا:۔ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب اور فوائد میں تحریر فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا اور تمہاری بقا اور انتفاع کے لیے زمین میں ہر طرح کی (بقیہ فوائد اگلے صفحہ پر)

اندازہ درست نہیں ہے۔واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم.

باب:۔ظلم دون ظلم (ظلم ظلم الگ ہیں سب ایک سے نہیں)

۳۱:. حدثنا ابوالولید قال حدثنا شعبۃ ح قال وحد ثنی بشر قال حدثنا محمد عن شعبۃ عن سلیمان عن ابراھیم عن علقمۃ عن عبدِاللہ لما نزلت الذین امنوا ولم یلبسوآ ایمانھم بظلم قال اصحاب رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اینا لم یظلم فانزل اللہ عزوجل ان الشرک لظلم عظیم.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیتِ کریمہ الذین امنو اولم یلبسو اایمانھم بظلم

(بقیہ فوائد صفحہ سابقہ) چیزیں بہ کثرت پیدا فرمائیں (مطعومات اور مشروبات اور ملبوسات اور ہر چیز کے لیے آلات وسامان) ص ۷ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور)

اس جگہ حضرت شیخ الہندؒ نے صرف اتنا ہی لکھا ہے البتہ ایضاح الادلہ میں قضاء قاضی کے ظاہراً وباطناً نافذ ہونے کی بحث فرماتے ہوئے حنفیہ کی تائید اور غیر مقلدین کی جوابدہی کے ذیل میں کچھ مزید باتیں تحریر فرمائیں ہیں جن کو بعض حضرات نے معاشی مساوات ثابت کرنے کے لیے نقل کیا ہے، ہم نے اصل کتاب مذکور سے پوری بحث پڑھی اور حسب ذیل نتائج اخذ کئے۔(۱) حضرتؒ کا اصل مقصد اس جگہ (اس آیت کی تفسیر کرنا نہیں ہے۔(۲) مقصد صرف اس امر پر زور دینا اور آیت سے ثابت کرنا ہے کہ غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے تمام لوگوں کی حوائج وضروریات کو پورا کرنا ہے۔(۳) جب تک کسی شئی پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی ہے اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کرسکتا۔(۴) جن اشیا کا کسی خاص شخص کے قبضہ وملک میں ہونا معلوم نہ ہو اور قاضی کے یہاں ایک شخص ان پر اپنی ملک بتا کر اور گواہ شرعی پیش کر کے قاضی سے اپنے حق میں فیصلہ کرالے تو چونکہ قاضی شرعی نائب خدا اور رسول ہونے کی وجہ سے اس فیصلہ کا حق رکھتا ہے اس کا یہ فیصلہ ظاہر وباطن میں نافذ ہو جائے گا۔(۵) حضرتؒ نے قضاء قاضی مذکور کو مزید قوت پہنچانے کے لیے ایک نکتہ یا لطیفہ یہ بیان فرمادیا کہ آیتِ خلق لکم کے تحت چونکہ دنیا کی ہر چیز ہر شخص کے ملک وقبضہ میں آسکتی ہے تو گویا ایک درجہ میں ہر ایک کا کچھ حقِ ملک اس سے متعلق ہے اس لیے بھی قضاء قاضی کا نفاذ مکمل طور سے ہو جانے میں کوئی استبعاد عقلاً وشرعاً نہ رہنا چاہیے۔

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا قدس سرہ کی عبارت ایضاح الادلہ مندرجہ ص ۲۶۸ سے جو نتائج ہم نے اخذ کر کے اوپر لکھے ہیں وہ واضح ولا کلام ہیں لیکن مندرجہ ذیل چند امور جالِ کلام، تنقیح طلب اور محتاجِ ثبوت ہیں۔

(۱) ہر شئی اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے اگر اس سے مراد صرف اتنی ہے کہ باعتبارِ اصل اوروں کے حقوق کسی قابض ومالک کے مال سے متعلق ہورہے ہیں تو جیسا کہ ہم نے پہلے حدیث ان فی المال لحقاً سوی الزکوۃ کی تشریح کی ہے اس حد تک تو یہ بات درست ہے مگر آگے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ جملہ تحریر فرمایا کہ زائد علی الحاجت سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک "من وجہ" اس میں موجود ہے تو گیا شخص مذکورہ "من وجہ" مال غیر پر قابض ومتصرف ہے۔"

اس کی کوئی عقلی وشرعی وجہ ہم نہیں سمجھ سکے اس کو قرآن وسنت، اجماع وقیاس وغیرہ ادلہ شرعیہ کی کسوٹی پر کسنے کی ضرورت ہے۔

(۲) "مالِ کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہیں گوز کوۃ بھی ادا کردی جائے اور انبیاء وصلحا اس سے بغایت مجتنب رہے ہیں چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ وتابعین وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمادیا، بہرکیف غیر مناسب وخلافتِ اولی ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔"

اس عبارت میں انفاقِ جمیع مال کو انبیا علیہم السلام کا وصفِ خصوصی ماننے میں کوئی کلام نہیں لیکن تمام صلحا کے لیے اس امر کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں جب کہ صحابہ تابعین اور بعد کے لاکھوں کروڑوں صلحاءِ امت نے جمع مال کو عملاً جائز اور انفاقِ جمیع مال کو غیر واجب سمجھا اسی طرح یہ قول کہ بعض صحابہ وتابعین وغیرہ نے حاجت سے زائد مال رکھنے کو حرام قرار دیا۔محلِ نظر ہے کیونکہ صرف حضرت ابوذرؓ کا مسلک اور تشدد اس بارے میں مشہور ومنقول ہے اور وہ بھی زیادہ تشدد مال وزر کے بارے میں کرتے تھے دوسری چیزوں کے بارے میں نہیں چنانچہ خود ان کے پاس گدھے، گدھیاں، اونٹ، بکریاں تھے اور آپ کی ملک میں زمین بھی تھی جس میں باغ اور کھیتی تھی دو غلام اور ایک باندی خدمت کے لیے تھی اور مسند احمد میں حضرت ابوذرؓ ہی سے روایت ہے کہ جو شخص اونٹ، گائے یا بکری پالے اور زکوۃ نہ دے تو سب جانور قیامت کے روز اس پر وبال وعذاب بنیں گے، معلوم ہوا کہ زکوۃ نکالنے کی صورت میں جتنے چاہے پال سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ خود بھی اس اجازت سے مستفید ہوتے ہوں گے۔

بات لمبی ہوگئی کہنا صرف اتنا تھا کہ جن حضرات نے موجودہ دور کی اشتراکیت یا کمیونزم کو اپنے اکابر کے اس قسم کے اقوال کو پیشِ نظر رکھ کر اسلام سے قریب ثابت کرنے کی کوشش کی اس کو ہم خلافتِ احتیاط سمجھتے ہیں اس کے نتیجہ میں پہلے انفرادی ملکیت کے مسئلہ کو مجروح کیا گیا پھر ملکیتِ اراضی کی نوعیت ضعیف قرار دے کر جبری تنسیخ زمینداری کی تائید کی گئی حالانکہ حضرت گنگوہیؒ کے فتوئی میں موروثی کاشت تک بھی ناجائز قرار پا چکی تھی شاید کئی کہے کہ اس وقت انگریزی حکومت تھی اور ہندوستان دارالحرب تھا اور یہ سب احکام خود اپنی قومی حکومت کے دور سے متعلق ہیں جب کہ ہندوستان دارالحرب نہیں رہا بلکہ (بعض نیشنلسٹوں کی نظر میں) دارالمسلمین بن چکا ہے ظاہر ہے ایسی اونچی تحقیق وتدقیق پر کیا نقد ہوسکتا ہے؟ واللہ المستعان!

نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا ''ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے ظلم (گناہ) نہ کیا ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت **ان الشرک لظلم عظیم** اتاری کہ آیت بالا میں مقصود بڑا ظلم ہے جو شرک ہے۔

تشریح: چونکہ بقولِ خطابی صحابہ کرام شرک سے کم درجہ کے معاصی کو ظلم کا مصداق سمجھتے تھے اور شرک کا درجہ ظلم سے اوپر جانتے تھے اس لیے ان کو پریشانی ہوئی کہ ہم سب ہی نے کچھ نہ کچھ ظلم کا ارتکاب کیا ہے گناہوں سے معصوم کون ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مطمئن فرمادیا کہ ظلم سے مراد یہاں شرک ہے جو بڑا ظلم ہے حافظ ابن حجرؒ کی رائے یہ ہے کہ صحابہ کرام اس امر سے تو واقف تھے کہ ظلم کے تحت شرک و معاصی سب ہی داخل ہیں مگر چونکہ آیت میں تعمیم تھی کہ ایمان کے بعد کوئی ظلم بھی نہ کیا ہو تو صحابہؓ کو تشویش ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے ظلم و شرک کی تخصیص بتلا کر ان کی تشفی فرمادی اور وجہ تخصیص عام شارحین نے یہ لکھی کہ آیت میں بظلم کی تنوین تعظیم کے لیے ہے لہٰذا ظلم عظیم متعین ہوگیا دوسری توجیہ جو زیادہ بہتر ہے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے بیان فرمائی ہے کہ صحابہ کا اشکال تو لفظِ ظلم پر نظر کرنے کے باعث تھا لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب آیت کے کلمہ **ولم یلبسوا** سے دیا ہے کیونکہ لبس کا اطلاق چاہتا ہے کہ ایک جنس کی دو چیزیں ایک محل میں جمع ہوں سو ایمان و شرک دونوں عقیدہ کی چیزیں ہیں اور محل بھی دونوں کا ایک یعنی قلب ہے۔ معاصی کا تعلق جوارح سے ہے اور وہی اس کا محمل و مورد ہے لہٰذا ان کے لیے لبس کا لفظ موزوں نہیں ہوسکتا غرض لبس والتباس کی صورت ایمان و شرک ہی میں متصور ہے ایمان و معاصی میں نہیں اور اس کی طرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرمائی ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ بعینہ یہی حضرت نانوتویؒ والی توجیہ علامہ تاج الدین سبکی نے بھی عروس الافراح میں اپنے والد ماجد سے نقل کی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس آیت پر کچھ اپنے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے اور زیادہ بسط سے لکھنے کا سورۂ انعام میں آیت کے تحت لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر افسوس کہ وہاں تک تفسیری فوائد لکھنے کا وقت میسر نہ ہوا البتہ اس کی تکمیل حضرت عثمانیؒ کر سکتے تھے اور کرنی چاہیے بھی تھی نہ معلوم ان کو کیا مانع پیش آیا؟ بہر حال! اوپر کی آخری توجیہ ہی اس سلسلہ کے لیے حرفِ آخر معلوم ہوتی ہے اور کسی موقع سے ہم بھی مزید عرض کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

بحث و نظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں بھی میرے نزدیک کفر دون کفر کی طرح ظلم دون ظلم میں دون بمعنی غیر ہے اور میرے نزدیک ممکن ہے کہ امام بخاری نے یہ ترجمہ قولِ باری تعالیٰ ''**ظلمات بعضها فوق بعض** اور حدیثِ نبوی ''**الظلم ظلمات یوم القیامة**'' کے مجموعہ سے اخذ کیا ہو کہ دنیا کے تمام ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائیں گے اور وہ ظلمات (اندھیریاں) ایک ایک سے بڑھ کر تاریک ہوں گی اس لیے امام بخاریؒ نے یہ دکھلایا کہ ظلم بھی متغایر انواع کے ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ایک بحث یہاں یہ ہے کہ راوی نے کہا۔ صحابہ کے **اینالم یظلم**؟ کہنے پر اس کے جواب میں آیت **ان الشرک لظلم عظیم** نازل ہوئی حالانکہ دوسری روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم نے لقمان کا قول **ان الشرک لظلم عظیم** نہیں سنا؟!

جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت پہلے سے اتری ہوئی تھی اور صحابہ اس کو جانتے تھے حافظؒ نے فتح الباری ص ۱/۶۶ میں جواب لکھا کہ ممکن ہے آیتِ مذکورہ اسی قصہ میں اتری ہو اور ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے استشہاد بھی فرمالیا ہو اس طرح دونوں روایتوں میں مطابقت ہوگئی لیکن حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ صحیح جواب یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ اس واقعہ سے قبل ہی نازل شدہ تھی اور یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تلاوت اجنبیت و استبعاد دفع کرنے اور صحابہ نے غم و فکر کو دور کرنے کے لیے فرمائی تھی اور اس کو راوی نے نزول سے تعبیر کر دیا جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے خطبہ میں صحابہ کرام کے استبعاد کو دفع کرنے اور ان کو تسلی دینے کے لیے **وما محمد الا رسول** تلاوت فرمائی تھی چنانچہ ان سب کا تردد زائل ہوگیا اور کسی کہنے والے نے اس وقت کہا بھی تھا کہ ہم لوگوں نے ایسا محسوس کیا گویا یہ آیت ابھی آج ہی نازل ہوئی ہے غرض یہ راوی کے طرز بیان کا توسع ہے اور کچھ نہیں۔

سوال وجواب

ایک سوال یہ ہے کہ آیت میں تو ایمان والوں کے لیے امن وسلامتی کا وعدہ کیا گیا اوران کو ہدایت یافتہ بھی کہا گیا بشرطیکہ وہ لوگ شرک نہ کریں تو پھر گنہگار مومنوں کو عذاب کیوں ہوگا یہ بظاہران کے مامون وسلامت اور ہدایت یافتہ ہونے کے خلاف ہے اس کا جواب حافظؒ نے فتح الباری ص ۱/۶۷ میں یہ دیا کہ وہ ہمیشہ کے عذابِ جہنم سے مامون ہوں گے اور بہر حال طریق جنت کی طرف تو ہدایت پاتے ہوئے ہیں۔

اعتراض وجواب

ایک اہم شبہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان وشرک باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں تو ان کے تو ایک جگہ جمع ہونے کا جواز ہی نہیں نکلتا، پھر **ولم یلبسوا ایمانهم بظلم ای بشرک** کا کیا مفاد ہوا؟ اس کا جواب حضرت شیخ الہندؒ یہ دیتے تھے کہ آیت میں **لبس** کا لفظ ہے جس کے معنی ظاہری صورت میں رلنا ایک دوسرے سے قریب ہونا ہے کہ اجتماع کا شبہ ہو خلط کا لفظ نہیں ہے جس کے معنی حقیقۃً دو چیزوں کا باہم ملنا یا متحد ہونا ہوتا ہے غرض جس طرح اردو محاورے میں رلنے اور ملنے میں فرق ہے اسی طرح **لبس** و **خلط** میں بھی فرق ہے۔ پس ایمان کے ساتھ شرک کا **لبس** قلب کے اندر ہوسکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت الاستاذؒ کا یہ جواب ذکر کر کے فرمایا کہ میرے نزدیک اگرچہ لبس یا اختلاط کے لیے اتحادِ محل ضروری ہے مگر اس کے لیے اتحادِ شخص بھی کافی ہے لہٰذا اگر ایک شخص کے اندر ایمان کے ساتھ معاصی کا اختلاط ہو تو وہ بھی اتحادِ محل ہی کی صورت رہے گی اگرچہ ایمان کا محل قلب اور معاصی کا جوارح ہیں کیونکہ ایک شخص کے اندر تغایرِ محل تجویز کرنا یہ منطقی طریق فکر ہے اہلِ عرف اس طرح نہیں سوچتے سمجھتے۔

دقیق علمی فائدہ

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے علامہ مازری، امام نووی وغیرہ نے یہ استنباط کیا کہ کسی امر کی وضاحت و بیان ضرورت کے وقت تک موخر ہوسکتی ہے جس طرح ظلم کی وضاحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے سوال پر فرمائی لیکن قاضی عیاض اس کے خلاف ہیں انہوں نے فرمایا کہ یہاں حق تعالیٰ نے کسی عمل کا مکلف نہیں بنایا تھا بلکہ صرف تصدیق اعتقادی کا مکلف بنایا تھا جو ہر خبر الٰہی پر فوراً ضروری ہے لہٰذا یہاں بعد کو پیش آنے والی کسی ضرورت بیان کا وجود ہی نہ تھا جس پر استنباطِ مذکور کی بنیاد قائم ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ صحابہ کرام کو ڈر ہوا تو آنحضور نے ان کو ظلم کی مراد سمجھا دی اس پر جو بعض (یعنی حافظ ابن حجر) نے کہا کہ "بعض معتقدات میں بھی بیان ووضاحت کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا نفیِ ضرورت صحیح نہیں اور حق یہ ہے کہ اس قصہ میں تاخیر بیان صرف وقتِ خطاب کے لحاظ سے ہے کیونکہ جس وقت ان کو ضرورت پیش آئی بیان میں تاخیر نہیں ہوئی۔" حافظ عینی نے فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے قاضی عیاض کا مطلب ہی نہیں سمجھا وہ تو ہر اعتقادِ تصدیق کو فوری طور پر لازم کہہ رہے ہیں اس لیے ان کو فما انخفت الحاجہ سے کس طرح ملزم کرسکتے ہیں؟ اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہاں تاخیر بیان وقت خطاب سے ہے کیونکہ آیت میں خطاب ہی نہیں ہے (جو باب انشاء سے ہے) بلکہ اخبار ہے دوسرے یہ کہ ایک جماعتِ علماء کے نزدیک تاخیر بیان وقتِ خطاب سے بھی ممتنع ہے اور امام کرخی نے اس کا جواز صرف مجمل میں تسلیم کیا ہے (عمدۃ القاری ص ۱/۲۵۲)

باب علامة المنافق

منافق کی علامتوں کا بیان

۳۲ : حدثنا سلیمان ابو الربیع قال حدثنا اسمٰعیل بن جعفر قال حدثنا نافع ابن مالک بن ابی عامر ابو سھیل عن ابیه عن ابی ھریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اٰیة المنافق ثلث اذا حدث کذب واذاوعد اخلف واذا اؤ تمن خان.

۳۳: حدثنا قبیصة بن عقبة قال حدثنا سفیان عن الاعمش عن عبداللّٰه ابن مره عن مسروق عن عبداللّٰه بن عمر وان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اربع من کن فیه کان منافقا خالصاً ومن کان فیه خصلة منھن کانت فیه خصلة من النفاق حتیٰ یدعھا اذا وتمن خان واذاحدث کذب واذا عاھد غدرو اذاخاصم فجر تابعه شعبة عن الاعمش.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں (۱) بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) وعدہ کرے تو پورا نہ کرے (۳) امانت میں خیانت کرے۔

دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت اس طرح ہے جس شخص میں چار باتیں ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی حتیٰ کہ وہ اس سے باز آ جائے۔ (۱) امانت میں خیانت کرے، (۲) باتوں میں جھوٹ بولے، (۳) عہد کو پورا نہ کرے (۴) کسی سے جھگڑا ہو تو آپے سے باہر ہو کر بے تہذیبی پر اتر آئے۔

تشریح: مذکورہ بالا دونوں حدیث میں نفاق کی علامات بتلائی ہیں، مقصد یہ ہے کہ مومن کو ایسی باتوں سے سخت پرہیز کرنا چاہئے۔

(۱) جھوٹ یعنی خلاف واقعہ بات کہنا خدا کو نہایت ناپسند ہے وہ خود سچا ہے اور سچائی اس کو محبوب ہے، جھوٹ کے ناپسند ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے فتنے پھیلتے ہیں، دلوں میں برائیاں پیدا ہوتی ہیں، غلط خبروں سے لوگ مغالطوں میں پڑتے ہیں اور ایک غلط بات سے بعض اوقات ہزار دوسری غلطیاں رونما ہو جاتی ہیں، اسی لئے حدیث میں ہے جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ صرف اچھی بات زبان سے نکالے، ورنہ خاموش رہے، ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد جہنم میں اوندھے منہ صرف اس لئے ڈالی جائے گی کہ انہوں نے دنیا میں اپنی زبانوں پر کنٹرول نہیں کیا تھا، جھوٹ، غیبت، فتنہ انگیزی، لعن طعن سب وشتم وغیرہ کرتے رہتے تھے، قرآن مجید میں ہے **قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن، ان الشیطان ینزغ بینھم ان الشیطان کان للانسان عدوامبینا** (میرے بندوں کو سمجھا دیجئے کہ وہ اپنی زبان سے ہمیشہ اچھی باتیں کہا کریں کیونکہ شیطان (گھات میں ہے) ہر وقت ان میں جھگڑے ڈلوانے کی فکر و سعی کرتا رہتا ہے، وہ انسانوں کا کھلا دشمن ہے (ان کو چین وسکون سے نہیں دیکھ سکتا)

غرض اکثر فتنے وفساد جھوٹی اور غلط خبروں سے پھیلتے ہیں اسی لئے حدیث میں ہے کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو (بے تحقیق) بیان کردے، لہٰذا ہمیشہ پکی سچی اور تحقیق شدہ بات زبان سے نکالنی چاہئے بلکہ سچی بات بھی جو فتنہ وفساد یا لوگوں کو آپس میں دل برائی کا باعث ہو نہ کہنی چاہئے، کیونکہ لوگوں میں صلح واصلاح کی باتیں کرنا اسلامی شریعت کا اہم فریضہ ہے اور فساد ذات البین کی باتیں کرنا حرام وناجائز ہیں، اسی لئے اگر جھوٹ بول کر لڑنے والوں کے قلوب میں صلح وصفائی کی صورت نکالی جاسکے تو ایسے وقت جھوٹ بولنا بھی جائز ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب بات کہے تو سچ کہے مگر یہ ضروری نہیں کہ کوئی بات سچ معلوم ہو تو اس کو ضرور ہی کہہ دے

کیونکہ بعض اوقات سچی بات کہنا بھی فتنہ کا سبب بن جاتا ہے۔

جس وقت دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کی بے جا روش سے آپ کو اختلاف ہوا تو پہلے آپ نے اصلاح کی سعی فرمائی ان سے کہا کہ مدرسہ کو وقف اور خدا کی چیز سمجھو اس کو وراثت و ذاتی ملکیت مت بناؤ مگر ارباب اہتمام کب ایسی بات کا اثر لے سکتے تھے بالآخر آپ نے دارالعلوم سے احتجاجاً ترک تعلق فرمالیا اور آپ کے ساتھ دوسرے اکابر بھی مستعفی ہو گئے۔

سارے ملک میں ان حضرات کی علیحدگی سے بے چینی پھیل گئی اور مختلف جگہوں سے رہنمایان قوم کے وفود تحقیق و اصلاح حال کے لئے دیوبند پہنچنے لگے، یہاں خاص طور سے لکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت حضرت شاہ صاحب نے فرمادیا تھا کہ "میں کسی کی ذات سے متعلق یا مدرسہ کی خرابیوں کے بارے میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔ البتہ کسی بات پر میری شہادت کی ضرورت ہوگی تو اس کو چھپاؤں گا بھی نہیں"۔ یہ تھی بڑوں کی احتیاط، حالانکہ اس وقت لوگ بیانات ہی پر حق و باطل کا فیصلہ کر رہے تھے، مگر حضرت نے اس امر کو گوارا نہیں فرمایا کہ آپ کی کسی بات سے ادنیٰ درجہ کا بھی ناخوشگواری میں اضافہ ہو حالانکہ دارالعلوم کی اصلاح کا معاملہ بھی کسی طرح کم اہم نہیں تھا۔ **ولکن لا راد لقضائه**.

ایک مسئلہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جھوٹ وہی قابل مؤاخذہ ہے کہ جان بوجھ کر کوئی خلاف واقعہ بات کہی جائے لہٰذا اگر ایک محتاط آدمی کسی غلطی کی وجہ سے خلاف واقعہ بات کہہ دے تو وہ مواخذہ سے بری ہوگا کیونکہ وہ اپنی معلومات کی حد تک اس کو صحیح ہی سمجھ کر کہہ رہا ہے۔

(۲) وعدہ کا ایفا نہ کرنا۔ یہ بھی سخت گناہ اور مومن کی شان سے بعید ہے، اسی لئے علامات نفاق سے قرار پایا، پھر اس کی دو صورتیں ہیں اگر وعدہ کرنے کے وقت ہی اس کو پورا کرنے کی نیت نہ تھی تو خلاف وعدہ کرنے سے مکروہ تحریمی کا گناہ ہوگا اور اگر نیت اس وقت پورا کرنے کی ہی تھی مگر کسی مانع و مجبوری سے پورا نہ کرسکا تو اس میں کوئی گناہ نہیں، اسی طرح زید بن ارقم سے مرفوعاً ابوداؤد و ترمذی میں بھی وارد ہے، نیز وعید کا خلاف کرنا بھی درست بلکہ مستحب ہے، وعید یہ ہے کہ کسی مسلمان کو غصہ یا مصلحت سے ڈرایا، دھمکایا کہ تجھے فلاں نقصان پہنچاؤں گا تو ایسے وعدہ کا خلاف کرنا بہتر ہے۔

(۳) امانت میں خیانت کرنا۔ اس میں مال و متاع کی امانت بھی داخل ہے اور کسی نے راز کی بات کہی تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کو دوسروں پر ظاہر کرنا خیانت کے حکم میں ہوگا۔ المجالس بالامانۃ، یعنی مجلسوں کی بات بھی ان خاص مجلس والوں کے درمیان بطور امانت ہے، مجلس سے باہر کے لوگوں پر ظاہر کرنا درست نہیں۔ (۴) جب کسی سے معاہدہ کرے تو غدر کرے، وعدہ اور معاہدہ میں فرق یہ ہے کہ وعدہ ایک طرف سے اور معاہدہ دونوں طرف سے ہوتا ہے، معاہدوں کی پابندی اسلام و مسلمانوں کا وہ خصوصی و امتیازی وصف ہے کہ دوسرے مذاہب و ملل میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اس لئے نقض عہد نفاق کی بڑی علامت قرار دیا گیا۔ (۵) کسی سے جھگڑا یا اختلاف پیش آئے تو بیہودہ گوئی بے تہذیبی پر آجائے، یہ بھی مومن کی شان سے بعید ہے۔ حدیث میں ہے کہ حاملین قرآن کو جاہلوں کی طرح نہیں جھگڑنا چاہئے یعنی ان کا اخلاقی کردار بہت بلند ہونا چاہئے۔ یہ منافقوں، جاہلوں کی خصلت ہے کہ جھگڑے کے وقت اول فول بکنے لگیں۔

علامہ عینی نے تحریر فرمایا کہ ایک جماعت علماء نے اس حدیث کو مشکل احادیث میں شمار کیا ہے کیونکہ جو خصلتیں اس میں منافقین کی بتلائی گئی ہیں وہ بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں، دل و زبان کی گہرائی و سچائی کے لحاظ سے یقیناً مسلمان ہیں اور یہ بھی اجماع ہے کہ ان امور کے ارتکاب سے بھی ان پر کفر و نفاق کا حکم نہیں لگ سکتا، نہ ان کو جہنم کے درک اسفل کا مستحق گردانا گیا ہے جو منافقوں کا مقام ہوگا پھر اس حدیث کا صحیح مصداق کیا ہے؟ علامہ نے لکھا کہ علماء محققین کے اس میں حسب ذیل متعدد اقوال ہیں۔

ا...... امام نوویؒ نے فرمایا کہ حدیث میں کوئی اشکال نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب خصال نفاق کی ہیں اور ایسی خصلتوں والا منافق سے مشابہ ہے کیونکہ نفاق باطن کے خلاف امر کو ظاہر کرنا ہے جو ان خصلتوں والے میں بھی موجود ہے، پس ان خصلتوں والا دراصل اسلام کی خاص اصطلاح کا منافق نہیں ہے جو کفر کو چھپاتا ہے بلکہ اس کے نفاق کا تعلق خاص اس شخص سے ہے، جس سے وہ جھوٹ بولتا ہے

جس سے وعدہ خلافی کرتا ہے جس سے معاہدہ کر کے توڑتا ہے یا جس کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ وغیرہ

۲..... بعض نے کہا' اس نفاق کے حکم میں وہ لوگ داخل ہیں جو اکثری طور ان خصال کے عادی ہیں لیکن جن سے شاذ و نادر کبھی ایسی خصلتوں کا ظہور ہو جاتا ہے' وہ اس حدیث کا مصداق نہیں ہیں۔

۳..... علامہ خطابی نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بری خصلتوں سے ڈرانے اور احتراز کرانے کی غرض سے ایسا فرمایا ہے' تا کہ لوگ ایسی خصلتوں کے عادی نہ ہوں جن سے نفاق کی حد تک پہنچ سکتے ہیں' باقی نادر و غیر اختیاری صورتیں مراد نہیں ہیں جس طرح حدیث میں ہے التاجر فاجر واکثر منافقی امتی قراء ھا (تجارت پیشہ فسق و فجور کے مرتکب ہیں اور میری امت کے اکثر منافق قاری ہیں)

اس میں بھی تاجر کو جھوٹ سے اور قاریوں کو ریاء سے ڈرانا بچانا ہے ورنہ سب تاجر فاجر و کذاب نہیں ہوتے اور نہ سب قاری غیر مخلص وریا کار ہوتے ہیں۔

۴..... بعض نے کہا کہ یہ حدیث ایک مخصوص منافق کے بارے میں وارد ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو متعین کر کے اس کا عیب نہیں بتلایا کرتے تھے' اس لئے عام الفاظ سے فرمایا۔

۵..... بعض نے کہا کہ اس حدیث میں وہ زمانہ رسالت کے منافق مراد ہیں جنہوں نے ایمان کا دعویٰ کیا مگر جھوٹے تھے وہ اپنے دین کے امین بنائے گئے تھے مگر اس میں خیانت کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت دین کا وعدہ کیا مگر اس کو پورا نہ کیا قاضی نے کہا کہ اسی مراد کو ہمارے اکثر ائمہ نے پسند کیا اور یہی قول عطا بن ابی رباح کا اس حدیث کی تفسیر میں ہے اور اسی شرح کی طرف حسن بصری نے بھی رجوع کیا تھا' یہی مذہب ابن عمر' ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کا بھی ہے اور اس سلسلہ میں روایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عطا سے کہا میں نے حسن بصری سے سنا ہے جس میں تین خصلتیں ہوں گی' مجھے اس کو منافق کہنے میں کوئی تامل نہ ہوگا' بولے تو جھوٹ کہے' وعدہ کرے تو خلاف کرے' امین بنایا جائے تو خیانت کرے' عطا نے فرمایا جب تم حسن بصری کے پاس لوٹ کر جاؤ تو میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قصہ یاد کریں اور جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں خیانت' خلف وعدو غیرہ خصلتیں پیدا نہیں فرمائیں' یہ سب حصہ منافقوں کو دیا ہے۔ منافقوں کے بارے میں اس نے فرمایا ذلک بانھم آمنوا ثم کفروا کہ ایمان کے قریب آ کر کفر کی طرف لوٹ گئے لیکن ہمیں امید ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کبھی جدا نہ ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ اس حدیث کی وجہ سے کسی مسلمان میں ایسی خصلتیں دیکھ کر اس کو منافق کہنا درست نہیں ہے اس شخص نے حضرت عطاء کا یہ پیغام حضرت حسن بصری[1] کو پہنچایا

---

[1] حضرت حسن بصریؒ نہایت جلیل القدر تابعی تھے' خلافت فاروقی کے دو سال بعد ولادت ہوئی اور ۱۱۰ھ میں وفات ہوئی۔ آپ نے بہ کثرت صحابہ و تابعین سے روایت حدیث کی اور آپ سے بھی جلیل القدر ائمہ حدیث نے روایت کی ہے آپ بواسطہ حضرت قتادہ' ایوب' حمید الطویل' بکر بن عبداللہ مزنی و سماک بن حرب وغیرہ امام اعظمؒ کے شیوخ حدیث میں ہیں' حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا جو بات پوچھنی ہو حسن سے پوچھو کیونکہ ہم بھول چکے۔

حضرت قتادہ کا قول ہے کہ میں جس فقیہ کے پاس بھی بیٹھا' اس سے زیادہ افضل حسن بصری کو پایا' حضرت ایوب نے فرمایا کہ میری آنکھوں نے حسن بصری سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا' حضرت بکر بن عبداللہ مزنی نے فرمایا "جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے عالم کو دیکھے تو وہ حسن بصریؒ کو دیکھے ہم نے ان سے زیادہ عالم نہیں دیکھا۔

اعمش نے فرمایا "حسن بصری نے علم و حکمت کو خوب جمع کر کے دوسروں کو پہنچایا' حضرت ابو جعفر باقر کی مجلس میں حسن بصری کا ذکر آتا تو فرماتے تھے کہ ان کا کلام تو انبیاء علیہم السلام سے ملتا جلتا ہے۔

محدث ابوزرعہ نے فرمایا جو کچھ بھی حسن بصری نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر بیان کیا' اس سب کی اصل ثابت مجھ کو مل گئی بجز چار حدیثوں کے' محمد بن سعد نے فرمایا کہ حسن بصری جامع عالم' رفیع القدر فقیہ' ثقہ' مامون' عابد' ناسک' کثیر العلم' فصیح و بلیغ' جمیل و وسیم تھے' آپ نے ۱۲۰ صحابہ کو دیکھا۔ (تہذیب ص ۲/۲۶۳)

اتنے بڑے علم و فضل و علو مرتبت کے ساتھ اپنی کسی غلطی سے رجوع کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا بلکہ تلامذہ و اصحاب کو تاکید کرتے رہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو انہوں نے خوش ہو کر جزاک اللہ خیرا کہا (اور اپنی سابق رائے میں تبدیلی کر لی) پھر اپنے اصحاب سے فرمایا ''جب تم مجھ سے کوئی بات سنو اور پھر اس کو علماء تک پہنچاؤ' تو میری جو بات ناصواب وغیر صحیح ہو اس کا جواب بھی مجھ تک پہنچا دیا کرو''۔

مذکورہ توجیہ کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سعید بن جبیر کو اس حدیث کے سبب بڑا فکر ہوا کہ یہ علامات نفاق کی ہیں اور بعض مسلمان بھی ان خصلتوں سے بچ نہیں پاتے' اس لئے انہوں نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمیں بھی یہی فکر و پریشانی لاحق ہوئی تھی تو ہم نے خود رسول اکرم سے سوال کر لیا تھا' اس پر آپ نے ہنس کر فرمایا تھا تمہیں ان خصلتوں سے کیا واسطہ؟ (یہ تو منافقین کی مخصوص صفات ہیں چنانچہ میں نے جو کہا ''جب بات کرے تو جھوٹ بولے'' یہ منافقوں کے اس واقعہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں آیت **اذا جاء ک المنافقون** الآیۃ اتری ہے کیا تم اس طرح ہو؟ ہم نے عرض کیا ''نہیں آپ نے فرمایا پھر تمہیں کیا ڈر ہے؟ تم تو ان باتوں سے بری ہو۔

اور یہ جو میں نے کہا ''جب وعدہ کرے تو خلاف کرے'' تو اس کا مصداق وہ مضمون ہے جو آیت **ومنهم من عاهد الله لئن اتانا من فضله** الآیۃ میں بیان ہوا ہے کیا تم ایسے ہو؟ ہم نے عرض کیا ''نہیں!'' آپ نے فرمایا پھر تمہیں کیا فکر ہے تم اس سے بھی الگ ہو پھر یہ جو میں نے بتلایا کہ ''جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے'' تو اس سے اشارہ اس آیت کے مضمون کی طرف ہے جو مجھ پر اتری۔ **انا عرضنا الامانة على السموٰت والارض والجبال** الایۃ پس ہر انسان کو اس کے دین کی امانت سونپی گئی ہے غسلِ جنابت کرے گا پاک ہو کر نماز، روزہ (صحیح طور سے ادا کرے گا) اب یہ اس کے اپنے ظاہر و باطن کے اعمال ہیں (یعنی پاکی ناپاکی یا نماز روزہ کی صحیح ادائیگی کا حال عالم الغیب کے سوا کون جان سکتا ہے؟) منافق کے اس قسم کے سارے اعمال دھوکہ کی ٹٹی ہوتے ہیں تا کہ مسلمان ان کے ظاہری اعمال کے سبب ان کو اپنا جیسا مخلص سمجھیں حالانکہ وہ اپنے دین میں خیانت کر رہا ہے تو کیا تمہارا حال بھی ایسا ہے؟ ہم نے عرض کیا بالکل نہیں! فرمایا ''پھر تمہیں کیا غم ہے؟! تم ان خصلتوں سے عند اللہ پاک صاف ہو''۔

۶...... حضرت حذیفہ نے فرمایا کہ نفاق اب نہیں رہا وہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا کہ وہ لوگ کفر پر پیدا ہوئے تھے اور وہ ان کے دلوں میں رچا ہوا تھا مسلمانوں کے ڈر اور مصلحتِ وقت سے مجبور ہو کر اسلام ظاہر کرتے اور سارے اعمال نماز روزہ وغیرہ بھی ادا کرتے تھے اب اسلام کی اشاعت پوری طرح ہو گئی لوگ اسلام (دین فطرت) ہی پر پیدا ہوتے ہیں اسی میں ہوش سنبھالتے ہیں لہٰذا اس کے بعد جو لوگ اسلام ظاہر کریں اور دل میں کفر ہو تو وہ منافق نہیں بلکہ مرتد کہلائیں گے۔

۷...... قاضی عیاض نے فرمایا کہ حدیث الباب کا مقصد صرف ان ۴۔۵ خصلتوں کے اندر منافقین کے ساتھ تشبیہ دینا ہے پورے اسلام کے ساتھ نفاق کرنے والوں کے نفاق سے تشبیہ دینا مقصود نہیں ہے اور ایسے خصائل والے مومن کو صرف اس شخص کے ہی لحاظ سے نفاق کی بات کرنے والا سمجھیں گے جس کے ساتھ وہ ایسا معاملہ کرے گا یہ توجیہ اول توجیہ سے ملتی جلتی ہے۔

۸...... علامہ قرطبی نے فرمایا:۔ نفاق سے مراد عمل کا نفاق ہے عقیدہ کا نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ سے فرمایا تھا کہ تم میرے اندر کچھ نفاق پاتے ہو؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد عمل ہی کا نفاق ہو سکتا تھا عملی نفاق سے مراد اخلاص واحسان کی کمی ہو سکتی ہے حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ص ۱/۶۱ میں اس کو سب سے احسن جواب بتلایا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کہ میری باتیں علماء وقت پر پیش کر کے میری کوئی غلطی ہو تو اس سے مجھے مطلع کر دیا کرو چنانچہ متعدد مسائل میں اپنی آراء سے رجوع فرمایا اسی طرح دوسرے اکابر سلف بلکہ ہمارے اپنے اساتذہ کے دور تک بھی یہی طریقہ رہا کہ اپنی غلطی سے رجوع کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا یہ سب ان کے خلوص للّٰہیت اور پختگی علم کی دلیل تھی مگر اب ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ بات کیاب ہوتی جا رہی ہے' باوجود علم ومطالعہ کی کم مائگی کے محقق و متبحر کہلانے کا شوق اور بڑے بڑے القاب و خطابات پانے کی تمنا روز افزوں اگر کوئی غلطی ہو گئی تو اس سے رجوع سخت دشوار' کاش ہم اپنی غلط روش پر متنبہ ہوں اور طریق سلف سے دور نہ ہو۔ واللہ الموفق۔

ان سب اقوال کے بعد علامہ محقق حافظ عینیؒ نے فرمایا میں کہتا ہوں کہ المنافق میں الف لام اگر جنس کا ہے تو حدیث کا منشاء صرف تشبیہ وتمثیل ہی ہے حقیقت کا اظہار ہرگز نہیں اور اگر عہد کا ہے تو اس سے مراد کوئی خاص متعین منافق ہے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافق ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی تحقیق

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر ایک حل دوسرا ارشاد فرمایا کہ حدیث میں نفاق کی علامات ونشانیاں بتلائی ہیں علامات واسباب نہیں بتلائے علل واسباب کے ساتھ معاملات ومسببات کا وجود بھی متحقق ہوجاتا ہے لیکن کس چیز کی ابتدائی علامات ونشانیوں کے وجود سے یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز بھی متحقق ہوجائے جس کی یہ علامات ہیں جیسے علاماتِ قیامت کہ بہت پہلے سے اس کے آثار ونشانیاں ظاہر ہورہی ہیں اگر یہ سب اس کی علت ہوتیں تو قیامت کا وجود ضرور ہوجاتا۔

غرض علامت کے وجود سے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ نفاق کی خصلت بطورِ علامت پائی گئی اور اس کی وجہ سے اس شخص کو منافق نہ کہیں گے۔

تحقیق بیضاوی پر تنقید

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ جن لوگوں نے نفاق کا عملی واعتقادی دو قسم بتلا کر جواب دیا ہے مثلاً قاضی بیضاوی نے شرح مصابیح السنۃ میں وہ ٹھیک نہیں کیونکہ درحقیقت نفاق ایک ہی چیز ہے خواہ اس کا عمل خلافِ اعتقاد کہو یا اعتقاد خلافِ عمل۔

اول کا مصداق زمانہ رسالت کے منافقین تھے کہ وہ بظاہر سب اعمال مسلمانوں کی طرح انجام دیتے تھے اور ان کے دلوں میں کفر وشرک کی ظلمت بھری ہوئی تھی اور دوسرے کا مصداق آج کل کے بہت سے مسلمان ہیں جو اعمال کے لحاظ سے صفر ہیں۔ **والمعصوم من عصمة الله.**

حتی یدعها سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف رہنمائی فرمائی کہ اگر کسی مسلمان سے کسی خصلتِ نفاق کا صدور ہوجائے اور پھر وہ اس کو ترک کردے تو اس پر سے نفاق کا حکم ہٹ جائے گا جس طرح زانی کے ایمان کی تمثیل سائبان سے دی گئی ہے کہ زنا کے وقت اس کا ایمان سائبان تمثال باہر ہوجاتا ہے پھر جب وہ اس سے باز آجاتا ہے تو وہ ایمان پھر اندر واپس ہوجاتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کا مسلک

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حدیث الباب میں جو کچھ اشکال ہے وہ جمہور کے مسلک پر ہے کہ یہ سب نشانیاں اگر نفاق کی ہیں تو ان کا وجود نفاق کے وجود پر دال ہے اور حکم نفاق ہوا تو حکم ایمان کو وہاں سے ہٹانا لازمی ہوگا' ضدین کا اجتماع نہیں ہوسکتا' لیکن حافظ ابن تیمیہؒ کے مسلک پر کوئی اشکال نہیں' کیونکہ ان کے نزدیک ایک مسلم میں کفر ونفاق کی باتیں بھی جمع ہوسکتی ہیں اور حدیث کے الفاظ **"من کانت فیه خصلة منهن' کانت فیه خصلة من النفاق** سے بظاہر ان کی تائید ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور جواب

پہلی حدیث میں تین خصلتیں نفاق کی ذکر ہوئیں' جن سے بظاہر ان تین کے اندر حصر معلوم ہوتا ہے' پھر دوسری حدیث میں چار کا ذکر کیوں ہے؟ علامہ قرطبی نے جواب دیا کہ ممکن ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور خصلتوں کا علم بعد کو ہوا ہو' حافظ نے فتح الباری ۱/۶۷ میں کہا کہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں' ہوسکتا کہ کچھ خصلتیں اصل نفاق کی ہوں اور دوسری زائد کمال نفاق کی' دوسرے یہ کہ مسلم واوسط طبرانی کی روایت میں لفظ **من علامة المنافق ثلاث** آیا ہے۔

جس سے خود ہی عدم حصر مفہوم ہوتا ہے' پس ایک وقت میں چند خصلتیں ذکر کیں اور دوسرے وقت دوسری بتلائیں۔

علامہ نووی وقرطبی کی تحقیق

علامہ قرطبی ونووی نے یہ بھی لکھا کہ دونوں روایتوں کے مجموعہ سے پانچ خصلتیں معلوم ہوئیں' جھوٹ اور خیانت کا ذکر تو دونوں میں ہے اول میں خلف اور ثانی میں غدر اور فجور زیادہ ہے' پھر ان پانچ کا مال کار تین ہی خصلتیں ہیں کیونکہ غدر وخلف وعد دونوں ایک ہی خانے میں ہیں اور فجور کذب میں داخل ہے اور ان تین سے ان جیسی دوسری خصلتوں پر تنبہ ہو سکتا ہے۔

عینی وحافظ کی تحقیق

علامہ عینی اور حافظ ابن حجر نے لکھا کہ شریعت نے یہاں بطور اصل کلی' قول' فعل اور نیت کے فساد پر متنبہ کر دیا ہے' یعنی فساد قول پر جھوٹ سے' فساد فعل پر خیانت سے اور فساد نیت پر خلف سے پہلے گزر چکا کہ خلف وعد کی صورت میں گناہ جب ہی ہے کہ وعدہ کے وقت نیت ہی وعدہ پورا کرنے کی نہ ہو' اگر نیت تھی اور کسی سبب سے پورا نہ کر سکا تو اس پر کوئی گناہ نہیں واللہ اعلم۔

باب قیام لیلة القدر من الایمان

شب قدر کا قیام ایمان سے ہے

۳۴...... **حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب قال حدثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرہؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یقم لیلة القدر ایمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه**

ترجمہ...... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص شب قدر میں ایمان ونیت ثواب کے ساتھ عبادت کرے گا' اس کے تمام گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح...... شب قدر سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعیین میں تقریباً پچاس اقوال ہیں' ایک جماعت کہتی ہے کہ اس کے لئے کوئی ایک رات مقرر نہیں وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ایک سال ایک رات ہوتی ہے اور دوسرے سال دوسری' یہ قول بظاہر ان مختلف احادیث کے پیش نظر ہے جن میں مختلف اوقات ذکر ہوئے ہیں۔ امام مالک واحمد وغیرہ بھی منتقل مانتے ہیں' مگر صرف رمضان کے آخر عشرے کی راتوں میں' تمام سال میں نہیں۔ بعض نے کہا کہ پورے ماہ رمضان میں منتقل ہوتی رہتی ہے' ایک قول یہ ہے کہ تمام سال میں اور ہمیشہ کے لئے ایک ہی رات متعین ہے۔ بعض نے کہا کہ ہر سال میں ایک رات ہوتی ہے۔ ایک قول ہے کہ پورے ماہ رمضان میں ہوتی ہے' یہ قول حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے اور اس کو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ[1] نے بھی اختیار کیا ہے' بعض نے کہا کہ درمیانی وآخری عشرہ رمضان میں ہے۔ ایک قول ہے کہ صرف آخری عشرہ میں ہے' پھر کسی نے اس کی طاق راتوں میں کہا اور کسی نے جفت میں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ۲۳ یا ۲۷ رمضان میں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے' کسی نے ۲۱'۱۷' ۲۳ میں کہا' کسی نے ۲۳' کسی نے ۲۴' یہ قول حضرت بلال اور ابن عباس سے بھی منقول ہے' ایک قول ۲۷ رمضان کا ہے جو ایک جماعت صحابہ سے بھی منقول ہے اور امام ابو یوسف وامام محمد نے اسی کو اختیار کیا ہے حضرت زید بن ارقم سے ۱۷

---

[1] حضرت امام صاحب کا قول رد المختار شامی میں بھی یہی لکھا ہے کہ لیلۃ القدر صرف رمضان میں ہوتی ہے مگر کسی عشرہ یا کسی تاریخ کے ساتھ خاص نہیں' کسی رمضان میں کسی تاریخ کو اور کسی میں کسی دوسری تاریخ کو ہوتی ہے اور جن احادیث میں اس کا عشرہ آخیرہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے ان کا جواب یہ ہے کہ وہ اسی رمضان کا حال ہے جس میں وہ حدیث ارشاد ہوئی' یا اکثر عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے اس لئے زیادہ احادیث میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ تقریر درس بخاری شریف حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ (مرتبہ مولوی کفیل احمد صاحب کیرانوی) ۱۴۸/۱ میں حضرت ابن عمر اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ذکر ہوا ہے کہ لیلۃ القدر تمام سال میں دائر وسائر ہے اس میں بظاہر مرتب سے غلطی ہوئی ہے حضرتؒ نے اس طرح نہیں فرمایا ہوگا ہم نے ان دونوں حضرات کی رائے حافظ عینی اور علامہ شامی سے نقل کی ہے وہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم

اور ایک قول ۱۹ کا بھی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ایک قول مہینہ کی آخری شب کا بھی ہے۔ امام شافعی کا رجحان ۲۱' ۲۳ کی طرف ہے۔ یہ سب اقوال عمدۃ القاری ص ۱/۲۶۲ میں ذکر ہوئے ہیں۔

یہ سب تفصیل اور اقوال اس لئے بھی ذکر کر دیئے گئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ کی تلاش و جستجو جتنی بھی زیادہ راتوں میں ہو سکے۔ اچھا ہے' اس کی یاد کے لحات جتنی زیادہ توجہ وخیال اور شوق وذوق کے ساتھ گزریں وہ نہایت قیمتی دولت وسرمایہ ہیں اور غفلت کے لحات سے زیادہ خسران وخسارہ کسی چیز میں نہیں' اس لئے

غافل تو بیک لحظہ ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

اور دوسرے عارف نے کہا

اندریں رہ مے تراش و مے خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

تیسرے عارف نے شب قدر کی تلاش کرنے والوں کو کیا اچھا جواب دیا

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی! ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

یوں تو دن کے اوقات بھی خدا سے غفلت میں گزارنے کا کوئی عقلی وشرعی جواز ہرگز نہیں مگر شب کی سکون وتنہائی ویکسوئی وخموشی میں چونکہ ہر احساس جاگ جاتا ہے' اس لئے قلب مومن سے مزید جاگ کا مطالبہ بھی بڑھ جاتا ہے اور اگر خدا کی خصوصی رحمت اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مومن کو بیدار نہ کرتی تو اس کی خواب غفلت بھی غیروں ہی کی طرح ہوتی اور دنیا جس کا وجود وبقا محض خدا کی یاد والوں سے وابستہ ہے کیونکر قائم رہتی؟

پھر قیام شب قدر میں بحث ہوئی ہے کہ کیا اس کی موعودہ فضیلت حاصل کرنے کے لئے پوری رات عبادت میں گزارنی ضروری ہے یا کم بھی کافی ہے؟ بعض ائمہ کی رائے ہے کہ کم بھی کافی ہے حتیٰ کہ صرف عشاء کی فرض نماز ادا کر لینا بھی کافی ہے تو اس تحقیق پر اگر کوئی شخص تمام سال کی راتوں میں اہتمام واحتساب کے ساتھ عشاء کی نماز ہی باجماعت وقت پر ادا کرتا رہے تو امید ہے کہ وہ سال کے سال شب قدر کی فضیلت ضرور پالے گا اور جب وہ شب قدر کی تلاش سال کی مذکورہ اقوال گذشتہ راتوں میں مزید اہتمام سے کرے گا تو رمضان کی راتوں میں پھر خصوصیت سے درمیانی وآخری عشرہ میں اور اخص الخصوص آخیر عشرہ میں کیوں نہ کرے گا؟ اس طرح ایک بظاہر مشکل کام کے لئے کتنی آسانی نکل آتی۔

''رحمت حق بہانہ می جوید''

لیلۃ القدر کی وجہ تسمیہ: اس رات کا نام ''شب قدر'' اس لئے رکھا گیا کہ اس میں خدا کے علم وحکم سے ایک سال کی اقدار ارزاق و آجال لکھے جاتے ہیں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی عظمت وشرف کی وجہ سے یہ نام ہوا تیسرا قول یہ ہے کہ جو شخص اس رات میں طاعات بجالاتا ہے وہ قدر ومنزلت والا بن جاتا ہے چوتھا قول یہ ہے کہ جو طاعات اس میں ادا کی جاتی ہیں ان کی قدر وعظمت زائد ہے۔

شب قدر کا وجود: بعض لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ ایک روز آپ شب قدر کے تعیین کرنے لئے باہر تشریف لائے' دو شخصوں کو لڑتے دیکھا تو ان کی لڑائی کی نحوست کے باعث وہ بات آپ کے ذہن سے نکل گئی اور آپ نے فرمایا کہ وہ (شب قدر) اٹھالی گئی۔ یہ رائے قائم کر لی کہ لیلۃ القدر کا کوئی وجود تحقق نہیں رہا لیکن یہ بات غلط ہے کیونکہ خود اسی حدیث کے آخر میں آپؐ نے فرمایا کہ شاید یہی بات تمہارے لئے بہتر ہوئے' ۹ تاریخ میں اس کو تلاش کرو' معلوم ہوا کہ رفع سے مراد رفع وجود نہیں بلکہ رفع علم تعین ہے۔

علامہ نوویؒ نے فرمایا تمام معتمد اور بھروسہ کے علماء نے اجماع کیا ہے کہ اس ''شب قدر'' کا وجود ودوام آخر زمانے تک رہے گا' وہ موجود ہے' دیکھی بھی جاسکتی ہے اور بنی آدم میں سے ہر شخص ہر سال رمضان میں اس کی تصدیق کر سکتا ہے اس کے علاوہ صلحائے امت سے غیر محصور خبریں اس کے وجود ورویت کی منقول ہوئی ہیں' اس لئے مہلب کا یہ قول غلط ہے کہ در حقیقت اس کو دیکھنا ممکن نہیں۔

وجہ اخفاء شب قدر: زمخشری نے کہا ''شاید اس کے اخفاء میں یہ حکمت و مصلحت ہے کہ اس کو تلاش کرنے والا سال کی اکثر راتوں میں اس کو طلب کرے تا کہ اس کو پا لینے سے اس کی عبادت کا اجر وثواب بہت زیادہ ہو جائے دوسرے یہ کہ لوگ اس کے معلوم و متعین ہونے کی صورت میں صرف اسی رات میں عبادت کر کے بہت بڑا افضل و شرف حاصل کر لیا کرتے اور اس پر بھروسہ کر کے دوسری راتوں کی عبادت میں کوتاہی کیا کرتے' اس لئے بھی اس کو مخفی کر دیا گیا (عمدۃ القاری ص ۱/۲۶۳)

بحث و نظر: وجہ مناسبت باب کے سلسلہ میں علامہ محقق حافظ عینی نے عمدۃ القاری ص ۱/۲۶۲ میں ارشاد فرمایا کہ امام بخاری نے سب سے پہلے بطور مقدمہ باب کیفیة بدء الوحی'' کا بیان کر کے کتاب الایمان لکھی جس میں مختلف ابواب لائے' ان میں امور ایمان بیان کئے اور درمیان میں پانچ باب ایسے بھی ذکر کر دیئے جو امور ایمان کی ضد ہیں یعنی کفر و شرک' یا ظلم و نفاق وغیرہ سے تعلق رکھنے والی یا ان سے قریب کرنے والی باتوں سے احتراز کرانے کے لئے ان ابواب کو ذکر کر کے تنبیہ کی اور بتلایا کہ ایسی چیزوں سے ایمان کو نقصان پہنچتا ہے' اس کے بعد اب پھر بقیہ ابواب متعلقہ امور ایمان کا ذکر شروع کر دیا' مثلاً یہاں کہا کہ قیام لیلۃ القدر ایمان سے ہے' آگے جہاد' تطوع قیام رمضان' صوم رمضان وغیرہ کو امور ایمان سے گنائیں گے لہٰذا درمیان کے بطور استطراد ذکر شدہ پانچ ابواب امور مضادہ ایمان سے اوپر دیکھا گیا تو ان سے پہلے باب السلام من الاسلام تھا اور اس سے زیر بحث باب لیلۃ القدر کی مناسبت یوں ہے کہ جس طرح افشاء اسلام امور ایمان سے ہے' اسی طرح لیلۃ القدر کے اندر فرشتے بھی افشاء سلام کرتے ہیں حدیث میں ہے کہ شب قدر میں جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی کثیر تعداد کے ساتھ نزول کرتے ہیں اور جس مرد یا عورت کو نماز' تلاوت' ذکر و وعظ وغیرہ میں مصروف پاتے ہیں اس کو سلام کرتے ہیں اور یہ سلسلہ ساری رات صبح تک رہتا ہے علامہ زمخشری نے سلام هی حتی مطلع الفجر کی تفسیر میں لکھا کہ وہ ساری رات سلام و سلامتی ہی کی ہے کیونکہ اس میں فرشتے بکثرت مومنوں کو سلام کرتے ہیں۔

ایمان واحتساب کی شرط

ایمان کی شرط تو ظاہر ہے کہ بغیر اس کے کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی قبول نہیں ہو سکتا لیکن احتساب کیا ہے؟ اور وہ کیوں ضروری ہے؟ اس کو سمجھ لیا جائے۔

اس کے معنی ہیں حصول ثواب کی نیت سے یا محض خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے کوئی نیک عمل کرنا' جس میں ریا نمائش یا کسی کے خوف وڈر کا شائبہ نہ ہو اس کا درجہ نیت سے آگے ہے' کیونکہ یہ علم العلم کے درجہ میں ہے' لہٰذا اس کو استحضار نیت استشعار قلب وعدم ذہول نیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی تحقیق

فرمایا جس طرح پہلے بھی بتلا چکا ہوں افعالِ اختیاریہ کے وقت جو دل کا ارادہ خود بخود ان کے کرنے کا موجود ہوتا ہے وہ تو نیت ہے جو صحت عمل اور حصولِ اجر دونوں کے لیے کافی ہے اور اس کا زبان سے کہنا بھی ضروری نہیں گویا ہر اختیاری فعل کے ساتھ نیت موجود ہوتی ہے اور اس فعل کی شرعی صحت کے لیے کسی اور نیت کی ضرورت نہیں البتہ اتنی بات ضروری ہے کہ کوئی فاسد نیت موجود نہ ہو اب احتساب اس کے اوپر امر زائد ہے کہ اس نیت کا شعور حاصل ہو یعنی دل کی توجہ بھی اس نیت کی طرف ہو اور اس سے اجر وثواب میں زیادتی ہو جاتی ہے۔

غرض نیت بمنزلہ علم کا اجر اگر ایک حصہ تھا تو احتساب بمنزلہ علم العلم کا اجر مضاعف ہو جاتا ہے پھر چونکہ بعض مواقع میں یہ استشعارِ قلب یا احتساب ضروری یا مفید نہیں سمجھا جاتا اس لیے احادیث میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی تا کہ انسان کے قیمتی لمحات محض ذہول کے سبب بے قیمت نہ ٹھہریں مثلاً چند صورتیں لکھی جاتی ہیں۔

(۱)...... آفاتِ سماوی یا اچانک حادثات کے وقت عموماً اس طرف خیال نہیں ہوتا کہ اس میں نقصانِ جان و مال ہو تو اس پر اجر وثواب ہے کیونکہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اسباب کے تحت ایسا خود بخود ہونا ہی تھا ہم نے جان بوجھ کر کوئی تکلیف اللہ کے راستے میں برداشت نہیں کی کہ

اس کے ثواب کی توقع کریں مثلاً آگ لگ گئی گھر تباہ ہوگیا زلزلہ سے مکانات اور جانیں ضائع ہوگئیں عام وبا پھیل گئی جس سے دفعتاً اموات ہونے لگیں تو اسی کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی ایک عورت کا بچہ مرگیا فرمایا اس کو چاہیے کہ صبر کرے اور احتساب بھی کرے یعنی اس کو صرف تقدیری و ناگہانی امر سمجھ کر اللہ کے اجر جزیل اور ثوابِ عظیم سے غفلت نہ برتے۔

(۲)...... بہت سے مشقت و مجاہد کے اعمالِ خیر ایسے ہیں کہ خود ان کے اندر تعب و مشقت اٹھانے پر آدمی ان کے طاعت و ثواب کو تو ضرور سمجھتا ہے مگر دوسری جہت سے یہ نہیں سوچ سکتا کہ ان میں اجر و ثواب کس قدر وہم و خیال کی حد سے بھی زیادہ مثلاً یہی قیام لیلۃ القدر کہ بظاہر ایک رات کی عبادت ہے اور کسی دوسری رات میں کوئی شخص اگر اتنی ہی عبادت کر کے مشقت و تعب اٹھائے تو ظاہر ہے کہ اجر اس کا بھی بہت ہے مگر یہاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ اگر احتساب کرے گا تو اس میں ایک ہی رات کی عبادت سے اس کے سارے گذشتہ معاصی ڈھل جائیں گے، جس طرح حج مبرور سے پاک صاف ہو جاتا ہے، پھر اس رات کی عبادت کا ایک ہزار راتوں کی عبادت سے بھی زیادہ افضل ہونا قرآن مجید سے ثابت و معلوم تھا اس کے لیے بھی قلب کو متوجہ کرے گا اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لیے بھی حسبۃ للّٰہ کرنے کی تاکید آتی ہے کیونکہ اس کا اجرِ عظیم بھی اس کی مشقت و تعب کے اعتبار سے کہیں زیادہ بلکہ انسانی وہم و خیال سے بھی بلند و برتر ہے۔

اس کے علاوہ مشقتوں و مجاہدوں کے اعمال میں اس لیے بھی احتساب ضروری ہے کہ اس سے دشوار کاموں کے لیے ہمت و حوصلہ بڑھتا ہے احتساب سے عزم و ارادہ جوان ہوتا ہے اور بوڑھے وہ کچھ کر گذرتے ہیں جو جوان نہیں کر سکتے وہ محض خلوص و للّٰہیت و احتساب ہی کی طاقت تھی کہ صحابہ کرام نے آدھی دنیا کو فتح کر لیا تھا۔

صومِ رمضان کے لیے بھی احتساب کا لفظ حدیث میں آتا ہے کیونکہ اس میں بھی جہد و مشقت اور تعبِ نفس ہے مگر اس کی نیت پر تو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اور دنوں کے روزوں پر ملتا ہے اور رمضان کے اندر روزہ اگر احتساب کے ساتھ رکھا تو اس کے لیے گذشتہ تمام معاصی کی مغفرت بھی موعود ہوئی۔

(۳)...... بعض نیک اعمال ایسے ہیں کہ ان کو انسان بظاہر اپنے نفس کے تقاضوں سے کرتا اس لیے اس طرف خیال نہیں جاتا کہ ان پر بھی کوئی اجر و ثواب مل سکتا ہے تو اس پر بھی شارع علیہ السلام نے تنبیہ فرمائی کہ احتساب کے ساتھ ان پر بھی بڑا اجر ہے مثلاً اپنے (۱) بیوی بچوں پر خرچ کرنا (۲) دور سے نماز کے لیے مسجد میں پہنچنا (۳) مسلمان کے جنازے کے ساتھ قبرستان جانا وغیرہ کہ اگر صرف اچھی نیت سے ان کاموں کو کیا یہ سمجھ کر کہ اللہ کا حکم ہے یا اللہ ان کاموں سے خوش ہوتا ہے تو نیک نیت سے ہی یہ اعمالِ خیر سے بن گئے پھر اگر احتساب بھی کیا یعنی اس نیت کا استحضار اور استشعارِ قلب بھی حاصل ہوا تو مزید اجر و ثواب کا بھی مستحق ہوگیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس تفصیل کے بعد فرمایا کہ میں نے احتساب کی یہ شرح مسندِ احمد کی اس حدیث سے لی ہے **من هم بحسنة كتب له عشر حسنات اذا اشعر به قلبه و حرص الخ** یہ اشعارِ قلب و حرصِ ثواب ہی میرے نزدیک احتساب ہے اور یہ نفسِ نیت پر امر زائد ہے نیت پر بھی ثواب ہے مگر احتساب پر اجر مضاعف ہو جاتا ہے **اللهم وفقنا لكل ماتحب وترضىٰ بمنک وکرمک وبجاہ حبیبک المرتضیٰ صلی الله علیه وسلم.**

باب الجهاد من الايمان

(جہاد ایمان کا ایک شعبہ ہے)

۳۵...... حدثنا حرمي بن حفص قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا عماره قال حدثنا ابوذرعة بن عمر و بن جرير قال سمعت اباهريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال انتدب الله لمن خرج في سبيله لا يخرجه الاايمان بي وتصديق برسلي ان ارجعه بمانال من اجر اوغنيمة او ادخله الجنة ولو لا ان اشق على امتي ما

قعدت خلف سرية سرية ولو ددت انی اقتل فی سبيل الله ثم احيی ثم اقتل ثم احيی ثم اقتل .

ترجمہ:۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمہ لی ہے کہ جو شخص میرے راستے میں جہاد کے لیے نکلے اور اس کے نکلنے کا باعث مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق کے سوا کوئی دوسری چیز نہ ہو میں اس کو اجر و غنیمت دے کر واپس لوٹا دوں گا یا اس کو جنت میں داخل کر دوں گا (پھر آپ نے فرمایا) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میری امت تعب و مشقت میں پڑ جائے گی تو میں کسی سریہ (معرکہ جہاد) میں جانے سے رکتا اور مجھے یہ امر نہایت ہی مرغوب ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہوں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہوں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر شہید ہو جاؤں۔

تشریح:۔ارشاد ہے کہ جو شخص محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرے گا اس کے لیے حق تعالیٰ نے دو باتوں کا ذمہ لیا ہے اگر زندہ رہا اور سلامتی کے ساتھ گھر واپس آ گیا تو اجرِ عظیم اور مالِ غنیمت کا مستحق ہوا اور اگر شہادت کے منصبِ عظیم سے مشرف ہوا تو سیدھا جنت میں داخل ہو گیا کہ شہید حور کی گود میں گرتا ہے بغیر حساب و کتاب جنت میں داخل ہوتا ہے دن بھر اس کی سیر کرتا پھل میوے کھاتا ہے اور رات کے وقت عرشِ الٰہی کے ساتھ لٹکے ہوئے قندیلوں میں آرام کرتا ہے یعنی اپنے اصل مقام اور وطنِ اصلی کی طرف لوٹ جاتا ہے لوٹنا تو سب مومنوں کو ہے مگر شہید کے لیے یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کا دخولِ جنت یوم جزاء و آخرت تک موقوف و موخر نہیں ہوتا۔مولانا جامی نے فرمایا۔

دلا! تاکے دریں کاخ مجازی	کنی مانند طفلاں خاک بازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخی	کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرازاں آشیاں بیگانہ گشتی	چودوناں چغدایں ویرانہ گشتی
بیفشاں بال وپرز آمیزشِ خاک	پرتا کنگرِ ایوانِ افلاک

حسبِ تحقیق حضرت شاہ صاحبؒ جنت کا علاقہ ساتویں آسمان پر ہے اور عرشِ الٰہی اس کی چھت ہے لہٰذا جنتیوں کے ایوان و محلات کے کنگرے عرشِ الٰہی کے قندیلوں سے باتیں کریں گے اور مولانا جامی بھی اسی حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔واللہ اعلم۔

آگے ارشادِ نبوی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر معرکہ جہاد میں ضرور شرکت کروں گا مگر غریب و نادار مجبور ولاچار لوگوں کے خیال سے رک جاتا ہوں کہ نہ ان کے پاس اسلحہ ہیں نہ اتنا مال کہ اس سے اسلحہ خرید سکیں نہ بیت المال ہی میں اِس وقت اتنی گنجائش کہ اس سے ان کی امداد اسلحہ سواری وغیرہ کے لیے ہو سکے اگر میں نکلوں گا تو وہ کسی طرح گھروں میں نہ رہیں گے اور ہزار تکالیف اٹھا کر بھی میرے ساتھ ضرور شریک[1] ہوں گے پھر مجھ سے ان کی غیر معمولی تکلیف و مشقت نہ دیکھی جائے گی اس خیال سے سرایا[2] میں شرکت نہیں کرتا۔

بحث ونظر: جہاد پر جلد اول کی آخری حدیث اور اسی جلد کے شروع میں بھی لکھا جا چکا ہے یہاں ایک بحث یہ ہے کہ اس سے پہلے باب میں شبِ قدر کا بیان تھا اور اگلا باب قیام رمضان کا ہے درمیان میں جہاد کا باب کیوں لائے؟ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں جہاد مع الکفار سے پہلے جہاد مع النفس کی ضرورت ہے۔

پہلے خود مکمل ہو لیں پھر دوسروں کی طرف بڑھیں گے اول اپنی پوری اصلاح کا کام ضروری ہے اپنے کو کامل و مکمل طور سے تابع خداوندی بنا

---

[1] کئی غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکتِ جہاد حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام بڑی بڑی قربانیاں پیش کر چکے تھے غزوۂ تبوک کے وقت کہ سفر نہایت دور دراز کا تھا سخت گرمی پڑ رہی تھی کہ گھروں میں بھی آرام نہیں مل رہا تھا کھجور کی فصل تیار تھی جس پر سال بھر کے گزارہ کا دارومدار تھا آلاتِ حرب اور سواریاں بھی کم تھیں مگر جونہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ جہاد کا عزم و اعلان فرمایا بڑی سرعت کے ساتھ تیس ہزار مسلمان ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے حتیٰ کہ حضرت کعب ابن مالک کے قول کے مطابق سارے مدینہ طیبہ میں بجز معذور و مریض کے کوئی مسلمان باقی نہ رہ گیا تھا جو جہاد پر نہ گیا ہو ان ہی وجوہ سے آپ نے بعض معرکوں میں شرکت نہیں کی اور اپنے نفس پر جبر فرمایا۔ [2] اپنے زمانے میں جتنے معرکہائے جہاد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی وہ سب ''غزوات'' کہلاتے ہیں اور جن میں شرکت نہیں فرمائی وہ ''سرایا'' کہلاتے ہیں۔

لینا ہے ہر تکلیف و مشقت کو اس کی راہ میں ہنسی خوشی برداشت کرنے کی عادت کرنا ہے اقامتِ صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے تعلق کو مستحکم بنانا اور اداءِ زکوٰۃ وصدقات کے ذریعہ حبِ مال کو کم کرنا غریبوں ناداروں اور ضعیفوں کو اپنی جیسی فراغت کی زندگی کے لائق بنانا روزوں سے اللہ کی مرضی کے لیے بھوکے پیاسے رہنے کا خوگر ہونا ہے جہاد کا مطلب دنیا سے فتنہ وفساد کی باتوں کو ختم کرنا دین الٰہی کے قائم کرنے یا قائم رہنے میں جو بھی رکاوٹیں پیدا ہوں ان کو ہٹانا اور مٹانا ہے اللہ کے سچے دین اسلام کو غیر مسلموں پر پیش کرنا ہے اس کو اگر وہ قبول نہ کریں تو اس پر جبر نہیں لیکن اس کی برتری وسیادت کو ضرور ان سے تسلیم کرانا ہے تاکہ کفر والحاد کی بیجا دراز دستیوں سے دین فطرت اور اس کے پیرو مغلوب ولاچار ہو کر نہ رہ جائیں۔

مکہ معظمہ کی زندگی میں صرف اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ وغیرہ کا پابند بنایا گیا جب یہ زندگی مکمل ہو گئی تو مدینہ طیبہ میں جہاد مع الکفار کا دور شروع ہوا اس کا نتیجہ سب نے دیکھ لیا کہ پھر ہر ہر قدم پر کامرانی وکامیابی نے مسلمانوں کے قدم چومے نہایت تھوڑے مدت میں وہ ساری دنیا پر چھا گئے اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا فریضہ اس خوبی سے ادا کیا کہ وہ بعد والوں کے لیے بہترین نمونہ بنا۔

یہ اسی لیے ہوا کہ پہلے ان کے نفوس مرتاض ہو چکے تھے ان کی نیت میں نہ خونریزی تھی نہ کوئی انتقامی آگ ان کے دلوں میں بھڑک رہی تھی نہ وہاں عصبیت تھی نہ مال وزر کی حرص وطمع نہ عورتوں کا لالچ تھا نہ حکومت کرنے کا سودا ان کے سامنے محض اللہ کی خوشنودی تھی اور خدمتِ خلق کا جذبہ پھر ہر معاملہ میں للّٰہیت وخلوص مقصدِ زندگی وہ دن میں گھوڑوں کے شہسوار اور میدان کارزار کے مردِ مجاہد تھے اور رات کے وقت اللہ کی بارگاہ میں سربسجود اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کی مغفرت کے لیے گڑگڑاتے تھے **رھبان باللیل وفرسان بالنھار** درحقیقت یہ وہ اوصاف تھے کہ ان پر اللہ کے فرشتے رشک کرتے تھے ان کے قدموں کے نیچے اپنے پر بچھاتے تھے۔ **اتجعل فیھا من یفسد فیھا** کہنے والے اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھ رہے تھے کہ وہ جو دیکھ رہے ہیں خواب کا معاملہ ہے یا بیداری کا؟ غرض نبیِ امی صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کرام نے چشم ملک وفلک کو وہ کچھ دکھا دیا جو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ **ویفعل اللہ مایشاء**.

شبِ قدر و جہاد میں مناسبت

دوسری وجہ مناسبت حافظؒ نے فتح الباری ص ۱/ ۶۹ میں لکھی ہے وہ بہت عمدہ ہے کہ جس طرح محنت ومشقت اٹھا کر شب قدر کو تلاش کرتے ہیں پھر کبھی وہ میسر ہو جاتی ہے کبھی نہیں اسی طرح مردِ مجاہد بھی اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ شہادت کا طالب ومتمنی ہوتا ہے۔ پھر کبھی وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے کبھی نہیں پس دونوں باب میں قوی مناسبت مل گئی دونوں میں کامل مجاہدہ ہے اور دونوں میں مقصودِ اصلی کا حصول وعدمِ حصول محتمل ہوتا ہے پھر شب قدر کو تلاش کرنے والا۔ خواہ وہ نہ ملے ماجور ہے اور اگر مل جائے تب تو اس کا اجر بہت ہی بڑا ہے اسی طرح شہادت کا طالب بھی ماجور ہے اور بصورت حصول شہادت اس کا اجر بھی نہایت عظیم ہے جس کا اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنائے شہادت سے ہو سکتا ہے پس امام بخاری نے مناسبت مذکورہ کے سبب یہاں درمیان میں استطراداً جہاد کا باب بیان کر دیا ہے اور آگے پھر قیامِ رمضان کا باب لائے جس کی مناسبت لیلۃ القدر سے ظاہر تر ہے۔

ایک اہم شبہ: حدیثِ مذکورہ میں "من اجر او غنیمۃ" وارد ہے جو محلِ اشکال ہے کیونکہ اجر وغنیمت میں کوئی منافات نہیں بلکہ مجاہد کو اجر تو ہر حالت میں ضرور ملتا ہی ہے مالِ غنیمت ملے یا نہ ملے پھر تردید کیا موقع تھا؟

علامہ قرطبی کا جواب: علامہ قرطبیؒ نے اس کا جواب یہ دیا کہ کلام اصل میں "من اجر فقط اواجر غنیمۃ" تھا اس میں چونکہ تکرار تھا اس لیے معطوف والا اجر حذف کر دیا گیا ایسے مواقع میں اختصار کے لیے حذف اکثر ہو جاتا ہے چونکہ حصولِ اجر سب کو معلوم ومفروغ عنہ تھا اس کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے

او کے استعمال کے لیے خارج میں منافات یا دو چیزوں کا ایک جگہ جمع نہ ہوسکنا ضروری نہیں بلکہ اتنا بھی کافی ہے کہ ان دونوں کی صرف حقیقت و مصداق الگ الگ ہوں خواہ خارج میں جمع بھی ہوسکیں چنانچہ او کا استعمال تابع و متبوع میں بھی ہوسکتا ہے کیونکہ غنیمت اجر کے تابع ہے اور غنیمت چونکہ اجر سے مغائر ہے او کا استعمال بھی صحیح ہوگیا۔

یہی میری رائے آیت "او کسبت فی ایمانھا خیرا" میں بھی ہے جس سے زمخشری نے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ ایمان بدوں اعمال کے موجبِ نجات نہ ہوگا اور یہی مذہب معتزلہ کا ہے انہوں نے تقدیر عبادت اس طرح نکالی:۔ لا تنفع نفسا ایمانھا لم تکن امنت من قبل او امنت ولم تکسب فی ایمانھا خیرا تاکہ مقابلہ صحیح ہوسکے اس کا جواب ابن حاجب نے امالی میں ابوالبقا نے کلیات میں شیخ ناصر الدین وطیبی نے حاشیہ کشاف میں اور ابن ہشام نے مغنی میں دیا ہے اگرچہ ان میں سے طیبی کا جواب سب سے اچھا ہے مگر میرا جواب وہی ہے کہ یہاں بھی او، دو مقابل چیزوں میں بیانِ منافات کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اس امر کے اظہار کے لیے ہے کہ ایمان اور کسب دو الگ الگ حقیقتیں ہیں اور مقصد کسب و ایمان دونوں کی نفی ہے یعنی اس شخص کا ایمان نفع بخش نہ ہوگا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو اور نہ اس نے کسبِ خیر کیا ہو؟ لہٰذا انتفاء نجات کا حکم بسبب انتفاء کسب مع وجود ایمان نہیں ہے بلکہ بسبب انتفاء ایمان و کسبِ خیر معاً ہے جس میں ہمارا اور معتزلہ کا کوئی نزاع نہیں ہے اس لیے اس آیت سے ان کا استدلال بھی صحیح نہیں۔ علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا کہ یہاں او بمعنی الواو بھی ہوسکتا ہے اور ابوداؤد کی روایت میں واو ہی وارد ہوا ہے۔ (شروح البخاری ص ۱/۲۰۱)

درجہ نبوت اور تمنائے شہادت

یہاں یہ بحث بھی ہوئی ہے کہ نبوت کا درجہ سب سے اوپر ہے اس کے بعد صدیقیت کا مرتبہ ہے اور تیسرے درجے پر شہادت ہے اور گو شہادت کا درجہ بھی اپنے ماتحت درجات سے بہت عالی ہے تاہم بظاہر صاحبِ نبوت کو اس کی تمنا مناسب نہیں معلوم ہوتی اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جہاد کی رغبت اور شہادت کا شوق دلانے کے لیے ایسے کلمات ارشاد فرمائے ہیں دوسرے یہ کہ نبوت کے مدارجِ عالیہ کتنے ہی بلند سہی شہادت کی شان اس قدر پیاری اور اللہ کو محبوب ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی تمنا کرنی پڑی جس طرح قیامت کے روز انبیاء علیہم السلام مؤذنوں کو نور کی کرسیوں پر دیکھ کر غبطہ کریں گے تو اس قسم کی چیزوں کو محض مراتب کی اونچ نیچ کے پیمانوں سے ناپنا مناسب نہیں۔ واللہ علم وعلمہ اتم واحکم.

مراتب جہاد

بطور تکمیل بحث یہاں جہاد کے مراتب و مدارج بھی لکھے جاتے ہیں۔ جہاد کی بڑی اقسام چار ہیں۔ (۱) جہادِ نفس (۲) جہاد شیطان (۳) جہادِ کفار (۴) جہادِ منافقین اور جہادِ نفس کے بھی چار مراتب ہیں۔

(۱) ...... علم دین و ہدایت حاصل کرنے میں نفس کشی کرنا، تکالیف و مشقتیں اور ہر قسم کے مصائب و پریشانیوں کو عزم و حوصلہ سے برداشت کرنا کیونکہ لکل شیء آفة وللعلم آفات (ہر چیز کے حاصل کرنے میں کچھ دشواری ہوتی ہے مگر علم کے لیے بہت سی آفات پیش آتی ہیں علم دین حاصل کیے بغیر کوئی بھی معاش و معاد یا دنیا و آخرت کی سعادت و فلاح حاصل نہیں ہوسکتی اور جو شخص علم دین سے محروم ہوتا ہے اس کی شقاوتِ دارین و بدبختی میں شبہ نہیں ہوسکتا۔

(۲)......علم دین حاصل کرنے کے بعد مجاہدہ کا دوسرا درجہ اس کے مطابق عمل کرنے کا ہے ورنہ بے عمل بھی محض بے سود بلکہ مزید وبال ہے۔

(۳)......خود علم وعمل کے مجاہدہ کے بعد تیسرا درجہ دوسروں کو تعلیم وتلقین کا ہے یہ بھی ضروری، اہم اور سخت مجاہدہ ہے اس میں وقت ومال کی قربانی کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی نیابت کا حق ان ہی کے طور وطریق کی روشنی میں ادا کرنا ہے۔

(۴)......جو کچھ تکالیف ومشقتیں اور خلاف طبع امور دعوت وتبلیغ دین کی راہ میں پیش آئیں ان کو صبر واستقلال اور اولوالعزمی کے ساتھ برداشت کرنا اور کسی وقت بھی مایوسی وکم حوصلگی کا شکار نہ ہونا۔

ان چار مراتب کی تکمیل کے بعد ایک مسلمان ''ربانی'' لقب پانے کا مستحق ہو جاتا ہے ایسے لوگ صحیح معنی میں ''نائب رسول'' ہیں اور وہی امت کی صلاح وفلاح کے ذمہ دار ہیں پھر جہادِ شیطان کے دو مراتب ہیں۔

(۱)......جس قسم کے بھی شکوک وشبہات ایمان ویقین کو مجروح کرنے والے شیطان کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں ان کو دفع کرنے کی پوری سعی ومجاہدہ کرنا۔

(۲)......جس قسم کے بھی برے ارادے، شہوانی جذبات اور خلاف دین واخلاق وغیرہ خیالات شیطان کی طرف سے دلوں میں آئیں ان کو عملی زندگی سے دور رکھنا اس کے لیے بھی پورے مجاہدے کی ضرورت ہے۔

ان میں سے قسم اول کو یقین کی قوت سے اور قسم دوم کو صبر کی طاقت سے شکست دیتا ہے خوب سمجھ لو کہ شیطان اپنے مشن سے ایک لحہ بھی غافل نہیں ہے وہ ہر وقت تاک میں رہتا ہے کہ جیب کتروں کی طرح آپ کی ادنیٰ ترین غفلت سے بھی فائدہ اٹھالے اس لیے یقین وصبر کے ہتھیاروں سے ہر وقت مسلح اور اپنے نہایت سخت جان، بے حیا وبے ایمان دشمن شیطان سے ہوشیار رہیے آپ کا کام صرف اتنا ہی ہے اگر اس میں کوتاہی نہیں کی تو مخلص بندوں میں آپ کا شمار ہو چکا جن کی امداد ونصرت اور شیطان سے پوری حفاظت کا وعدہ اللہ کی طرف سے ہو چکا ہے۔ **وکان وعداللہ مفعولا**.

پھر جہادِ کفار ومنافقین کے بھی چار درجے ہیں اول سے، زبان سے، مال سے اور جان سے لیکن کفار سے جہاد میں قوتِ بازو سے جہاد کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور منافقین سے جہاد میں لسان وقلم کے ذریعے جہاد کا خاص مرتبہ ہے اس کے بعد ظالموں اہل منکرات اور اہل بدعت سے جہاد کا نمبر ہے جس کے تین درجات ہیں سب سے پہلے تو بشرطِ قدرت ہاتھ سے روکنا ہے پھر زبان سے روکنا اور آخر درجہ یہ ہے کہ دل سے برا جانے اصلاح کی دعا کرے جب تک اصلاح نہ ہو دل پر بوجھ سمجھے کم از کم اپنے دل سے برا جانے اور اس کی تکلیف ہی کو خود ان کو یا ان لوگوں سے اتصال رکھنے والوں کو محسوس کرائے وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ بھی نہیں تو ایمان کا وجود مشکوک وموہوم ہے۔

غرض ان تینوں صورتوں میں ہاتھ، زبان اور قلب سے جہاد کے درجہ کی ممکن کوشش کر ڈالے، کمی نہ کرے یہ سب مراتب ومدارج اس جہادِ اسلامی کے ہیں جن کو حدیث میں اسلام کے کوہان اور قبہ کی سب سے اوپر کی چوٹی فرمایا گیا ہے اس پر عمل کرنے والوں کے ایوان ومحلات جنت میں سب سے اعلیٰ وارفع ہوں گے وہ لوگ دنیا میں بھی سربلند رہتے ہیں اور آخرت میں بھی بڑی عزت پائیں گے اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ جو اس طرح مرجائے کہ نہ کبھی اس نے جہاد کیا اور نہ دل میں اس کا ارادہ کیا تو اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ پر ہوگی۔

ہجرت وجہاد

پھر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جہاد بغیر ہجرت کے مکمل نہیں ہوتا اور جہاد وہجرت بغیر ایمان کے سود مند نہیں اللہ کی رحمت ورافت کے صحیح مستحق وہی ہیں جو ان تینوں سعادتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ قال تعالیٰ '' **ان الذین امنو اوالذین ھا جرو او جاھدو افی سبیل اللہ اولئک یر جون رحمۃ اللہ واللہ غفور رحیم**.

باب تطوع قیام رمضان من الایمان

(تطوع قیام رمضان بھی ایمان کا شعبہ ہے)

۳۲ ...... حدثنا اسماعیل قال حدثنی مالک عن ابن شهاب عن حمید بن عبدالرحمن عن ابی هریرةؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من قام رمضان ایمانا واحتسا باغفرله ماتقدم من ذنبه

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص رمضان میں ایمان واحتساب کے ساتھ قیام کرتا ہے اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

تشریح: تطوعِ قیامِ رمضان سے مراد تراویح کی نماز ہے جو رمضان المبارک کی راتوں کا مخصوص عمل ہے اس کے علاوہ دوسرے نوافل تہجد وغیرہ کی نماز بھی جو رمضان میں ادا ہوں قیامِ مذکورہ کی فضیلت میں داخل ہیں یا نہیں؟ محدثین کا اس میں اختلاف ہے علامہ نووی اور کرمانی کی رائے ہے کہ اس حدیث میں فضیلت صرف تراویح کی بیان ہوئی جو رمضان کی راتوں کا مخصوص عمل ہے تہجد وغیرہ نوافل جو رمضان کے ساتھ خاص نہیں اس سے مراد نہیں حافظ ابن حجر اور علامہ عینی حنفی کا خیال ہے کہ رمضان میں ادا کئے ہوئے تمام نوافل اس میں داخل ہیں اور قیام رمضان کی فضیلت سب کو حاصل ہوگی۔

بحث ونظر: یہ اختلاف تو شرحِ حدیث کے سلسلہ کا تھا جس میں دو جلیل القدر شافعی المذہب شارحین بخاری نے ایک شرح اختیار کی اور حافظ ابن حجر شافعی وحافظ عینی حنفی نے بالاتفاق دوسری شرح کی دوسرا مسئلہ شوافع واحناف کا اختلافی ہے۔

کہ نوافل کو جماعت سے ادا کرنا کیسا ہے؟

امام شافعی نے فرض پر قیاس کر کے نوافلِ جماعت کو بلا کراہت جائز کہا ہے اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر بھی کٹر شافعی ہیں فقہی مسائل میں وہ امام شافعیؒ کی حمایت حد سے زیادہ کرتے ہیں دوسری طرف حافظ عینی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو متصلب حنفی ہیں اور امام صاحب جماعتِ نوافل کو مکروہ فرماتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وتابعین سے جماعتِ نوافل کا ثبوت نہیں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی عادتِ مبارکہ ''نوافل وسنن گھروں میں ادا کرنے کی تھی'' مسجد میں وہ صرف فرض پڑھتے تھے چنانچہ اسی سے علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ نماز کی ادائیگی مسجد میں افضل ہے خواہ منفرداً ہی ہو اور جماعت کے ساتھ ۲۵ گنا یا ۲۷ گنا ثواب ملے گا اس کے برعکس نوافل وسنن کی ادائیگی گھروں میں افضل اور مسجد میں مفضول ہے اور یہ نسبت مسجد کے ان کو گھروں میں پڑھنے کا ثواب ۲۵ گنا زیادہ ہے (کمافی المصنف لابن ابی شیبۃ باسناد قوی قالہ الشیخ الانور)

پھر احناف نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر نفل کی جماعت دو تین آدمی بھی مل کر لیں (جو حدِ کراہت میں نہیں ہے) تب بھی ان کو جماعت کا ثواب نہیں ملے گا۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ احناف کا یہ فیصلہ شدت لیے ہوئے ہے مگر ذرا دقت نظر سے کام لیا جائے تو ایک اسی مسئلہ سے امام اعظم اور حنفیہ کی دقتِ نظر اور ان کے مذہب کے احقیت وافضلیت بھی واضح ہوتی ہے کیونکہ ''اہل حدیث'' شوافع جو ہمیشہ احناف کو عدم اتباع سنت اور قیاس پسندی وغیرہ کے طعنے دیا کرتے ہیں۔

انہوں نے محض جماعتِ فرض پر قیاس کر کے جماعتِ نوافل کو مستحب تک کہہ دیا ہے ان کے مقابلہ میں ''اصحاب الرائے'' احناف کا اتباعِ سنت ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے یہاں کوئی قیاس نہیں کیا نہ عقلی گھوڑے دوڑائے بلکہ اوّل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر نظر کی اس کے لیے کوئی قول نہیں ملا تو عمل کو دیکھا تو وہ بھی نہیں اور جہاں کہیں کچھ ملا بھی تو صرف اتنا کہ مثلاً حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسولِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ تہجد میں مشغول تھے میں آپ کے بائیں جانب پہلو میں کھڑا ہو کر مقتدی بن گیا حضور نے میرا کان پکڑ کر گھمایا اور اپنے دائیں پہلو پر کھڑا کر دیا غرض ایسی ایک دو روایت اگر ملتی ہیں تو ان میں فرضوں کی طرح اہتمام یا زیادہ جماعت کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسی لیے احناف نے دو یا تین مقتدی تک بلا کراہت جماعتِ نفل کو جائز مان لیا اور آگے رک گئے کہ اس سے آگے نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک کی روشنی ملی اور نہ صحابہ و تابعین کے عمل سے ثبوت ہوا۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بجز تحیۃ المسجد، نمازِ کسوف، نمازِ احرام، نمازِ طواف، نماز واپسی سفر کی دو نفلوں کے تمام سنن و نوافل اپنے حجرۂ مبارکہ میں ادا کرتے تھے اور کسی حدیث[1] سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ آپ کی اقتداء تہجد و نوافل میں مردوں میں کسی نے یا ازواجِ مطہرات نے کی ہو پھر رمضان شریف کے عشرہ آخیر میں اعتکاف کا برابر معمول رہا ظاہر ہے کہ پورے عشرہ میں رات دن مسجد میں ہوتے اور اس زمانے میں پورے نوافل و سنن مسجد ہی میں ادا فرماتے تھے کہیں ثابت نہیں کہ مردوں میں کسی نے یا ازواجِ مطہرات ہی نے آپ کی اقتداء تہجد وغیرہ میں کی ہو البتہ تراویح کی صرف دو تین روز جماعت ہوئی ہے پھر خود راویِ حدیث (امام مالک سے استاذ ابنِ شہاب زہری ہی کے قول کے مطابق) حضور کے زمانے میں خلافتِ صدیقی کے زمانے میں اور شروع زمانہ خلافتِ فاروقی میں بھی تراویح کی جماعت موقوف رہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ زمانہ رسالت دور خلافتِ صدیقی اور ابتداء دور خلافت فاروقی تک تراویح کی جماعت نہ تھی تہجد وغیرہ نوافل کی جماعت تو نہ پہلے ثابت ہے نہ بعد کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات تراویح جماعت کے ساتھ جاری کیں ایک زمانے کے بعد چونکہ مکہ معظمہ میں ہر دو ترویحہ کے درمیان زیادہ ثواب کے لیے طواف کرنے لگے تو مدینہ طیبہ کے لوگوں نے اس کا یہ بدل کیا کہ ہر طواف کی جگہ چار رکعت درمیان میں بڑھا لیں اس طرح وہ تراویح کی ۳۶ رکعات پڑھنے لگے ایک قول چالیس کا بھی ہے مگر اس کے بارے میں کوئی موثق روایت نہیں ہے کہ مالکیہ جو ۳۶ یا ۴۰ رکعت پڑھتے تھے وہ سب جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے یا ۲۰ رکعت جماعت سے اور باقی انفرادی طور پر اگر پہلی صورت ہے تو یہ عمل محققین حنفیہ شیخ ابن ہمام، حافظ عینی وغیرہ کے نزدیک قابل اعتراض اور سنتِ صحابہ کے خلاف ہے اور اہل مکہ جو ہر ترویحہ پر طواف کرتے تھے اور دو رکعت طواف پڑھتے تھے وہ اکیلے اکیلے پڑھتے تھے نہ کہ جماعت سے۔

حافظ ابن حجر کی عبارت فتح الباری ص ۴/ ۱۷۸ سے تراویح کی وجہ تسمیہ کے ذیل میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک آٹھویں صدی ہجری تک نمازِ تراویح کے علاوہ رمضان میں کوئی دوسری نفل نماز جماعت سے نہ ہوتی تھی اور حافظ عینی حنفی نے بنایہ شرح ہدایہ ص ۱/ ۸۶۷ میں لکھا کہ اگر کوئی شخص امام مالک کے مسلک پر ۳۶ رکعات پڑھنی چاہے تو اس کو چاہیے کہ امام اعظمؒ کے قول کے موافق ۲۰ رکعات جماعت کے ساتھ پڑھے اور باقی ۱۶ رکعات بلا جماعت پڑھے کیونکہ وہ تراویح نہیں ہیں الگ سے مستقل نوافل ہیں جن کی جماعت مکروہ ہے معلوم ہوا کہ شرح حدیث قیامِ رمضان کے سلسلے میں جو تحقیق ان دونوں حضرات حافظ ابنِ حجرؒ اور حافظ عینیؒ کی منقول ہے اس کا تعلق نوافل کی جماعت کے مسئلہ سے کچھ بھی نہیں ہے اسی طرح موطا امام محمدؒ میں جو لکھا ہے کہ ماہِ رمضان میں تطوع کی جماعت جائز ہے کیونکہ اس کے بہتر ہونے پر اجماعِ مسلمین ہو چکا ہے وہاں بھی مراد تطوع سے تراویح ہی ہے جیسا کہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے حاشیہ میں لکھا اور دلیل بھی خود بتلا رہی ہے کہ اجماع کس پر ہوا ہے امام محمد کا مقصد یہ ہے کہ جماعتِ تراویح کو نفل ہونے کے باعث مکروہ نہ کہیں گے کیونکہ اس کا مستقلاً ثبوت گو شارع علیہ السلام کے قول و عمل سے نہیں ہوا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اجماعِ مسلمین سے ہو چکا ہے۔

اسی طرح صاحب بدائع نے امام محمد کا قول باب الکسوف میں کتاب الاصل سے نقل کیا ہے کہ کوئی نمازِ نفل جماعت کے ساتھ نہ پڑھی جائے

---

[1] حضرت گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرداً پڑھتے تھے کبھی بتداعی جماعت نہیں فرمائی اگر کوئی شخص آ کھڑا ہوا تو مضائقہ نہیں بخلاف تراویح کے اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کر کے ادا کیا۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۰۷)

بجز قیامِ رمضان اور صلوٰۃِ کسوف کے پھر آگے چل کر صاحبِ بدائع نے لکھا کہ امام محمد نے صلوٰۃِ کسوف کا قیام رمضان یعنی تراویح کے ساتھ ملا کر یہ بتلایا ہے کہ وہ بھی سنتِ موکدہ ہے واجب نہیں ہے (ص ۱/۲۸۰) صاحبِ بدائع ایسے جلیل القدر محقق حنفی کا یعنی تراویح کہنا معمولی بات نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ فقہا حنفیہ قیامِ رمضان سے تراویح ہی مراد لیتے تھے اور فتح القدیر میں جو امام محمد کا قول حاکم کی کافی باب صلوٰۃ الکسوف سے نقل ہوا ہے "ویکرہ صلوٰۃ التطوع ماخلا قیام رمضان و صلوٰۃ الکسوف وہاں بھی حسبِ تصریح صاحب بدائع قیامِ رمضان سے مراد نمازِ تراویح ہی ہے کیونکہ حاکم کی کافی امام محمد کی کتاب الاصل ہی کا مختصر ہے اور سرخسی کی مبسوط اسی کافی ہے کی شرح ہے۔

صاحبِ بدائع ملک العلماء کاسانی نے لکھا ہے کہ "جماعتِ تطوع سنت نہیں ہے بجز قیامِ رمضان کے" یہاں بھی قیامِ رمضان سے علامہ موصوف کی مراد عام نوافل نہیں ہے بلکہ صرف تراویح کی جماعت ہے چنانچہ اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھا جماعت شعائرِ اسلام سے ہے اور فرائض وواجبات کے ساتھ خاص ہے نوافل کے ساتھ نہیں اور تراویح میں جو ہم نے جماعت کو اختیار کیا ہے وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سبب کیا ہے۔

امام سرخسیؒ نے فرمایا:۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نوافل کی جماعت مستحب ہے اور ہمارے یہاں مکروہ ہے ہمارا حق پر ہونا اس بات سے ظاہر ہے کہ اگر (تراویح کے علاوہ) دوسرے نوافل کی رمضان وغیر رمضان میں جماعت مستحب ہوتی تو ہمارے اسلاف[1] جو عبادت میں نہایت ہی جفاکشی اور غیر معمولی مشقتیں برداشت کرنے والے تھے وہ ضرور ان نوافل کو جماعت سے ادا کرتے اس لیے کہ جو نماز اکیلے اور جماعت کے ساتھ دونوں جائز ہے اس میں جماعت افضل ہے مگر عصر نبوی یا عہد صحابہ یا زمانہ تابعین کسی میں بھی ان نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھنا منقول نہیں ہوا لہٰذا تراویح کے علاوہ کسی بھی نفل کی جماعت کو کراہت سے خالی یا مستحب کہنا ساری امت کے خلاف ہے اور یہ امر باطل ہے (مبسوط ص ۱۴۴)

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ نوافل کی جماعت کے مسئلہ میں محدثانہ حیثیت سے احناف ہی کا مذہب قوی ومحکم ہے اس لیے اگر شوافع کو اہل الرائے اور احناف کو اصحاب الحدیث کہا جائے تو نہایت موزوں ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جن حضرات نے یہ سمجھا کہ احناف کے اس بارے میں دو قول راجح ومرجوح ہیں ان کو کسی وجہ سے مغالطہ ہوا ہے احناف میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو کچھ خلاف ہے وہ احناف وشوافع کا ہے پس نمازِ تہجد کی جماعت اور وہ بھی خاص طور سے مساجد میں رائج کرنا سنتِ نبوی وتعاملِ صحابہ وتابعین کی روشنی میں درست نہیں اسی لیے اگر کسی غلط فہمی سے پہلے بھی اس کا رواج ہوا تو اس کو ہمارے اکابر وسلف نے رکنے کی سعی فرمائی ہے چنانچہ حضرت امام ربانی مجدد صاحب الف ثانی قدس سرہ کے زمانے میں بھی اس کا رواج ہو گیا تھا اور یہ عجیب بات تھی کہ وہ بھی دوسرے سلاسلِ طیبہ میں نہیں بلکہ سلسلہ علیہ نقشبندیہ ہی کے کچھ حضرات نے اختیار کیا تھا جس پر حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکاتیب ص ۱۲۸ و ص ۱۳۱ میں ارشاد فرمایا:۔ "افسوس! ہزار افسوس کہ بعض وہ بدعتیں جو دوسرے سلاسل میں قطعاً نہیں ہیں ہمارے طریقہ علیہ میں پیدا ہو گئی ہیں نمازِ تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں اطراف وجوانب سے اس وقت لوگ جمع ہوتے ہیں اور بڑی جمعیتِ خاطر کے ساتھ نمازِ تہجد اس طرح ادا کرتے ہیں حالانکہ یہ عمل مکروہ بہ کراہت تحریمہ ہے۔

دوسرے لوگ اگر اس طریقہ کو التزام بدعت اور اجتنابِ سنت بھی کہیں تو ان کو حق پہنچتا ہے کیونکہ اس بدعت کو سنت تراویح کے رنگ میں رونق دے کر مروج کیا جا رہا ہے اس عمل کو نیک سمجھا جاتا ہے او دوسروں کو اس کی طرف ترغیب دی جاتی ہے حالانکہ نوافل کی جماعت کو فقہا نے مکروہ اور شدید الکراہت قرار دیا ہے اور جن فقہا نے تداعی کو شرطِ کراہت قرار دیا ہے انہوں نے نفل نماز کے جواز کو مسجد سے الگ حصہ کے ساتھ مقید کیا ہے اور تین شخصوں سے زیادہ کی جماعت کو بالاتفاق مکروہ کہا ہے۔"

---

[1] حضرت امام اعظمؒ خود حافظ تھے اور رمضان میں ایک قرآن مجید نوافل شب کو اور ایک دن میں ختم فرماتے تھے اور عید کی رات میں دو قرآن مجید ختم کرنے کا معمول تھا مگر کہیں ثابت نہیں ہوا کہ آپ کے پیچھے کسی نے اقتداء کی ہو اسی طرح دوسرے اکابر وائمہ مجتہدین کے بارے میں بھی ایسا منقول نہیں ہوا۔

16

جماعتِ نوافل اور اکابرِ دیوبند

اس سلسلہ میں اکابر علماء دیوبندؒ میں سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا جو اس جماعت میں حدیث وفقہ دونوں کے مسلم امام تھے ارشاد ہے۔

''نوافل کی جماعت بجز ان مواقع کے جو حدیث سے ثابت ہیں اگر تداعی کے ساتھ ہو تو فقہ میں مکروہ تحریمی ہے اور تداعی سے مراد چار مقتدی کا ہونا ہے لہٰذا صلوٰۃ کسوف، تراویح، واستسقاء درست ہیں باقی سب مکروہ (کذافی کتب الفقہ فتاویٰ رشیدیہ ص ۱/ ۱۲۸)

دوسری جگہ فرمایا ''نوافل کی جماعت تہجد ہو یا غیر تہجد سوائے تراویح وکسوف واستسقاء کے اگر چار مقتدی ہوں تو حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمہ ہے خواہ خود جمع ہوں یا بلانے سے آئیں اور تین کی صورت میں اختلاف ہے البتہ دو میں کراہت نہیں ہے کذافی کتب الفقہ (ص ۲/ ۶۶)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کو رمضان المبارک میں احیاء لیالی اور قرآن مجید سننے کا نہایت شغف تھا اس لیے پہلے یہ معمول رہا کہ بلا تداعی تہجد سنتے مخصوص مہمان شرکت کرتے تھے جو دو چار سے زائد نہ ہوتے تھے اور باہر کا دروازہ مکان کا بند کرادیا تھا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند دام ظلہمؒ نے تحریر فرمایا۔

میرے نزدیک مسئلہ زیر بحث میں فتویٰ یہی ہے کہ علاوہ تراویح کے رمضان میں کسی دوسری نفل کی نماز درست نہیں جمہور فقہاء ومحدثین اسی پر ہیں اور اسی پر اکابر علماء دیوبند کا عمل رہا ہے سیدی وسندی حضرت شیخ الہند قدس سرہ جن کا معمول پورے رمضان کی شب بیداری اور نفلوں میں سماعتِ قرآن مجید کا تھا جب لوگوں نے اس کی جماعت میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تو اس کی اجازت نہیں دی گھر کا دروازہ بند کر کے اندر حافظ کفایت اللہ صاحب کی اقتداء میں قرآن مجید سنتے تھے پھر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو معمول یہ بنالیا کہ فرض نماز مسجد میں بہ جماعت پڑھ کر وہ باہر تشریف لے آتے تھے کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد تراویح میں پوری رات قرآن مجید سنتے تھے مکان پر جماعت ہوتی تھی جس میں چالیس پچاس آدمی شریک ہوتے تھے یہ احقر خود بھی حضرتؒ کی اسارتِ مالٹا سے پہلے دو سال اس جماعت میں شریک رہا ہے جو تراویح کی جماعت تھی نفل تہجد کی جماعت کو حضرتؒ نے کبھی گوارا نہیں فرمایا حضرت مدنیؒ کی جلالتِ شان اور علمی پایہ بلند اپنی جگہ ہے لیکن جب جمہور حنفیہ نے محقق ابن ہمام کے تفردات کو قابلِ عمل نہیں سمجھا حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے تفردات کو معمول نہیں بنایا تو بعد کے علما کا معاملہ اہون ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ (دارالعلوم کراچی ۱/ ۴ شوال ۱۳۷۸ھج)

مندرجہ بالا عبارت مطبوعہ ''فتویٰ نے متعلقہ جماعتِ تہجد ورمضان'' سے نقل کی گئی ہے جو ادارۃ المعارف لسبیلہ چوک کراچی سے شائع ہوا ہے اس میں مولانا مفتی محمد سہول صاحب عثمانی سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی بابتہ کراہت جماعتِ تہجد درج ہے جس میں تفصیلی دلائل پیش کئے ہیں۔

حکیم الامت حضرت علامہ تھانویؒ نے جو حدیث وفقہ کے متبحر عالم تھے امداد الفتاویٰ جلد اول میں نوافل کی جماعت کو علاوہ تراویح کے مکروہ قرار دیا ہے الا یہ کہ صرف دو مقتدی ہوں اور تین میں اختلاف لکھا ہے نیز دوسری جگہ شبینہ رمضان کے سلسلہ میں لکھا کہ اگر وہ تراویح کے بعد نوافل میں ہو تو بوجہ جماعتِ کثیر کے مکروہ ہے۔''

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری مہاجر مدنی قدس سرہ حافظ تھے اور تہجد میں قرآن مجید تلاوت فرماتے اور دو حافظ مقتدی ہو کر سنتے تھے مولانا اسعد اللہ صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ ایک رات میں بھی مقتدی بن گیا تو حضرت نے نماز کے بعد میرا کان پکڑ کر الگ کردیا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے علم وتبحر کا کیا کہنا! درسِ بخاری شریف میں ''**باب طول السجود فی قیام اللیل**'' پر عجیب

تحقیق فرمائی جو یہاں قابل ذکر ہے:۔فرمایا کہ یہاں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طول سجود کا اندازہ بتلایا گیا ہے جتنی دیر میں کوئی پچاس آیتیں پڑھ لے اسی لیے آپ نے صحابہ کو اپنے ساتھ تہجد کی نماز میں اقتداء کرنے سے روک دیا تھا کہ اس میں فرض نماز کی طرح ضعفا ومریضوں کی رعایت نہیں فرما سکتے تھے پھر فرمایا کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز تنہا بغیر جماعت کے ہی پڑھنے کی چیز ہے اور اسی کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ''نافلة لک'' فرما کر پانچ فرض نمازوں سے الگ کر دیا جن کو **اقم الصلوٰة لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر** سے بیان فرمایا تھا۔

ان پانچوں نمازوں کے لیے اقامت کا حکم فرمایا جس کا منشاء یہ ہے کہ علی الاعلان مساجد مساجد میں نداء واقامت کے ساتھ ادا کی جائیں پھر تہجد کا ذکر فرمایا تو **ومن اللیل فتہجد بہ نافلة لک** میں اس کو نافلہ سے تعبیر فرمایا کیونکہ اس میں جماعت کی شرکت نہیں ہے اور پانچ فرض نمازوں میں دوسرے سب آپ کے ساتھ شریک ہیں جس طرح مالِ غنیمت میں تمام مجاہدین کے حصے لگتے ہیں اور نفل (خصوصی عطیہ میں) سب کا کچھ حق نہیں ہوتا اسی طرح تہجد کی نماز آپ کے لیے نافلہ ہے لہٰذا دوسرے لوگ آپ کے ساتھ داخلِ نماز نہ ہوں گے پس وہ آپ کی ایک الگ حالت اور آپ کا انفرادی وظیفہ ہے درحقیقت ان ہی امور پر نظر فرما کر ہمارے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ رات کے نوافل میں تداعی مکروہ ہے اور میرے نزدیک تداعی سے مراد وہی معنی ہے جو عرف عام میں سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کو اس کے لیے بلایا جائے اور جو کچھ مفتیانِ کرام نے دو یا تین مقتدی لکھے ہیں وہ بغرضِ تحدید عمل لکھا ہے اس لیے نہیں کہ وہ صاحبِ مذہب سے منقول ہے۔

اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ نے ''باب صلوٰۃ النفل'' کے درس میں فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں نوافل کی جماعت نہیں ہے اسی لیے اس کے واسطے لوگوں کو بلانا بھی مکروہ ہے پھر فرمایا کہ فقہا حنفیہ کی اس عبارت سے کہ ''نوافل کی جماعت مکروہ ہے بجز رمضان کے'' بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ رمضان میں ہر نفل کی جماعت جائز ہے حالانکہ فقہا کی مراد اس سے صرف تراویح کے نوافل تھے دوسرا کچھ نہیں تھا پھر فرمایا اس کو اچھی طرح سمجھ لو کیونکہ علم بہت ہی تحقیق، دیدہ ریزی کاوش وتجربہ کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

تکمیل بحث: اوپر کی تفصیلات سے حدیث الباب اور مسئلہ تطوعِ رمضان پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اب باقی چند اہم امور کا ذکر مناسب ہے جن سے مزید علمی فائدہ ہوگا یہ اچھی طرح سے واضح کیا جا چکا کہ حنفی مسلک ومکتبِ خیال کی رو سے نوافل کی جماعت روح شریعت سے میل نہیں کھاتی اور نوافل میں پوری طرح اخفاء وعدم اشتہار ہی شریعت کو پسند ہے برعکس فرائض وواجبات کے کہ ان میں پوری طرح اعلان واظہار، اذان واقامت، اہتمام ومظاہرہ کو نہ صرف بہتر بلکہ ضروری قرار دیا ہے یہاں تک کہ اذان کو شعار سب ہی مانتے ہیں اور جماعتِ فرض کو بھی ائمہ نے واجب وشرطِ صحت تک قرار دیا ہے اور سنت موکدہ سے کم درجہ تو احناف کے یہاں بھی نہیں ہے جو جماعت نفل کو بالاتفاق مکروہ تحریمہ وبدعت کہتے ہیں البتہ روح شریعت کو اس طرح سمجھنے سے شوافع قاصر رہے اور انہوں نے جماعتِ فرض پر قیاس کر کے جماعتِ نفل کو بھی جائز ومستحب کہہ دیا۔

اس سلسلہ میں حنفیہ کا مسلک اس قدر واضح تھا کہ اس کو پوری طرح سمجھنے کے بعد کوئی دوسری رائے قائم ہو ہی نہیں سکتی وجہ یہ کہ حنفیہ نے اس امر تک کا اہتمام کیا ہے کہ جہاں نوافل کی جماعت کا زیادہ اہتمام عام لوگ کر سکتے تھے یا کرتے تھے اس موقع پر اور بھی زیادہ سختی سے اس کو روکنے کی کوشش کی ہے چنانچہ لیلۃ القدر کے خیال سے یا زیادہ فضیلت کی راتیں ہونے کی وجہ سے رمضان کے آخیر عشرہ کی راتوں میں شبینہ یا نوافل کی جماعت کا اہتمام ہو سکتا تھا مگر فقہا حنفیہ کا فیصلہ پڑھیے۔ **ویکرہ الاجتماع علی احیاء لیلة من ھذہ اللیالی فی المسجد وصرح بکراتھہ ذلک فی الحاوی القدسی وقال ماروی عن الصلوات فی ھذہ الاوقات یصلی فرادی غیر التراویح** (شامی ص ۱/۷۷۱)

(رمضان کے آخیر عشرہ کی راتوں میں عبادت کے لیے مساجد میں اجتماع کرنا مکروہ ہے اور حاوی قدسی میں بھی اس کی کراہت پر تصریح ہے اس میں ہے کہ ان اوقات (لیالی عید، لیلۃ النصف من شعبان، لیالی عشرہ اخیرہ رمضان ولیالی عشرہ اولیٰ ذی الحجہ) میں احادیث سے بیداری

وعبادت کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے توان میں نوافل تنہا تنہا پڑھنا چاہیے بجز تراویح کے کہ وہ اخیر عشرہ رمضان کی اس سے مستثنیٰ ہیں)

یہاں علامہ شامی نے حاوی قدسی کا حوالہ دیا ہے جس کا مصنف حدود ۶۰۰ھ میں گزرا ہے یعنی بہت متقدم اور لائق استناد فقیہ ومحدث ہیں جو علامہ شامی کی نظر میں بھی بہت معظم ہیں۔

یہاں ذرا توقف سے گزریئے اور شریعتِ غراء کے مزاج کو سمجھ کر آگے بڑھیئے! تا کہ عجلت میں آپ فقہا کے بارے میں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں یہ بات تو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ثابت ہے کہ کسی بدعت کے رواج کی یہ نحوست لازمی ہے کہ اس کی وجہ سے بدعت میں مبتلا ہونے والے کسی محبوب سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم ہو جاتے ہیں۔

یا خدا کی طرف سے بطور سزا محروم کر دیئے جاتے ہیں اس لیے شریعت کی نظر میں بدعت سے زیادہ قبیح وقابل نفرت سے دوسری چیز نہیں ہے جو بظاہر ہم رنگ احکام شرعی ہے اور حقیقت میں اس کو شریعت کی روح سے کچھ بھی تعلق نہیں لیکن اس کے بعد اسی نظر سے دیکھئے کہ جو لوگ جس درجہ میں بھی خود اپنے غیر شرعی مقیاس ونظر سے فیصلہ کر کے اہم کو غیر اہم یا برعکس کر لیتے ہیں وہ بھی جادۂ حق واعتدال سے بہت دور پڑ جاتے ہیں ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ جمعۃ الوداع اور عیدین کی نماز کا ہمیشہ کی نماز پڑھنے والوں سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں ان کے دل میں دوسری فرض نمازوں کی بہت کم اہمیت ہوتی ہے اسی طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ نوافل کا اہتمام زیادہ اور فرض نمازوں میں کوتاہی کرتے ہیں دہلی کے زمانہ قیام میں دیکھا کہ ستائیسویں شبِ رمضان میں اردو بازار کی ایک مسجد میں شب کو بڑا اجتماع ہوتا تھا اس وقت حضرت مولانا احمد سعیدؒ بھی حیات تھے موصوف وعظ فرماتے تھے اور ان کے وعظ کی تاثیر کا کیا کہنا؟ آخر میں بجلی گل کر کے مکمل اندھیرا کر کے ہر شخص کو موقع دیا جاتا تھا کہ اس اندھیری میں اپنے اپنے دلوں کی اندھیری کوٹھریوں کا جائزہ لے اور اپنی سیاہ کاریوں کو یاد کر کے خوب روئے گڑگڑائے اور توبۃ النصوح کرے یقیناً یہ نہایت مفید طریقہ تھا مگر جہاں ایسے لوگوں کے لیے اکسیر تھا جو پہلے ہی پابندِ شریعت تھے وہاں آزاد قسم کے ناپابند شرع لوگوں میں یہ غلط پندار بھی پیدا کرتا تھا کہ شیعی برادران کی طرح سال میں ایک دفعہ ماتم حسینؓ اور گریہ وزاری یا صحابہ کرام پر تبراء کر لینے سے سال کے سال گناہ دھل جاتے ہیں غرض بدعت وسنت میں ایک بہت بڑا فرق اس لحاظ سے بھی ہے کہ ایک ایک بدعت کرنے سے دوسری بہت سی غیر شرعی باتوں کی طرف رغبت بڑھتی ہے اور اتباع سنت سے شریعت کے دائرہ میں پابند ہو کر طاعات عبادات کی توفیق ملتی ہے اس لیے اصول یہی ہے کہ شریعت کے تمام احکام کی رعایت درجہ بدرجہ کی جائے اور اس کے دائرے سے نکلنے کو کسی طرح جائز نہ سمجھے کہ وہ ہی غلطی کی طرف پہلا قدم ہے۔

حضرت مجدد صاحب قدس سرہ نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر فرضوں میں دل کم لگے اور نوافل ومستحبات میں زیادہ تو سمجھ لو کہ دل میں غیر شرعی رجحان کی بنیاد پڑ گئی تو عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتیں، جن کی عبادت اور ان کو بیدار ہو کر ذکر اللہ میں گزارنا شریعت کا نہایت ہی محبوب عمل ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اہتمام فرما کر اپنے گھر والوں کو بیدار فرماتے اور پوری پوری رات جاگ کر عبادت میں گزارتے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ فقہا کی نظر شریعت غرا کے مزاج ومقصد کو پہچاننے میں کس قدر تیز اور خردبین ہے کہ ایسی راتوں میں بھی بطور اہل بدعت اجتماع وہنگامہ کرنے کو مکروہ فرما دیا' صرف اس لئے کہ زمانہ رسالت اور عہد صحابہ وتابعین میں اس قسم کے اجتماع کا کوئی ثبوت نہیں ملا' غیر مقلدین زمانہ محبِ سنت ومتبع حدیث ہونے کا بڑا ڈھونگ رچاتے ہیں اور احناف کو بدعات ورسوم غیر شرعی کا مرتکب بتلایا کرتے ہیں کیا فقہاء احناف کی مندرجہ بالا قسم کی ہدایات پر ان کی نظر نہیں ہے؟ کیا سنت کے اتباع کا اس سے بھی زیادہ کوئی درجہ نکل سکتا ہے کہ بجز تراویح یا صلوٰۃ کسوف وغیرہ کے (جن میں جماعت کا ثبوت خود شارع علیہ السلام سے مل گیا) انہوں نے ہر نفل کی جماعت کو بدعت ومکروہ تحریمہ قرار دے دیا جبکہ شوافع تک نے اس کو محض قیاس کے ذریعے جائز ومستحب کہہ دیا پھر غیر مقلدین کا مزید ظلم دیکھئے کہ وہ اپنی تصانیف میں احناف کے مقابلہ میں شوافع کو اہل حدیث کہتے ہیں اور احناف کو اہل الرائے اور اہل قیاس ہونے کا طعنہ دیتے

ہیں۔ اس کے علاوہ فقہا حنفیہ ہی کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اگر ایک بار تراویح پڑھنے کے بعد دوبارہ تراویح ہی کی نیت سے نوافل پڑھنا چاہیں تو اس میں بھی جماعت نہیں کرا سکتے بلکہ تنہا تنہا پڑھیں گے (کذافی عالمگیری' فصل التراویح ص ۱/۱۱۶) مطبوعہ مصر ونقلہ عن التتارخانیہ)

پھر علامہ شامی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ جو بات صدر اول (یعنی عہد رسالت وصحابہ) میں نہیں ہوئی' اس کو بہ تکلف لازم کر لینا جیسے نوافل کی ادائیگی جماعت کے ساتھ بطریق مداعی (لوگوں کو بلا کر اور ترغیب دے کر' مناسب نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص ۲۷ ویں شب رمضان کی نفل نمازوں کو اس خیال سے ترک بھی کر دے گا تو اچھا کرے گا کہ عام لوگ یہ بات سمجھ لیں کہ یہ کوئی شعار اسلام کے درجے کی چیز نہیں ہے (شامی جلد اول قبیل ادراک الفریضہ ص ۴۷۲) اور اسی موقع پر یہ بھی لکھا کہ نفل کی جماعت اگر ایک دو آدمی کے ساتھ ہو رہی ہے جو بلا کراہت ہے' پھر دوسرے لوگ آ کر شامل ہو جائیں تو کراہت کا گناہ صرف ان لوگوں پر ہوگا جو بعد کو آ کر شریک ہوئے ہیں' پہلے لوگوں پر نہیں ہے۔

غرض فقہ حنفی کی کسی معتبر کتاب سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ رمضان شریف میں تہجد کی نماز جماعت' اگر تین اشخاص سے زائد مقتدی ہوں' بلا کراہت جائز ہے بلکہ ایسی جماعت مذہب حنفی میں بدعت ومکروہ تحریمہ ہے اور تمام ائمہ احناف وفقہاء اس بارے میں متفق ہیں' اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ شوافع کے ساتھ ہے اور اوپر کی تفصیل سے واضح ہو چکا کہ احناف کا مذہب اس بارے میں کس قدر قوی اور مؤید بالسنّت ہے' دوسرے یہ کہ جن محدثین احناف علامہ عینی وغیرہ نے شرح حدیث قیام رمضان کے ذیل میں یہ تحقیق کی ہے کہ قیام رمضان کی فضیلت تہجد ودیگر نوافل کے بارے میں بھی ہے' صرف تراویح کے ساتھ خاص نہیں ہے' اس کا تعلق جماعت نوافل کی کراہت وعدم کراہت کے مسئلہ سے کچھ نہیں ہے۔

اکابر دیوبند میں سے استاذنا العلام حضرت الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ' کا جو کچھ معمول اس بارے میں تھا ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق تربیت واصلاح سالکین سے تھا' بعض حضرات کے عرض کرنے پر کہ آپ کے اس عمل کو لوگ سند بنائیں گے۔ آپ نے فرمایا بھی تھا کہ "میں خود ہی تو کرتا ہوں' دوسروں کو تو نہیں کہتا"۔

اس سے بھی ہمارے خیال مذکور کی تائید ہوتی ہے' دوسرے یہ کہ بالفرض اگر حضرتؒ کی یہی تحقیق بھی تھی تو اس کا منشاء کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے اور غلطی سے بجز انبیاء علیہم السلام کے کس کو معصوم کہا جا سکتا ہے۔ جس شخص کے علمی تبحر پر سینکڑوں مسائل مشکلہ کی گرانقدر تحقیقات شاہد ہوں' وہاں ایک دو مسائل میں تفرد کی کوئی اہمیت نہیں رکھتا' لیکن حضرتؒ کے تلامذہ ومتوسلین کو چاہئے کہ وہ مسئلہ کی صحیح نوعیت کو سمجھیں' جماعت تہجد کو خصوصاً مساجد میں اور تداعی کے ساتھ رواج دینے سے احتراز کریں' ہمارے اسلاف اور اکابر دیوبند کا یہی طرہ امتیاز ہے کہ ہمیشہ صحیح بات کی پیروی کی ہے اور ہر شرعی مسئلہ کو ہر وقت قرآن وسنت' تعامل صحابہ' ائمہ احناف اور محققین امت کے فیصلوں پر پیش کیا ہے اور الحق احق ان یتبع پر عمل کیا ہے' وما علینا الا البلاغ۔

افادہ مزید: باب تطوع قیام رمضان کے ذیل میں ذکر ہو چکا ہے کہ شارحین بخاری کے اقوال نفس شرح حدیث کے بارے میں مختلف ہیں اور اس کا ذکر مطبوعہ فتویٰ وغیرہ میں بھی آیا ہے مگر اس کے بیان میں کچھ تسامح ہوا ہے چونکہ ہماری کتاب انوار الباری کا موضوع محدثین کے اقوال کو بھی پوری صحت ووضاحت کے ساتھ پیش کرنا ہے اس لئے شروح بخاری شریف سے ان کو نقل کرتے ہیں۔

(۱) علامہ محقق حافظ عینیؒ نے لکھا حدیث کے جملہ من قام رمضان سے مراد یہ ہے کہ جو شخص لیالی رمضان میں طاعات وعبادات کرے گا الخ۔ کہا گیا ہے کہ شارع علیہ السلام کی اس سے مراد نماز تراویح ہے اور بعض نے کہا کہ یہ نماز تراویح کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ جس وقت بھی جو نوافل پڑھے گا اس حدیث کی بیان کردہ فضیلت حاصل کر لے گا' پھر اس امر پر سب علما کا اتفاق ہے کہ نماز تراویح مستحب ہے لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ ادائے تراویح کی افضل صورت کیا ہے؟ امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام احمد' جمہور اصحاب شافعی' اور اصحاب امام مالک میں سے ابن عبدالحکم نے فیصلہ کیا کہ تراویح کو جماعت کے ساتھ مساجد میں ادا کرنا افضل ہے۔ جس طرح کہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ نے اس کو قائم کیا اور ان کے بعد مسلمانوں نے برابر اس پر عمل کیا۔

بعض کبار ائمہ حدیث تراویح کو بھی مساجد میں غیر افضل کہتے ہیں

امام مالک، امام ابو یوسف امام طحاوی، بعض اصحاب شافعی وغیرہم کا فیصلہ یہ ہے کہ نماز تراویح کو بھی (دوسرے نوافل و مستحبات کی طرح گھروں میں تنہا تنہا بغیر جماعت کے پڑھنا افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے بہتر و افضل نماز وہی ہے جو اپنے گھر میں ادا کی جائے بجز فرض نماز کے" (عمدۃ القاری ص ۱/۱۷۲)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمایا جب کہ تیسرے یا چوتھے روز بڑی کثرت سے صحابہ تراویح ہی کی جماعت کے واسطے مسجد نبوی میں جمع ہو گئے تھے، بلکہ حدیث میں یہ بھی آتا ہے، ہر روز مجمع بڑھتا رہا اور تیسرے یا چوتھے روز اتنے ہو گئے کہ مسجد نبوی میں جگہ نہ رہی، اس وقت آپ نے دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا، ایک تو وہی مشہور بات کہ میں اس نماز تراویح کو اب اس لئے قائم نہیں کرتا کہ کہیں اس کی فرضیت نازل نہ ہو جائے اور پھر بعد کے لوگوں سے سنبھالی نہ جا سکے، دوسرے آپ نے فرمایا کہ تمہارے لئے سب سے بہتر نماز وہی ہے جو تم اپنے گھروں میں ادا کرو۔ سوائے فرض نمازوں کے۔

یہاں آپ نے دیکھا کہ خود علامہ عینی کی ہی تصریح سے کتنے بڑے بڑے محدثین وفقہا نے نماز تراویح کو بھی مسجد میں اور جماعت سے افضل نہیں سمجھا اور گھروں میں تنہا پڑھنے کو افضل قرار دیا پھر تہجد وغیرہ نوافل کو مسجدوں میں اور جماعت واہتمام سے ادا کرنے کا کیا موقع رہا؟ نیز یہ بھی ظاہر ہوا کہ جن حضرات نے تراویح کی جماعت کو مساجد میں افضل کہا وہ سنت فاروقی، تعامل صحابہ اور استمرار عمل مسلمین و تلقی امت کے سبب کہا ہے، ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور کے بعد وہ بھی اس کو افضل قرار دینے کی جرات نہ کرتے۔

لہٰذا تہجد رمضان کی جماعت کا اجراء کرنے کی جرات بھی اسی وقت ہونی چاہئے کہ اس درجہ کا تعامل صحابہ وسلف ثابت ہو حالانکہ ہم خود شوافع کو اسی امر کے عدم ثبوت کے باعث ملزم بنا رہے ہیں۔

اس تفصیل کی روشنی میں ظاہر ہے کہ شوافع کا فیصلہ کرنا کہ ہر نفل کی جماعت جائز یا مستحب کے درجہ میں آ سکتی ہے، ایسا قیاس ہے کہ ان کی محدثانہ شان کے لائق نہیں اور ہم باوجود احناف و شوافع کے اختلافات کے بھی ان کی محدثانہ رفعت شان اور بلندی مرتبت کے پوری وسعت حوصلہ کے ساتھ معترف و معتقد ہیں اس لئے یہاں پہنچ کر جو کچھ ہم نے لکھا اس سے نہ صرف ہمیں ندامت ہے بلکہ ایک قسم کا خلجان بھی ہے اور سر دست جو کچھ تاویل ان کے اس فیصلہ کے بارے میں ہم سوچ سکے وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں جماعت کی وہ حیثیت ہی نہیں ہے جو ہونی چاہئے یا جو احناف کے یہاں ہے، ان کے یہاں صرف ظاہری طور سے ادائیگی ارکان یا تعداد رکعات وغیرہ میں توافق ہوتا ہے حتیٰ کہ ان کے یہاں امام کی نماز فاسد بھی ہو جائے تو مقتدی کی صحیح رہ سکتی ہے یعنی اگر نماز کے بعد معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے امام صاحب کی نماز درست نہیں ہوئی، مثلاً وہ بے وضو تھا یا جنبی تھا تو وہ امام تو اعادہ کرے گا مگر مقتدی پر اس نماز کا اعادہ نہیں، اس کی درست ہو گئی بلکہ فتح الباری میں یہ بھی ہے کہ بعض شوافع کا قول یہ ہے کہ اگر مقتدی نے دیکھ لیا کہ امام نے بعض ارکان صلوٰۃ کو ترک کر دیا اور مقتدی نے ان کو پورا کر لیا تب بھی مقتدی کی نماز صحیح ہو گئی (العرف الشذی ص ۱۰۲)

اسی طرح شوافع کے یہاں فرض نماز پڑھنے والا مقتدی، نفل نماز پڑھنے والے امام کے پیچھے اقتداء کر سکتا ہے اور امام کوئی فرض نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے مقتدی دوسرے کسی فرض کی نیت سے اقتداء کر سکتا ہے وغیرہ۔ غرض شوافع کے یہاں جماعت وانفرادی نماز میں زیادہ فرق نہیں ہے اور حنفیہ کے یہاں حدیث نبوی "الامام ضامن" کی وجہ سے تمام احکام ہی دوسرے ہیں جن کو احناف اچھی طرح جانتے ہیں، دوسرے یہ کہ مساجد میں فرضوں کی طرح اہتمام کر کے علاوہ تراویح کے دوسرے نوافل کی جماعت ممکن ہے، شوافع کے یہاں بھی مستحب نہ ہو، اگرچہ ایسی تصریح ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گزری اور ائمہ احناف وفقہا کی طرح ان سے ایسی دقت نظر کی توقع بھی زیادہ نہیں ہے۔ **واللہ اعلم و علمہ اتم**

(۲)...... فتح الباری ص ۲/۱۷۸ میں حافظ ابن حجرؒ نے کتاب صلوٰۃ التراویح کے تحت باب فضل من قام رمضان میں لکھا ہے کہ ''اس سے مراد رمضان کی راتوں میں نماز کے لئے کھڑا ہونا ہے'' (جس میں تہجد وغیرہ شامل ہے) امام نووی نے ذکر کیا کہ مراد قیام رمضان سے نماز تراویح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قیام مطلوب کا تحقق ہو جاتا ہے یہ مطلب نہیں کہ قیام رمضان کی اس کے بغیر اور صورت ہی نہیں اور علامہ کرمانی نے عجیب بات ذکر کی ہے کہ تمام علماء نے اس امر پر اتفاق کیا کہ حدیث میں قیام رمضان سے مراد نماز تراویح ہے''۔

(۳)...... امام نووی نے خود شرح بخاری میں حدیث الباب پر اس طرح لکھا۔ ہمارے اصحاب اور دوسرے علماء نے قیام رمضان کو نماز تراویح پر محمول کیا ہے اور تحقیق یہ ہے کہ نماز تراویح سے قیام رمضان کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے لیکن وہ فضیلت صرف اس کے اندر منحصر نہیں ہے اور نہ حدیث کی مراد اس کے ساتھ خاص ہے بلکہ رات کے جس وقت میں بھی نماز نفل پڑھے گا اس کو یہ فضیلت مل جائے گی (شروح البخاری ص ۱/۲۰۲)

تطوع قیام رمضان کی ایک اور حیثیت سابقہ صورتوں سے الگ بھی ہے، جب اتنی طویل بحث اسی سلسلہ کی ہو چکی تو اس کو بھی ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ جو شخص خود حافظِ قرآن ہو اس کے لیے ایک جماعت علماء حنفیہ نے افضل اس امر کو قرار دیا ہے کہ گھر میں ادا کرے (مسجد میں نہیں) بلکہ اس صورت میں امام شافعی کا مختار مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص تنہا بغیر جماعت کے پڑھے ترمذی شریف باب قیام شہر رمضان میں اس کا ذکر ہے وہاں دیکھ لیا جائے امام طحاوی حنفیؒ بھی تراویح کی نماز گھر میں افضل فرماتے تھے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے باب فضل من قام رمضان کے درس میں فرمایا تھا کہ راجح بھی یہی قول معلوم ہوتا ہے کیونکہ بڑے بڑے صحابہ سے یہی ثابت ہے کہ وہ گھروں میں تراویح پڑھا کرتے تھے حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جنہوں نے جماعت تراویح قائم کی ہے وہ بھی خود جماعت کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے حالانکہ اس وقت تک دستور کے مطابق امیر المومنین اور خلیفہ وقت کی حیثیت سے بھی وہی امام مسجد تھے۔

لیکن حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مسئلہ تحقیق اگرچہ اسی طرح ہے مگر اس زمانے میں علماء کو اس کا فتویٰ نہیں دینا چاہیے خطرہ ہے کہ جماعت میں نہ آنے والے سرے سے نماز تراویح ہی ترک کر دیں جس طرح سنن کی ادائیگی گھروں میں افضل ہے مگر اس زمانے میں بہتر یہی ہے کہ مساجد میں ادا کریں تاکہ متساہل و متکاسل لوگ سنتوں کو چھوڑے کا بہانہ نہ بنالیں۔

حدیث الباب کا اوّلی مصداق

تفصیل بالا سے یہ بات منقح ہوتی کہ اس بارے میں سب ہی متفق ہیں کہ حدیث کا اولی مصداق تو نماز تراویح ہے اور ضمناً دوسرے نوافل وطاعات بھی اس کا مصداق بنتے ہیں صرف علامہ کرمانی کا رجحان ادھر معلوم ہوتا ہے کہ صرف نمازِ تراویح مراد ہو اور اس کے لیے انہوں نے اتفاق بھی نقل کیا ہے، جس پر حافظؒ نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔

بات بہت طویل ہوگئی مگر ناظرین کو اس سے اندازہ ہوگا کہ بغیر مراجعتِ اصول اور بغیر حوالوں کی تصحیح کے جو بات چل جاتی ہے اس میں بڑے بڑوں سے بھی مسامحت ہو جاتی ہے اور زیر بحث مسائل کی صحیح نوعیت کھل کر سامنے نہیں آتی جس کی وجہ سے تحقیق ناتمام و نامکمل رہ جاتی ہے۔

ناظرین واقف ہیں کہ ہم کسی بحث کو تشنہ نہیں چھوڑنا چاہتے اور علمِ نبوت کی ایضاح و بیان کے لیے جتنی تحقیقات بھی ائمہ مفسرین، محدثین وفقہاء وغیرہم کی ہمارے سامنے ہے اس کو موقع بہ موقع پیش کرنے کی کوشش کریں گے خواہ اس میں کتنا ہی وقت صرف ہو یا کتاب کا حجم بڑھ جائے۔ امید ہے کہ ہمارے محترم ناظرین اس طرز کو پسند کریں گے اور اگر اس سلسلے میں کوئی مفید اصلاحی مشورہ ملے گا تو اس کی رعایت بھی آئندہ حصوں میں کی جاتی رہے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

باب صوم رمضان احتساباً من الایمان (حسبۃ للہ رمضان کے روزے رکھنا ایمان کا شعبہ ہے)

۳۷ حدثنا ابن سلام قال انا محمد بن فضيل قال حدثنا يحيى بن سعيد عن ابى سلمة عن ابى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صام رمضان ايماناً واحتساباً غفرله ماتقدم من ذنبه

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جوشخص ایمان کے ساتھ محض اللہ سے اس کی خوشنودی وثواب حاصل کرنے کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے گا اس کے پچھلے سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔

تشریح:۔ حدیث مذکور اور دوسری اس قسم کی احادیث سے جن میں کسی عمل خیر کے لیے ایمان واحتساب کی شرط لگائی گئی ہے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہر عمل طاعت کے لیے ایک مبدا اور ایک نہایت وغایت ہونی چاہیے ہر عمل کی صحت کے لیے ایمان تو شرط اول ہے بغیر اس کے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت وقربت بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں یعنی آخرت کے اجر وثواب کے لحاظ سے ورنہ یوں تو کفار ومشرکین کو بھی ان کی بھلائیوں اور نیکیوں پر دنیا کی ہی کوئی خیر وفلاح دے کر معاملہ چکا دیا جاتا ہے یعنی آخرت میں کافر ومشرک کی کسی بھلائی ونیکی پر کوئی ادنیٰ حصہ خیر وفلاح کا نہیں ملے گا یہ فیصلہ شدہ چیز ہے۔

دوسری چیز مومن کے سامنے ہر عمل کے لیے اس کی غرض وغایت ہونی چاہیے اور وہ اللہ کی مرضی وثوابِ آخرت ہے جس کو احتساب سے تعبیر کیا گیا ہے پس عمل خیر کے لیے مبدا ومصدر باعث دواعیہ تو خالص ایمان باللہ ہو کہ نہ اس کو بطور عادت کرے نہ خواہش نفس سے نہ داعیہ طلب جاہ وستائش سے نہ ریاکاری ودکھاوے کے لیے پھر اس مبدا کی غرض وغایت مذکورہ بالا ہو تو وہ عمل عنداللہ ضرور مقبول ہوگا۔

بحث ونظر: حدیث مذکورہ میں (۱) رمضان کے روزوں پر گذشتہ گناہوں کی مغفرت کا وعدہ ہے اور اس سے پہلے قیامِ رمضان (۲) پر بھی ایسا ہی وعدہ تھا ایک حدیثِ صحیح میں عرفہ کے روزہ (۳) کو دوسال کے گناہوں کا کفارہ بتلایا ہے ایک میں (۴) عاشوراء کے روزے کو ایک سال کے گناہوں کا کفارہ فرمایا ایک میں رمضان (۵) سے رمضان تک کے گناہوں کا کفارہ فرمایا اسی طرح عمرہ (۶) سے عمرہ تک بھی کفارہ ہے اور (۷) جمعہ سے جمعہ تک بھی ایک حدیث میں وضو (۸) سے سب گناہوں کے ڈھل جانے کا ذکر ہے دوسری میں پانچ (۹) وقت کی نمازوں کو نہر سے تشبیہ دے کر فرمایا کہ جس طرح پانچ وقت کے غسل سے بدن کا میل کچیل صاف ہوجاتا ہے پانچ وقت کی نمازوں سے بھی گناہوں کے میل صاف ہوجاتے ہیں ایک حدیث میں ہے کہ نماز میں الحمد (۱۰) شریف کے ختم پر جو آمین کہہ کر اللہ سے قبولیت کی درخواست کرتے ہو اگر وہ فرشتوں کی آمین سے موافقت کرگئی تو سب پچھلے گناہ بخشے گئے لیلۃ القدر کی عبادت سے بھی گذشتہ معاصی کی مغفرت گزر چکی ہے اور اسی طرح اور احادیث بھی اس قسم کی ہیں تو سوال یہ ہو سکتا ہے کہ فرض کیجئے اگر ایک وضو ہی سے سارے گناہ ڈھل گئے تو باقی اعمال مذکورہ سے کون سے گناہوں کی مغفرت یا ان کا کفارہ ہوگا؟

علامہ نووی علامہ قسطلانی وحافظ عینیؒ نے شرح بخاری شریف میں اس کا یہ جواب دیا کہ جب اس کے پہلے گناہ کسی ایک عمل یا توبہ وغیرہ سے ڈھل چکے تو دوسرے اعمالِ مذکورہ سے بجائے مغفرتِ ذنوب کے اس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے درجات بلند کئے جائیں گے بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ امید ہے کہ اس کے کبیرہ گناہ ہوں گے تو ان میں بھی تخفیف ہوگی اور اللہ کے وسیع فضل وانعام سے ایسی امید بجا ہے (شرح البخاری ص ۱/۲۰۳-عمدۃ القاری ص ۱/۲۷۲)

یہاں دوسری قابل ذکر بحث یہ ہے کہ جن احادیث میں مغفرتِ ذنوب کا وعدہ ہے وہاں کون سے گناہ مراد ہیں؟ صغیرہ یا کبیرہ بھی؟ علامہ نوویؒ نے لکھا کہ علماء کا مشہور مذہب تو یہی ہے کہ صرف صغیرہ گناہ مراد ہیں کیونکہ وضو والی حدیث میں **مالم يوت كبيرة** (جب تک بڑے گناہ نہ کرے اور **مااجتنب الكبائر** (جب کہ بڑے گناہوں سے پرہیز کرے) قید وشرط لگی ہوئی ہے دوسرے اس امر پر بھی علماء کا اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ یا حد شرعی کے ساقط نہیں ہوتا! تاہم (محولہ بالا احادیث میں سے اکثر کے اطلاقات وعموم پر نظر کرتے ہوئے) تخصیص کا حکم لگادینا محل نظر ہے (شروح البخاری ص ۱/۲۰۳)

علامہ قسطلانی نے لکھا کہ اگر چہ بعض احادیث کی تقلید سے صغائر کی تخصیص مفہوم ہوتی ہے لیکن اللہ کے فضل وسعتِ کرم سے دوسری احادیث کے اطلاقات پر نظر کرتے ہوئے کبائر کی مغفرت بھی متوقع ہے (شروح البخاری ص ۱/۲۰۳)

اس کے بعد گذارش ہے کہ بہت سی احادیث کے اطلاقات وعموم اور اللہ کی رحمت واسعہ پر نظر کرتے ہوئے تو واقعی تخصیص صغائر مرجوح معلوم ہوتی ہے دوسرے یہ کہ بعض احادیث سے سقوطِ کبائر کا ثبوت بغیر توبہ کے بھی وارد ہے مثلاً قتل وشہادت فی سبیل اللہ کے بارے میں مسلم شریف کی حدیث ہے کہ وہ سواء دین وقرض کے ہر گناہ کا کفارہ ہے ظاہر ہے کہ **یکفر کل شیء الا الدین** میں صغائر کی تخصیص بے محل ہے اسی لیے محدثین نے لکھا کہ شہداء کا دخول جنت بغیر حساب وبلا عذاب ہوگا اور ان سے گناہوں پر بھی کوئی مواخذہ نہیں ہوگا (دیکھو عمدۃ القاری ص ۱/۲۶۹) تو جو حدیثیں کفارہ ذنوب وسیئات اور مغفرت کے بارے میں مطلق وارد ہیں ان کو اطلاق ہی پر رکھنا بہتر ہوگا تاہم احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ بڑے گناہوں پر توبہ واستغفار کی طرف سے غفلت نہ کی جائے اس کے بعد حقوق العباد (دین وقرض واخذِ مالِ غیر حق غیبت ایذا مسلم وغیرہ) کا معاملہ ہے ان کی ادائیگی وواپسی کی استطاعت نہ ہو تو صاحبِ حق سے معاف کرانے کا نہایت اہتمام ہونا چاہیے۔

کیونکہ بغیر اسے اخروی نجات دشوار ہوگی یا اگر اپنے قیمتی اعمال دے کر اصحابِ حقوق کو راضی کرنا پڑا تو اس میں بھی خسارہ ہی کی صورت ہے اول تو اعمال ہی کہاں پھر ان میں سے مقبول ہی کتنے اور رہے سہے میں بھی دوسرے حقدار ہو جائیں گے تو اس سے زیادہ تکلیف دہ بات آخرت کی زندگی میں کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کے معاملات مطابق شریعت کرے تمام معاصی خصوصاً حقوق العباد کے فتنہ وآزمائش سے محفوظ رکھے اور کم از کم بقدرِ نجاتِ آخروی ہمیں اعمالِ صالحہ مقبولہ کی توفیق بخشے۔ آمین۔

ایک سوال یہ ہے کہ قیامِ رمضان سنت ہے اور صیامِ رمضان فرض، امام بخاریؒ نے فرض کا بیان مؤخر کیوں کیا جب کہ اس کا مرتبہ تقدم کا مقتضی تھا؟ اس کا بہتر جواب یہ ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر سب سے پہلا شرعی مطالبہ خواہ وہ نفل وسنت ہی کے درجہ کا سہی تراویح کا ہے جو رات میں ادا ہوگا۔ پھر دن کو مطالبہ روزے کا متوجہ ہوگا اور اسی طرح ہر روز قیام رمضان مقدم اور صومِ رمضان مؤخر ہوتا رہے گا اس لیے امام بخاری نے زمانہ کی تقدیم وتاخیر کی رعایت فرمائی ہے۔

یہاں سے یہ بات ثابت کرنا کہ چونکہ امام بخاری نے فرض پر سنت کے ذکر کو مقدم کیا تو یہ ایک اصول بن گیا "فریضہ میں سنت کے راستے سے داخل ہوا جائے کہ یہی راستہ مقبولیت کا ہے"، صحیح نہیں اول تو خود امام کا مقصد متعین کرنا ہی ظنی ہے یقینی نہیں اکثر تو ایسی توجیہات نکات بعد الوقوع کا درجہ رکھتی ہیں پھر اگر واقعی امام بخاری کے نزدیک یہ کوئی اصول بھی ہو تو وہ دوسروں پر خصوصاً باب مسائل میں حجت نہیں ہو سکتا اس لیے اس کی وجہ سے یہ مسئلہ کیسے صاف ہو گیا کہ حاجی اوّل مکہ معظمہ حاضر ہو یا مدینہ طیبہ؟ اور امام بخاریؒ کی صرف مذکورہ بالا ذکری تقدیم وتاخیر سے یہ ثابت کرنا کہ اول مدینہ طیبہ کی حاضری اولی وافضل ہے ہماری سمجھ سے باہر ہے خصوصاً جب کہ اس مسئلہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ نقل موجود ہے کہ "اگر حج فرض کر رہا ہو تو بہتر یہ ہے کہ پہلے حج کر کے پھر زیارتِ طیبہ کے لیے مدینہ مکرمہ حاضر ہو البتہ جائز یہ بھی ہے کہ پہلے زیارت کے لیے حاضری دے" حضرت ملا علی قاری حنفیؒ نے بھی اس کو اختیار کیا اور لکھا کہ پہلے حج فرض کرے پھر زیارت کے لیے حاضر ہو اس کے بعد لکھا کہ نفلی حج ہو تو حج کرنے والے کے لیے دونوں صورتیں برابر ہیں جس کو چاہے مقدم کرے۔

(ارشاد الساری الی مناسک الملا علی قاری ص ۳۳۴) مطبعۃ مصطفیٰ محمد مصر۔

باب الدین یسر. وقول النبی صلی الله علیه وسلم احب الدین الی الله الحنیفیة السمحة

(دین آسان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ کو سب سے زیادہ وہ دین پسند ہے جو سہل ہو اور اس میں خالص تعلق مع اللہ کی تعلیم ہو)

۳۸. حدثنا عبدالسلام بن مطهر قال حدثنا عمر بن علی عن معن بن محمد الغفاری عن سعید بن ابی

سعیدن المقبری عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبة فسددوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوة والروحة وشیء من الدلجة.

ترجمہ:۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک دین آسان ہے اور جوشخص دین کے کاموں میں شدت اختیار کرے گا، دین اس پر غالب ہی رہے گا، پس دین کے اعمال میں میانہ روی اختیار کرو، اور قریب قریب رہو، خوشخبری حاصل کرو، اور صبح وشام، وآخرِ شب کے اوقاتِ نشاط سے (اپنی طاعت وعبادت کیلئے) مدد وقوت حاصل کرو۔

تشریح:۔دینِ فطرت (اسلام) کی بنیاد سہولت وآسانی پر ہے، دوسرے مذاہب میں بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ابتداءً سختی نہ تھی، مگر اہل مذاہب کے غلط طریقوں یا ان کی بدکرداریوں نے سخت احکام عائد کرائے، یا بہت سی سختیاں انہوں نے خود بغیر حکم خداوندی اختیار کرلیں، جیسے ''رہبانیت'' کہ اس کو خود گھڑ کر دین سمجھ لیا، حالانکہ اس کو خدا نے ان پر فرض نہیں کیا تھا، بہر حال! دوسرے تمام ادیانِ عالم (خواہ وہ تحریف شدہ ہوں یا دینِ اسلام کی وجہ سے منسوخ شدہ) کے مقابلہ میں یہ دین اسلام بہت ہی آسان وسہل ہے، چونکہ یہ دین مع اس کے احکام کے قرآن مجید حدیثِ رسول اور آئمہ مجتہدین کے ذریعہ مدون ومحفوظ صورت میں موجود ہے، اور قیامِ قیامت تک اپنی اصل صحیح حالت میں محفوظ رہے گا۔(کیونکہ ایک جماعت اہلِ حق علماءِ ربانیین کی حسب پیش گوئی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حفاظت برابر کرتی رہے گی، اور دین کے اندر غلط چیزیں ملانے والوں کا پردہ فاش کرتی رہے گی وغیرہ، اس لیے یہ دین اور اس کے احکام حق تعالیٰ کی رضاء وپسندیدگی کا صحیح ترین نمونہ ہیں۔

اب چونکہ اس دین پر عمل کا سب سے اعلیٰ نمونہ خود سید المرسلین علیہم السلام کی زندگی ہے جس کا ہر لمحہ اللہ کی طاعت عبادت ویاد سے معمور تھا حتی کہ سونے کی حالت میں بھی صرف آنکھیں سوتی اور دل بیدار رہ کر اللہ کی یاد میں مشغول ہوتا تھا اور آنکھوں نے بھی عالم غیب، عالمِ ارواح، عالمِ اجساد وعالمِ مثال وغیرہ کے وہ سب امور پر مشاہدہ فرمائے جو آپ سے قبل وبعد کسی پر منکشف نہیں ہوئے۔

آپ کے اعمال کو دیکھ کر پھر شریعت میں اعمالِ صالحہ کے ہزار ہا فضائل وترغیبات پر نظر کرکے کون مسلمان نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ایسا ہوگا جس کے دل میں زیادہ سے زیادہ اعمالِ شاقہ اور عبادت وریاضت میں انہماک کا جذبہ وشوق پیدا نہ ہوگا پھر کسی عمل خیر پر ہمیشگی ودوام ہوسکے یا نہ ہوسکے عبادت وریاضت میں زیادہ انہماک سے خود اس کی صحت اہل وعیال کی نگہداشت اور دنیا کے دوسرے مشاغل پر کیسا ہی برا اثر پڑے مگر دل کے ایمانی تقاضوں سے مجبور ہوکر وہ سب کچھ تج دینے کو تیار ہوگا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا کوئی خیال آرائی یا قیاس وحسن ظن کی بات نہیں دورِ صحابہ کے بیسیوں واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صومِ وصال رکھتے دیکھا تو صحابہ نے بھی شروع کردیے آپ نے ان کو روکا کہ تم اس کو برداشت نہ کرسکو گے کسی نے شب وروز عبادت شروع کردی آپ نے فرمایا ایسامت کرو تم پر تمہارے جسم وبدن کا بھی حق ہے آنکھوں کا بھی حق ہے بیوی کا بھی حق ہے اتنی زیادہ عبادت کے ساتھ تم ان سب حقوق کی ادائیگی نہیں کرسکتے پہلے گزر چکا کہ صحابہ نے یہ خیال کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تو سب اگلے پچھلے گناہ بخشے گئے پھر بھی اس قدر عبادت فرماتے ہیں ہمیں تو آپ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے تو آپ نے ان کو بھی سمجھایا غرض اس قسم کے غیر معقول جذبات کی روک تھام کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر وافضل وہ عمل ہے جس پر ہمیشگی ومداومت ہوسکے اگر چہ وہ تھوڑا ہی ہو اور فرمایا کہ اتنے ہی اعمال کا شوق کرو جن کو ہمیشہ کرنے کی طاقت ہو (ایسا نہ ہو کہ چند روز کرو پھر تھک کر بیٹھ جاؤ) حضرت علقمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا یا ام المومنین! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کس طرح تھا؟ کیا خاص دنوں میں کوئی خاص اعمال کرتے تھے؟ فرمایا:۔نہیں! آپ ایک اعمال پر مداومت فرماتے تھے اور آپ کی استطاعت جیسی تم میں سے کس کی استطاعت ہوسکتی ہے؟!

یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میانہ روی اختیار کرو اس سے دور نہ ہٹو (تھوڑے عمل خیر پر بھی خوش رہو کیونکہ صرف اپنے عمل

کے بھروسہ پر کوئی بھی جنت میں نہ جائے گا صحابہؓ نے عرض کیا کیا آپ بھی یارسول اللہ!؟ فرمایا'' ہاں میں بھی نہیں جاسکوں گا بجز اس کے کہ اللہ مجھ کو اپنی مغفرت ورحمت سے ڈھانپ لے''

نیز فرمایا درمیانی راہ پکڑو تمہارا عمل بھی موجبِ بشارت وخوشخبری ہے حضرت ابو ہریرۃؓ سے ایک روایت میں یہ کلمات مروی ہیں:۔'' میانہ روی کرو قریب اس سے رہو صبح وشام اور آخر حصہ شب کے نشاط کے اوقات میں اپنا سفر کرو اور درمیانی رفتار سے چلو متوسط قدم اٹھاؤ! اسی طرح منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے'' یہ سب احادیث امام بخاری نے باب القصد والمداومة على العمل کے تحت ص ۹۵۷ میں ذکر فرمائی ہیں چونکہ ان سب سے حدیث الباب پر روشنی پڑتی ہے اس لیے یہاں ان کا ترجمہ پیش کر دیا گیا یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حدیث الباب کو اصحابِ صحاح ستہ میں سے صرف امام بخاری اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

شارع علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ دین میں تشدد برتنا عبادت ونوافل میں حد سے بڑھ جانا جو برداشت سے باہر یا دوسرے ضروری کاموں میں مخل ہو اللہ کو پسند نہیں ہر شخص اپنی استطاعت اور احوال وظروف کی رعایت سے جتنا عمل خیر مداومت سے کر سکے وہ نہ صرف محبوب وپسندیدہ ہے بلکہ اتنے تھوڑے عمل پر بھی بڑے ثواب کی بشارت اور منزلِ مقصود اللہ کے قربِ خاص تک رسائی کی یقین دہانی ہے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟!

حدیث الباب میں پانچ جملے ہیں۔ علامہ محقق حافظ عینیؒ نے فرمایا کہ ان الدين يسر جملہ مؤکدہ ہے کہ بیشک دین اسلام سراپا سہولت وآسانی ہے لن يشاد الدين کہ دین کے معاملہ میں جو بھی تعمق یا کلاں کاری کرے گا کہ میں زیادہ سے زیادہ اعمال انجام دے کر دین پر غالب آجاؤں گا تو ہرگز اس میں کامیابی نہ ہوگی بلکہ دین ہی اس کا غالب ہوگا اور وہ تھک کر عاجز ہو کر بیٹھ رہے گا۔ فسدد وا وقاربوا کہ امر صواب اور درمیانی قول وعمل کو اختیار کرو اگر تم میں اکمل پر عمل کی طاقت نہ ہو تو اس سے کم اس سے قریب پر قناعت کرو یا عبادت کے معاملہ میں بہت دور تک ہاتھ پاؤں مت پھیلاؤ اس طرح تم منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکو گے یا امورِ خیر میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ البشروا تمہارے لیے تھوڑے عمل پر بھی بشارت ہے واستعینوا یعنی اعمالِ خیر کیلئے اِن اوقاتِ نشاط سے مدد طلب کرو (کیونکہ دوامی طور پر ہمہ وقت تو عمل خیر میں لگا رہنا تمہاری استطاعت سے باہر ہے اس لیے اللہ کو پسند بھی نہیں)

لہٰذا جس طرح دنیا کے سفر کو ان ہی اوقاتِ نشاط میں آسانی سے طے کرنے کے عادی ہو آخرت کے سفر کو بھی (جس کی منزلِ مقصود قربِ خداوندی ہے) ان ہی اوقاتِ نشاط میں عبادت بجالا کر پورا کرو۔

علامہ خطابی نے فرمایا کہ مقصد شارع علیہ السلام یہ ہے کہ دن ورات کے سارے اوقات عبادت میں مشغول نہ کردو، بلکہ سہولتِ عبادت کے لیے رات کے ایک حصہ کو دن کے ایک حصہ کے ساتھ ملالو اور ان دونوں کے درمیان میں بھی کچھ حصہ دلجمعی سے عبادت کرنے کا نکال لو (یعنی دن کے اوّل حصہ میں فجر کی نماز شب کے اول حصہ میں مغرب وعشاء ہوئی اور دونوں کے درمیان میں ظہر وعصر اس طرح کرنے سے جتنی عبادت ہوگی اس میں نشاط رہے گا۔

حضرتِ محقق محدث ابن ابی جمرہؒ نے بہجۃ النفوس شرح مختصر البخاری میں اس حدیث الباب پر نہایت تفصیلی کلام کیا ہے اور حدیث کے پانچوں جملوں میں سے ہر ایک جملہ کی توضیح وتشریح ۱۲، ۱۳ وجوہ سے کی ہے جو ص ۱/ ۲۷ سے ص ۱/ ۹۳ تک پھیلی ہوئی ہیں بہتر تو یہ تھا کہ ہم ان سب کو یہاں ذکر کر دیتے مگر بخوف طوالت صرف چند وجوہ پیش کرتے ہیں۔

(۱)...... قوله صلى الله عليه وسلم ان الدين يسر دین سے مراد ایمان واسلام دونوں بھی ہو سکتے ہیں اور صرف ایمان یا اسلام بھی، ایمان کے یسر وآسانی کے ثبوت میں جاریہ والی مشہور حدیث کافی ہے کہ آپ نے ایک باندی سے پوچھا اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا آسمان میں آپ نے دریافت فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے کہا رسول اللہ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مالک سے فرمایا۔ اس کو

آزاد کردو کیونکہ ایمان والی ہے معلوم ہوا کہ ایمان وتصدیق کے لیے بعض صفاتِ خداوندی کا علم بھی کافی ہے جس طرح اس باندی نے آسمان کی طرف اشارہ کرکے اللہ کی عظمت وجبروت کا اقرار کیا اسی لیے بعض علماء اہل سنت نے کہا کہ بعض صفات سے جاہل کو کافر نہ کہیں گے ورنہ بہت عوام جاہل مسلمانوں کی تکفیر کرنی پڑے گی حالانکہ صحابہ وسلف کے زمانہ میں بھی ایسے لوگ تھے اوران سب کو مومن سمجھا گیا البتہ جو لوگ اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں غلط باتوں کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔

اسلام کے آسان وسہل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ضمام صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا عرض کیا ان کے علاوہ بھی کچھ نماز ہے؟ فرمایا نہیں ہاں نفل پڑھو تو اختیار ہے پھر آپ نے فرمایا رمضان کے روزے عرض کیا اس کے علاوہ بھی ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں ہاں! نفلی روزے رکھو تو اختیار ہے پھر آپ نے زکوٰۃ کا فریضہ سمجھایا عرض کیا اس کے سوا بھی کچھ دینا فرض ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں ہاں! نفلی صدقہ دو تو اختیار ہے یہ سن کر حضرتِ ضمام یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ واللہ! نہ اس سے زیادہ کروں گا نہ اس سے کم کروں گا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ شخص فلاح پانے والا ہے اگر سچا ہے۔

جب اسلام کا صرف اس قدر حصہ بھی فلاح ونجات آخرت کے لیے کافی ہو گیا تو اسلام کے آسان ہونے میں کیا شک وشبہ رہا۔

(۲)......دین اسلام بہ نسبت دیگر ادیانِ عالم کے آسان اور سہل الحصول ہے پہلی امتوں کے سخت احکام اس امت سے اٹھا دیے گئے ہیں مثلاً پہلے کسی کبیرہ گناہ کی معافی قتل سے ہوتی تھی اس امت میں توبہ سے ہو جاتی ہے جو **اقلاع ندم وعزم علي الترک** کا نام ہے پہلے نجاست کاٹ چھانٹ سے پاک ہوتی تھی اب دھونے سے ہو جاتی ہے پہلے یمین باللہ سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی اب کفارۂ یمین کی صورت جائز قرار پائی پہلے حالتِ اضطرار میں بھی اکل میتہ کے ذریعہ زندگی نہیں بچائی جا سکتی تھی اب جائز ہے وغیرہ۔

اسلام میں کسی کو قدر استطاعت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دی گئی یہ بھی یسر وسہولت ہی کی شان ہے خطا ونسیان اور دل کے خطرات ووساوس پر اسلام میں کوئی مواخذہ نہیں۔

نماز جیسے مہتم بالشان فرض کی ادائیگی میں یہ سہولت دی گئی کہ کسی بیماری ومعذوری کے سبب قیام نہ ہو سکے تو بیٹھ کر وہ بھی نہ ہو سکے تو لیٹ کر پڑھ لے اور زیادہ حرکت نہ کر سکے تو سر کے اشارے ہی سے پڑھ لے پانی نہ ملے تو بجائے وضو کے تیمم کرلے' بحالت سفر نماز میں قصر اور روزہ کا افطار مشروع ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدا کو جس طرح عزیمتوں پر عمل کرنا پسند ہے یہ بھی اس کو محبوب ہے کہ اس کی دی ہوئی رخصتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۳......دین کا علم رکھنے والے اس کی سہولتوں سے واقف ومستفید ہوتے ہیں' جاہل ناواقف محروم رہ کر تنگی وسختی محسوس کرتے ہیں' لہٰذا علم دین حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

۴......اس جملہ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تم جن اعمال دین کے بہ نص صریح بے تاویل مکلّف کئے گئے ہو وہ سب سہل ہیں اور ان کی تعداد بھی کم ہے اور اکثر اعمال وہ ہیں جن میں تاویل کا احتمال ہے' لہٰذا یہ بھی خدا کی طرف سے تیسیر وتسہیل ہی ہے' اس کی مثال مشہور حدیث بنی قریظہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم سب جاؤ اور عصر کی نماز بنی قریظہ ہی پہنچ کر پڑھنا پھر ان لوگوں کو نماز عصر کا وقت راستہ ہی میں ہو گیا کچھ نے کہا ہم راستہ میں نماز عصر نہیں پڑھیں گے بعض نے کہا ہم پڑھیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقصد نہیں تھا جو تم سمجھے ہو واپس ہو کر سارا واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا' آپؐ نے کسی کو غلطی پر نہیں بتایا (کیونکہ ہر ایک جماعت نے قابل تاویل حکم سے ایک ایک بات سمجھ کر اس پر عمل کر لیا تھا' غرض بہت سی آیات واحادیث پر عمل میں بہت توسع ہے' کیونکہ ان میں احتمال

تاویل موجود ہے اور ایسے ہی مواقع میں اختلاف امت رحمت ہے۔ (اس قسم کے مسائل نیز قیاس و اجماع کے ذریعہ ثابت شدہ مسائل ائمہ مجتہدین کی فقہ میں مدون ہو چکے ہیں، جس فقہ پر بھی کسی کا عمل ہوگا' وہ قرآن وسنت ہی پر عمل سمجھا جائے گا' لیکن یہ درست نہیں کہ کوئی شخص اپنی نفسانی خواہشات کے تحت کچھ مسائل ایک فقہ کے اختیار کرلے اور کچھ دوسری کے)۔

۵...... دین سے مراد اذعان و استسلام ہے' یعنی ایمان و یقین محکم اور اپنے کو کلی طور پر خدا کے سپرد کر دینا' اس میں کوئی دشواری نہیں ہے' نہ یہ کوئی جوارح کا دشوار و شاق عمل ہے' صرف عمل قلب ہے۔

۶...... دین آسان ہے اس حیثیت سے کہ آدمی اس کے مقتضیات پر عمل کرے اور دنیا کے کاموں کی حرص اور بڑی لمبی امیدیں نہ باندھے' جن کی وجہ سے دین پر عمل میں بھی دشواریاں آتی ہیں' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب صبح کرو تو شام کی فکر مت کرو اور شام کرو تو صبح کی فکر میں مت پڑو' یعنی خواہ مخواہ لمبی امیدیں مت باندھو' مختصر علائق زندگی کے ساتھ زہد و تدین کا حصول آسان ہوتا ہے' اسامہ رضی اللہ عنہ نے کوئی چیز ایک ماہ کے ادھار پر خریدی یا بیچی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسامہ تو بڑی لمبی امیدیں باندھنے والا ہے۔

۷...... دین آسان ہے اس حیثیت سے کہ وہ خدا کی رضا جوئی کا نام ہے جس سے ایک مسلمان اعلیٰ مقامات و درجات سالکین تک پہنچ سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ سے فرمایا اگر تم اپنے اعمال خیر محض خدا کی رضا مندی کے یقین پر کر سکو تو بہت اچھا ہے' ورنہ تکالیف و خلاف منشا باتوں پر صبر کرنا ہی تمہارے لئے خیر کثیر ہے۔

۸...... دین سے مراد صرف قوت یقین ہے کہ اس سے بھی اعلیٰ درجات قرب و مقامات قبول خداوندی حاصل ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے متعلق فرمایا کہ وہ تم سب سے بوجہ کثرت صلوٰۃ وصوم افضل نہیں بنے ہیں بلکہ اس چیز کے باعث جوان کے دل میں مضبوط بیٹھ گئی ہے'' اور وہ چیز قوت یقین ہی تھی' اس کی وجہ سے دین پر عمل کرنا بڑا آسان ہو جاتا ہے یقین کی قوت آیات و انفس میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔

۹...... دین پر عمل اگر خالصاً لوجہ اللہ ہو تو اس کی وجہ سے طاعت و عبادت میں حلاوت حاصل ہوتی ہے اور اس حلاوت کی وجہ سے دین پر عمل کرنا بڑا آسان ہو جاتا ہے' بعض عارفین کا قول ہے کہ مسکین اہل دنیا یوں ہی دنیا سے چلے گئے اور اصل نعمتوں کے ذائقہ سے محروم رہے' پوچھا گیا وہ نعمتیں کیا ہیں؟ فرمایا کہ وہ اخلاص کے ساتھ طاعات و عبادات خداوندی ہیں' جن کی حلاوت سے محروم رہے۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے اس کی ترغیب دی ہے اور نماز کی ہر رکعت میں ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' پڑھنے کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ خالص اسی کی عبادت اور اسی سے استعانت ان کا حال و قال بن جائے۔

غرض مندرجہ بالا تمام وجوہ سے دین کے آسان ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲)...... قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ''و لن یشاد الدین احد الاغلبہ''

۱...... یعنی اتنی شدت اختیار کرنا کہ مقصود دین پر غالب آ جانا ہو تو اس میں کامیابی نہ ہوا اور نتیجہ میں دین سے مغلوب ہی ہونا پڑے گا۔

معلوم ہوا کہ جو شدت اس درجہ کی نہ ہو تو وہ اس نہی میں داخل نہیں بلکہ اس کا محمود ہونا بھی ثابت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مومن قوی بہتر ہے مومن ضعیف سے اور یوں خیر و بھلائی دونوں میں ہے'' معلوم ہوا کہ ضعیف کا مرتبہ قوی سے گھٹا ہوا ہے کیونکہ اس کے دین میں قوت اور ہمت میں بلندی ہوتی ہے تاہم ضعیف بھی اگر بقدر استطاعت' اخلاص نیت کے ساتھ دین کے ضروری احکام بجالائے گا تو وہ بھی خیر و فضیلت سے خالی نہیں ہے' نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ شرعاً مطلوب یہی ہے کہ یقین و عمل کا کمال حاصل کیا جائے مگر شدت و سختی کیساتھ نہیں بلکہ قوت و نرمی کے ساتھ' عاجزی و فروتنی کے ساتھ' مثلاً یقین کا کمال تقلید سلف اور آیات و انفس میں تدبر کے راستہ سے نہیں بلکہ استدلالات و

استباطات عقلیہ کے اندر قوت کے ذریعہ حاصل کرنا چاہئے تو صحیح نہ ہوگا' یا عمل کا کمال فرض و مستحب کو اپنے اپنے مرتبہ میں رکھ کر اپنی استطاعات کے موافق حاصل نہ کرے بلکہ ادا مندوبات و مستحبات میں غلو و مغالیہ کی حد تک پہنچ جائے اس سے بھی حدیث کے جملہ مذکورہ میں روکا گیا ہے۔

۲۔مندوبات میں اس قدر توغل وانہماک کیا جائے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی میں خلل پڑے' درست نہیں کیونکہ سب سے بڑا اور اصلی درجہ کا تقرب الی اللہ فرائض وواجبات ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ ساری رات عبادت کروں (اور صبح کی نماز رہ جائے)

۳۔صرف عزیمتوں پر عمل کرنا اور شرعی رخصتوں سے فائدہ نہ اٹھانا بھی شدت ومشادہ ہے۔

۴۔جو شخص دین کے بغیر کتاب وسنت کے دوسرے علوم عقلیہ کے ذریعہ حاصل کرے وہ بھی مشادہ میں داخل ہے کیونکہ اس طرح حق کا پوری طرح اس پر انکشاف نہ ہو سکے گا اور دین کا حصول اس پر دشوار ہو جائے گا۔

۵۔جو شخص دین کے تمام مسائل پر عمل اس شرط پر کرنا چاہئے کہ سب مجمع علیہ ہوں تو وہ بھی ناکام ہوگا' دین پر عمل دشوار ہو جائے گا کیونکہ بہت سے مسائل ایسے ملیں گے جن پر اجماع نہیں ہو سکا۔

۶۔جو شخص مقدورات الٰہیہ اور فرائض خداوندی سے دل تنگ ہو کر تسلیم وانقیاد' صبر و رضا اختیار نہ کرے گا۔ اس پر بھی دین غالب آ جائے گا' کیونکہ وہ ان کو نا قابل برداشت مشقت اور دین میں شدت سمجھے گا اور ہمت ہار دے گا۔ جس کی وجہ سے مزید سخت احکام دین اس پر عائد ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم ہوا تو ان پر گراں گزرا اپنے نبی سے کہا کہ آپ اور آپ کا رب جا کر کافروں سے لڑیں' ہم یہاں بیٹھیں گے تو اس کی سزا میں چالیس سال وادی تیہ میں بھٹکتے پھرے حتیٰ کہ بہت سے بوڑھے وہیں مر گئے اور بچے جوان ہوئے اور جو لوگ مصائب وشدائد پر صبر کرتے ہیں اور ہر حال میں اذعان وتسلیم کا وتیرہ اختیار کرتے ہیں ان پر خدا کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

غرض مقدر ومقدور تو بدل نہیں سکتے' اس لئے دین میں شدت سمجھنا یا دین کے کاموں میں شدت اختیار کرنا سخت غلطی ہے اہل سلوک کا قول ہے "**تجری المقادیر' فان رضیت جرت و انت ماجور و ان سخطت جرت و انت مازور**" یعنی تقدیری امور تو ضرور ہی پیش آ کر رہیں گے اگر تم ان سے راضی ہوئے تب بھی جاری ہوں گے اور اس صورت میں تمہیں ثواب واجر ملے گا اور اگر تم ناخوش ہوئے تب بھی جاری ہوں گے مگر اس صورت میں تم گنہگار و سزایاب ہو گے۔

(۳)......قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "**فسددوا وقاربوا**"

۱-سداد ومقاربت کبھی ہم معنی بھی بولے جاتے ہیں' مراد درمیانی حالت ہوگی' کیونکہ اس کے معنی اعلیٰ سے قریب اور ادنیٰ سے اوپر کے ہوتے ہیں یا سداد سے مراد ٹھیک درمیانی حالت اختیار کرنا اور مقاربت سے مراد سداد سے قریب رہنا ہے' اول مرتبہ تسدید کا ہے دوسرا تقریب کا۔

۲-سداد سے مراد صلاح حال ہے کہ نفس کو تسلیم وانقیاد کا خوگر کیا جائے اور مقاربت اس سے قریبی حالت اختیار کرنا جب کہ سداد کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

۳-سداد سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کے اصلاح اتباع سنت سے کی جائے' مقاربت سے مراد اس سے قریب رہنا جبکہ سداد دشوار ہو' اگر مقاربت بھی نہ ہو سکے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے نفس کا مجاہدہ کرو۔

۴-تسدید سے مراد نفس کو لمبی امیدیں باندھنے سے روکنا ہے' امیدوں کو مختصر کرنا خیر سداد ہے' مقاربت کے معنی یہ ہیں کہ اگر سداد کا اعلیٰ مرتبہ حاصل نہ ہو سکے تو اس سے قریب تو رہو' ایسا نہ ہو کہ اس اعلیٰ مرتبہ سے دور ہو کر پیچھے رہ جاؤ جو بڑی محرومی ہے۔

۵-تسدید سے مراد حقیقت رضا کی تحصیل ہے اور مقاربت سے مراد صبر علی الشدائد ہے۔

۶-ترک حظوظ ولذات نفسانی کے عمل خیر میں لگے رہو اگر نہ ہو سکے تو ریاضات ومجاہدات کے ذریعہ اس درجہ کا قرب حاصل کرو وغیرہ۔

(۴)......قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "وابشروا"

۱-بشارت کا تعلق عمل تسدید وتقریب سابق سے ہے اور بشارت دو قسم کی آئی ہیں' ایک معلوم ومحدود کہ ایک نیکی پر دس گنا ثواب' ستر گنا' سو گنا' سات سو تک' اس کے بعد **واللہ یضاعف لمن یشاء** (جس کو خدا چاہے اس سے زیادہ دے سکتے ہیں) یا فرمایا **ویزید ھم من فضلہ** (اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جس کو چاہیں جتنا زیادہ دے دیں' یہ تو ایک طرح کی تعیین کی صورتیں ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اس کی تعیین وتحدید کچھ بھی نہیں کی گئی' مثلاً **فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون** (ان لوگوں کے نیک اعمال پر جو کچھ اجر وثواب اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی عجیب وغریب نعمتیں ہم نے چھپا رکھی ہیں' ان کو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا' یہاں دونوں قسم کی بشارت مراد ہو سکتی ہے۔ **واللہ ذو الفضل العظیم**

۲-یہاں بشارت نوافل ومستحبات اعمال پر ہے کیونکہ فرائض وواجبات پر تو کتاب وسنت میں بہ کثرت وعدہ اجر وثواب وارد ہے' اسی کو یہاں سے مراد لینا تحصیل حاصل ہے مطلب یہ ہے کہ ادا فرض کے بعد اگر تھوڑا بھی نوافل کا اہتمام مداومت وپابندی کے ساتھ ہوگا تو وہ بھی زیادہ ثواب وفضل خصوصی کی بشارت کا مستحق ہے۔

۳-مراد یہ ہے کہ تھوڑے عمل پر بھی استقامت کر کے بشارت لو' ممکن ہے وہی خدا کی خاص رضا کا مستحق بنا دے' اخلاق وانابت الی اللہ بہت بڑی چیز ہے' حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ بعض گناہ بھی دخول جنت کا سبب ہوں گے جس کی شرح علماء نے یہ کی کہ بعض دفعہ گناہ کے بعد ندامت وتوبہ نصوص اس درجہ کی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کو وہ عاجزی وانابت پسند آجاتی ہے اور جنت کا مستحق بنا دیتی ہے' ایک بزرگ سالک کو الہام ربانی ہوا کہ "ہم جس بندہ کو اپنا بنانا چاہتے ہیں اس کو (گناہوں پر) اپنا خوف وخشیہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی رحمت کا اس کو امیدوار بھی بناتے ہیں' اس طرح وہ ہم سے اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے اور جس بندہ کو ہم پسند نہیں کرتے' اس کو غافل رہنے دیتے ہیں اور وہ ہم سے دور ہی رہتا ہے۔

۵......قولہ علیہ السلام "**واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ و شیء من الدلجۃ**".

۱-استعانت یہاں دو قسم کی ہے' ایک زمانے سے' دوسری عمل سے' زمانے سے اس طرح کہ صبح وشام اور آخر شب کے اوقات اعتدال ہو ونشاط کے ہیں اور نشاط ورغبت کے وقت عبادت میں حضور قلب ودل جمعی بھی زیادہ ہوگی جو عنداللہ بھی زیادہ قبولیت کا باعث ہوگی' اسی لئے صبح و شام کے اوقات میں خدا کے پکارنے والوں کی مدح قرآن مجید میں آئی ہے۔ **واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ** اور آخر شب میں ذکر' توبہ واستغفار کرنے والوں کے لئے نزول رحمت ومغفرت کا خاص وعدہ حدیث میں وارد ہے۔

استعانت بالاعمال کا ثبوت قرآن مجید کی آیت **واستعینوا بالصبر والصلوۃ**. وغیرہ سے ہے' غرض ان خاص اوقات کو اگر انواع عبادات سے معمور کیا جائے گا' خواہ وہ اعمال مقدار ووقت کے لحاظ سے کم ہی ہوں موجب بشارت ہوں گے۔ نماز کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ وہ افضل عبادات' دین کا ستون اور دین میں اس کی حیثیت بمنزلہ راس من الجسد ہے تو افضل طاعات پر بشارت بھی عظیم القدر ہوگی۔

۲-ایک قول یہ ہے کہ غدوہ سے چاشت کی نماز' روحہ سے ظہر وعصر کے درمیان کی نماز اور دلجہ سے آخر شب کی نماز مراد ہے۔ ان اوقات کے نوافل سے چونکہ اصلاح حال اور تقرب خداوندی میں استعانت ہوتی ہے' اس لئے ان کے اہتمام کے لئے ترغیب دی گئی۔

۳-استعانت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان اوقات میں طاعات کا اہتمام کرے گا' اس کے لئے دوسرے اوقات میں باقی امور دین کی ادائیگی سہل وآسان کر دی جائے گی اور اس کے ایمان ویقین میں قوت عطا ہوگی لہٰذا عاقل کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے دین کی تکمیل کے لئے ایسے امور سے مدد لے جن کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اور اپنے نفس کے محاسبہ سے غافل بھی نہ ہو اور دین کے کاموں میں شدت بھی اختیار نہ کرے۔

۴-استعانت کا یہاں مقصد یہ ہے کہ ان اوقات میں حق تعالیٰ کی خصوصی توجہات ونفحات کی امید لگائی جائے' حدیث میں ہے"**الا ان لربکم فی ایام دھرہ نفحات الافتعرضوالھا**"(دیکھو تمہارے رب کی طرف سے خاص خاص اوقات میں خصوصی رحمت وکرم کی ہوائیں چلتی ہیں'ان سے تمہیں بہرہ اندوز ہونا چاہئے)۔

۵-ایک مطلب یہ ہے کہ جس پر دینی اعمال میں دشواری ہو'اس کو چاہئے کہ رب جلیل کے دروازے پر ان خاص اوقات نزول رحمت میں حاضری دے'اس سے اس کو نفس وشیطان اور دوسرے موانع خیر کے مقابلہ میں مدد ملے گی۔حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو آنے والے فتنوں کی خبر دی تو انہوں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم!ان سے نجات کی صورت کیا ہوگی؟تو آپؐ نے فرمایا"**الجاء الی الایمان و الاعمال الصالحات**"(ایمان واعمال صالحہ کی پناہ لینا'لہٰذا اس زمانے میں کہ فتنوں کی کثرت ہوگئی ہے'اس نسخہ نجات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

۶-مقصد ترغیب وتحریض ہے کہ ان اوقات میں حق تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق وربط قائم کیا جائے تاکہ مشکلات وپریشانیوں کے وقت اس کی مدد تمہارے شامل حال ہو۔حدیث میں ہے کہ جس کو دعا کی توفیق مل گئی اس کے لئے تمام نیکیوں کے دروازے کھل گئے اور حدیث قدسی میں ہے کہ"جس کو میری یاد اپنی ضروریات کے سوال سے مشغول کردے'اس کو میں سوال کرنے والوں کی نسبت سے زیادہ اور اچھا دیتا ہوں"۔

اوپر علامہ محدث ابن ابی جمرہ کی طویل شرح کا خلاصہ درج کردیا گیا کیونکہ حدیث الباب کا مضمون نہایت اہم تھا اور عربی شروح میں بھی اس پر بہت کم لکھا گیا تھا'پھر اردو میں تو کہیں اس کی تشریحات نظر سے گزری ہی نہ تھیں۔

افادات انور

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کے خصوصی افادات پیش کئے جاتے ہیں فرمایا قرآن مجید میں یہودیت ونصرانیت کو حنیفیت کے مقابل ذکر فرمایا۔**قالو اکونوھودا او نصاریٰ تھتدو ا قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا**۔پس یہودیت ونصرانیت کی مذمت فرمائی اور حنیفیت کی مدح فرمائی حالانکہ وہ دونوں بھی ادیان سماویہ میں سے تھے'اس اشکال کا حل میرے نزدیک یہ ہے یہودیت ونصرانیت دراصل اتباع توریت وانجیل کا مرادف ہے اور چونکہ ان دونوں کتب سمایہ کی ان کے متبعین نے تحریف کردی تو اب یہ دونوں القاب بھی اس تحریف شدہ تورات وانجیل کے اتباع ہی پر بولے گئے'لہٰذا ان کی مذمت اور حنیفیت سے ان کا مقابلہ بھی صحیح ہوگیا۔

سب سے پہلے حنیف حضرت ابراہیم کا لقب ہوا ہے کیونکہ وہ کفار کی طرف مبعوث ہوئے تھے'بخلاف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے کہ وہ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے جو نسباً مسلمان تھے'اسی لئے اگرچہ وہ بھی یقیناً حنیف تھے مگر یہ لقب ان کو نہیں ملا۔

حق تعالیٰ نے سب لوگوں کو حنیف ہی کی دعوت دی ہے"**وما امرو االا لیعبدو ا اللہ مخصلین لہ الدین حنفآء** پھر شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے **الملل و النحل** میں دیکھا کہ حنیف'صابی کا مقابل ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حنیف معترف ومقر نبوت ہوتا ہے اور صابی منکر نبوت ہوتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی غلطی

حافظ ابن تیمیہؒ کے سامنے صابی کی بحث کئی جگہ آئی مگر انہوں نے کسی جگہ تشفی بخش بات نہیں لکھی ایک جگہ لکھا کہ قوم نمرود صابی تھی'ان میں فلسفہ تھا اور ان ہی سے فارابی نے فلسفہ سیکھا ہے'پھر آیت **ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجر ھم عند ربھم ولاخوف علیھم ولا ھم یحزنون** (آیت نمبر۶۲ بقرہ) پر گزرے اور

چونکہ صابئین کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی، اس لئے اس کی تفسیر صابئین کو مومنین قرار دیا، وہ سمجھے ہیں کہ جس طرح یہود ونصاریٰ اپنی یہودیت و نصرانیت کے باوجود اپنے زمانہ میں مومن تھے ایسے ہی صابئین بھی باوجود اپنی صابئیت کے اپنے زمانے میں مومن تھے حالانکہ صابئین کسی وقت بھی ایمان نہیں[1] لائے کیونکہ ان میں سے ایک فرقہ کا عقیدہ تو فلاسفہ کے طریقہ پر اول مبادی پر تھا، دوسرا فرقہ نجوم کی پرستش کرتا تھا، تیسرا فرقہ بت تراش کران کی عبادت کرتا تھا (کمافی روح المعانی واحکام القرآن للجصاص)

غرض علماء نے صائبین کے حالات پر تفصیل سے بحث کی ہے، ان کے احوال وعقائد خفا میں نہیں رہے اور سب میں سے اچھی محققانہ اور کافی شافی بحث امام ابوبکر جصاص نے تین جگہ اپنی تفسیر میں کی ہے اور ابن ندیم نے فہرست میں بھی خوب لکھا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ صائبین اپنی مخترعات اور شیطانی تسویلات پر عقیدہ کرتے تھے اور اگرچہ ان کے یہاں کچھ باتیں نبوت کی بھی تھیں مگر وہ کسی خاص نبی کا اتباع نہیں کرتے تھے۔

تو جب کہ حسب تحقیق علماء محققین صائبین منکر نبوت اور غیر اللہ کے پرستار رہے ہیں تو ان کو حافظ ابن تیمیہؒ کا مومنین قرار دینا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ پھر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ علماء نے **من آمن باللہ** میں مراد من یومن لیا ہے۔ یعنی ان میں سے جو مستقبل میں اس طرح ایمان لائے گا الخ تا کہ بظاہر **ان الذین آمنوا** سابق سے تکرار نہ لازم آئے۔

میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ دوسرے جملہ "**من آمن باللہ**" کو بطور استناف مانا جائے جس طرح نحو میں لفظ اما کے ذریعے استناف ہوا کرتا ہے (مثلاً **اما علما فکذا و اما عملا فکذا** وغیرہ)

فرمایا کہ صابی کے معنی ہیں "ہٹا ہوا اور پھرا ہوا راہ سے" (اس کا مقابل حنیف ہے سیدھا ایک جانب دین حق کی طرف چلنے والا کہ دوسرے جوانب واطراف کی طرف رخ نہ پھیرے) حافظ ابن تیمیہؒ کی چونکہ عربیت[2] ناقص ہے اس لئے انہوں نے صابی کے معنی وحقیقت کو

---

[1] صاحب "ترجمان القرآن" کے میلان "وحدت ادیان" کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، آیت مذکورہ کے ترجمہ ونوٹ مندرجہ صفحہ ۱/ ۳۳۷ میں بھی انہوں نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ صابئین کو ملت حقہ مان کر لکھا کہ "ان میں سے کوئی ہو اور کسی گروہ بندی میں سے ہو لیکن جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان اور عمل صالح کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی"، ممکن ہے مولانا کو صابئین کے بارے میں یہ مغالطہ حافظ ابن تیمیہ کی وجہ سے بھی ہوا ہو کیونکہ وہ ان کے غالی معتقد تھے، ہم لوگ بھی حافظ ابن تیمیہ کے علم وفضل اور جلالت قدر کے بڑے معترف ہیں مگر ان کے تفردات پر نہیں جاتے اور "الحق احق" پر عمل کرتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے فوائد میں تحریر فرمایا صابئین ایک فرقہ ہے جس نے ہر ایک دین میں سے اچھا سمجھ کر کچھ اختیار کر لیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں اور فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں اور زبور پڑھتے ہیں اور کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں" غرض آیات میں صابئین کا ذکر بطور ملت حقہ کے نہیں ہوا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ یہود ونصاریٰ کی طرح گروہ بھی اپنے اصل دین کی صداقت پر قائم ہو جائیں تو ناجی ہوں گے اگرچہ خود یہ اصول بھی صحیح نہیں کیونکہ اسلام نے تمام ادیان سماویہ سابقہ حقہ وغیر حقہ کو منسوخ کر دیا ہے، نہ کسی سابق دین کی اصل صورت و حقیقت اب باقی رہی ہے۔

[2] راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ صاحب ترجمان القرآن کی بھی چونکہ عربیت قاصر ہے اس لئے فہم فیہ سواء کا ترجمہ حالانکہ وہ برابر ہیں کیا جب کہ عربی زبان میں فا حالیہ نہیں ہوتی، اسی طرح یوم یکشف عن ساق کی تفسیر کرتے ہوئے کشف ساق سے مراد کفار ومشرکین مکہ کی سیاسی ذلت وناکامی فتح مکہ کے موقع کی لی ہے اور کشف ساق کا محاورہ جنگ کی شدت سے لیا ہے حالانکہ اس آیت میں نہ کشف حزب عن الساق والے محاورے سے کچھ تعلق ہے، نہ کسی مفسر نے اس طرح تفسیر کی اور کبار محدثین نے بھی اس کو قیامت کے دن کا حال بتلایا ہے نہ کہ فتح مکہ کا اسی طرح آیت **فقبضت قبضۃ من اثر الرسول** الخ کا ترجمہ کہ "میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی اس لئے (اللہ کے) رسول کی پیروی میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا پھر چھوڑ دیا اور تشریح اس طرح کی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا تو دین حق سے کیوں پھر گیا؟ تو اس نے کہا میں نے اللہ کے رسولؑ کی (یعنی آپ کی) ایک حد تک پیروی کی کیونکہ جو بات میری قوم کے دوسرے آدمی نہ پا سکے تھے میں نے پالی تھی مگر پھر میں نے آپ کا طریقہ چھوڑ دیا"۔ ترجمان القرآن صفحہ ۲/ ۴۵۶)

اس میں ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بحالت خطاب، غائب قرار دیا، دوسرے **فقبضت قبضۃ** کا ترجمہ رسول کی پیروی میں کچھ لیا تھا نہ عربی زبان کے محاورہ کے لحاظ سے صحیح ہے، نہ کسی مفسر نے ایسی تفسیر کی ہے، تفسیر ابن کثیر وروح المعانی وغیرہ میں پورا واقعہ مستند طریقہ سے بہ تفصیل نقل ہوا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ واللہ اعلم۔

صحیح طور سے نہیں سمجھا اور غلطی سے اس کو دین سماوی کا ایک فرقہ اور مومن قرار دیا ہے۔

حدیث الباب کی اہمیت

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ حدیث الباب نہایت اہم اور جلیل القدر حدیث ہے پھر ہر جملہ کا اردو زبان میں اس طرح ترجمہ و مطلب بتلایا "لن یشاد الدین" کوئی شخص سخت نہیں پکڑے گا دین کو مگر کہ دین اس پر غالب آئے گا مثلاً احتیاط ہی پر عمل کرے بایزید یا جنید جیسا بننے کا زعم رکھتا ہوا ایسا نہ چاہئے بلکہ کبھی رخصت پر، کبھی جواز پر اور کبھی عزیمت پر بھی عمل کرنا چاہئے۔ "سددوا" سداد بالفتح سے مشتق ہے، میانہ روی اختیار کرو، سداد بالکسر سے نہیں ہے جس کے معنی ڈاٹ کے ہیں۔ "قاربوا" بلند پردازی مت کرو پاس پاس اور نزدیک آجاؤ اور جس قدر ہوسکے عمل کرو "وابشروا" یعنی جس قدر عمل ہوسکے، اسی کے مطابق خدا سے توقع رکھو۔ سنا ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث بیعت کرنے کے وقت سنایا کرتے تھے اور بالغدوۃ والروحۃ سے مراد صبح و شام و آخر لیل کے اوقات میں ذکر الٰہی کرنا بتلاتے تھے اگرچہ حدیث کا ورود جہاد کے بارے میں ہوا ہے، اسی طرح غدوہ کے معنی اگرچہ صبح کے وقت چلنے کے ہیں مگر یہاں نماز صبح سے قبل و بعد ذکر کرنا ہے اور روحہ کے معنی اگرچہ بعد زوال چلنے کے ہیں یہاں مراد عصر کے بعد کچھ ذکر کرنا ہے اور شیء من الدلجہ سے مراد آخر شب میں تہجد، ذکر اذکار اور حصین حصین وغیرہ کا ورد ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حدیث الباب کی شرح میں ایک جگہ نظر سے گذرا کہ میانہ روی و استقامت چونکہ بہت دشوار ہے اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "شیبنی هود" فرمایا تھا کہ اس سورت میں فاستقم کما امرت کا حکم نازل ہوا ہے مگر یہ طریق استدلال کمزور ہے علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں کئی جگہ اس پر بحث کی ہے۔

آپ نے ابتداء سورۂ میں تحریر فرمایا کہ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ آپ پر بڑھاپے کے آثار بہت جلد ظاہر ہوگئے؟ اس پر آپ نے فرمایا "مجھے سورۂ ہود اور اسی جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا بنادیا"۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح عرض کیا تو فرمایا ہاں! مجھے سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، مرسلات عم یتسا لون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کردیا حضرت عمرؓ کے عرض کرنے پر سورۂ ہود کے ساتھ صرف عم، واقعہ اور اذا الشمس کورت کا ذکر فرمایا ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ قبل از وقت بوڑھا کرنے والے اسباب وہ ہیں جن کا ذکر ان سب سورتوں میں ہوا ہے اور استقامت کا حکم چونکہ صرف سورۂ ہود میں ہے۔ اس لیے اس کو خاص کرنا صحیح نہیں،

لہٰذا وہ مشترک ذکر شدہ امور احوالِ یوم قیامت اور اخبارِ ہلاکتِ امم وغیرہ ہو سکتے ہیں اور اسی کی تائید دوسرے آثار سے بھی ہوتی ہے، پھر علامہ آلوسی نے یہ بھی لکھا کہ بعض ساداتِ صوفیہ نے ابوعلی مشتری کی ایک منامی روایت پر بھروسہ کر کے استقامت والی بات کو خاص سمجھ لیا ہے، جو اس طرح ہے کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں عرض کیا کہ آپ سے جو "شیبنی هود" والی روایت ہے

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ایک حکایت منقول ہے کہ خلیفہ مامون نے ایک حدیث پڑھی، جس میں سداد من عوض بکسر سین تھا مگر اس نے سداد بالفتح سین پڑھا تو حضرت حماد نے ٹوکا اور بتلایا کہ صحیح لفظ یہاں سداد ہے مامون نے کہا کہ ثبوت لاؤ انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

اضاعونی و ای فتی اضاعوا — یوم کریھۃ و سداد ثغر

مامون اس اصلاح سے بہت خوش ہوا اور حضرت حماد کو پچاس ہزار روپیہ کا رقعہ لکھ کر ایک عامل (گورنر) کے پاس بھیجا اس عامل نے خط پڑھ کر دریافت کیا کہ آپ کو یہ انعام کس بات کا ملا ہے؟ آپ نے قصہ بتلایا تو اس نے تیس ہزار روپے کا اضافہ کر کے ان کی خدمت میں اسی ہزار روپے پیش کئے یہ تھی اس دور خیر و صلاح میں علم و علما کی وقعت وقدر مگر وہ علماء آج کی طرح دست سوال دراز کر کے علم و علماء کو ذلیل نہیں کرتے تھے۔

کیا وہ صحیح ہے، فرمایا۔ صحیح ہے، میں نے عرض کیا آپ کو اس سورت میں سے کس امر نے بوڑھا کیا قصص انبیاء سابقین اور ہلاکت امم نے؟ فرمایا۔ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم فاستقم کما امرت نے۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

علامہ نے فرمایا کہ حق یہ ہے کہ جن چیزوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کیا وہ محض استقامت نہیں، بلکہ دوسرے امور بھی ہیں جو سورۂ ہود اور دوسری سورتوں میں مذکور ہیں، جو آپ کے منصب رفیع اور مرتبۂ جلیل کے لحاظ سے آپ کے قلبِ مبارک کو متاثر کرنے والے تھے اور جن کو صحابہ خود ہی سمجھتے تھے، اسی لیے کسی نے آپ سے سوال نہیں کیا۔

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ استقامت والی بات ہی سب صحابہ سمجھے ہوئے تھے، اس لیے کسی نے سوال نہیں کیا اور صرف ابوعلی کو شک وتردد تھا، انہوں نے سوال کر لیا تو اس کو تسلیم کر لینے پر بھی یہ اشکال باقی رہے گا کہ صحابہ نے دوسری سورتوں کے بارے میں کیوں سوال نہیں فرمایا جب کہ ان میں استقامت کا ذکر نہیں تھا، بلکہ صرف اہوال قیامت و ہلاک امم کا ذکر تھا؟ اگر کہا جائے کہ صحابہ کو یہ معلوم تھا کہ سورۂ ہود میں تو بوڑھا کرنے والا سبب امرِ استقامت ہے اور دوسری سورتوں میں ذکرِ قیامت و ہلاکت امم ہے، تو خبرِ ابی علی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب مکمل نفی والا اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک سورت سے جو بڑھاپے کا سبب مفہوم ہوتا تھا، اس کو بیان فرما دیا دوسری سورتوں والے اسباب سے تعرض نہیں فرمایا تو یہ توجیہ بھی جس درجے کی ہے ظاہر ہے۔

بہر حال! مذکورہ منامی روایت پر اگرچہ ابوعلی سے اس کی روایت درست بھی ہو اعتماد کرنا مناسب نہیں اور خواب دیکھنے والے پوری طرح بات یاد نہ رکھنے یا دیکھی ہوئی بات کو زیادہ محقق طور پر منضبط نہ کر سکنے کی تاویل کر لینا، اس سے بہتر ہے کہ روایت منامی کو صحیح مان کر اس کے معانی و مطالب میں تاویل و توجیہ کا تکلف کیا جائے۔ (روح المعانی ص ۲۰۳، ۱۱)

علامہ آلوسیؒ سے آگے آیت "فاستقم کما امرت" پر کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کلمۂ جامعہ ہے، جس کے تحت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوامی طور پر ہر معاملہ میں استقامت اور افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی خط پر چلنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، خواہ وہ امور علم و عمل سے متعلق ہوں یا عقائد و اعمال سے امور عامۂ امت سے متعلق ہوں یا خاص آپ کے ذاتی معاملات سے مثلاً تبلیغِ احکام، قیام بوظائفِ نبوت، اداءِ رسالت میں تحملِ شاق و مشکلات وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اس قدر اہم اور جلیل القدر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا حق تعالیٰ ہی کی توفیق و نصرت سے ممکن تھا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت متفکر، دائم الحزن اور ذمہ داریوں کے بوجھ میں دبے رہتے تھے اور یہ امر بھی آپ کو بوڑھا کر دینے والا ضرور تھا، اسی لیے جب یہ آیت اتری تو آپ نے فرمایا شمروا شمروا (مستعد ہو جاؤ کمر بستہ ہو جاؤ) کیونکہ آپ کے بعد ان سب ذمہ داریوں کا بوجھ آپ کے صحیح جانشینوں پر پڑنے والا تھا، یہ بھی روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی آیت اس استقامت والی آیت سے زیادہ بھاری اور آپ کو فکر و مشقت میں ڈالنے والی نہیں اتری۔

یہ سب صحیح ہے مگر جن مفسرین نے استقامت کی دشواری پر حدیث مشہور "شیبتنی ھود" سے استدلال کیا ہے وہ ظاہر و قوی نہیں، کیونکہ دوسری بہ کثرت احادیث میں دوسری سورتوں کا بھی ذکر موجود ہے، اسی لیے صاحبِ کشاف نے کہا کہ (تشیب کے لیے) آیتِ استقامت کی وجہ سے سورۂ ہود کی تخصیص بظاہر درست نہیں کیونکہ دوسری احادیث مرویہ میں استقامت کا ذکر نہیں ہے اور قوت القلوب میں ہے کہ زیادہ ظاہر اور کھلی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذکرِ اہوالِ قیامت نے بوڑھا کر دیا تھا اور گویا آپ نے اس ذکر ہی کے ضمن میں

اس روزِ قیامت کے پورے اہوال ومصائب کا مشاہدہ فرمالیا تھا جو حسب ارشاد باری تعالیٰ بچوں کو بوڑھا کردے گا۔ (روح المعانی ص ۱۲،۱۵۲)

مذکورہ بالاقسم کے حدیثی ابحاث کو شاید کوئی صاحب طوالت کا نام دیں مگر امید ہے کہ اکثر ناظرین اور مشتاقین علوم نبوت ان سے محظوظ ومستفید ہوں گے اور اندازہ لگائیں گے کہ علم حدیث کی خدمت میں کیسی کیسی موشگافیاں اور دیدہ ریزیاں علماءِ امت نے کی ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ کسی ایک آیت یا حدیث پر بھی اگر سیر حاصل بحث ہو سکے اور اس کے متعلق پورے مباحث ہم پیش کر سکیں تو ایسی کاوش کو ناظرین یقیناً قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ وما توفیقنا الا باللہ.

باب الصلوٰة من الایمان و قول اللہ تعالیٰ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم یعنی صلوٰتکم عندالبیتِ

(نماز ایمان کا ایک شعبہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں یعنی تمہاری ان نمازوں کو جو تم نے بیت اللہ کے پاس بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں)

۳۹ ...... حدثنا عمرو بن خالد قال ناز ھیر قال نا ابو اسحاق عن البرآء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اول ما قدم المدینة نزل علیٰ اجداده اوقال اخواله من الانصار وانه صلی قبل بیت المقدس ستة عشر شهراً اوسبعة عشر شهراً وکان یعجبه ان تکون قبلته قبل البیت وانه صلی اول صلوٰة صلا ها صلوٰة العصر وصلی معه قوم فخرج رجل ممن صلی فمر علیٰ اهل مسجد وهم راکعون فقال اشهد بالله لقد صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم قبل مکة فدا روا کما هم قبل البیت، وکانت الیهود قد اعجبهم اذکان یصلی قبل بیت المقدس واهل الکتب فلما ولی وجهه قبل البیت انکروذلک قال زهیر حدثنا ابو اسحاق عن البراء فی حدیثه هذا انه مات علی القبلة قبل ان تحول رجال وقتلو افلم ندرما نقول فیهم فانزل الله تعالیٰ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم.

ترجمہ:۔ حضرت براء ابن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے اپنے ننہال میں اترے جو انصار تھے اور وہاں آپ نے ۱۶ یا ۱۷ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور آپ کی خواہش تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو (جب بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا) سب سے پہلی نماز جو آپ نے بیت اللہ کی طرف پڑھی عصر کی تھی آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی پڑھی پھر آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والوں میں سے ایک آدمی نکلا اور اس کا گزر اہل مسجد (بنی حارثہ جس کو مسجد قبلتین کہتے ہیں) کی طرف سے ہوا تو وہ رکوع میں تھے وہ بولا کہ میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ معظمہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے (یہ سن کر وہ لوگ اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف گھوم گئے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے یہود اور عیسائی خوش ہوتے تھے پھر جب بیت اللہ کی طرف منہ پھیر لیا تو انہیں یہ امر ناگوار ہوا۔

زہیر (ایک راوی) کہتے ہیں کہ ہم سے ابواسحٰق نے براء سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ قبلہ کی تبدیلی سے پہلے کچھ مسلمان انتقال کر چکے تھے تو ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی نمازوں کے بارے میں کیا کہیں تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

تشریح:۔ پہلے باب میں بتلایا تھا کہ دین آسان ہے یہاں دین کے ستون کا ذکر فرمایا جو سب سے بڑا ترقی ایمان واسلام کا سبب ہونے کے باوجود آسان وسہل بھی ہے کیونکہ دن ورات میں گھنٹہ سوا گھنٹہ کا عمل ہے اور اس میں کوئی خاص مشقت جسمانی بھی نہیں پھر اس میں سفر وبیماری وغیرہ حالات میں سہولتیں بھی دی گئی ہیں۔

دوسرا مقصد امام بخاریؒ کا یہ بھی ہے کہ تمام اعمالِ اسلام کی طرح نماز کو بھی ایمان کا ایک جزو سمجھتے ہیں اور اس کے لیے استدلال

وما کان اللہ لیضیع ایمانکم سے کیا لیکن یہ استدلال جب ہی صحیح ہوسکتا ہے کہ ایمان کا اطلاق نماز پر بطور ''**اطلاق الکل علی الجزو**'' فرض کیا جائے اگر یہ بات ثابت نہ ہوسکے تو استدلال کمزور ہے (کما قال الشیخ الانورؒ) حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں اطلاق مذکور اس طور پر نہیں ہے جو امام بخاریؒ نے سمجھا بلکہ یہ بابِ سرایت سے ہے گویا ان لوگوں کی ۱۶، ۱۷ ماہ کی ان تمام نمازوں کی جو بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی تھیں اگر اکارت وضائع سمجھا جائے تو ایمان کو بھی ضائع قرار دیا جائے گا کہ دین وایمان کو تھامنے والی چیز ہی گر گئی تو اس کا اثر ایمان پر ضرور پڑنا چاہیے۔

اس کے علاوہ اگر امام صاحب کا مقصد صرف فرقہ مرجۂ اہل بدعت کی تردید ہے اور ایمان کے ساتھ عمل کی اہمیت ہی بتلانی ہے تو وہ یقیناً صحیح ہے۔

بحث ونظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں دو اشکال ہیں اوّل یہ کہ منسوخ شدہ عمل قبل حکم نسخ مقبول ہوا کرتا ہے پھر صحابہ کو اس بارے میں کیوں فکر وتامل تھا کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے والے جو مر چکے ان کی عاقبت اچھی ہوئی یا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں یہ پہلا نسخ تھا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے لہٰذا صحابہ کرام کو مسئلہ مذکورہ کا علم نہیں تھا۔

دوسرا اشکل یہ ہے کہ صحابہ کو جو کچھ تردد تھا وہ بیت المقدس کی طرف پڑھی ہوئی نمازوں میں تھا بیت اللہ کی طرف پڑھی ہوئی میں نہیں تھا تو امام بخاریؒ نے صلوٰۃ عندالبیت سے تفسیر کیوں کی؟ پھر نسائی شریف کی روایت میں تو **لیضیع ایمانکم** کی تفسیر **صلوتکم الی بیت المقدس** ہی مروی ہے۔

اس کے جواب میں بعض علماء نے کہا کہ بیت سے امام بخاریؒ کی مراد بیت المقدس ہی ہے اور عند معنی الیٰ ہے لیکن یہ جواب اس لیے مناسب نہیں کہ مطلق بیت کے لفظ سے بیت اللہ ہی مقصود ہوا کرتا ہے۔ امام نووی نے یہ جواب دیا کہ مکہ معظمہ کی نمازیں مراد ہیں یہ جواب بھی بے وزن ہے کیونکہ تردد وشبہ تو مدینہ طیبہ کی نمازوں میں تھا جو تحویلِ قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی تھیں، حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا کہ امام بخاری ایسے مواقع میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت ہے وہ مکہ معظمہ کی نمازوں کی خاص حالت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کیونکہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مکہ معظمہ کے قیام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس جہت کو نماز ادا فرماتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی رائے ہے کہ آپ نماز تو بیت المقدس ہی کی طرف کو پڑھتے تھے مگر بیت اللہ کو درمیان میں رکھ کرتا کہ مواجہہ بیت اللہ کا بھی فوت نہ ہو دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ بیت المقدس کی طرف توجہ فرماتے تھے، خواہ بیت اللہ کی طرف توجہ فرمائی ہو یا نہ فرمائی ہو تیسری رائے یہ بھی ہے کہ مکہ معظمہ کے قیام میں بیت اللہ ہی کی طرف توجہ فرماتے تھے جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو بیت المقدس کی طرف قبلہ ہو گیا تھا لیکن یہ قول زیادہ ضعیف ہے کیونکہ اس سے قبلہ کی جہت کے بارے میں دو بار نسخ کا حکم معلوم ہوتا ہے لہٰذا پہلی رائے زیادہ صحیح ہے اس کی تفصیل علامہ زرقانی کی شرح المواہب میں موجود ہے اور بظاہر امام بخاریؒ بھی اس پہلی ہی رائے کی توثیق فرما رہے ہیں کہ جو نمازیں بیت اللہ کے پاس پڑھی گئیں وہ بھی بیت المقدس کی طرف تھیں اور عندالبیت لکھ کر یہ اشارہ دقیقہ فرمایا کہ جب بیت اللہ کے جواز میں ہوتے ہوئے بیت المقدس کی طرف نمازیں ہو گئیں تو بیت اللہ سے دور ہو کر جو نمازیں غیر بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں۔ وہ بھی بدرجہ اولیٰ درست اور نہ ضائع ہونے والی ہیں پس تقدیر عبارت اس طرح ہوئی:۔ یعنی **صلوٰتکم التی صلیتمو ھا عندالبیت الی بیت المقدس** اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ عند یہاں زمانیہ ہے مکانیہ نہیں ہے اور بیت سے مراد بیت اللہ ہی ہے مقصد یہ ہے کہ بیت اللہ کے قبلہ ہونے کے زمانے کی تمہاری ساری نمازیں جو بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں مقبول ہیں وہ ہرگز ضائع نہیں ہوئیں (اور بیت اللہ کے ہر زمانہ میں قبلہ ہونے کی حیثیت مسلم ہے خواہ کسی وقت عملاً اس کی طرف توجہ نماز کے وقت منسوخ ہی رہی ہو۔ **واللہ اعلم۔**

قبلہ کے متعلق اہم تحقیق

اس بارے میں تو تمام علما کا اتفاق ہے کہ بیت اللہ (مکہ معظمہ) ذریعہ وحیِ الٰہی قبلہ رہا ہے مگر بیت المقدس (شام) کے بارے میں

اختلاف ہے کہ وہ بھی وحی الٰہی کے ذریعہ قبلہ بنا تھا یا یوں ہی بنو اسرائیل نے اپنی رائے سے قبلہ بنالیا تھا۔

بعض حضرات کا یہی خیال ہے کہ بیت المقدس میں کبھی قبلہ نہیں رہا۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ اپنی نمازوں میں تابوت[1] کا استقبال کریں حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کرائی تو اس میں یہ تابوت رکھ دیا تھا اور وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں اسی لیے پڑھتے تھے کہ تابوت مذکور اس میں رکھا ہوا تھا یعنی قبلہ ہونے کی وجہ سے اس کا رخ نہیں کرتے تھے اس کے بعد انہوں نے اپنے اجتہاد سے قبلہ بنالیا تھا۔

حافظ ابن قیمؒ کی رائے

حافظ ابن قیمؒ نے بھی ہدایۃ الحیاری میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے مگر یہ رائے غلط ہے اور خود حافظ ابن قیم بھی اس کو تھام نہیں سکے وجہ یہ کہ توریت میں تصریح ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیت اقصیٰ کی جگہ ایک کھونٹا گاڑ دیا تھا اور اپنی اولاد کو وصیت فرمائی تھی کہ جب ملکِ شام فتح ہو تو اسی کو قبلہ بنائیں پھر کئی قرنوں کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہاں تعمیر کرائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام پوتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ذبیح دو ہیں حضرت اسحاق علیہ السلام جن کی قربانی بیت المقدس میں ادا کی گئی اور وہ بنی اسرائیل کا قبلہ قرار پایا، دوسرے حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کی قربانی مکہ معظمہ میں بیت کے جوار میں ادا کرائی گئی، اس لیے بنی اسماعیل کا قبلہ بیت اللہ قرار پایا، اس طرح انبیا علیہ السلام کے متبعین نے بلاد کی تقسیم اپنے عمل سے کر کے الگ الگ دو قبلے بنالیے اور شام کی طرف کے سب شہروں کے بسنے والوں نے بیت المقدس کو قبلہ بنالیا اور مدینہ منورہ کے ساکنین بھی اسی کو قبلہ سمجھتے تھے۔

حافظ ابن قیمؒ کی طرف جس رائے کی نسبت راقم الحروف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے لکھی ہے وہی درست ہے اور صاحب روح المعانی نے بھی آیت **وما انت بتا بع قبلتهم** کے تحت حافظ موصوف کی طرف وہی رائے منسوب کی ہے:۔ **وذهب ابن القيم الى ان قبلة الطائفتين الآن لم تكن قبلة بوحی وتوقيف من الله تعالىٰ بل بمشورة واجتهاد منهم الخ** (روح المعانی ص۲/۱۱) چونکہ فیض الباری ص ۱/۱۳۲ میں اس کے خلاف رائے حافظ ابن قیم کی طرف منسوب ہوگئی ہے جب کہ میری ضبط کردہ تقریر درسِ بخاری میں دوسری بات (مع تنقید حضرت شاہ صاحبؒ) موجود ہے اور اسی کی تائید بعد کو روح المعانی کے مذکورہ بالا حوالہ سے بھی ہوگئی لہٰذا رفع اشتباہ کے لیے یہاں ان چند سطور کا اضافہ کر رہا ہوں، **واللہ اعلم**.

قبلہ کی تقسیم حسب تقسیم بلاد

اس دستور کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ نے بھی اور آپ کے صحابہ نے بھی ۱۶، ۱۷ ماہ تک بیت المقدس ہی کی طرف نمازیں پڑھیں، مگر آپ کی دلی خواہش بہت سی مصالح کے باعث بھی یہی رہی کہ مستقل طور سے اس امت کا قبلہ بیت اللہ (مکہ معظمہ) ہی ہو جائے، جس کی چند بڑی وجوہ تھیں، ایک یہ کہ سب سے اول و افضل وہی قبلہ تھا۔ کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ پہلے بیت اللہ کی تعمیر ہوئی تھی، پھر اس کے چالیس سال بعد بیت اقصیٰ بنایا گیا، دوسرے اس لیے کہ تقسیم بلاد و اقوام کے اصولِ مخترعہ کے تحت دو قبلے آپ کو پسند نہ تھے اس لیے چاہتے تھے کہ پوری امت کے لیے ایک ہی قبلہ ہو تیسرے اس لیے کہ کفار و مشرکینِ مکہ بھی بیت اللہ ہی کے قبلہ ہونے سے زیادہ خوش تھے اور وہ کسی دین کے موافق ملت ابراہیمی ہونے کو اسی پر موقوف سمجھتے تھے کہ اس دین میں بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا

---

[1] بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا جس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء بنی اسرائیل کے اس کو بنی اسرائیل لڑائی کے وقت آگے رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا تھا وغیرہ (فوائد حضرت شیخ الہندؒ)

گیا ہو، چوتھے اس لیے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنی اسماعیل میں تھے اور فطرۃً آپ کو اپنے آباؤ اجداد کے قبلہ بیت اللہ سے قلبی علاقہ زیادہ تھا۔ (وغیرہ وجوہ جن کو امام رازی نے بسط وتفصیل سے لکھا ہے)۔

دونوں قبلے اصالۃً برابر تھے

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دونوں قبلے اصل کے لحاظ سے یکساں درجہ کے تھے، جن کی طرف حسبِ تقسیم بلاد قوموں نے نمازوں کے وقت رخ کیا تھا اور آپ نے بھی مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اسی تقسیم کے موافق عمل فرمایا تھا، اس لیے حافظ ابن قیمؒ کی یہ رائے صحیح نہیں کہ بیتِ اقصیٰ قبلہ تھا ہی نہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، بیت اللہ سے چالیس ۴۰ سال بعد بیت اقصیٰ (مسجد اقصیٰ) کی تعمیر کا ثبوت بھی اس کے خلاف ہے وغیرہ۔

اسی طرح بعض لوگوں کی یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچ کر اتنی مدت تک تالیفِ قلوبِ یہود کے لیے بیت اقصے کی طرف نمازیں پڑھی تھیں۔

اہم علمی نکات

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبالِ قبلہ کا حال آپ کی معراجِ مبارک کے حال سے مشابہ ہے، جس طرح آپ کو بیتِ اقصیٰ سے معراج کی ابتداء کرائی گئی اور بیت اللہ سے ابتداء نہیں کرائی گئی، اسی طرح آپ کو پہلے استقبالِ بیت المقدس کا حکم ہوا، پھر استقبالِ بیت اللہ کا ہوا، کیونکہ جائے استقرار اور منتہائے سفر بیت اللہ ہی ہے اور اس طرح سمجھنے میں نسخ کے مکرر ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایک نکتہ دوسرا ہے جو اس سے بھی زیادہ دقیق ہے کہ بیت اللہ بطور دیوانِ خاص ہے جو اصلی مستقر ہوتا ہے اور بیت المقدس بطور دیوانِ عام ہے جو بوقتِ ضرورت منعقد کیا جاتا ہے، اس نقطۂ نظر سے سوچا جائے تو اولاً بیت اللہ کا مکہ معظمہ میں قبلہ ہونا، پھر بیت المقدس کا مدینہ منورہ میں ایک مدت وضرورت کے لیے قبلہ ہونا، اس کے بعد پھر بیت اللہ کا ہمیشہ کے لیے قبلہ قرار پانا اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے، واللہ اعلم۔

تاویلِ قبلہ والی پہلی نماز

یہ امر زیرِ بحث رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کے بعد سب سے پہلے کون سی نماز پڑھی گئی، امام بخاری نے یہاں صراحت کے ساتھ لکھا کہ سب سے پہلی نماز جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی طرف کو پڑھی وہ نمازِ عصر تھی اور سیر کی کتابوں میں یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ نماز ظہر تھی۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے ان دونوں صورتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلی نماز تو وقتِ ظہر ہی کی تھی لیکن نسخ دو رکعتوں کے بعد ہوا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجدِ قبلتین میں تھے یعنی مسجدِ بنی سلمہ میں جو مدینہ طیبہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ (یہ بھی روایت ہے کہ آپ وہاں بشر بن البراء کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور وہیں ظہر کا وقت ہو گیا اس لیے نماز مسجد بنی سلمہ میں ہی ادا فرمائی اور دو رکعت کے بعد آپ مع صحابہ کے بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف گھوم گئے اور مردوں، عورتوں کی صفیں بھی بدل گئیں) اس کے بعد پھر پوری نماز آپ نے عصر کے وقت مسجد نبوی میں بیت اللہ کی طرف پڑھائی۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ علامہ سمہودی (تلمیذ ابنِ حجر) کی "وفاء الوفا باخبار دار المصطفٰے" سے ثابت ہوتا ہے کہ آیتِ تحویل کا نزول مسجدِ نبوی میں ہوا تھا نہ کہ مسجدِ قبلتین میں اور اس نزول کے واقعہ سے حافظ ابن حجر کو ذہول ہوا ہے (ورنہ اس طرح نہ فرماتے کہ تحقیق یہ ہے تحویل قبلہ کے بعد بنوسلمہ کی مسجد میں (بشر کی نمازِ جنازہ کے سبب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر پڑھی ہے اور مسجد نبوی میں عصر پڑھی ہے (فتح ص ۲/۱/۷)

ابن سعد نے تردد کے ساتھ لکھا کہ تحویلِ قبلہ نماز ظہر یا عصر میں ہوئی ہے، (فتح الباری ص ۱/۱۷) علامہ سیوطیؒ نے اہل سیر کی رائے کو امام

بخاری کی رائے پر ترجیح دی ہے اور علامہ آلوسی نے لکھا کہ بعض لوگوں نے قاضی عیاض کی ذکر کردہ روایت (اداءِ نمازِ ظہر بنی سلمہ مذکور) سے استدلال کیا ہے لیکن یہ بقول علامہ سیوطیؒ کے حدیثِ نبوی کی تحریف ہے کیونکہ بنو سلمہ میں جو نماز تحویلِ قبلہ کے بعد سب سے پہلے پڑھی گئی۔ اس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امام نہیں تھے اور نہ آپ نے نماز کے اندر عملاً تحویلِ قبلہ فرمائی چنانچہ نسائی کی مذکورہ ذیل روایت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔

ابو سعید بن المعلی کا بیان ہے کہ ہم دوپہر کے وقت مسجد کی طرف جایا کرتے تھے ایک دن ادھر گزرے تو دیکھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے ہیں میں نے دل میں کہا کہ آج کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے اور بیٹھ گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت **قد نری تقلب وجهک فی السمآء** تلاوت فرمائی میں نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ! حضور کے منبر پر سے اترنے کے قبل ہی دو رکعت پڑھ لیں تا کہ ہم سب پہلے نماز پڑھنے والے ہو جائیں (یعنی بیت اللہ کی طرف چنانچہ ہم دونوں نے دو رکعت پڑھیں۔

پھر آپ منبر سے اترے اور نمازِ ظہر پڑھائی علامہ عینی نے **فمر علی اهل مسجد** کے ذیل میں لکھا کہ یہ لوگ اہل مسجد قبلتین تھے جن پر وہ گزرنے والا نمازِ عصر کے وقت گزرا ہے اور ان لوگوں نے کچھ نماز بیت المقدس کی طرف پڑھی تھی پھر باقی بیت اللہ کی طرف پڑھی ہے اور اہلِ قبا کو اسی طرح صبح کی نماز میں خبر دینے والے نے خبر دی ہے اور انہوں نے بھی آدھی نماز بیتِ اقصیٰ کی طرف اور آدھی بیت اللہ کی طرف ادا کی ہے۔

حافظ وعلامہ سیوطیؒ

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ سیوطیؒ بڑے محدث تھے بلکہ وہ تبحر میں حافظ سے زیادہ ہیں البتہ فن حافظ کے یہاں زیادہ ہے میں علامہ سیوطیؒ کے نمازِ عصر کے بارے میں اصرار اور علامہ آلوسی کی ترجیح روایتِ سیر کے باعث متردد ہو گیا ہوں یہ بھی فرمایا کہ حافظ سیوطی نے بیضاوی کی تخریج کی ہے جو مراجعت کے قابل ہے۔

مدینہ میں استقبالِ بیت المقدس کی مدت

اقوال مختلف ہیں ۱۶ ماہ یا ۱۷ یا ۱۸۔ حضرتِ ابن عباسؓ کی روایت سے ۱۲ ربیع الاوّل کو داخلہ مدینہ طیبہ ثابت ہوتا ہے اور اس پر بھی اکثر حضرات کا اتفاق ہے کہ اگلے سال نصف رجب پر تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا۔

امام ترمذی و مسلم نے ۱۶ ماہ قرار دیئے اس طرح کہ ۱۶ ماہ کامل ہوئے اور زائد تین روز کا لحاظ نہیں کیا۔ امام نووی نے شرح مسلم میں اسی قول کو راجح قرار دیا ہے اور شرح بخاری میں لکھا کہ یہاں اگرچہ شک کا کلمہ ہے مگر امام مسلم وغیرہ نے براء سے ۱۶ ماہ کی روایت بلاشک کی ہے لہٰذا اسی پر اعتماد ہونا چاہیے۔ **واللہ اعلم۔**

امام بزار و طبرانی وغیرہ نے ۱۷ ماہ قرار دیے کہ ربیع الاوّل اور رجب (اوّل وآخر ماہ) کو پورا گن لیا، محدث ابن حبان نے ۱۷ ماہ اور تین دن بتلائے اس طرح کہ ابن حبیب کا قول شعبان میں تحویلِ قبلہ کا ہے (جس کو امام نووی نے بھی روضہ میں ذکر کیا ہے اور اس پر کچھ نقد نہیں کیا۔

ابن ماجہ کی روایت سے ۱۸ ماہ معلوم ہوتے ہیں وہ بھی غالباً شعبان کو ملا کر اور کسر کو پورا قرار دے کر ہے امام بخاریؒ نے شک کے ساتھ ۱۶ یا ۱۷ ماہ قرار دیئے ہیں۔ (شروح البخاری ص ۱/۳۱۱)

یہود واہلِ کتاب کی مسرت وناراضگی

روایت میں ہے کہ یہود واہلِ کتاب کو اس امر کی خوشی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان بیتِ المقدس کے طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں پھر جب تحویلِ قبلہ ہوئی تو ان کو یہ بات ناپسند ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ یہود کو تو اس لیے خوشی ہوگی کہ بیت المقدس ان کا قبلہ تھا مگر اہلِ کتاب سے اگر نصاریٰ مراد ہیں تو ان کا قبلہ بیت اللحم (مقام ولادت عیسیٰ علیہ السلام تھا جو بیت المقدس سے سمتِ مشرق میں تھا ان کے لیے تو کوئی وجہ خوشی کی اور بیت اللہ کی طرف قبلہ ہو جانے پر ناراضگی کی بھی نہ تھی ان کے واسطے دونوں برابر تھے جواب یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد نصاریٰ ہیں اور مدینہ طیبہ کے زمانے میں جب استقبالِ بیت المقدس ہوتا تھا تو اس کے ساتھ ہی بیت اللحم کا بھی ہو جاتا تھا کیونکہ وہ دونوں اس کے لحاظ سے ایک ہی سمت میں تھے دوسرے یہ کہ دین موسوی کو وہ بھی مانتے تھے اس لیے بیت المقدس کی بھی پوری عظمت کرتے تھے علامہ قسطلانیؒ نے یہ وجہ قرار دی کہ بیت المقدس اگر چہ نصاریٰ کا قبلہ نہ تھا مگر تبعاً للیہود وہ بھی خوش ہوئے اور تحویلِ قبلہ پر بھی ان کے اتباع میں ناخوش ہوئے۔

تحویلِ قبلہ سے قبل کے مقتولین

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ مجھے زہیر کی روایت کے سوا کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس میں تحویل سے قبل کسی کے مقتول ہونے کا ذکر ہو کیونکہ اس وقت کوئی غزوہ و جہاد بھی نہیں ہوا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس طرح قبل تحویل مطلقاً نفی قتل صحیح نہیں معلوم ہوتی اور ممکن ہے کہ روایت زہیر میں مکہ معظمہ کے زمانے کے مقتولین مراد ہوں، مدینہ منورہ کے نہ ہوں جس کا ذکر خود حافظ نے بھی آخر میں کیا ہے اور لکھا کہ اگر زہیر سے لفظِ قتلوا کی روایت قطعی سمجھ لی جائے تو اس سے مراد وہ بعض غیر مشہور مسلمان ہو سکتے ہیں جو اس مدت کے اندر بغیر جہاد کے قتل ہوئے اور ان کے نام اس لیے نہ مل سکے کہ اس وقت تاریخ منضبط کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ ہوئی تھی۔

اس کے بعد حافظ نے لکھا کہ پھر میں نے مغازی میں ایک شخص کا ذکر دیکھا جس کے اسلام میں اختلاف ہے سوید بن صامت کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ عقبہ میں انصار بھی نہ آئے تھے حضور نے ان پر اسلام پیش کیا انہوں نے کہا کہ یہ بات تو اچھی ہے پھر وہ مدینہ پہنچے اور بعاث کے واقعہ میں قتل ہوئے جو ہجرت سے پہلے کا ہے اس کے بعد ان کی قوم کے آدمی کہا کرتے تھے کہ وہ بحالتِ اسلام قتل ہوئے حافظ نے کہا کہ ممکن ہے وہی مراد ہو۔ پھر حافظ نے بعض فضلا کے حوالے سے یہ توجیہ بھی نقل کی کہ مکہ معظمہ میں جو ضعیف کمزور مظلوم مسلمان کفار کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے وہ اس سے مراد ہیں جیسے عمار کے والدین، حافظ نے اس رائے پر یہ تنقید کی کہ اس توجیہ کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان دونوں کا قتل اسراء کے بعد ثابت ہو جائے (فتح الباری ص ۷۳/۱)

ہمارے علامہ محقق حافظ عینیؒ نے حافظ ابن حجر کی یہ پوری عبارت نقل کر کے اس پر تعقب و نقد کیا ہے جس سے حافظ عینیؒ کی دقتِ نظر اور شانِ تحقیق نمایاں ہے فرمایا۔ مجھے اس میں کئی وجوہ سے کلام ہے۔

(۱) اس کی بنیاد ایک احتمالی و شکی بات پر ہے (جو مقامِ تحقیق کے مناسب نہیں۔)

(۲) اس زمانہ میں تاریخ کا اعتنا کم تھا کسی طرح درست نہیں دوسرے جن لوگوں نے قبلِ تحویل کے دس (۱۰) انتقال کرنے والے اشخاص کے نام منضبط کئے کیا وہ قتل ہونے والے حضرات کے نام نہ لکھتے حالانکہ ان کی زیادہ فضیلت و شرف کے باعث ان کے ناموں کا ضبط و نقل زیادہ اہم بھی تھا، بہ نسبت اپنی موت سے مرنے والوں کے۔

(۳)...... جس شخص کا ذکر مغازی سے کیا گیا ہے وہ قابلِ استناد نہیں کیونکہ اس کے اسلام میں اختلاف ہے دوسرے وہ ایک ہے اور روایت میں قتلوا جمع کا صیغہ ہے جس سے جماعت مراد ہوتی ہے اور اس کا کم سے کم درجہ تین ہے۔

(۴)...... بعاث کا واقعہ دورِ جاہلیت میں اوس و خزرج کے درمیان پیش آیا ہے اس وقت اسلام کی دعوت کہاں تھی؟ غرض بعاث کا

واقعہ کہاں اوراس سے استدلال کسی شخص کے بیت المقدس سے قبلہ ہونے کے وقت مقتول ہونے پر کہاں؟ بڑا بے محل استدلال ہے۔
پھر حافظ عینی نے صغانی کا حوالہ بھی پیش کیا کہ بعاث مدینہ طیبہ سے دو رات کی مسافت پر ایک مقام ہے اور یوم بعاث سے مراد وہ دن ہوتا ہے جس میں اوس وخزرج باہم لڑے تھے (عمدۃ القاری ص ۱/۲۹۰)

نسخ احکام کی بحث

حافظ عینیؒ نے اس موقع پر نسخِ احکام کی نہایت مفید بحث لکھی ہے جو قابل ذکر ہے۔
(۱)......حکم تحویلِ قبلہ سے ثابت ہوا کہ نسخِ احکام درست ہے اور یہ مسئلہ مجمع علیہا ہے سب کا اس پر اتفاق ہے بجز ایک نا قابلِ اعتنا جماعت کے پھر جمیع احکام شرح میں عقلاً بھی نسخ درست ہے۔ یہود میں سے بعض لوگ نسخ کو نقلاً باطل کہتے ہیں یعنی جو احکام تورات میں آچکے ہیں وہ ان کے نزدیک نا قابلِ نسخ ہیں اس دعویٰ پر دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ تورات میں ہے **تمسکوا بالسبت مادامت السمٰوات والارض** اور اس کی نقل متواتر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا "ان کی شریعت منسوخ نہ ہوگی" اور ان میں سے کچھ لوگ نسخ کو عقلاً باطل کہتے ہیں۔
نسخ کو جائز کہنے والوں کی نقلی دلیل یہ ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہنوں سے نکاح جائز تھا اور اس سے توالد وتناسل بھی ہوا جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اور تورات میں بھی ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس امر کا حکم ملا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کا نکاح اپنی بیٹیوں سے کردیں اس کے بعد وہ حکم منسوخ ہوگیا اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں آزاد کو غلام بنانے کا بھی جواز تھا حتیٰ کہ یہ بھی نقل ہوا کہ انہوں نے زمانہ قحط میں سب اہلِ مصر کو غلام بنالیا تھا اس طرح کہ ان سب کی جانوں کو غلہ وطعام کے بدلے میں خرید لیا تھا پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے قبل سنیچر کے دن عمل مباح تھا موسوی شریعت میں وہ منسوخ ہوگیا اور یہود کا یہ دعویٰ کہ تورات میں سبت کا حکم ہمیشہ کے لیے دیا گیا تھا غلط ہے انہوں نے تحریف کرکے ایسی باتیں اس میں بڑھادی ہیں اسی لیے موجودہ تورات پر یقین کرنا اور اس پر ایمان لانا اسلامی شریعت کی رو سے درست نہیں ہے پھر تورات کا تواتر بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ بختِ نصر کے زمانے میں بہت تھوڑے یہودی رہ گئے تھے۔ اہلِ تاریخ نے بالاتفاق لکھا ہے کہ بختِ نصر کا جب بنی اسرائیل پر تسلط وغلبہ ہوا تو اس نے ان کے سب مردوں کو قتل کرادیا تھا اور ان کی ذریتوں کو غلام بنالیا تھا تورات کے سب نسخے جلادیے تھے حتیٰ کہ اس وقت ان کا کوئی شخص تورات کا حافظ باقی نہ رہا تھا۔ خود یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ حق تعالیٰ کے حضرت عزیر علیہ السلام کو تورات کا الہام فرمایا تھا اور انہوں نے اس کو اپنی یاد سے پڑھا تھا ان سے پہلے اور بعد کو کسی نے بھی اس کو حفظ نہیں کیا اور اسی لیے یہودیوں نے ان کو ابن اللہ کہا اور ان کی عبادت کی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنے ایک شاگرد کو تورات دی تھی تاکہ بنی اسرائیل کو پہنچ جائے اور پھر سب نے اسی سے اس کو حاصل کیا لہٰذا تواتر کا دعویٰ کس طرح درست ہوسکتا ہے؟!
پھر بعض یہود کا خیال ہے کہ حضرت عزیر نے اس میں کچھ حذف والحاق بھی کیا ہے ایسی صورت میں اس پر وثوق کرنا اور بھی دشوار ہے۔
(۲)......دوسرے معلوم ہوا کہ سنت کا نسخ قرآن مجید کے ذریعہ جائز ہے اور یہ جمہور اشاعرہ ومعتزلہ کا مذہب ہے امام شافعی کے اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ جائز نہیں جیسا کہ ان کے نزدیک قرآن مجید کا نسخ سنت سے جائز نہیں قاضی عیاض نے فرمایا کہ اکثر علماء نے اس کو عقلاً وسمعاً جائز سمجھا ہے اور بعض نے عقلاً درست اور سمعاً ممنوع کہا۔
امام رازی نے فرمایا:۔ امام شافعی اور ہمارے اکثر اصحاب نے، نیز اہل ظاہر اور امام احمد نے (ایک قول میں) کتاب اللہ کا نسخ سنتِ

متواترہ سے قطعاً ممنوع قرار دیا اور جمہور علماء، نیز امام ابوحنیفہ و مالک نے اس کو جائز قرار دیا۔ اس کے بعد ہر ایک کے دلائل ذکر کئے جاتے ہیں یہ بحث چونکہ نہایت اہم ہے اس لیے باذوق ناظرین اور اہل علم کے لیے بطور ضیافتِ علمیہ پیش کی جارہی ہے۔

دلیل جوازِ نسخ سنت بہ قرآن مجید

یہ ہے کہ توجہ بیت المقدس کی طرف کتاب اللہ سے ثابت نہیں تھی اور وہ آیت **وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ** سے منسوخ ہوگئی، امام شافعیؒ کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں نسخ قرآن بہ قرآن ہے کیونکہ پہلے حکمِ امتیازی قرآن مجید ہی سے ثابت تھا **اینما تولوا فثم وجہ اللہ**. پھر وہ حکم استقبالِ قبلہ سے منسوخ ہوا بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ **اقیموا الصلوٰۃ** میں اجمال تھا جس کی تفسیر چند امور سے کی گئی ان ہی میں سے توجہ بیت المقدس بھی تھی اس طرح گویا وہ بھی بحکم مامور بہ لفظا ہوگئی پس توجہ بیت المقدس کا حکم قرآن ہی سے ثابت ہوگیا تھا جس کا نسخ بھی قرآن سے ہوا بعض نے کہا کہ نسخ تو سنت سے ہی ہوا قرآن مجید نے اس کی موافقت کی ہے لہٰذا نسخ سنت بہ سنت ہوا۔ حافظ عینیؒ نے لکھا کہ پہلے دونوں جواب اس لیے مقبول نہیں کہ اگر اس طرح توجیہ کر لینی درست ہو تو پھر کوئی ناسخ، منسوخ سے ممتاز نہ ہو سکے گا کیونکہ یہ دونوں جواب ہر ناسخ و منسوخ میں چل سکتے ہیں اور تیسرا جواب ادعاء محض ہے اس لیے وہ بھی قابل قبول نہیں۔

(۳)...... خبر واحد سے بھی جواز نسخ ثابت ہوا قاضی عیاض نے فرمایا کہ اسی کو قاضی ابوبکر بن العربی وغیرہ محققین نے اختیار کیا ہے وجہ یہ کہ جس طرح قرآن مجید وسنتِ متواترہ پر عمل قطعی ہے اسی طرح خبرِ واحد پر بھی ہے اور اسی کو امام غزالی اور مالکیہؒ میں سے باجی نے اختیار کیا اور یہی قول اہلِ ظاہر کا بھی ہے۔

(۴) معلوم ہوا کہ دوسری احادیث کی طرح خبر واحد بھی مقبول ہے اور معلوم ہوا کہ اس کو صحابہ کرام بھی قبول کرتے تھے اور سلف سے اس کے قبول پر اجماع ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل و عادت سے بھی بہ تواتر اس کا ثبوت ہے کہ آپ نے ولاۃ حکام اور اپنے قاصد تنہا تنہا آفاق و اطراف کو روانہ فرمائے تھے تاکہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں اور ان کو آپ کے طریق و سنت سے باخبر کریں۔

(۵) پھر حافظ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب سے اس امر کا استحباب معلوم ہوا کہ جب کسی ایسے شہر میں جائے جہاں اس کے اقارب واعزاء بھی ہوں تو اس کو ان ہی کے یہاں اترنا چاہیے دوسروں کے یہاں نہیں۔ جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا۔

(۶)...... نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ خود احکام الٰہیہ کو بدلوانے کی تمنا کرنا بھی جائز ہے جب کہ اس میں دینی مصالح ہوں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحویلِ قبلہ کی تمنا فرمائی وغیرہ۔

حافظ عینیؒ نے ''استنباطِ احکام کے'' تحت حدیث الباب سے ۱۶۔ احکام و عملی فوائد ذکر فرمائے ہیں جن میں سے ہم چند ہی ذکر کر سکے۔

''**فلم ندر مانقول فیھم**'' پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ مشہور تو یہ ہے کہ ان کو شبہ نمازوں کے قبول و عدم قبول میں تھا لیکن اس صورت میں تخصیص موتی کی کوئی خاص وجہ ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ نماز اگر ضائع ہوتی ہے تو اس میں مردے زندہ سب برابر ہیں اس لیے میرے نزدیک دوسرا بہتر احتمال یہ ہے کہ ان کو دفنِ موتی کے بارے میں شبہ تھا کیونکہ وہ اپنے وقت کے قبلہ کی طرف دفن کئے گئے تھے اور ظاہر ہے کہ دفن کے بعد بھی اسی پر باقی رہے حالانکہ اب قبلہ بدل گیا۔

علمی افادہ

حافظ عینیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔ امام طحاویؒ نے فرمایا کہ اس حدیث سے ثابت ہوا جو شخص فرائض خداوندی سے واقف نہ ہو اور اس کو دعوت نہ پہنچی اور نہ دوسروں سے وہ احکام معلوم کرنے کا موقع ملا ہو تو اس پر وہ فرائض لازم نہیں ہوئے اور نہ اس پر کوئی حجت قائم ہوئی قاضی نے اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ علماء اسلام اس بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں کہ جو شخص دارالحرب یا اطراف بلادِ اسلام

میں اسلام لایا جہاں ایسے علماء اسلام موجود نہ ہوں جن سے شرائع اسلام کا علم حاصل کر سکے اور نہ اس کو یہ بات کسی دوسرے طریقہ سے معلوم ہو سکی کہ حق تعالیٰ نے اس پر کیا فرائض عائد کئے ہیں پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کو ان کا علم ہوا تو اس پر اس ناواقفی کے زمانے کے فرائض، نماز، روزہ وغیرہ کی قضا ہوگی یا نہیں؟ امام مالک وشافعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ قضا لازم ہے کیونکہ اس کو قدرت تھی جاننے کی کوشش کرتا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے باہر جاتا امام اعظمؒ نے فرمایا کہ قضا اس وقت لازم ہے کہ جب کوئی صورت ممکن تھی اور اس نے کوتاہی کی ہو اور اگر اس کے پاس کوئی ایسا آدمی نہ آسکا جس سے معلوم کرتا تو اس پر قضا نہیں آپ نے فرمایا کہ اللہ کا فرض اس شخص پر کیسے عائد ہوسکتا ہے جس کو اس کی فرضیت نہیں پہنچی (عمدۃ القاری ص ۲۸۸)

آخر میں گزارش ہے کہ خبر واحد سے نسخ قاطع کی بحث بہت اہم ہے جس کی تفصیل آئندہ آئے گی اور اس کے بارے میں حضرت شاہ قدس سرہ کے بھی افاداتِ خصوصی پیش کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

باب حسن اسلام المرء

انسان کے اسلام کی خوبی

۴۰...... قال مالک اخبر نی زید بن اسلم ان عطاء بن یسار اخبره ان اباسعید الخدری اخبره انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول اذا اسلم العبد فحسن اسلامه یکفر الله عند کل سیئة کان ذلفها و کان بعد ذالک القصاص الحسنة بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف و السیئة بمثلها الا ان یتجاوز الله عنها.

۴۱ ...... حدثنا اسحاق بن منصور قال حدثنا عبدالرزاق قال اخبرنا معمر عن هشام عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا احسن احدکم اسلامه فکل حسنة یعلمها تکتب لهٗ بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف و کل سیئة یعملها تکتب له بمثلها.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ فرماتے تھے۔ جب کوئی شخص اسلام اختیار کرے اور اس کا اسلام اچھا بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی پچھلی کی ہوئی ہر برائی کو معاف فرما دیتے ہیں اور اس کے بعد بدلہ کا اصول جاری ہو جاتا ہے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے اور برائی کا بدلہ صرف اس کے برابر سرابر، مگر اللہ تعالیٰ چاہیں (تو اپنی رحمتِ خاصہ سے) اس کو بھی معاف فرما دیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اسلام کو اچھا کرلے تو جتنی نیکی کرے گا ہر ایک کا بدلہ دس گنے سے سات سو گنے تک حاصل کرے گا اور ہر برائی کا بدلہ صرف اس کو برابر ملے گا۔

تشریح:۔ اوپر کی دونوں احادیث میں اسلام اختیار کرنے اور اس کے بعد نیکیوں کی راہ چلنے کی نہایت بڑی فضیلت بتلائی گئی ہے ذرا سوچئے کہ اسلام کے بغیر کوئی بڑی سے بڑی عبادت بھی مقبول نہیں اور اسلام کے بعد ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی حتیٰ کہ راستے سے کسی تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دینا، کسی انسان کو اچھی خیر خواہی کی بات بتلا دینا یا کسی جانور کو معمولی درجہ کا آرام پہنچا دینا بھی ایسی نیکی بن جاتی ہے کہ اس کا اجر وثواب صرف اس کے برابر نہیں بلکہ سات سو گنا تک ملتا ہے بلکہ اس پر حد نہیں قرآن مجید میں ہے **و الله یضاعف لمن یشآء** (اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہیں اور بھی بڑھا دیتے ہیں) صحیح بخاری، باب الرقاق میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے۔ **کتب الله عشر حسنات الی سبعمائة ضعف الی اضعاف کثیرة** (اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو صرف دس گنا سے سات سو گنے بلکہ اضعافِ کثیرہ تک بڑھا دیتے ہیں)

اورحافظ عینیؒ نے کتاب العلم لابی بکر احمد بن عمر بن ابی عاصم النبیل سے بروایت ابی ہریرہؓ حدیث نقل کی۔ان اللہ تعالیٰ یعطی بالحسنۃ الفی الف حسنۃ" (اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیوں کا اجر عطا فرماتے ہیں

فضلِ صدقہ کے باب میں صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے آتی ہے کہ حلال کمائی سے اگر ایک کھجور بھی صدقہ کی جائے تو اس کو حق تعالیٰ اپنے داہنے ہاتھ میں قبول فرماتے ہیں اور وہ ان کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے حتی کہ پہاڑ سے بھی بڑی ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو پال کر بڑا کرتے ہیں جس طرح تم لوگ اپنے بچھیرے یا بچھڑے کو پال پوس کر بڑا کرتے ہو۔

ضعف کے معنی عربی میں مثل مع زیادت کے ہوتے ہیں اسی لیے اکثر اس سے مراد دو مثل اور تین مثل بھی ہوتی ہے کیونکہ اس کے اصلی معنی غیر محصور وغیر مخصوص زیادتی کے ہیں (قاموس وغیرہ) لہٰذا اضعاف کثیرہ اور فضلِ صدقہ والی نیز دوسری اسی قسم کی احادیث کا مفاد یکساں ہے۔

اجرِ عظیم کے اسباب ووجوہ

بظاہر اعمالِ جوارح پر اس قدر اجرِ عظیم کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی اس لیے کچھ اشارات کئے جاتے ہیں۔انسان کا سب سے بڑا کمال علم ومعرفت ہے جو عملِ قلب ہے پھر علم ومعرفت میں سب سے بڑا درجہ ایمان باللہ یا معرفتِ خداوندی کا ہے کافر کی عبادت اسی لیے قبول نہیں کہ وہ اللہ کی صحیح معرفت کے بغیر اور بے روح ہے پھر جب اللہ کی صحیح معرفت کے ساتھ دوسرے عقائد کا علم ویقین حاصل ہو گیا تو اسلام کی لازوال دولت مل گئی جس کے صدقے میں زندگی کے لمحات نہایت قیمتی اور قابل قدر ہو گئے تھوڑے عمل پر اجر زیادہ کا فلسفہ بھی اسی میں مضمر ہے۔وعد اللہ الذین امنوا وعملوا الصالحت لھم مغفرۃ واجر عظیم (مائدہ) فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعلمون. (الم السجدہ) گویا ایمان واسلام کے بعد آپ اللہ کی بارگاہِ الوہیت کے مقربین میں داخل ہو چکے اب اسلام کی زیادہ سے زیادہ خوبی واچھائی کے مطالبات پر توجہ دینی ہے اور کوئی لمحہ بھی غفلت یا لایعنی کاموں میں گزارنا آپ کے اسلام پر بدنما داغ ہے من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ.شاہانِ دنیا کے مقربین خاص بھی تھوڑے عمل پر زیادہ اجر اور خاص اعمال پر یا خاص اوقات میں غیر معمولی انعامات کے مستحق ہوا کرتے ہیں تو ملک الملوک کے خدام ومقربین کے اجر وانعامات پر تعجب کیوں ہو، ہاں! ایک بات باقی ہے کہ شاہانِ دنیا کے مقربین کو نافرمانیوں پر سزا بھی اوروں سے زیادہ ملتی ہے، پھر مسلمانوں کو معاصی پر سزا کیوں کم ہے کہ برائی ومعصیت کی سزا مضاعف نہ ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفتِ عدل وزیادتی کی روادار نہ ہوئی، دوسرے اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لیے ہوئے ہے جتنی رحمت وشفقت دنیا میں کسی کو دوسرے پر زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہے اس کی رحمت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے کفر وشرک کی وجہ سے چونکہ انسان معرفتِ خداوندی کی ابجد سے بھی نابلد اور جاہل ٹھہرا (اور اسی لیے حق تعالیٰ نے ان کو مثل چوپاؤں کے بلکہ ان سے بھی زیادہ بدتر اور بے شعور بتلایا، اس لیے رحمتِ خداوندی سے پوری طرح محروم اور اس کے قہر وغضب کا ہر طرح مستحق بن گیا۔

دوسری وجہ نیکیوں پر اجرِ عظیم کی یہ بھی ہے کہ مومن کا قلب، شرف ایمان کے سبب حق تعالیٰ کے خصوصی انوار وبرکات کا مرکز بن جاتا ہے اور اس کے قلبی ارادوں کی بھی بڑی قیمت لگ جاتی ہے نیۃ المومن خیر من عملہ.(نیتِ مومن کی قدر وقیمت اس کے عمل سے بھی زیادہ ہے) اس لیے کسی ایک عمل پر اگر مختلف قسم کی بہت سی اچھی نیتیں شامل ہو جائیں تو ان سب کی وجہ سے بھی اجر بڑھ جاتا ہے۔

صدقہ وامداد کا اجرِ عظیم

جیسے صدقہ یا کسی غریب ضرورت مند کی امداد کہ بظاہر ایک عمل ہے مگر اس کی امداد کے ضمن میں بہت سی نیک نیات شامل ہو سکتی ہیں مثلاً آپ کی مدد سے وہ سودی قرض یا سخت فاقہ وتنگی سے بچ جائے جو بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتی ہے آپ کی امداد کے سبب اس نے نہ صرف

اپنے آپ کو بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی سنبھال لیا جس کے نتائج اس کی نسلوں تک خوشگوار ہوتے چلے گئے اگر خود آپ کی نیت میں بھی امداد کے وقت وہ سب باتیں تھیں تب تو ان کی وجہ سے بھی ورنہ اللہ کے علم میں ضرور وہ سب باتیں ہیں، لہٰذا وہ آپ کی امداد وصدقہ کو ان ہی امور آئندہ کی وجہ سے بڑھاتے رہیں گے۔ جس کو اوپر کی حدیث میں بچھیرا پالنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

نماز کی غیر معمولی فضیلت

اسی طرح نماز بظاہر ایک عمل ہے مگر اس میں تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، رکوع، سجود، تسبیحات، تشہد، درود شریف وغیرہ مستقل طور سے بڑی بڑی عبادات ہیں، حدیث میں ہے کہ کچھ فرشتے صرف رکوع کی عبادت میں، کچھ صرف سجدہ میں، کچھ تسبیح میں مشغول ہیں اور آسمانوں میں ''اطیط'' ہے یعنی فرشتوں سے کوئی انچ بھر جگہ بھی خالی نہیں ہے وہ سب اللہ کی عبادت میں ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے مصروف ہیں اور ان کے بوجھ سے آسمانوں سے بوجھل کجاوہ کی طرح آواز نکلتی ہے۔

اب مثلاً نماز کے صرف ایک رکن قرأت کو لیجئے:۔ ابن عدی اور بیہقیؒ کی حدیث میں ہے کہ ''نماز میں کھڑے ہو کر قرآن مجید کا ایک حرف پڑھنے پر ایک سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں، ایک سو گناہ معاف ہوتے ہیں اور ایک سو درجہ بلند کئے جاتے ہیں، اگر ایک روز کی فرض ومسنون رکعات میں فاتحہ اور چھوٹی سورت اخلاص کے حروف کا ثواب شمار کیا جائے اور فرض جماعت کے ساتھ ادا ہوں جس سے ثواب ۲۷ گنا ہو جاتا ہے تو ایک دن کی باجماعت نمازوں میں صرف قرآن مجید کی نیکیاں (۶۶۹۵۷۰۰) ہو جاتی ہیں، دوسرے ارکان نماز کا اجر اس کے علاوہ رہا اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ جماعت کی نماز میں ۲۷ گنے ثواب کا مطلب یہ ہے کہ ہر عدد کو ۲۷ تک ڈبل کرتے جاؤ، اس طرح صرف ایک نماز باجماعت کا ثواب (۱۴۴۹۸۰۷۴۶۲۴) یعنی تقریباً ساڑھے چودہ ارب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اسلام کی اچھائی یا برائی کے اثرات

مذکورہ بالا تفصیل سے ایمان واسلام کی قدر وقیمت کا کچھ اندازہ آپ نے فرما لیا اب آگے بڑھیئے، بعض صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ اگر کسی کا اسلام اچھا ہو تو اس نے جو نیکیاں اور بھلے کام زمانہ کفر وشرک میں کئے تھے اور کفر وشرک کے سبب وہ ثواب سے خالی تھے وہ بھی اب معتبر وصحیح بن جائیں گے اور حقیقت اتنا حصہ حدیث کا خود حدیث الباب کا بھی حصہ ہے جو اگرچہ یہاں امام بخاری نے ذکر نہیں کیا مگر دار قطنی نے غریب حدیثِ مالک میں ۹ طریقوں سے روایت کیا ہے اور امام نووی نے شرحِ مسلم میں اس کو ذکر کیا اس کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حکیم بن حزامؓ سے مسلم شریف میں مروی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اسلام سے پہلے جو طاعات میں نے کی تھیں ان سے کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا اسلمت علیٰ مااسلفت من خیر'' (تم اپنے سابق اعمالِ خیر کے ساتھ ہی تو مسلمان ہوئے ہو) یعنی اسلام کی برکت سے تمہارے وہ پہلے اعمالِ خیر بھی قائم رہے اور اس وقت کی طاعات بھی اب نیکیاں بن گئیں۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے

حدیث مذکور کا یہی ترجمہ ومطلب مذکورہ بالا ہمارے شاہ صاحبؒ نے پسند فرمایا اور دوسرا ترجمہ کہ تمہیں سابق اعمالِ خیر ہی پر توفیقِ اسلام ہوئی ہے پھر اس کی جو تاویلات امام نووی نے ذکر کی ہیں حضرت کو پسند نہیں تھیں۔

طاعات وعبادات کا فرق

بلکہ یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس بات پر یقین حاصل ہو گیا ہے کہ کفار کی طاعات وقربات ضرور نفع پہنچاتی ہیں کیونکہ ان میں نیت اور معرفتِ خداوندی

ضروری نہیں البتہ عباداتِ کفار کسی قسم کی بھی معتبر نہیں کیونکہ ان میں نیت اور معرفتِ خداوندی ضروری ہے جن کی صحت اسلام وایمان پر موقوف ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ طاعات وقربات سے مراد حلم، صلۂ رحم، غلام آزاد کرنا، صدقہ وخیرات کرنا، عدل وانصاف، رحم وکرم، عفو وغیرہ اوصاف ہیں اور ان کا نفع کفار کو دنیا ہی میں پہنچتا ہے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ایلاء میں حضرتِ عمرؓ سے فرمایا تھا **افی شک انت یا ابن الخطاب؟ اولئک قوم عجلت لھم طیباتھم**، یہ طیبات ان کے اعمالِ خیر کا بدلہ بھی ہوسکتی ہیں کہ دنیا ہی میں ان کا معاملہ چکا دیا گیا ہے اور آخرت کی نعمتوں سے محروم ہوگئے۔ **ومالھم فی الاخرۃ من خلاق** صاحبِ روح المعانی نے لکھا ہے کہ **اولئک لھم نصیب مما کسبوا** میں اشارہ کفار ومومنین دونوں کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور جب کفار کے لیے آخرت میں طیبات سے کچھ حصہ نہیں تو دنیا میں ان کی دعا یا عمل کا فائدہ ملنا متعین ہوگیا گو اس کی حیثیت آخرت کی ابدی نعمتوں اور راحتوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ ہو۔ رہا آخرت کا فائدہ تو اس کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ کفار کے اعمالِ خیر بغیر اسلام کے نجاتِ آخرت کا سبب تو بن ہی نہیں سکتے نہ وہاں کے ثواب ونعمت کا مستحق بنائیں گے البتہ جس کے لیے حق تعالیٰ چاہیں گے اس کے لیے وہ کسی قدر تخفیفِ عذاب کا سبب بن سکیں گے اس لیے علماء نے بالاتفاق فیصلہ کیا ہے کہ

عذاب ہائے کفار کا باہم فرق

عادل کافر کے عذاب میں بہ نسبت ظالم کافر کے تخفیف ہوگی اور شریعت سے کفار کے لیے درکاتِ عذاب میں بھی تفاوت کا ثبوت ملتا ہے جو کسی درجہ میں نفع طاعات ہی کی ایک صورت ہے چنانچہ ابوطالب نے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں جاں نثارانہ خدمات انجام دی تھیں آپ نے فرمایا کہ اگر ان کے وہ اعمال نہ ہوتے تو ان کو وسط جہنم رکھا جاتا اب اس کے کنارے پر رکھا گیا اور ان کے صرف پیر کے جوتے کے تسمے آگ کے ہیں جن سے ان کا دماغ کھولتا رہتا ہے (**اعاذ اللہ من سخطہ**)

اسلام کی اچھائی وبرائی کا مطلب

اس کے بعد تشریح حدیث کے سلسلہ میں نہایت اہم بات یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام کی اچھائی کا مطلب کیا ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام فضائل کو موقوف فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں ایک حدیث اور بھی سامنے رکھئے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یارسول اللہ! کیا ہم سے اعمالِ جاہلیت کا بھی مؤاخذہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا۔ جو اسلام لانے کے بعد اس میں اچھائی اختیار کرے گا اس سے ان اعمال کا مؤاخذہ نہ ہوگا اور جو برائی اختیار کرے گا تو اس سے اوّل وآخر کا مؤاخذہ ہوگا۔

امام نوویؒ کی رائے

اس کی شرح میں امام نووی نے فرمایا کہ احسان فی الاسلام سے مراد یہ ہے کہ ظاہر وباطن دونوں کے لحاظ سے اسلام میں داخل ہو جائے اور اساءۃ اسلام سے مراد یہ ہے کہ ظاہر میں تو احکامِ اسلام کی اطاعت کرے شہادتین بھی زبان سے ادا کرے لیکن دل سے اسلام کا معتقد نہ ہوا ایسا شخص بالاجماع منافق اور اپنے کفر پر باقی ہے اس لیے اس سے اسلام ظاہر کرنے سے قبل وبعد کے سب اعمال کا مؤاخذہ ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے نزدیک احسانِ اسلام یہ ہے کہ دل سے اسلام لائے اور زمانہ کفر کے تمام برے اعمال سے توبہ بھی کرے اور اسلام کے بعد ان سے بچنے کا عزم مصمم کرے، ایسے شخص کے تمام گناہ بخشے جائیں گے اور اساءۃِ اسلام یہ ہے کہ اسلام لائے مگر زمانہ کفر

کے معاصی سے توبہ نہ کرے اوران کاارتکاب برابر کرتا رہے ایسا شخص اگر چہ اسلام میں داخل ہوگیا مگراس سے تمام اگلے پچھلے معاصی کا مؤاخذ ہوگا لہٰذا جس حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ اسلام پہلے گناہوں کوختم کردیتا ہے اس سے مرادوہی صورت ہے کہ اس کے اسلام میں توبہ بھی شامل ہوئی ہو۔

علامہ قسطلانی کی رائے

علامہ قسطلانی نے لکھا کہ حسن اسلام سے مراد یہ ہے کہ ہر قسم کے شکوک وشبہات دل سے نکال کر اسلام پر قائم ہو یا مراد اس سے اخلاص میں مبالغہ ہے کہ اچھی طرح دل کی گہرائی سے اور پورے اخلاص سے دین اسلام کواختیار کرے۔

ضروری تبصرہ

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ احادیثِ مذکورہ سے ہمیں بڑی روشنی ملتی ہے اور ہر مسلمان مرد وعورت کو اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہمارا اسلام اچھا ہے یابرا؟

قدیم الاسلام مسلمانوں کے لیے لمحہ فکر

اگر ہم اسمی، رسمی یا نسلی مسلمان ہیں تو کیا ہمارے لیے ضروری نہیں کہ اسلام کے تمام مقتضیات کو پورا کریں اس کے تمام احکام کے سامنے ہمہ وقت بلاچون وچرا سرِتسلیم خم کریں "یایھاالذین امنوا ادخلوا فی السلم کآ فۃ" کچھ احکام پر عمل کیا، کچھ پر نہ کیا، کچھ احکام وعقائد کوشکوک وشبہات کی نذر کیا، کچھ میں تاویلِ باطل نکالی، کچھ کوخواہشِ نفسانی کے تحت نظرانداز کردیا کیا ان چیزوں کوحسن اسلام کے تحت لایا جائے یاان پر اساءۃِ اسلام کالیبل لگانا پڑے گا۔

افسوس کہ آج یورپ وامریکہ کے خوش قسمت لوگ نئے مسلمان ہوکر احکامِ اسلام کی خوبیوں کے قائل اوران پر عامل ہوتے جارہے ہیں اور ہم میں سے بہت پرانے مسلمان ان سے آزاد ہوتے جارہے ہیں "وان تتولوا یستبدل قوم غیر کم ثم لا یکونو ا امثالکم"۔ (اگرتم احکامِ اسلام سے روگردانی کروگے توحق تعالیٰ تمہاری جگہ دوسروں کونعمتِ اسلام سے سرفراز کردے گا اوروہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔)

نماز اور پردہ کی اہمیت

ہم سب قدیم الاسلام مسلمانوں خصوصاً مسلمان عورتوں کے لیے عبرت حاصل کرنے کو یہ تازہ واقعہ کافی ہے کہ حال ہی میں ایک نو مسلمہ جرمن خاتون فاطمہ ہیرن نے (جو اپنے نومسلم شوہر کے ساتھ ترکِ وطن کرکے مستقل طور پر ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) کو اپنا وطن ثانی بنا چکی ہیں) ایک مکتوب اپوا کی صدر بیگم رعنالیاقت علی خان مرحوم کے نام انگریزی اخبار میں شائع کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

"میں نے پاکستان کو اسلامی ملک سمجھ کر نئے وطن کے طور پر اپنایا ہے اور میری بڑی خواہش ہے کہ پاکستانی مسلم خواتین کی سماجی بیداری کے لیے کچھ خدمت کرسکوں، اس لیے میں اپوا کی سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کرتی رہی ہوں آپ نے ڈھاکہ کی اپوا کانفرنس میں خواتین کو تلقین کی تھی کہ "مغربی ثقافت کی اندھادھند پیروی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ خاندانی زندگی اور ثقافت کے دائرے میں دینی آداب اور مشرقی اقدار کاماند پڑجانا انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔" مگر افسوس کہ اپوا کی اس کانفرنس میں نہ پردے کا کوئی انتظام تھا نہ نماز کا کوئی اہتمام تھا اپوا کی لیڈر خواتینِ اسلام، مشرقی روایات اور اخلاقی اقدار کا زبانی ذکر کرتی رہیں مگر نہ ان میں سے کوئی پردہ میں تھا۔ نہ کسی نے اذان سن کر نماز کی ادائیگی پر توجہ دی، حالانکہ اسلام میں نماز اور پردے کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

"میں ہوئی کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگئی" کی مثال اس سے زیادہ واضح کہاں ملے گی یورپ کے آزاد اور فیشن زدہ معاشرے میں پلی

ہوئی خاتون اسلام لانے کے بعد اس کی ہر پابندی کو بطیبِ خاطر گوارہ کرتی ہے پردہ کرتی ہے نماز کی شرعی اہمیت محسوس کرتی ہے اس کے مقابلہ میں ہماری قدیم الاسلام مسلم خواتین ہی کیا مرد بھی دینی احکام وشعائر کی تعظیم وتوقیر بجالانے والے کتنے رہ گئے ہیں۔

ہمارا اسلام اور شیر کی تصویر!

ہمیں سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہے کہ کہیں ہمارا اسلام اس شخص کی طرح تو نہیں ہوگیا ہے جس نے ایک گودنے والے سے اپنے بازو پر شیر کی تصویر بنوانی چاہی تھی اور جب اس نے بازو پر سوئی چبھوئی تو تکلیف محسوس کر کے اس کو روک دیا اور پوچھا کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ شیر کے پیر بنا رہا ہوں اس شخص نے کہا کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ شیر لنگڑا بھی ہوتا ہے پیر مت بناؤ گودنے والے پھر سوئی چلائی تو پوچھا اب کیا بناتے ہو؟ کہا ہاتھ بناتا ہوں اس نے کہا رہنے دو، بغیر ہاتھ کے بھی تو شیر ہوسکتا ہے پھر کان بنانے چاہے تو روک دیا کہ شیر کان کٹا بھی تو ہوسکتا ہے ناک بنانے لگا تو روک دیا کہ شیر نکٹا بھی ہوسکتا ہے آنکھ بنانی چاہی تو کہا رہنے دو شیر کانا بھی ہوسکتا ہے غرض اسی طرح اکثر اعضائے بنانے سے روک دیا اور صرف چند معمولی نشانات اور ہلکے نقوش پر اکتفا کی ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے شیر کو دیکھا ہے وہ اس ناقص تصویر کو شیر نہیں کہہ سکتے اسی طرح جو لوگ ناقص ونا تمام اسلام کے قائل وعامل ہیں ان کے بارے میں سوچنا پڑے گا اور ان کو خود بھی اپنی غلطی کا احساس کر کے اپنے نقائص کو دور کرنا چاہیے۔ **واللہ الموفق۔**

بحث ونظر: حدیث الباب میں **اذا اسلم العبد** آیا ہے اس لیے لفظِ اذا پر بھی بحث ہوئی ہے کہ اس کا مفاد کیا ہے حافظ عینی جو حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، تاریخ ورجال کے ساتھ علوم عربیت میں بھی امامت کا درجہ رکھتے ہیں اس لیے وہ ہر حدیث کی تحقیق فرماتے ہوئے، بیان اعراب، بیانِ معانی وغیرہ مستقل عنوانات بھی قائم کرتے ہیں ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے ان کی ابحاث کو ترک کیا ہے مگر یہاں بطورِ نمونہ اذا کی بحث نقل کرتے ہیں جو علمی فائدہ ودلچسپی سے خالی نہیں۔

حافظ اور عینی کا مقابلہ

حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری ص ۱/۴۷ میں لکھا کہ "**یکفر بضم الراء** ہے اس لیے کہ اذا اگرچہ حروف شرط میں سے ہے لیکن وہ جزم نہیں دیتا۔

حافظ عینیؒ نے عمدہ ص ۱/۲۹۲ میں اس طرح لکھا:۔ **یکفر اللہ** جزاء شرط ہے یعنی قول اذا الخ کی اور اس میں جب کہ فعلِ شرط ماضی اور جواب مضارع ہو تو رفع اور جزم دونوں جائز ہیں، جیسے قولِ شاعر میں۔

اذا اتاہ خلیل یوم مسغبۃ   یقول لا غائب مالی ولا حرم

(میرا ممدوح اتنا کریم ہے کہ جب بھوک وقحط کے دنوں میں اس کے پاس کوئی دوست پہنچ جاتا ہے تو وہ اس سے کہہ دیتا ہے کہ تمہارے لیے مال اور گھر بار سب حاضر ہے)

یہاں یکفر میں اگر جزم ہوتا تو قاعدۂ عربیت سے **یکفر اللہ** راء کا زیر ہوتا مگر یہاں روایت میں **یکفر ء بضم الراء** ہی منقول ہے بعض لوگوں نے لکھا کہ "**یکفر اللہ بضم الراء** اس لیے ہے کہ اذا اادواتِ شرط میں ضرور ہے مگر وہ جزم نہیں دیتا میں کہتا ہوں کہ ایسی بات تو وہ کہہ سکتا ہے جس نے عربیت کی بو بھی نہ سونگھی ہو کیونکہ عربی شاعر کہتا ہے۔

استغن ماأغناک ربک بالغنی   واذا تصبک خصاصۃ فتحمل

(جب تک تجھ کو اللہ اچھے حال میں رکھے استغنا کے ساتھ گزار اور جب تنگی کا وقت آئے تو صبر وتحمل کر)

آپ نے دیکھا کہ اذا نے تصبک کو جزم دیدیا، مشہور نحوی فراء نے کہا کہ "اذا شرط کے لیے استعمال ہوتا ہے پھر یہی شعر استشہاد میں پیش کیا اور کہا کہ اذا شرط کے لیے ہے اسی لیے یہاں اس نے جزم دیا ہے۔"

18

علامہ قسطلانی کی رائے

علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا کہ یہاں یکفر میں روایت بالرفع ہے اور جزم بھی جائز ہے کیونکہ فعلِ شرط ماضی اور جواب مضارع ہے پھر حافظ کی عبارت مذکور نقل کر کے علامہ عینی کا نقد مذکور بھی نقل کیا ہے اور ابن ہشام ورضی کے اقوال نقل کئے جن سے ضرورتِ شعری وغیرہ کے وقت اذا کا جزم دینا ثابت ہوا۔

نواب صاحب کی تنقید

اس کے بعد محترم جناب نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم نے موقع پا کر عون الباری میں حافظ عینی کو آڑے ہاتھوں لیا اور لکھا کہ ''عینی کا نقد بے محل ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے (یعنی بجائے حافظ کے عینی عربیت سے بے بہرہ ہیں) کیونکہ علم نحو کی چھوٹی کتابوں میں بھی جن کو بچے پڑھتے ہیں یہ لکھا ہوا ہے کہ اذا بغیر ضرورتِ شعر کے جزم نہیں دیتا اور حدیث میں ضرورت نہیں تھی پھر عینی نے جو شعر پیش کیا ہے وہ بھی بے محل ہے کیونکہ حافظ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اذا کسی حالت میں بھی جزم نہیں دیتا حتی کہ شعر میں بھی نہیں دیتا اگر ایسا کہتے تو اعتراض درست بھی ہوتا لیکن خود بڑا بننے اور حافظ کی بات گرانے کے جذبے نے عینی کو اس بے سود اور غلط بحث میں الجھا دیا۔ اللھم غفراً۔

تنقیح وتبصرہ

ہم نے پہلے حافظ ابن حجرؒ کی پوری عبارت کا ترجمہ اور پھر حافظ عینی وقسطلانی کی عبارت کو نقل کر دیا ہے سب کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ حافظ عینی خود بھی یہاں روایت میں یکفر بلا جزم کے مان رہے ہیں اور علامہ قسطلانی وعینی دونوں جوازِ جزم پر متفق ہیں۔ ابن ہشام اور رضی بھی ضرورت کے وقت جزم کے قائل ہیں فراء حرف شرط ہونے کی وجہ سے اذا کا حق جزم مانتے ہیں اور اس کے حرف شرط ہونے سے تو حافظ کو بھی انکار نہیں اب جو بات قابل نقد تھی اور جس بات پر عینی نے نقد کیا وہ یہ ہے کہ حافظ نے مطلقاً ایک عام بات لکھ دی کہ اذا حرف شرط ہونے کے باوجود جزم نہیں دیتا اور حافظ نے اس کے ساتھ کوئی استثناء ضرورت شعر وغیرہ کا بھی نہیں کیا جس کو سب نحوی تسلیم کر رہے ہیں حافظ عینی صرف اس اطلاقی اور عام قاعدہ کلیہ کی صورت ہی پر نقد کر رہے ہیں کہ ایک عالمِ عربیت کے لیے شایان نہیں کہ وہ اس طرح بغیر استثناء بات کہہ دے۔

حافظ کی فروگزاشت

حافظ سے یقیناً یہاں فروگزاشت ہوئی ہے اور علما کے لیے یہ کسی طرح موزوں نہیں کہ وہ حق کی صراحت نہ کریں یا بات کو چبالیں ایک دوسرے پر صحیح طور سے نقد ضرور ہونا چاہیے رہا یہ کہ عینیؒ کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا تو وہ اوّل تو عربیت کے ایک قاعدہ کی حفاظت کے جذبہ کے تحت ایسا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ عربیت کی حفاظت، شخصیات کی رعایت سے بہت بلند ہے دوسرے یہ کہ حافظ عینی، حافظ ابنِ حجر سے کئی سال عمر میں بڑے ہیں بلکہ استاد بھی ہیں جیسا کہ ہم نے ان کے حالات میں حوالوں کے ساتھ لکھا ہے پھر علم وفضل میں بھی حافظ عینیؒ کا پایہ بہت بلند ہے اس کو بھی ہم ثابت کر چکے ہیں اور ہر شخص عمدۃ القاری وفتح الباری کا مقابلہ کر کے دونوں کے مراتب کا اندازہ کر سکتا ہے جہاں حافظ ابن حجرؒ ایک صفحہ میں لکھتے ہیں حافظ عینی وہاں ۸۔۱۰ صفحات میں تحقیقات کے دریا بہا دیتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ حافظ ابنِ حجر فنِ حدیث میں پہاڑ جیسے ہیں مگر فقہ میں درک نہیں رکھتے، قیامِ میلا دکو قوموا السید کم کی وجہ سے مستحب کہہ گئے وغیرہ دوسری طرف حافظ عینی فقہ واصولِ فقہ کے بہت بڑے امام ہیں وغیرہ۔

بڑا بننے کا طعنہ

نواب صاحب کا یہ کہنا کہ حافظ عینی کو حافظ ابن حجر کے مقابلہ میں بڑا بننے کا شوق ہے بالکل بے محل بات ہے جو شخص عمر میں بڑا ہو استاد بھی ہو علم وفضل میں ہر طرح فائق ہو اس کو اپنے شاگرد اور مفضول کے مقابلہ میں بڑا بننے کا کیا شوق ہو سکتا ہے؟!

نواب صاحب کی دوسری غلطی

پھر نواب صاحب کے یہ الفاظ کہ ''اوقعه فی ماوقعه'' بھی بے محل اور خلاف واقعہ ہیں کیونکہ حافظ عینی کی بات جچی تلی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور انہوں نے صرف بیانِ جواز کے لیے وہ بھی نثر نہیں شعر پیش کیا اور یہی بات سب نحویوں کو بھی تسلیم ہے غرض حافظ کی فرو گذاشت ضرور نشاندہی کی مستحق تھی اور اس موقع پر حافظ عینی کو مطعون کرنا خلافِ حق وانصاف ہے واللہ اعلم۔

اساءۃِ اسلام والی حدیث پر بحث

یہاں امام بخاریؒ نے صرف احسانِ اسلام والی حدیث ذکر کی ہے دوسری حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے اور اس کو امام مسلم نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے اس کو امام بخاری نے آخر کتاب میں باب استتابۃ المعاندین والمرتدین ص ۱۰۲۲ میں ذکر کیا ہے۔ **من احسن فی الاسلام لم یئواخذ بما عمل فی الجاھلیة ومن اساء فی الاسلام اخذ بالاول والاخر** (جس نے ایمان لانے کے بعد اچھے کام کئے اس سے اعمالِ جاہلیت کی کوئی باز پرس نہ ہوگی اور جس نے برے کام کئے اس سے اوّل وآخر کا مؤاخذہ ہوگا) مسلم میں **اخذ یعلمه فی الجاھلیة والاسلام** ہے یعنی برائی اختیار کرنے پر اس سے جاہلیت واسلام دونوں زمانوں کے برے اعمال کا مؤاخذہ ہوگا۔

امام بخاریؒ کی رائے

امام بخاری نے چونکہ امام مسلم کی طرح اس حدیث کو کتاب الایمان میں ذکر نہیں کیا بلکہ مرتدین کے باب میں حدیث اکبر الکبائر الشرک (سب بڑے گناہوں سے بھی زیادہ بڑا شرک ہے) کے بعد اس کو لائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اساءتِ اسلام سے مراد کفر کو سمجھے ہیں جو سب سے بڑا درجہ برائی کا ہے اور علامہ قرطبی وابوعبدالمالک بونی سے بھی یہی منقول ہے کہ یہاں نفاق والا اسلام سے مراد ہے اسی طرح دوسرے علماء کی بھی رائے ہے جنہوں نے احسانِ اسلام سے مراد قبولِ اسلام کے وقت اخلاص پھر آخر وقت (موت) تک اس پر دوام وقیام لیا ہے اور اس کی ضد کو اساءۃِ قرار دیا ہے۔

علامہ خطابی کا ارشاد

علامہ خطابی نے فرمایا کہ بظاہر اساءۃِ اسلام والی حدیث ''**الاسلام یھدم ماقبله** (اسلام پچھلے سب گناہوں کو ختم کر دیتا ہے) اور آیت قرآنی ''**قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ماقد سلف**'' کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور اجماع امت بھی اسی پر ہو چکا ہے کہ اسلام سے سارے پچھلے گناہ بخشے جاتے ہیں۔

لہٰذا یہاں مؤاخذہ سے مراد یہ ہے کہ اسلام سے قبل کے گناہوں پر تو اس کو زبانی تنبیہ وسرزنش ہوگی۔ (ان کو جتلا کر کہا جائے گا تم ایسے ایسے اعمال بد کا ارتکاب کفر کے زمانے میں کیا کرتے تھے اور اسلام کے بعد بھی ان کو نہ چھوڑا) پھر بعد کے اعمال پر عذاب بھی ہوگا، اس تفصیل کے بعد اصل بحث کی طرف آیئے! حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں امام احمدؒ کا ایک قول پیش کر کے مذکورہ بالا اجماع کے دعویٰ کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس میں چونکہ امام اعظم رحمہ اللہ پر بھی ضمناً تعریض ہوئی ہے اس لیے یہاں کچھ مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

حافظ ابن حجر کی تنقیح

حافظؒ نے لکھا کہ میں نے عبدالعزیز بن جعفر کی (جو اکابر حنابلہ میں سے ہیں کتاب السنۃ میں ایسا قول دیکھا جس سے خطابی وابن بطال کے دعویٰ اجماع کی نفی ہوتی ہے میمونی کے واسطے سے امام احمد کا یہ قول نقل ہوا کہ ''مجھے یہ بات پہنچی کہ ابو حنیفہؒ فرماتے تھے کہ اسلام لانے

کے بعد اعمال جاہلیہ کا مؤاخذہ نہ ہوگا، حالانکہ یہ بات حدیث عبداللہ بن مسعود کے خلاف ہے'' (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد اگر زمانہ کفر کے گناہوں پر اصرار کرے گا تو پہلے گناہوں کا بھی اس سے مؤاخذہ ہوگا) اور شافعیہ میں سے حلیمی کی بھی یہی رائے ہے۔

اختلاف کی اصل بنیاد

پھر حافظ نے کہا کہ درحقیقت اس اختلاف کی بنیاد اس مسئلہ پر ہے کہ توبہ کا مطلب گناہ پر ندامت ہے نیز گناہ کو چھوڑ دینا اور آئندہ کے لیے عزم ترک کہ کبھی اس گناہ کی طرف نہ لوٹے گا اگر کافر نے کفر سے توبہ کی اور گناہوں سے باز آنے کا عزم نہ کیا تو ان گناہوں سے تو تائب نہ ہوا لہٰذا ان گناہوں سے توبہ کرنے کا مطالبہ اس سے باقی رہا (اور اس کو پورا نہ کرنے کے باعث ان پر مؤاخذہ بھی ہونا چاہیے)

جمہور کی طرف سے جواب

جمہور علماء کی طرف سے اسکا جواب یہ دیا گیا کہ توبہ کا مفہوم مذکور صرف مسلم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ کافر کا حکم یہ ہے کہ وہ اسلام لانے کیساتھ ہی سارے گناہوں سے ایسا پاک صاف ہوگیا جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو اور احادیث بھی اسی بات کو واضح کرتی ہیں مثلاً حدیث اسامہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ **لا الہ الا اللہ** کہنے والے کو قتل کردینے پر ان کو سخت تنبیہ فرمائی جس سے ان کو سخت ندامت ہوئی اور یہاں تک کہا کہ مجھے اس دن یہ تمنا ہوئی کہ آج ہی اسلام لایا ہوتا تا کہ جہاں اور پہلے گناہ اسلام کی برکت سے دھل گئے تھے یہ گناہ بھی بخشا جاتا۔ (فتح الملہم ص۱/۱۷۱)

حافظؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اگرچہ اجماع والی بات ان کے نزدیک محل نظر ہے مگر خود ان کا رجحان مسلک جمہور ہی کی طرف ہے۔

قابل توجہ

ایک بات یہاں قابلِ توجہ یہ بھی ہے کہ جو رائے جمہور کی ہے اس کو صرف امام ابوحنیفہ پر رکھ کر اس پر نکیر کرنا انصاف سے بعید ہے؟ اور یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ بیشتر اہم مسائل میں ایسا ہی ہوا ہے کہ صرف امام صاحب کی رائے نہیں ہوتی اور اکابر بلکہ اکثر متقدمین ومتاخرین علماء محققین کی بھی وہی رائے ہوتی ہے مگر امام صاحب کو ہدف بنالیا جاتا ہے یا احناف سے بدظن کرنے کے لیے یہ چلتا ہوا آسان نسخہ اختیار کرلیا جاتا ہے ابھی آپ نے دیکھا کہ خود حافظ ابن حجر ہی کے حوالے سے امام احمدؒ ایسے جلیل القدر مقتدا کا اعتراض بھی صرف امام صاحب پر ہوا حالانکہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور اس دور کے بھی سینکڑوں ہزاروں علماء وائمہ کی رائے وہی تھی جو امام صاحب کی تھی اور حافظ ابن حجر اجماع کے خلاف صرف امام احمد اور حلیمی کو لائے ہیں۔؟

امام احمدؒ کے جوابات

امام احمدؒ کے اعتراض کا جواب ایک تو وہی ہے جو حافظ نے جمہور کی طرف سے ذکر کیا، دوسرے یہ کہ اساءۃِ اسلام سے مراد کفر ہے، جس کی طرف امام بخاری نے اشارہ کیا، تیسرا جواب علامہ خطابی کا بھی ذکر ہو چکا اور اس سے قبل ہم تشریح حدیث کے ذیل میں حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ اس کا اسلام توبہ عن المعاصی پر مشتمل نہ ہو، دل میں چور ہو کہ اسلامی عقائد اور بعض اعمالِ ظاہری کو اختیار کرلیا اور دوسرے کبائر معاصی سے بچنے کا عزم نہیں کیا، نہ اسلام کے بعد ان سے اجتناب کیا تو اس قسم کے جتنے معاصی پہلے کئے ہوں گے یا اب کئے ان سب پر یکساں عذاب مستوجب ہوگیا، کیونکہ یہ بات متحقق ہوگئی کہ ان خاص معاصی کو نہ اس نے اسلام لانے کے وقت برا سمجھا (ورنہ کفر وشرک اور دوسرے کبائر کی طرح ان سے بھی تائب ہوتا) اور نہ بعد کو برا سمجھا اسی لیے ان پر اصرار کرتا رہا۔

غرض اس خاص صورت میں تو حضرت شاہ صاحب کی رائے بھی تقریباً وہی ہے جو امام احمدؒ کی ہے، لیکن اگر اسلام کے وقت توبۂ کفر و کبائر معاصی کے ساتھ ان گناہوں سے بھی توبہ صدقِ دل سے کرچکا تھا تو اس کے زمانہ کفر کے سارے گناہ دھل چکے اور اس کے بعد ان گناہوں کا ارتکاب یا

قتضائے بشریت ہوگا، تو صرف ان ہی پر عذاب ہوگا۔ سابق گناہوں پر نہ ہوگا جس طرح دوسرے مسلمانوں کے لیے معاصی اور عقوبت کا قاعدہ ہے۔

امام اعظم کا عمل بالحدیث

اس طرح امام صاحب اور جمہور کے نزدیک تمام احادیث پوری طرح معمول بہا بے تکلف بن جاتی ہیں۔ نہ ان میں باہم کوئی تعارض باقی رہتا ہے اور نہ کسی کا ترک لازم آتا ہے۔

مسلم شریف کی حدیث:۔ آخر میں ہم ایک حدیث مسلم شریف کا ترجمہ کرتے ہیں، جس سے مسئلہ کی مزید توضیح وتقویت ہوجائے گی۔ نیز حدیث کا مضمون بھی کئی لحاظ سے بہت نافع اور نصیحت آموز ہے، یہ حدیث امام مسلم نے باب **کون الاسلام یهدم ما قبله و کذاالحج و الهجرة** کے تحت ذکر کی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ امام مسلم کی بھی وہی رائے ہے جو اور سب جمہور علماء اور بقول امام احمدؒ امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ کی رائے ہے۔

حضرتِ عمرو کا سفرِ آخرت

ابن شمامہ مہری سے روایت ہے کہ ہم حضرت عمرو[1] بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر تھے ان کی وفات کا وقت قریب تھا اور دیر سے دیوار کی طرف رخ کئے ہوئے زار وزار رو رہے تھے ان کے صاحبزادے نے عرض کیا:۔ ابا جان! آپ کو یاد نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایسی ایسی بڑی بشارتیں دی ہیں؟! یہ سن کر حضرت عمرو دیوار کی طرف سے رخ ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہوگئے اور فرمایا دیکھو سب سے اعلیٰ وافضل آخرت کے لیے ذخیرہ توحید ورسالت کا اقرار وایمان ہے میری زندگی کے تین دور گزرے ہیں ایک دور وہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے بغض رکھنے والا مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص نہ تھا اور اس وقت میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح آپ پر میرا قابو چل جائے تو میں آپ کو مار ڈالوں، اگر (خدانخواستہ) اس حالت میں مرجاتا تو یقیناً دوزخی ہوتا۔

اس کے بعد جب حق تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرما کر میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں آپ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایئے! میں دستِ نبوت پر بیعت کرنا چاہتا ہوں آپ نے ہاتھ بڑھا دیا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا آپ نے ارشاد فرمایا:۔ عمرو! یہ کیا بات؟ میں نے عرض کیا! حضرت میں کچھ شرائط لگانا چاہتا ہوں! فرمایا:۔ کیا شرط ہے؟ میں نے کہا یہ کہ

---

[1] مشہور صحابی ہیں ۸ھ میں اسلام لائے، تقریباً ایک سو سال کی عمر پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جیش ذات السلاسل کا سردار بنا کر جھنڈا دیا اور حضرت ابوبکر وعمر جیسے صحابہ کو آپ کی کمان میں دے کر روانہ کیا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ عمرو بن العاص صالحین قریش میں سے ہیں، حضرت قبیصہ بن جابر نے فرمایا کہ میں حضرت عمرو بن العاص کی صحبت میں رہا، ان سے بہتر رائے والا، ان سے زیادہ جودوکرم والا ہم نشین اور ان سے زیادہ ظاہر وباطن کو یکساں رکھنے والا میں نے نہیں دیکھا۔

مجاہد نے شعبی سے نقل کیا کہ عرب کے نہایت ذہین عقلمند چار تھے، حضرت معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ اور زیاد پھر حضرت معاویہ حلم وبردباری میں ضرب المثل ہوئے، حضرت عمرو بن العاص سخت سے سخت مشکل اور دشوار معاملات کی گتھی سلجھانے میں طاق تھے، حضرت مغیرہ سرداری کے لیے نہایت موزوں تھے اور زیاد ہر چھوٹے بڑے کی ضرورت پوری کرنے میں ممتاز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص کو عمان کا گورنر بنا دیا تھا، فتوحات شام میں لشکروں کی سرداری کی، حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں مصر فتح کیا اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں چار سال، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں چار سال اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں سوا دو سال مصر کے گورنر رہے، بہت زیادہ مال ودولت چھوڑی، وفات کے وقت مال کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ کاش تو بجائے مال ودولت کے اونٹ کی مینگنیاں ہوتا اور میں غزوۂ ذات السلاسل ہی میں مرگیا ہوتا (اس کے بعد) میں ایسے کام میں پڑا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کی بارگاہ میں ان معاملات کا کیا جواب دوں گا، میں نے معاویہ کی دنیا سنواری اور اپنی آخرت بگاڑی۔ پھر کہا بیٹا! ایک کپڑے سے میرے ہاتھوں کی میری گردن سے باندھ دو! جس طرح ایک مجرم کو باندھا جاتا ہے۔ تعمیل کی گئی تو آسمان کی طرف سر اٹھا کر فرمایا۔ بارالہا! آپ کے اوامر ونواہی کی تعمیل مجھ سے نہ ہوسکی، میری کوئی عزت وشوکت نہیں کہ کسی سے مدد لوں، میں جرموں سے بری بھی نہیں کہ میرا عذر قابلِ قبول ہو، البتہ یہ یقین واقرار ضرور ہے کہ آپ کے سوا کوئی میرا معبود ومقصود نہیں اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بندے اور رسول ہیں، اتنا کہہ کر ایک فکر مند نادم کی طرح اپنی انگلی منہ میں دی، حتیٰ کہ بارگاہِ بے نیاز میں پہنچ گئے رحمہ اللہ ورضی عنہ وارضاہ۔ (تہذیب وفتح الملہم ص ۱/۲۷۴)

میرے سارے گناہوں کی بخشش ہو جائے۔ آپ نے فرمایا: عمرو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام تو کفر کی زندگی کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور ہجرت بھی پہلے تمام گناہوں کو صاف کر دیتی ہے اور حج بھی سارے گناہوں کا قصہ پاک کر دیتا ہے یہ دوسرا دور تھا اس وقت آپ سے زیادہ محبوب آپ سے زیادہ بزرگ و برتر میری نظر میں کوئی اور باقی نہ ہا تھا آپ کی عظمت اور رعبِ جلال و جمال سے میرے دل ونگاہ اس درجہ متاثر ہو چکے تھے کہ میری اتنی تاب نہ تھی کہ چہرۂ انور کو نظر بھر کر دیکھ سکوں اور اگر مجھ سے آپ کی صورتِ مبارک پوچھی جائے تو میں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے کبھی جی بھر کر آپ کو دیکھا ہی نہیں کاش! میں اسی حال میں مرجاتا تو امید ہے کہ اہل جنت میں شمار ہو جاتا اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوا اور ہم نے ولایت وحکومت کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے لیے اس امتحانی میں کیا کچھ مقدار ہوا؟! (گویا حضرت عمرو آخر وقت میں اسی آخری دور کی باتوں کو یاد کر کے نالاں و پریشان تھے کہ نہ معلوم کس بات پر رب العزت کی بارگاہِ بے نیاز میں پکڑ ہو جائے اور درمیانی دور کی ساری سعادتیں ایک طرف رکھی رہ جائیں **الایمان بین الخوف والرجاء** کا کیسا بہترین مرقع حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے پیش کیا ہے۔ **اللھم عاقبتنا کلنا واعف عنا**)

پھر فرمایا: جب میں مرجاؤں تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت نہ جانے پائے اور نہ زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق آگ میرے جنازہ کے ساتھ ہو اور دیکھو جب تم مجھے دفن کر چکو تو میری قبر پر اچھی طرح سے مٹی ڈالنا اور فارغ ہو کر بھی اتنی دیر تک ٹھیرنا جتنی دیر میں اونٹ ذبح ہو کر اس کا گوشت تقسیم ہوتا ہے تاکہ تمہاری موجودگی کی وجہ سے میری وحشت کم ہو اور اتنے میں یہ بھی دیکھ لوں کہ اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے سوالات کا جواب مجھ سے کیا بن پڑتا ہے۔

بحث زیادۃ ونقص ایمان

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا حدیث الباب کے اوّل حصہ میں منکرین زیادۃ ونقصِ ایمان کا رد ہے کیونکہ حسن کے درجات متفاوت ہوتے ہیں اور آخر حصہ میں معتزلہ وخوارج کا رد ہے۔ حافظ عینی رحمہ اللہ نے اس پر تعقب کیا اور لکھا کہ حسنِ اوصافِ ایمان سے ہے وصف کی قابلیتِ زیادۃ ونقص سے ذات کی قابلیت کیسے ثابت ہوگئی؟ اور ذاتِ ایمان من حیث ہی ہی کے عدم قبول پر ہم کافی بحث کر چکے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے پہلے اسلام کی تقسیم عسر ویسر بیان کی اب حسن وغیرہ کی تقسیم کر رہے ہیں اور حسن کا تعلق ایمان سے ایسا ہی ہے جیسا کہ چہرے کی خوبصورتی کا تعلق چہرہ سے ہوتا ہے گویا حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی حافظ عینیؒ کی تائید فرمائی اور وصف وذات کی طرف اشارہ فرمایا لیکن نواب[1] صاحبؒ نے یہاں بھی لکھا کہ حافظ عینیؒ کا اعتراض محض عقلی ہے اور ظاہر حدیث کو اپنے مذہب کی مدد کے لیے رائے کے ذریعے رد کر دیا ہے اور امام بخاری وغیر نے جس مسلک کو راجح قرار دیا ہے وہی سلف سے بھی منقول ہے اور حسبِ روایت لالکائی امام بخاری نے فرمایا کہ میں ایک ہزار سے زیادہ علماء سے ملا سب نے یہی کہا کہ ایمان قول وعمل کا مجموعہ ہے جو زیادہ وکم ہوتا ہے مگر آگے خود ہی نواب صاحب نے لکھا کہ "اگر کوئی اعتراض کرے کہ ایمان تو تصدیق باللہ والرسول ہے اور تصدیق شئی واحد ہے اس کے اجزاء نہیں ہو سکتے لہٰذا اس کا کبھی کامل اور کبھی ناقص ہونا بھی متصور نہیں تو جواب یہ ہے کہ ایمان کے اندر قول وفعل کو داخل ماننے کے بعد اس

---

[1] نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کا تذکرہ مقدمہ انوارالباری جلد دوم میں آچکا ہے ان کی علمی خدمات بالخصوص اہتمام اشاعت کتب حدیث کے احسان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل عطا فرمائے خود نواب صاحب مرحوم کی طرف بھی بہت سی مفید علمی تصانیف کی نسبت ہے اگرچہ شہرت اس امر کی بھی ہے کہ نواب صاحب کی تصانیف میں بیشتر حصہ دوسرے علماء کی کاوش ومحنت کا ہے واللہ اعلم مگر اس وقت جس امر کا اظہار راقم الحروف کو اپنے تازہ تجربہ کی بنا پر کرنا ہے وہ یہ کہ شروح البخاری کا مجموعہ یکجا طبع شدہ سامنے ہے جس کو شرح کے وقت اکثر دیکھتا ہوں اوپر علامہ نووی کی شرح ہے اس کے نیچے علامہ قسطلانی کی اور سب سے نیچے نواب صاحب کی عون الباری جس میں اوپر ہی کی دونوں شروح کی عبارتیں کی بجنسہ لفظ بہ لفظ نقل ہوئی ہیں مگر بغیر حوالے کے گویا وہ سب خود نواب صاحب کی اپنی تحقیقات ہیں البتہ جہاں کچھ حافظ عینیؒ یا حنفیہ کے خلاف ضرورت سمجھتے ہیں تو اپنے افادات سے بھی نوازتے ہیں جن کی ایک دو مثالیں اوپر پیش کی گئیں ہیں ظاہر ہے کہ اس طرز کو نہ تصنیف کہہ سکتے ہیں نہ تالیف۔ واللہ بحال عبادہ

کا زیادتی وکمی کو قبول کرنا ظاہر ہے تو اس جواب میں بھی ہمارا جواب ہے کہ ہماری بحث ایمانِ محض میں ہے نہ کہ دوسری چیزیں اس میں داخل کرنے کے بعد اور لالکائی ہی کے حوالے سے پہلے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ سلف کا قول وعمل یزید بالطاعات وینقص بالمعاصی تھا جس کو امام بخاری نے مختصر کر کے مخل بالمقصود کر دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی یہی تحقیق ہے نیز حضرتؒ نے بسط الیدین کے ص ۴ میں لکھا کہ جس نے یہ کہا "میں ایک ہزار شیوخ سے ملا سب یہی کہتے تھے کہ ایمان قول وعمل ہے" اس قول سے مسئلہ مذکورہ کا ضعف زیادہ معلوم ہوتا ہے یہ نسبت قوت کے کیونکہ ضروریاتِ دین کے بارے میں اس طرح سوال نہیں ہوا کرتا (وہ تو سب ہی کو معلوم ہوتی ہیں) دوسرے یہ کہ جنہوں نے ایسی خبر دی ہے تو انہوں نے اپنا اختیار کردہ مسلک بتلا دیا یہ تو نہیں کہا کہ ہم نے اسی طرح صحابہ سے اس کو حاصل کیا ہے تو اس میں محض اپنے مسلک کے شیوخ کی رائے کا اظہار واتباع ہو سکتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں جس طرح کہ انہوں نے جزء رفع یدین میں رفع یدین کرنے والوں کی تعداد بھی اپنے شیوخ ہی کے اتباع میں لکھی ہے۔ جس میں امر واقعی سے تعرض نہیں کہ حقیقۃً وہ کتنے تھے آخر میں اس امر کا اعادہ بھی مفید ہے کہ خود امام صاحبؒ نے نزدیک بھی ایمان کا چونکہ ایک محفوظ ومعین درجہ ہے۔ جس سے کمی نہیں ہو سکتی مگر اضافہ اور ترقی اعمالِ صالحہ سے ان کے یہاں بھی ممکن ہے اس لیے اس کے اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے اور ظواہر سے زیادہ حقائق پر توجہ کی جائے تو اچھا ہے۔

علامہ نوویؒ کی غلطی کا ازالہ

حدیث الباب کی بحث ونظر کا ایک مختصر گوشہ باقی ہے وہ بھی پیش ہے۔ امام نووی نے لکھا "فقہا نے جو یہ لکھا ہے کہ "کافر کی کوئی عبادت صحیح نہیں اور اگر اسلام لے آئے تب بھی اس کا اعتبار نہ ہوگا" اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی احکام میں اس کا اعتبار نہ ہوگا آخرت کے ثواب سے اس میں تعرض نہیں ہے" اس پر بھی اگر کوئی جرأت کر کے یہ دعویٰ کرنے لگے کہ اسلام لانے کے بعد اس کو عباداتِ زمانہ کفر کا آخرت میں ثواب نہ ملے گا تو یہ محض اٹکل کی اور بے دلیل بات ہے دوسرے اسی مذکورہ حدیث صحیح کے وجہ سے بھی یہ دعویٰ قابلِ رد ہے۔ جس میں اچھا اسلام ہونے کی صورت کافر کو سابقہ اعمالِ خیر پر بھی ثواب کی بشارت دی گئی ہے نیز حدیث حکیم بن حزام بھی یہی بتلاتی ہے اور سب علماء محققین کی بھی یہی رائے ہے بلکہ اس امر پر اجماع کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔" (شروح البخاری ص ۱/ ۲۱۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے امام نووی کی مذکورہ بالا عبارت اور تاویلِ قول فقہاء پر فرمایا کہ امام نووی سے غلطی ہوئی فقہا نے عبادت کفار کے بارے میں جو فیصلہ کیا وہ بغیر تاویل صحیح ہے کیونکہ کفار کی عبادات نہ احکام دنیا میں معتبر ہیں نہ احکام آخرت میں اور حدیث حکیم بن خرام میں بجز عتق، صدقہ وغیرہ کے (جو طاعات ہیں) کسی عبادت کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح صاف بات یہی ہے کہ کافروں کی طاعات وقربات تو سب نافع ہیں لیکن عبادات قطعاً غیر معتبر ہیں کیونکہ ان کا مدار نیت پر ہے جو صحیح معرفت خداوندی پر موقوف ہے اور وہ کسی غیر مسلم کو حاصل نہیں ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت اہم غلطی کی اصلاح فرمائی ہے امام نووی کی عبارت مذکورہ بالا کو سب ہی شراح بخاری نے نقل کیا ہے مگر اس پر کسی نے تنبیہ نہیں کی کہ امام نووی کو مغالطہ ہوا ہے یعنی ان کو یہاں طاعات وعبادات کے فرق سے ذہول ہو گیا ہے۔

قاضی عیاض وغیرہ کا اختلاف

دوسرے یہ کہ شیخ عبداللہ مازری اور قاضی عیاض وغیرہ کا اس مسئلہ میں اختلاف بھی اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا اسلامی اصول وقواعد کی رو سے کافر کا تقرب صحیح نہیں لہٰذا اس کو کسی طاعت پر ثواب بھی نہیں ملے گا پھر فرمایا کہ ایک شخص مطیع اور غیر متقرب دونوں ہو سکتا ہے مطیع تو اس لیے کہ اوامر الٰہیہ کے مطابق کام کر رہا ہے طاعت موافقتِ امر ہی کا نام ہے اور متقرب اس لیے نہیں کہ تقرب کی شرط متقرب الیہ کی معرفت ہے۔ جو بغیر ایمان کے حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا حدیثِ حکیم کا مطلب صرف اتنا ہے کہ تم نے زمانہ کفر میں اچھے اخلاق وملکات جمع کر لیے تھے لہٰذا ان سے تمہیں اسلام

کے دور میں بھی نفع پہنچے گا یا ان سے تم نے قابلِ مدح وتعریف حالت حاصل کرلی یا ان کی وجہ سے حسنات اسلام میں زیادتی حاصل ہوگی وغیرہ۔

تنقیح مسئلہ

لہٰذا اب بات اس طرح منقح ہوئی کہ قاضی عیاض وغیرہ کو بھی مغالطہ پیش آیا ہے کہ انہوں نے بھی طاعات وعبادات میں فرق نہیں کیا اس لیے ایک اجماعی مسئلہ اور حدیثِ صحیح سے ثابت شدہ امر کا خلاف کیا اور ان کی دلیل خود بتلا رہی ہے کہ کس طرح مغالطہ ہوا۔

الحمدللہ حضرت شاہ صاحب کے ارشاد گرامی سے پوری بات نکھر کر سامنے آگئی اور اب بظاہر اصل مسئلہ میں کسی کا اختلاف بھی باقی نہیں رہا۔

کفار کی دنیوی راحتیں

کفار ومشرکین کو دنیا کی راحتیں، نعمتیں، رزق وغیرہ سب ان کی طاعات وقربات کے صلہ میں دیئے گئے اور ان کا سارا معاملہ دنیا ہی میں چکا دیا گیا البتہ کسی کسی کافر کو آخرت میں تخفیف عذاب کی صورت سے نواز دیا جائے گا۔

مومنین کا معاملہ

اور مومنین کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے خرید کردہ غلام ہیں (ان اللہ اشتریٰ الایۃ) ان کی کڑی نگرانی ہے بات بات پر محاسبہ ہے بغیر اپنے آقا ومولیٰ کی مرضی کے ایک قدم ادھر سے ادھر کرنے کی اجازت نہیں دل وزبان پر پہرہ ہے اخلاق اعمال معاملات ومعاشرت وغیرہ کا کوئی گوشہ نہیں جس میں بغیر ہدایتِ خداوندی کچھ کرسکیں عبادات کا بھی ایک خاص نظام عمل ہے جس پر عمل درآمد اشد ضروری ہے اگر ایسا نہیں تو اسلام نام کا ہے۔

نومسلموں کے لیے اصول

نومسلموں کے لیے ایک جدا اصول ہے کہ سارے غیر اسلامی عقائد واعمال سے خالص توبہ کرکے اسلام اختیار کریں تو پچھلی زندگی کے سارے مطالبات ومؤاخذات قلم زد بلکہ اسلام اچھا ہو تو گذشتہ طاعات (غیر عبادات) پر بھی اجر وثواب کے مستحق ہوں گے اور اگر اسلام میں کمی ہوئی تو جس قسم کی کمی ہوگی اسی کا وبال بھی بھگتیں گے۔ **واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لآ الہ الاانت استغفرک واتوب الیک.**

باب احب الدین الی اللہ عزوجل ادومه

(حق تعالیٰ عزوجل کو دین کا وہ عمل سب سے زیادہ محبوب ہے جس پر مداومت کی جائے)

۴۲ ...... حدثنا محمد بن المثنی قال حدثنا یحییٰ عن هشام قال اخبر نی ابی عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل علیها وعند ها امراة قال من هذه قالت فلا نة تذ کر من صلاتها قال مه علیکم بما تطیقون فواللہ لایمل اللہ حتی تملوا وکان احب الدین الیه مادام علیه صاحبه.

ترجمہ:۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک دن) ان کے پاس تشریف لائے اس وقت ایک عورت بھی ان کے پاس بیٹھی تھی آپ نے دریافت کیا یہ کون ہے؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا فلاں عورت ہے پھر اس کے بکثرت نماز پڑھنے کا ذکر کرنے لگیں آپ نے فرمایا ٹھیر جاؤ (سن لو) کہ تم پر اتنا ہی عمل واجب ہے جتنے عمل کی تمہارے اندر سکت ہے اللہ کی قسم (ثواب دینے سے) اللہ نہیں اکتاتا مگر تم (عمل کرتے کرتے) اکتا جاؤ گے اور اللہ کو دین (کا) وہی (عمل) زیادہ پسند ہے جس کی ہمیشہ پابندی کی جائے۔

تشریح:۔ معلوم ہوا کہ عبادت کی زیادتی اتنی مطلوب نہیں جتنی اس کی پابندی اور ہمیشگی پسند ہے کہ تھوڑے عمل میں انبساط و فرحت بھی رہتی ہے اور آدمی اس کو دیر تک نبھا بھی سکتا ہے اور زندگی کی گوناگوں ذمہ داروں کے ساتھ ایسی ہی عبادت اختیار بھی کی جا سکتی ہے جو انسان میں اس کی عبدیت کے احساس کو ہمیشہ اور ہردم برقرار رکھ سکے اور اسے عام انسانی فرائض کی بجا آوری سے بھی نہ روکے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علماء نے حدیث الباب وغیرہ کی روشنی میں فیصلہ کیا ہے کہ تھوڑا عمل جس پر مداومت کی جائے۔ اس زیادہ عمل سے بہتر ہے۔ جس کو ہمیشہ نہ کیا جا سکے امام غزالیؒ نے اس کی مثال دی کہ ایک پتھر پر پانی کا قطرہ قطرہ ٹپکتا رہے تو اس میں کچھ عرصے کے بعد سوراخ ہو جائے گا لیکن اگر پانی بڑی مقدار میں بھی اس پر بہا دیا جائے تو اس میں کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

لایمل (اللہ نہیں اکتائے گا) پر فرمایا کہ اکتانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف مناسب نہیں مگر یہ لفظ بطریق مشاکلت بولا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینا ترک نہیں فرمائیں گے جب تک کہ تم ہی عبادت کو نہ چھوڑ دو۔

یہ تو اس کا مشہور عام جواب ہے مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں اس کو اسی طرح سمجھتا ہوں جس طرح حق تعالیٰ کے لیے ید، اصابع، وجہ وغیرہ کا اطلاق آیا ہے، یعنی یہ تمام چیزیں اس کے لیے ثابت ہیں مگر ایسی ہی جیسی کہ اس کے شان کے مناسب ہیں ہم اس کے ادراک و اظہار سے قاصر ہیں۔

بحث ونظر: اس میں بحث ہے کہ خصور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (رک جاؤ) کیوں فرمایا' اور کس سے فرمایا؟ بعض علماء کی رائے ہے کہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا اس لیے کہ کسی کی تعریف اس کے منہ پر پسندیدہ نہیں یا اس لیے فرمایا کہ میں بات کو سمجھ گیا' زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں! طاقت سے زیادہ عبادت نہیں کرنی چاہیے' پھر بہت زیادہ انہماک عبادت نبھ بھی نہیں سکتا' اسی لیے تھوڑا عمل کرو مداوت و انشراح کے ساتھ' جس سے خدا زادہ خوش ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خود خولاء سے ہی فرمایا (جو وہاں بیٹھی تھیں' اور جن کی نماز وغیرہ عبادت کا تذکرہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا) کہ اس طرح عبادت میں غلومت کرو' اس سے رک جاؤ' پھر عبادت کا بہتر اور زیادہ پسندیدہ طریقہ تعلیم فرمایا۔

اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی کے منہ پر تعریف کرنا جائز ہے' ورنہ حضرت عائشہؓ ایسا کیوں کرتیں؟ اول تو ان کا مقصد تعریف کرنا بظاہر تھا ہی نہیں' بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کا حال عرض کر کے ہدایت حاصل کرنی تھی' اور اس غرض کے لئے ساری بات اور سامنے ہی کہنے کی ضرورت تھی' تا کہ کوئی کمی بیشی بھی نہ ہو' اور ہو تو اس کی تصحیح ہو جائے دوسرے یہ کہ احتمال اس کا بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا مقصد تعریف ہی کرنا ہو اور ان کو اس وقت تک سامنے تعریف کرنے کی ممانعت معلوم نہ ہوئی ہو' اس لیے ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس ناپسندیدہ عمل سے روکا تا کہ وہ مسئلہ سمجھ لیں' دوسری طرف معاملہ مرجوعہ میں رہنمائی بھی فرما دی' تیسرے یہ کہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خولاء کی تعریف اس وقت کی، جب وہ اٹھ کر جا چکی تھیں، اور علیکم بما تطیقون وغیرہ ہدایت حضرت عائشہ کی وساطت سے ان کو پہنچی' یا دوسرے وقت خولاء سامنے ہوئیں تو ان کو براہ راست ہدایت فرمائی۔

ابن التین کی رائے یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے خولاء کے منہ پر تعریف اس اطمینان پر کی کہ ان کے غرور و تکبر وغیرہ کسی فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ نہیں تھا' اور ایسی صورت میں تعریف جائز بھی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ باب سابق میں امام بخاریؒ نے حسن اسلام کا بیان کیا تھا کہ احسن وغیر احسن ہوتا ہے یہاں دین کی تقسیم احب وغیر احب کی طرف بتلاتی' اور باپ سابق میں یہ ظاہر ہوا تھا کہ اسلام کا حسن مطلوب ہے' یہاں حسن کی ایک صورت دوام عمل بتلائی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی رائے یہ ہے کہ باب سابق میں اس طرف اشارہ تھا کہ ایمان و اسلام میں حسن اعمال صالحہ سے آتا ہے مگر اس سے کوئی

یہ نہ سمجھے کہ عمل صالح ہی میں لگے رہو اور سب کام دنیا کے چھوڑ دو' تو اس حد بندی یہاں دوسرے باب سے کردی کہ عمل صرف اسی حد تک مطلوب ہے' جب تک دوام ونشاط سے کرسکو' واللہ اعلم۔

باب زيادة الايمان و نقصانه و قول الله تعالى و زدنهم هدى و يزداد الذين امنوآ ايمانا و قال اليوم اكملت لكم دينكم فاذا ترك شيئاً من الكمال فهو ناقص

(ایمان کی زیادتی وکمی کا بیان' اور اللہ تعالےٰ کے ارشادات کی تفسیر "ہم نے اصحاب کہف کو مزید ہدایت دے دی" اور " تا کہ ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے"" آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کردیا" پس اگر کمال کے درجہ میں سے کوئی چیز چھوڑ دی تو نقص آ گیا۔

۴۳ ...... **حدثنا مسلم بن ابراهيم قال حدثنا هشام قال حدثنا قتادة عن انس عن النبى صلى الله عليه وسلم قال يخرج من النار من قال لآ اله الا الله و فى قلبه وزن شعيرة من خير و يخرج من النار من قال لآ اله الا الله و فى قلبه وزن برة من خير و يخرج من النار من قال لآ اله الا الله و فى قلبه و زن ذرة من خير قال ابو عبد الله قال ابان حدثنا قتادة حدثنا انس عن النبى صلى الله عليه وسلم من الا يمان مكان من خير:**

ترجمہ:۔حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا اور اس کے دل میں جو برابر نیکی' (ایمان) ہے تو وہ دوزخ سے نکلے گا' اور دوزخ سے وہ شخص (بھی) نکلے گا' جس نے کلمہ پڑھا اور اس کے دل میں گیہوں کے برابر ایمان ہے' اور دوزخ سے وہ (بھی) نکلے گا جس نے کلمہ پڑھا اور اس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر ایمان ہے۔

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ ابان نے بروایت قتادہ بواسطہ حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی جگہ ایمان کا لفظ نقل کیا ہے۔

تشریح:۔محض زبان سے کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں جب تک دل میں اس کلمہ کی حقیقت جاگزیں نہ ہو' ایمان اگر ہے تو سزا بھگتنے کے بعد پھر بخشا جانا یقینی ہے' اس حدیث میں متعدد چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے' مطلب یہ ہی ہے کہ کم سے کم مقدار میں بھی اگر ایمان قلب میں موجود ہے تو آخرت میں اس کا فائدہ ضرور حاصل ہوگا' حدیث میں خیر سے ایمان مراد ہے' پھر آخر میں امام بخاری نے خود ایک روایت کے حوالے سے نقل فرمادیا کہ اس میں ایمان کا لفظ بھی آیا ہے۔

ایمان میں زیادتی وکمی ہوتی ہے یا نہیں' یہ بحث ابتداء کتاب الایمان میں' پھر کچھ درمیان میں بھی ہو چکی ہے' امام بخاریؒ نے جو آیات یہاں پیش کیا ہیں' ان میں سے پہلی دو گزر چکی ہیں اور ان کا مقصد بھی واضح کیا جا چکا ہے' جہاں تک اعمال کی اہمیت وافادیت کا تعلق ہے' احناف یا دوسرے تمام ہی اہل حق اس کے قائل ہیں' البتہ فرقہ مرجہ اور معتزلہ دونوں تفریط وافراط کا شکار ہوئے' جن کے خلاف سب ہی علماء حق نے لکھا اور بہت کچھ لکھا' امام بخاری نے بھی ان فرقوں کی تردید کے لیے پوری توجہ دی ہے' مگر ایک اہم نقطۂ اختلاف جو باہم اہل حق کا ہے' کہ اعمال ایمان کا جزو بھی ہیں یا نہیں' ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے اور گو اس کے بیشتر حصہ کو نزاع لفظی بھی کہہ سکتے ہیں۔تاہم اختلاف کے صحیح منشاو بنیاد سے انکار نہیں ہوسکتا۔ہم یہاں فتح الملہم صفحہ ۱/۱۵۸ سے کچھ مفید اشارات نقل کرتے ہیں۔

شوافع واحناف کا اختلاف

اور اسی اختلاف پر ایمان کی زیادتی وکمی کا مسئلہ چھڑ جاتا ہے' معتزلہ' اشاعرہ' امام شافعیؒ اور بہت سے علماء کی رائے ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے' امام اعظم ابوحنیفہ' آپ کے اصحاب اور بہت سے علماء فرماتے ہیں کہ نہیں ہوتی۔

امام الحرمین

امام الحرمین شافعی بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ ایمان اس تصدیق کا نام ہے جو حد یقین واذعان پر پہنچی ہو اور اس میں کمی وزیادتی ہو نہیں سکتی'

پھر اگر وہ تصدیق کرنے والا طاعات بجالاتا ہے‘ یا ارتکاب معاصی کرتا ہے۔ تب بھی اس کی تصدیق بحالہ موجود ہے اس میں کوئی تغیر وفرق نہیں آیا‘ وہ فرق جب ہی آسکتا ہے کہ ایمان کو طاعات کا مجموعہ قرار دیں جو کم وبیش ہوتی ہیں۔

امام رازی

اور اسی وجہ سے امام رازی شافعی وغیرہ نے لکھا کہ یہ اختلاف تفسیر ایمان پر مبنی ہے‘ اگر اس کو صرف تصدیق کہیں تو اس میں کمی وبیشی کے درجات نکلنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا‘ اور اگر اعمال پر اس کا اطلاق کریں تو پھر متفاوت درجات نہ نکلنے کی کوئی وجہ نہیں‘ پھر امام رازی نے دونوں رایوں میں اس طرح توفیق دی کہ عدم تفاوت والوں کی نظر اصل ایمان پر ہے‘ اور تفاوت والوں کی کامل ایمان پر۔

شارح حاجبیہ

شارح حاجبیہ نے فرمایا کہ کبھی ایمان کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو اصل مدار نجات ہے‘ اور کبھی کامل درجہ پر جو ملا خلاف نجات کا باعث ہے‘ علامہ شمس محمد البکری کا قول نقل ہوا کہ ”ہمارے اصحاب نے جہاں علی الاطلاق یہ کہا کہ ایمان میں زیادتی وکمی نہیں ہوتی‘ وہاں مراد وہی مرتبہ ہے جو اصل ومدار نجات ہے‘ اور جس نے زیادتی ونقصان کو مانا تو اس سے مراد کامل درجہ لیا ہے لیکن کامل کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کے مقابل کو ناقص کہیں‘ اور یہ تعبیر زیادہ اچھی نہیں‘ البتہ اس کی جگہ ایمان شرعی کہیں تو زیادہ مناسب ہے جیسا کہ بعض محققین نے کہا بھی ہے۔

ایمان میں قوت وضعف مسلم

اس کے علاوہ ایمان کا باعتبار قوت وضعف‘ اجمال وتفصیل‘ اور بہ لحاظ تعداد بوجہ تعدد مومن بہ (یعنی ایمانیات کا کم وبیش ہونا) تو یہ بھی محققین اشاعرہ کا مختار قول ہے۔ امام نووی کا بھی یہی قول ہے‘ اسی قول کو سعد نے شرح عقائد میں بعض محققین کی طرف منسوب کیا ہے‘ اور مواقف میں بھی اسی کو حق قرار دیا۔ (کذا فی شرح الاحیاء)

شیخ اکبر کی رائے

شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا کہ ایمان اصلی جو زیادہ وکم نہیں ہوتا‘ وہ فطرت ہے‘ جس پر خدا نے سب لوگوں کو پیدا کیا‘ یعنی ان لوگوں نے اخذ میثاق کے وقت جو خدا کی وحدانیت کی شہادت دی تھی‘ پس ہر بچہ اسی میثاق پر پیدا ہوتا ہے‘ مگر جب وہ جسم خاکی کی قید میں آتا ہے جو محل نسیان ہے تو اس حالت کو بھول جاتا ہے جو اس کو اپنے رب کے حضور میں حاصل ہوئی تھی‘ اور پھر سے خدا کی وحدانیت کا علم ویقین حاصل کرنے کے لیے دلائل وبراہین کا محتاج ہوجاتا ہے‘ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مسافر جنگل میں ہے آسمان صاف ہے‘ سمت قبلہ کو اچھی طرح پہچان رہا ہے‘ اپنی منزل کا رخ بھی صحیح سمجھ رہا ہے‘ کچھ دیر کے بعد فضا ابر وغبار سے گھر جاتی ہے‘ اب وہ مسافر نہ سمت قبلہ کو پہچانتا ہے‘ نہ اپنی منزل کے رخ کو‘ اور اس حالت میں اجتہاد وعقل سے فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

علامہ شعرانی کا فیصلہ

علامہ شعرانی شافعی نے تحریر فرمایا کہ اس تقریر سے تم پر ”ایمان فطرت“ کا حال واضح ہوگیا‘ جس پر بندہ کو موت آتی ہے اور اس میں کمی ہوتی ہے نہ زیادتی‘ اور یہ جو تم نے سن رکھا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے‘ اس سے مراد درمیانی زندگی کے نشیب وفراز ہیں‘ واللہ اعلم۔

علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب الفصل میں لکھا کہ کسی چیز کی تصدیق میں یہ بات کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ زیادتی وکمی ہو‘ اور بالکل اسی

طرح توحید ونبوت کی تصدیق میں بھی زیادتی وکمی ناممکن ہے الخ

حضرت شاہ صاحب کی رائے

علامہ عثمانی قدس سرہ نے اس کے بعد استاذ نا العلام شاہ صاحب قدس سرہ کے کلمات ذیل بھی نقل فرمائے:۔ ایمان شرعی کے معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر ہر چیز میں اپنے اوپر لازم کرلینا ہے' یعنی جو کچھ آپ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اس سب کو بے چون وچرا قبول کرلینا۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو باعتبار مومن بہ کے پوری اسلامی شریعت پر حاوی ہے' نہ اس میں زیادتی ہوسکتی ہے نہ کمی' اسی لئے ایمان شرعی کا اطلاق وتصور اس طرح ہو ہی نہیں سکتا کہ کچھ چیزوں کو تسلیم کرلیا جائے اور کچھ کورد کردیا جائے۔ قال تعالیٰ:۔

افتؤ منون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (کیا بعض چیزوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا کفر کرتے ہو)

ویقولون نومن ببعض و نکفر ببعض (کہتے ہیں کہ ہم تو کچھ چیزوں کو مانیں گے اور کچھ کو نہیں مان سکتے)

ایمان میں اجمال وتفصیل

البتہ اجمال وتفصیل کا تفاوت قابل تسلیم ہے' اور یہی امام اعظمؒ کے اس قول کا مطلب ہے" امنو ا بالجملة ثم بالتفصیل" پہلے ایمان اجمالی اختیار کرو پھر تفصیلی' اس کو کردری نے مناقب میں نقل کیا ہے' معلوم ہوا کہ امام صاحب کا نفی زیادۃ ونقصان کا قول اسی وجہ مذکور سے ہے اور وجوہ سے نہیں۔

حافظ عینی کی محققانہ بحث

فتح الملہم شرح صحیح مسلم سے اوپر کے اقوال کرنے کے بعد ہم حافظ عینی کا وہ اہم علمی فائدہ بھی نقل کرتے ہیں' جو انہوں نے آیت اکملت لکم دینکم کے بارے میں لکھا' کیونکہ امام بخاری نے یہ نئی آیت یہاں استدلال میں بڑھائی ہے' جو پہلے باب ذکر ایمان میں نہیں لائے تھے' ابن بطال نے کہا کہ یہ آیت زیادۃ نقصان وایمان کی دلیل ہے' کیونکہ وہ اس روز نازل ہوئی جس روز تمام فرائض وسنن کامل ہوگئے اور دین کا استقرار واستحکام ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے واپس بلالیں' لہٰذا اس آیت سے بتلایا کہ کمال دین پوری شریعت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اور اسی کے ساتھ نقصان دین والی صورت بھی سمجھ میں آجاتی ہے' پھر دین سے یہاں توحید کو اس لیے مراد نہیں لے سکتے کہ وہ تو آیت مذکورہ کے نزول سے پہلے بھی تھی' پس اعمال ہی مراد ہوں گے' اگر ان کی پوری پابندی کرے گا تو اس کا ایمان بہ نسبت اس شخص کے زیادہ کامل ہوگا' جو کوتاہی کرے گا۔ حافظ عینیؒ نے ابن بطال کا پورا استدلال کرکے لکھا کہ اس آیت سے دین کی زیادتی وکمی پر استدلال درست نہیں' کیونکہ اس سے تو مراد یہ ہے کہ میں نے تمہارے دین کی شرائع (احکام شرعیہ) کو مکمل کردیا' کیونکہ شریعت کے احکام رفتہ رفتہ اتر رہے تھے' تا آنکہ اس دن مکمل ہوگئے' یہ کہاں ہے کہ دین وایمان کو مکمل کیا' کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پہلے دین وایمان ناقص تھا' جو صرف اس دن مکمل ہوا' ہاں شرعی احکام یا شرائع الٰہیہ کی تکمیل ضرور اس روز ہوئی ہے' جن کا تعلق اعمال سے ہے' لہٰذا اس آیت سے تو ابن بطال کا مدعا نہیں بلکہ خلاف مدعا بات نکل رہی ہے' اور خود ابن بطال نے بھی اقرار کیا کہ یہاں دین سے مراد توحید نہیں ہوسکتی' جو اصل دین وایمان ہے (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۳۰۰)

حافظ ابن تیمیہؒ کی رائے

آخر میں حافظ ابن تیمیہ کی رائے بھی پیش کی جاتی ہے' جو اس بحث کی تکمیل ہے' موصوف نے ارجاء سنت وارجاء بدعت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی لیے ارجاء فقہاء میں ایسے حضرات بھی سرفہرست نظر آتے ہیں' جو ائمہ دین کی نظر میں اہل علم ودین ہیں اور سلف میں سے کسی ایک نے بھی آج تک فقہاء مرجئین کی تکفیر نہیں کی' البتہ صرف اتنا کہا کہ یہ اقوال وافعال کی بدعت ہے' عقائد کی بدعت کسی نے نہیں کہا کیونکہ

اس سلسلہ کا نزاع اکثر لفظی ہے البتہ جو الفاظ کتاب وسنت کے مطابق تھے، وہی زیادہ بہتر تھے۔

غرض یہ معمولی سی لفظی خطا' دوسروں کے لیے عقائد واعمال میں بڑی خطاء کا پیش خیمہ بن گیا' اور اسی لیے بعد کے لوگوں نے ارجاء کی مذمت میں بڑی بڑی باتیں کہہ ڈالیں''۔

حافظ ابن تیمیہؒ کا مقصد

حافظ ابن تیمیہؒ کا مقصد یہ ہے کہ مرجئہ اہل بدعت اور فساق کو اہل سنت فقہاء مرجئین کے اقوال سے اپنے فسق وفجور وغیرہ کے لیے سہارا مل گیا اور یہی بات بہت سے محدثین (امام بخاری وغیرہ) پر زیادہ گراں گزری' جس کی وجہ سے انہوں نے بڑے بڑے ائمہ دین وفقہ پر طعن ارجاء کیا۔

علامہ عثمانی کا ارشاد

حضرت علامہ عثمانیؒ نے حافظ ابن تیمیہ کی رائے مذکور نقل کرنے کے بعد لکھا کہ موصوف نے یہاں پہنچ کر اس امر کا خیال نہیں فرمایا کہ خوارج (ومعتزلہ) کا فتنہ بھی تو مرجئہ کے فتنہ سے کم نہیں تھا' جو ایک گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر ایمان سے خارج ہونے کا حکم لگا رہے تھے۔ (فتح الملہم صفحہ ۱/۵۱)

امام اعظم کی گرانقدر رہنمائی

ہمارے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کو تو فرقہ قدریہ' مرجئہ اہل بدعت' خوارج ومعتزلہ وغیرہ تمام ہی اس وقت کے گمراہ فرقوں کا مقابلہ کرنا پڑا' اس لیے اگر وہ اس وقت کھل کر صاف صاف طریقہ سے رہنمائی نہ کرتے' تو احقاق حق ہرگز نہ ہوسکتا کج فطرت اہل زیغ نے تو قرآن وسنت سے بھی اپنے لیے گمراہی کے راستے نکال لیے ہیں، اگر امام اعظم، ان کے اصحاب، فقہا ومحدثین اور دوسرے مرجئہ اہل سنت کے اقوال سے انہوں نے اپنی گمراہی کے لیے سہارا ڈھونڈھ لیا تو یہ بات ان اکابر پر جواز طعن کی وجہ نہیں بن سکتی' دوسری طرف خوارج ومعتزلہ نے اس وقت انتہائی زور پکڑ رکھا تھا' بقول حضرت عثمانیؒ' ان کے فتنوں کی بھی تو روک تھام ضروری تھی' واللہ اعلم۔

طعن ارجاء درست نہیں

حافظ ابن تیمیہؒ کے مذکورہ بالا فیصلہ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ائمہ حنفیہ وغیرہ کے لئے جو بطور طعن کتب رجال وحدیث میں مرجئی یا رُمی بالارجاء وغیرہ لکھا گیا ہے' اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔

تکمیل بحث

ایمان کی حقیقت' اعمال کا مرتبہ اور دوسرے ضروری امور روشنی میں آچکے اور بعض باتیں خصوصی اہمیت مسئلہ ایمان کے سبب بہ تکرار آ چکیں' یہاں پہنچ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ چند سطور کا اضافہ اور کیا جائے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے مسئلہ ایمان پر مستقل کتاب الایمان لکھ کر جو کچھ داد تحقیق دی تھی اس کا خلاصہ اوپر عرض کردیا گیا' اس میں ائمہ حنفیہ وغیرہم کی طرف سے جو دفاع کیا گیا وہ بھی قابل قدر علمی افادہ ہے مگر ایک چیز کھٹکی' جس کا اظہار وازالہ ضروری ہے۔

انہوں نے لکھا کہ جو لفظ کتاب وسنت کے مطابق تھا وہی صواب تھا کسی کو اس کے خلاف کرنا خصوصاً جبکہ وہ اہل کلام ومرجئہ اہل بدعت کے غلط وخلاف سنت طریقہ کے لئے سہارا بن گیا' مناسب نہ تھا''۔ (فتح الملہم صفحہ ۱/۱۵۸)

اسی طرح نواب صاحب نے موقع پا کر حدیث الباب کے تحت اپنی شرح ''عون الباری'' میں بھی لکھا کہ سلف سے ایمان کا مفہوم قول وعمل یزید وینقص منقول ہوا تھا جس طرح کہ لالکائی نے کتاب السنۃ میں نقل کیا اور انہوں نے حضرات صحابہ وتابعین کا بھی یہی قول لکھا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کے قول پر نظر

تو اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ کے مذکورہ بالا الفاظ سے کچھ غلط فہمی ہو سکتی ہے اور نواب صاحب نے تو پورا مغالطہ دیا ہے، ہم جلد اول صفحہ ۸۹ میں عمدۃ القاری کے حوالے سے علامہ لالکائی کی تحقیق نقل کر آئے ہیں اور یہ بھی بتلا دیا تھا کہ بقول حضرت شاہ صاحب امام بخاریؒ نے سلف کی طرف پورا قول منسوب نہیں کیا' لالکائی نے جو سلف کا قول نقل کیا تھا' اس میں **قول و عمل یزید بالطاعته و ینقص بالمعصیته** تھا (ایمان قول و عمل ہے جو طاعت سے بڑھتا اور معصیت سے گھٹتا ہے اور لالکائی نے اسی کے بعد یہ لکھا تھا کہ صحابہ و تابعین کا بھی یہی قول تھا۔

نواب صاحب کا مغالطہ

نواب صاحب نے مختصر بات کو نقل کر کے اسی کو لالکائی کے حوالہ سے سلف کی طرف منسوب کر دیا اور پھر اسی کو صحابہ و تابعین کا قول بنا دیا' حافظ ابن تیمیہؒ کی عبارت سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ائمہ حنفیہ نے کوئی لفظ خلاف کتاب و سنت استعمال کیا' حالانکہ یہ بھی غلط ہے در حقیقت جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بسط الیدین کے صفحہ ۴ پر فرمایا' سلف کے جس قول کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ خود ان کا مختار ہے سلف نے یہ کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے یہ قول صحابہ سے لیا ہے دوسرے یہ کہ سلف کے قول میں بھی حسب روایت علامہ لالکائی تفصیل تھی' وہ اجمال نہیں تھا جو امام بخاریؒ یا اب نواب صاحب مرحوم نے نقل کیا ہے۔

اجمال و تفصیل کا فرق

اس کے بعد گزارش ہے کہ اجمال سے تو ہمیں انکار نہیں کہ وہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے' جو امام بخاری وغیرہ نے لیا' مگر تفصیل سے صاف مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ یا معاصی سے ایمان کی کیفیت نور یا ظلمت میں کمی زیادتی ہوتی رہی ہے' یعنی فرمانبرداری اور طاعات سے ایمان کی کیفیات بڑھتی ہیں اور نافرمانی و معاصی سے اس کی روحانی کیفیات میں کمزوری آتی ہے، تو اس تفصیلی جملہ کو اعمال کی جزئیت کی دلیل بنانا صحیح نہیں' ظاہر ہے ایمان (تصدیق قلبی اذعان) کی جنس اور ہے اعمال کی جنس اور۔ اعمال کی وجہ سے ایمانی کیفیت میں کمی و بیشی تو ضرور سمجھ میں آتی ہے اس کی وجہ سے خود ایمان کی کمیت و مقدار میں کمی و بیشی متصور نہیں ہے جس کی تائید دوسرے اکابر امت کے اقوال سے یہاں اور پہلے بھی پیش کی گئی۔

بدع الالفاظ کی بات

رہی بدع الالفاظ والی تنقید تو وہ اس لئے صحیح نہیں کہ کتاب و سنت' یا صحابہ و تابعین سے ایمان کی حد و تعریف خاص الفاظ سے ماثور نہیں ہے کہ اس کے خلاف کو بدع الالفاظ کہا جائے' بلکہ اس قسم کی تشریحات و توضیحات کی جب ضرورت پیش آئی تو سب سے پہلے حضرت امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب و تلامذہ ہی کو یہ خدمت انجام دینی پڑی' ان کے بعد آپ کے تلامذہ کے طبقہ میں امام بخاری اور دوسرے شیوخ صحاح ستہ وغیرہم کے اساتذہ آئے ہیں اس لئے جو بات امام بخاری وغیرہ نے اپنے اساتذہ و شیوخ سے نقل کی ہے اس سے زیادہ بہتر تو یہ تھا کہ ان شیوخ کے شیوخ سے لیتے' کہ وہ ان کے بھی سلف تھے اور انہوں نے براہ راست تابعین سے علم و فیض حاصل کیا تھا' پھر اگر انصاف کیا جائے تو یزید و ینقص والا قول بھی صحیح ہے کہ مراد کیفیات کی کمی بیشی ہے اور لا یزید و لا ینقص بھی صحیح کہ اصل ایمان ایک محفوظ درجہ ہے' جو مدار نجات ہے۔

غرض ائمہ حنفیہ بھی پہلے معنی کے لحاظ سے زیادتی و نقصان ایمان کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے معنی سے جو وہ انکار کرتے ہیں' اس میں ان کے ساتھ دوسرے ائمہ و اکابر امت ہیں۔ اس سلسلہ میں مغالطے جو کچھ بھی اور جس کو بھی ہوئے وہ دور دور کے اندازوں کے سبب ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

افادہ انور

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول یہ بھی مروی ہے۔ **الایمان یزید و لا ینقص** (ایمان بڑھ کر رہے گا، گھٹ کر نہیں رہے گا) یہ میرے نزدیک حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قول سے ماخوذ ہے، جوانہوں نے مسلم کو کافر کے مال کا وارث قرار دے کر اور کافر کو مسلم کے مال کا وارث قرار نہ دیتے ہوئے فرمایا تھا "**الاسلام یزید و لاینقص**' ابوداؤد کتاب الفرائض) اس کی شرح میں محدثین نے لکھا ہے ای **یعلو و لایعلی**، یعنی اسلام بلند ہوتا ہے، نیچا نہیں ہوتا۔

۴۴- **حدثنا الحسن بن الصباح سمع جعفر بن عون حدثنا ابوالعبس اخبرنا قیس بن مسلم عن طارق ابن شهاب عن عمر بن الخطاب ان رجلا من الیهود قال له یآ امیر المؤمنین ایة فی کتاب بکم تقرؤنها ونها لو علینا معشر الیهود نزلت لاتخذنا ذلک الیوم عیداً قال ای ایة قال الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ؕقال عمر قدعرفنا ذلک الیوم والمکان الذی نزلت فیه علیٰ النبی صلی الله علیه وسلم وهو قآئم بعرفة یوم جمعة.**

ترجمہ:- حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین! تمہاری کتاب (قرآن) میں ایک آیت ہے جسے تم پڑھتے ہو، اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس (کے نزول کے) دن کو یوم عید بنا لیتے آپ نے پوچھا وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے جواب دیا (یہ آیت کہ) "آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "ہم اس دن اور اس مقام کو خوب جانتے ہیں، جب یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی (اس وقت) آپ عرفات میں جمعہ کے دن کھڑے ہوئے تھے۔

تشریح:- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کا دن، اور عرفہ کا دن ہمارے یہاں عید ہی شمار ہوتا ہے اس لئے ہم بھی ان آیتوں پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں، پھر عرفہ سے اگلا دن عیدالاضحیٰ کا ہوتا ہے اس لئے جتنی خوشی اور مسرت ہمیں ہوتی ہے تم تو کھیل تماشوں اور لہو ولعب کے سوا اتنی خوشی منا بھی نہیں سکتے۔

بظاہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودی کے جواب میں یہاں صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں وہ دن اور وہ جگہ معلوم ہے جہاں یہ آیت اتری ہے، لیکن یہاں حدیث میں اختصار ہوا ہے اسحٰق بن قبیصہ کی روایت میں اس طرح ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ آیت جمعہ و عرفہ کے دن اتری ہے اور یہ دونوں دن بحمد اللہ ہماری عید کے دن ہیں۔

ترمذی میں ہے کہ یہودی کے سوال پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ آیت تو اس دن اتری ہے کہ ہماری ایک چھوڑ دو عیدیں تھیں، جمعہ بھی تھا اور عرفہ بھی، غرض جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہماری تو اس دن میں عیدیں ہی ہوتی ہیں۔ یعنی جمعہ[1] کو اور عرفہ کے دن کو اس لئے عید کہہ سکتے ہیں کہ اس سے ملا ہوا دن عید کا ہے یا اس لئے کہ آیت مذکورہ بعد عصر نازل ہوئی گویا عید کی رات میں اتری، رات شریعت میں دن سے پہلے ہوتی ہے۔

امام نووی نے لکھا کہ اس دن میں دو شرف اور دو فضیلت جمع ہوئیں جمعہ کی اور عرفہ کی، اس لئے ہم اس دن کی ڈبل تعظیم کرتے ہیں اور ہم نے نہ صرف اس دن کی عظمت کی بلکہ اس مقام کی بھی جہاں اتری ہے کہ عرفات کا مقام ہمارے یہاں نہایت عظمت و رفعت کا مقام ہے، اسی

---

[1] ابن جریر طبری نے تہذیب الآثار میں روایت نقل کی ہے کہ یوم جمعہ یوم عیدالاضحیٰ سے بھی افضل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اشہر (مہینوں) میں سے ماہ رمضان افضل ہے، انہر سال کے دنوں) میں سے عرفہ کا دن افضل ہے، ہفتہ کے دنوں میں جمعہ کا دن افضل ہے عاشوروں میں سے ذوالحجہ کا ابتدائی عاشورا (دس دن) افضل ہیں (کذا افادنا الشیخ الانورؒ)

لئے حضرت عمرؓ نے نہ صرف زمانہ کے شرف کی طرف اشارہ فرمایا بلکہ مقام کے شرف وعظمت کو بھی ظاہر کیا اور جس حالت میں وہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھی اس کو بھی ذکر فرمایا' مطلب یہ کہ اس آیت کے نزول کے وقت' دن' مقام' اور حالت کو حضور اونٹنی پر سوار تھے' سب ہی ہماری نظروں میں ہیں ان سب چیزوں کی عظمت و مسرت جو کچھ ہمارے دلوں میں ہونی چاہئے' ظاہر ہے۔

مسلمانوں کی عید کیا ہے

دوسرے اہل مذہب وملل کے مقابلہ میں ہماری عید کی شان بالکل الگ ہے وہ لوگ اس دن میں کھیل تماشہ' تفریحی مشاغل وغیرہ سے دل بہلاتے ہیں ہماری عید کے دن وہ ہیں جن میں حق تعالیٰ کے روحانی انعامات کی بارش ہوتی ہے' ہر نیک عمل کا اجر وثواب بڑھ جاتا ہے' خدا کی مغفرت اور دعاؤں کی قبولیت کے دروازے کھل جاتے ہیں' عبادت کی پابندی میں اضافہ ہو جاتا ہے' مثلاً ہفتوں کی اور نمازوں کو اگر ہر جگہ اور بغیر جماعت کے بھی ادا کر سکتے تھے' تو جمعہ کی نماز بغیر جماعت کے اور بجز شہر کی جامع مسجدوں کے دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ واری عید کا دن ہے پھر سال واری دونوں عیدوں میں تو مستقل ایک نماز ہی کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کو شہر سے باہر میدان میں نکل کر پورے اہتمام ومظاہرہ کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے اور ایک سے پہلے صدقہ فطر' دوسری کے بعد قربانی کے حکم نے بھی یہی بتلایا کہ دنیا میں تمہاری عیدیں اسی شان سے سب غیروں کی عیدوں سے الگ طریقہ پر ہوں گی اور ان کے نتائج میں جو ہمیشہ ہمیشہ کی خوشی والی' اور دل کی امنگیں پوری آزادی کے ساتھ پوری کرنے کی عیدیں آنے والی ہیں وہ سب جنت میں حاصل ہوں گی' جہاں عیدین کے دن دربار عام میں حق تعالیٰ کے دیدار کا شرف حاصل ہوا کرے گا۔

انبساط عید دیدن روئے تو عیدگاہ ماغریباں کوئے تو

افادات انور

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں حدثنا الحسن بن الصباح سمع لکھا گیا ہے اور اس طرح بغیر انہ کے لکھا جاتا ہے مگر پڑھنے میں انہ سمع پڑھنا چاہئے'' فرمایا:۔ یہودیوں کو آیت **اکملت لکم دینکم** پر اس لئے خیال ہوا کہ تورات وانجیل میں کوئی آیت اس قسم کی نہیں ہے' اس لئے کہ اس میں پورا اطمینان دلایا گیا ہے اور اسلام کے مکمل ترین ادیان ہونے کا یقین دلایا ہے اور **رضیت لکم الاسلام** سے سب سے بڑی اور آخری نعمت بھی دیئے جانے کا اظہار ہے' کیونکہ رضا ہی انتہا سفر ہے' جس کو عارفین مقام رضا کہتے ہیں' اور جنت میں سب سے آخری یہی نعمت حاصل ہوگی۔

دوسرے اس آیت کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ بطور فذلکۂ قرآن ہے جس طرح حساب کے آخر میں ٹوٹل ومیزان ہوتی ہے کہ اس میں سب کا خلاصہ آ جاتا ہے۔

ردِ بدعت:۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ آیت **الیوم اکملت لکم دینکم** سے بدعات و محدثات فی الدین کا بھی رد ہو جاتا ہے کیونکہ دین کی سب باتیں مکمل ہو چکیں' اب دین کے نام پر کوئی بات جاری کرنا ہی بدعت وگمراہی ہے جو وعید **کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار** کا مستحق بنا دیتی ہے اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **ایاکم و محدثات الامور** (یعنی دین کے اندر نئی نئی باتیں نکالنے سے بچتے رہنا۔ یہی باتیں دین وطریق سنت سے دور کرنے والی ہیں' غرض رد بدعت کے لئے اس آیت مبارکہ کو پیش کر سکتے ہیں۔

نواب صاحب اور عدم تقلید

مگر نواب صدیق حسن خان صاحب نے عون الباری میں لکھا کہ ''اس آیت سے معلوم ہوا دین کا کمال قرآن وحدیث کے ذریعہ حاصل ہو چکا اور اب کوئی ضرورت ان دونوں کے سوا کسی امر کی ایمان کے راستہ پر چلنے کے لئے باقی نہیں رہی' لہٰذا ان دونوں سے کھلا ہوا رد اہل تقلید واصحاب الرائے کا ہو گیا۔''

کون نہیں جانتا کہ زندگی کے لاکھوں مسائل ایسے ہیں جن کے لئے جواز وعدم جواز کا کھلا ہوا فیصلہ قرآن وحدیث میں درج نہیں ہے اور ایسے ہی غیر منصوص مسائل میں قرآن وحدیث کے اصول وقواعد کے تحت **اجتهاد و تفقه فی الدین** کے ذریعے فیصلے کئے گئے اور یہ طریقہ حضرات صحابہ وتابعین اور زمانہ خیر القرون ہی سے شروع ہو گیا تھا اور اس سلسلہ میں بعد کے لوگوں نے اپنے سلف کے علم ودیانت پر اعتماد کیا' یہ اعتماد اس امر کے پورے اطمینان کر لینے کے بعد کیا جاتا رہا ہے کہ سلف نے استنباط مسائل میں قرآن وسنت کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا' اور جس مسئلہ میں بھی اس کے خلاف کوئی بات کسی وقت بھی ظاہر ہوئی یا ہو گی تو اس پر اعتماد کا سوال باقی نہیں رہتا' تقلید اس کے سوا اور کیا ہے؟ رہا اصحاب الرائے کا طعنہ اس کے بارے میں مقدمہ میں کافی لکھا جا چکا ہے' **والله اعلم و علمه اتم و احکم۔**

باب الزکوٰة من الاسلام و قوله تعالیٰ و مآ امروا الا لیعبدو ا الله مخلصین له الدین حنفآء ویقیموا الصلوٰة ویؤتوا الزکوٰة وذلک دین القیمة۔

(زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان (اہل کتاب) کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ یکسوئی واخلاص کے ساتھ صرف خدا کی عبادت کریں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں یہی مستحکم دین ہے۔

۴۵—حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک بن انس عن عمه ابی سهیل بن مالک عن ابیه انه سمیع طلحة بن عبید الله یقول جآء رجل الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم من اهل نجد ثآئر الراس نسمع دوی صوته ولانفقه مایقول حتیٰ دنا فاذا هویسأل عن الاسلام فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم خمس صلوات فی الیوم واللیلة فقال هل علی غیرها قال لاالا ان تطوع قال رسول الله صلی الله علیه وسلم وصیام رمضان قال هل علی غیره قال لا الا ان تطوع قال وذکرله رسول الله صلی الله علیه وسلم الزکوٰة قال هل علی غیرها قال لاالا ان تطوع قال فادبرالرجل وهو یقول والله لآ ازید علی هٰذا ولاانقص قال رسول الله صلی الله علیه وسلم افلح ان صدق.

ترجمہ:-طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ ایک پراگندہ بال نجدی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اس کی آواز کی گنگناہٹ تو ہم سنتے تھے مگر اس کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی' جب وہ قریب آ گیا تو (معلوم ہوا کہ) وہ اسلام کے بارے میں کچھ آپ سے دریافت کر رہا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دن' اور رات (کے سب اوقات) میں پانچ نمازیں (فرض) ہیں' اس پر اس نے کہا' کیا اس کے علاوہ بھی (اور نمازیں) مجھ پر فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا' نہیں' لیکن اگر تم نفل پڑھنا چاہو (تو پڑھ سکتے ہو) اور رمضان کے روزے فرض ہیں' اس نے کہا' ان کے علاوہ (اور روزے مجھ پر فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں' مگر نفل روزے رکھنا چاہو (تو رکھ سکتے ہو) طلحہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) اس سے زکوٰۃ (کے فرض ہونے' کو بیان کیا (تو) اس نے کہا' کیا اس کے علاوہ (کوئی صدقہ) مجھ پر فرض ہے؟ آپ نے فرمایا' نہیں' مگر جو (خیرات) تم اپنی طرف سے کرنا چاہو' طلحہؓ کہتے ہیں کہ پھر وہ شخص یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا' خدا کی قسم! نہ اس پر (کوئی چیز) گھٹاؤں گا اور نہ بڑھاؤں گا۔ (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کہ اگر یہ شخص (اپنی بات میں) سچا رہا تو کامیاب ہے۔

تشریح: کامیاب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی سرفرازی اسے نصیب ہو گی' آپؐ نے سائل کو اسلام کے وہ بنیادی احکام بتلا دیے کہ جن پر اسلامی زندگی کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے اور یہ ہی بنیادی احکام اپنی جگہ اسلامی اخلاق کی نشو ونما کے لیے سرچشمہ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں' اگر عقیدہ کی پختگی' اور صحیح اسلامی مزاج کے ساتھ اسلام کی ان بنیادی حقیقتوں کو اپنا لیا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آدمی کی سیرت کا کوئی گوشہ ناقص رہ جائے' جس کی بدولت کسی ناکامی سے دوچار ہونا پڑے۔

اور یہ سائل کی سادگی اور اخلاص کی بات ہے کہ اس نے احکام میں کسی کمی بیشی کو گوارا نہیں کیا' اگر چہ بخاری نے باب الصیام میں اس روایت میں یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے کہ ان احکام کے بعد رسول اللہ نے اسے اسلام کے تفصیلی احکامات بھی بتلائے بہر صورت حدیث کے مفہوم و مطلب میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بحث ونظر: آنحضرت اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں مختلف مقامات سے وفود پہنچے ہیں۔ جنہوں نے اسلام وایمان کے بارے میں سوالات کر کے آپ سے جوابات حاصل کئے ہیں' ان ہی میں سے ضمام بن ثعلبہ کی بھی حاضری ہوئی ہے' حضرت انسؓ سے جو روایات صحیحین' ابو داؤد اور مسند احمد مروی ہیں' ان میں اس طرح ہے کہ اہل بادیہ میں سے ایک شخص حاضر ہوا اور آپ کی رسالت' خالق سمٰوات وارض وغیرہ کے بارے میں سوالات کئے' پھر فرائض وشرائع اسلام کے بارے میں دریافت کیا' اس نے سن کر کہا کہ میں اپنی قوم کا فرستادہ ہوں اور میں ضمام بن ثعلبہ اخو بنی سعد بن بکر ہوں' پھر یہ بھی کہا'' **لا ازید علیهن شیئا و لا انقص منهن یشاء**'' حضورؐ نے فرمایا:۔ اگر یہ سچا ہے تو ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت ضمام کا سال حاضری

پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت ضمام کی آمد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کس سال ہوئی ہے' ابن اسحٰق وابو عبیدہ وغیرہ کی رائے ہے کہ ۹ھ میں پہنچے ہیں اور واقدی ۵ھ میں فرماتے ہیں' ہمارے حضرت شاہ صاحب نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے' علامہ قرطبیؒ کی رائے ہے کہ اسی وقت جب کہ یہ سوال فرما رہے ہیں' اس وقت اسلام بھی لائے ہیں مگر امام بخاریؒ وغیرہ کا رجحان اس طرف ہے کہ اسلام تو وہ اسی وقت لے آئے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ان کے پاس پہنچا تھا اور جس وقت یہ اپنی قوم کی طرف سے آئے ہیں تو آپ کے ارشادات سن کر اپنے سابق اسلام وایمان کی مزید توثیق واظہار کیا ہے۔

دوسری حدیث اسی طرز کی اور آتی ہے' جو حضرت طلحہؓ سے مروی ہے اس میں بھی ایک بدوی کا آنا' آپ سے سوالات کرنا' اور جوابات سن کر اسی طرح **واللہ لا ازید علیهن ولا انقص منهن** کہنا پھر حضرت کا **قد افلح ان صدق**' فرمانا منقول ہے' یہ بھی صحیحین' ابوداؤد و مسند احمد وغیرہ میں مروی ہے' اور اس وقت ہمارے پیش نظر یہی طلحہ والی حدیث الباب ہے' اور یہاں یہ بحث ہوئی ہے کہ اس میں جس بدوی کا ذکر ہے یہ بھی وہی ضمام ہیں' یا کوئی دوسرے شخص ہیں۔

حافظ عینی کی رائے

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ قاضی (عیاض) کی رائے یہ ہے کہ یہ بھی ضمام ہی کا واقعہ ہے، اور استدلال کیا کہ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ کی روایت باب القرأۃ والعرض علی المحدث میں آنے والے اور سوال کرنے والے کا نام ضمام ہی لکھا ہے اس طرح گویا حضرت طلحہؓ اور حضرت انسؓ دونوں کی روایات کا تعلق ایک ہی قصہ سے ہوگیا، پھر قاضی ہی کا اتباع ابن بطال وغیرہ نے بھی کیا، لیکن اس میں گنجائش کلام ہے، کیونکہ دونوں حدیث کے الفاظ میں فرق وتبائن ہے، جیسا کہ اس پر علامہ قرطبی نے بھی تنبیہ کی ہے، دوسرے یہ کہ ابن اسحاق اور بعد کے حضرات ابن سعد اور ابن عبدالبر نے ضمام کیلئے حضرت انسؓ والی حدیث کے علاوہ دوسری ذکر نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قصہ ایک نہیں دو ہیں، (عمدۃ القاری ص ۳۱۰)

حافظ ابن حجر کی رائے

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ جس شخص کا یہاں ذکر ہے' ابن بطال وغیرہ نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ یہ ضمام ہی ہیں' کیونکہ امام مسلم نے ان کا قصہ حدیث طلحہؓ کے بعد متصلاً ذکر کیا ہے اور دونوں میں بدوی کا آنا اور آخر میں **لا ازید علی هذا و لا نقص منهن** کہنا منقول ہے' لیکن علامہ قرطبی نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ دونوں حدیث کا سیاق الگ الگ ہے اور دونوں کے سوالات بھی مختلف ہیں' پھر بھی یہ

دعویٰ کرنا کہ قصہ ایک ہی ہے، محض دعویٰ اور بے ضرورت تکلف ہے، واللہ اعلم

بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں ابن سعد و ابن عبدالبر وغیرہ کے حضرت ضمام کے لیے صرف حدیث انسؓ کے ذکر سے بھی استدلال کیا ہے، مگر وہ ایسی لازمی بات نہیں، جس سے کوئی قوت دلیل مل سکے۔ (فتح الباری صفحہ ۱/ ۷۹)

اوپر کی دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ حافظ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں کے نزدیک ترجیح بجائے ایک قصہ بنانے کے دو الگ قصوں کو ہی ہے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ابن سعد وغیرہ کے عدم ذکر سے حافظ عینی کے نزدیک ان کے نظریہ کو قوت ملتی ہے اور حافظ اس کو اس طرح نہیں سمجھتے۔ اس لیے ایضاح البخاری میں جو رائے حافظ ابن حجر کی طرف منسوب ہوئی ہے اس کو ہم نہیں سمجھ سکے، **و اللہ اعلم و علمہ و احکم۔**

حضرت شاہ صاحب کی رائے

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے بھی یہی ہے کہ دونوں قصے الگ ہیں، البتہ دونوں میں کئی وجوہ سے مشابہت ضرور ہے۔

اتمام و قضاء نوافل

حدیث الباب کے تحت ایک بحث یہ ہے کہ نفل شروع کرنے سے ان کو پورا کرنا اور کسی وجہ سے فاسد ہو جائے تو اس کی قضا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ احناف اس کی قضا کو لازم و واجب قرار دیتے ہیں، شوافع اور دوسرے حضرات حج کے علاوہ اور تمام نفلی عبادت کی قضا ضروری نہیں سمجھتے۔

شوافع کا استدلال

ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض بیان فرمانے کے بعد فرمادیا کہ اب کوئی اور فریضہ نہیں رہا، اس کے بعد تم نفلی عبادت کر سکتے ہو، گویا استثنا منقطع ہوا جس میں مستثنیٰ منہ سے خارج ہوتا ہے، مستثنیٰ منہ میں فرائض و واجبات تھے اور مستثنیٰ میں نوافل و مستحبات ہیں اور چونکہ استثناء میں اصل اتصال ہے، انقطاع نہیں، اس لیے شوافع کو ایسے قرائن و دلائل کی بھی ضرورت ہوئی جن سے اصل کو چھوڑنے کا جواز مل سکے، چنانچہ انہوں نے نسائی کتاب الصوم سے ایک روایت پیش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی نفلی روزے کی نیت فرماتے تھے اور پھر افطار فرمالیتے تھے، اور بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے جویریہ بنت حارث کو جمعہ کے دن روزہ شروع کرنے کے بعد افطار کا حکم دیا تھا، حافظ نے فتح الباری صفحہ ۱/ ۷۹ میں اسی طرح استدلال کیا ہے۔

حافظ کا تسامح اور عینی کی گرفت

حافظ عینی نے عمدۃ القاری صفحہ ۱/ ۳۱۱ میں حافظ پر گرفت کی کہ یہ انصاف کی بات نہیں ہوئی کہ حافظ نے اپنے مسلک کے موافق احادیث تو لکھیں اور دوسری احادیث نہ لکھیں، جن سے ثابت ہے کہ نفل عبادت شروع کرنے پر اس کا اتمام ضروری ہو جاتا ہے اور بصورت افساد قضاء واجب ہے۔

حنفیہ کے دلائل

چنانچہ امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت درج کی ہے، میرا اور حفصہ کا ایک دن روزہ تھا، کہیں سے بکرے کا گوشت آ گیا، ہم دونوں نے کھالیا اور روزہ ختم کر دیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ہم نے یہ واقعہ ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس کی جگہ ایک روزہ دوسرے دن رکھنا ہوگا'' دوسری روایت میں ہے کہ اس کے بدلہ میں دوسرے دن روزہ رکھنا۔ اس حدیث میں آپ نے قضاء کا حکم فرمایا، اور امر وجوب کے لیے ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ اس کو شروع کرنے کے بعد پورا کرنا

ضروری ہے، ورنہ قضا واجب ہوگی' نیز دار قطنی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ نفلی روزہ رکھا' پھر توڑ دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اس کی جگہ ایک دن روزہ رکھیں۔ حدیث نسائی سے جو معلوم ہوا کہ آپ روزہ رکھتے تھے پھر توڑ دیتے تھے' تو اس میں یہ تو ذکر نہیں ہے کہ آپ اس کی قضاء بھی نہیں کرتے تھے' دوسرے یہ کہ آپ کا افطار کسی عذر سے ہوتا تھا' اس طرح آپ نے حضرت جویریہ کو بھی کسی عذر ضیافت وغیرہ کے وقت افطار کی اجازت دی تھی' اور اگر روایات میں تعارض بھی مان لیا جائے تو تین وجہ سے حنفیہ کے مسلک کو ترجیح حاصل ہے اول صحابہ کا اجماع' دوسرے ہماری تائید میں احادیث مثبتہ ہیں اور شوافع کے پاس احادیث نفی والی ہیں اور قاعدہ سے مثبت کو نافی پر ترجیح ہے' تیسرے یہ کہ عبادات میں احتیاط کا پہلو بھی یہی ہے کہ قضاء ضروری ہو۔

مالکیہ حنفیہ کے ساتھ

"الا ان تطوع" سے صرف حنفیہ نے استدلال نہیں کیا' بلکہ مالکیہ نے بھی کیا ہے' امام مالک نے کسی نفل کو شروع کرنے کے بعد بلاوجہ فاسد و باطل کرنے پر قضا کو واجب کہا ہے' اور افساد حج کی صورت میں تو سب ائمہ نے بالاتفاق قضاء کو واجب قرار دیا ہے' حنفیہ نے تمام عبادات کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے۔

سب سے عمدہ دلیل حنفیہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے لیے سب سے بہتر و عمدہ استدلال وہ ہے' جس کو صاحب بدائع نے اختیار کیا' اور کہا کہ نذر دو قسم کی ہیں' قولی جو مشہور ہے' اور فعلی یہی ہے کہ کوئی نفل عبادت شروع کی تو گویا اپنے عمل و فعل سے اس کو پورا کرنے کی نذر کر لی' لہٰذا اس کو بھی پورا کرنا واجب ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ آیت لا تبطلوا اعمالکم سے استدلال زیادہ اچھا نہیں' کیونکہ آیت کا بطلان ثواب ہے' بطلان فقہی نہیں ہے' لہٰذا وہ لا تبطلوا صدقا تکم بالمن و الا ذی کی طرح ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا فیصلہ

پھر فرمایا کہ میں نے اس بحث کا فیصلہ دوسرے طریقہ سے کیا ہے وہ یہ کہ حدیث الباب کو بھی موضوع نزاع سے غیر متعلق کہا' کیونکہ اس میں تو اس ایجاب سے بحث ہے جو وحی الٰہی کے ذریعہ ہو' اور مسئلہ لزوم نفل کا تعلق شروع کرنے نہ کرنے سے ہے' جو خود بندہ کے اختیار و ارادہ سے شروع کر کے اپنے اوپر لازم کر لینے کا معاملہ ہے۔

بحث وجوب وتر

حدیث الباب میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہوا کہ دن و رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں باقی سب نمازیں نفل ہیں تو وتر کو واجب کہنا کس طرح صحیح ہوگا؟ حنفیہ کی طرف سے اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ان اللہ امدکم بصلوٰۃ ھی خیر لکم من حمر النعم (ابوداؤد) اللہ تعالیٰ نے ایک نماز کا اضافہ فرمایا ہے جو تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے' اس حدیث سے اس امر کا بھی اشارہ ملا کہ پہلے پانچ نمازیں ہی فرض تھیں' پھر ایک نماز وتر کا اضافہ ہوا' جس کا درجہ فرض سے کم' سنت سے اوپر' واجب کا قرار پایا۔

(۲) من نسی الوترا و نام عنھا فلیصلھا اذا ذکر ھا ' (مسند احمد) جو وتر کی نماز بھول گیا' یا اس کے وقت سو گیا' تو اسے یاد آنے پر پڑھ لینا چاہئے۔

(۳) الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا' الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا' الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا (ابوداؤد) نماز وتر حق (واجب ہے' جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں' وتر حق ہے' جس نے اس کو ادا نہ کیا وہ ہماری جماعت سے خارج ہے' وتر حق ہے' پس جو بھی اس کو ادا نہ کرے گا وہ ہم میں

سے نہیں اسی طرح بکثرت احادیث میں وتر کی نہایت تاکید ہے، جس سے وجوب کا درجہ مفہوم ہوتا ہے، ان کا ذکر اپنے مواقع پر آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں وتر کے وجوب کے لیے یہ طریق استدلال صحیح نہیں کہ حدیث الباب میں وتر کا ذکر ہی تو نہیں ہے، اور عدم ذکر ذکر عدم کو لازم نہیں، چنانچہ یہاں توحج کا بھی ذکر نہیں ہے اور صدقہ فطر کا بھی نہیں، جو امام بخاری کے نزدیک فرض ہے اس لیے امام بخاری نے اسی حدیث کا ایک ٹکڑا دوسری جگہ یہ بھی نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو دوسرے شرائع اسلام بھی بتلائے تھے، تو اس میں حج وغیرہ کا ذکر ضرور ہوا ہوگا، غرض صرف اس حدیث کی وجہ سے انکار وجوب وتر صحیح نہیں۔

عدم زیادۃ ونقص

سائل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سن کر کہا کہ "واللہ میں اس پر نہ زیادتی کروں گا نہ کمی کروں گا" اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ وہ شخص اپنی قوم کا نمائندہ تھا، یا خود ہی اس کا ارادہ تھا کہ دوسروں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وہدایات پہنچاؤں گا، اس لیے کہا کہ میں دوسروں تک یہ پیغام بلا کمی وبیشی کے پہنچاؤں گا۔ اور حضور نے بطور تصویب واظہار مسرت فرمایا کہ یہ شخص اپنے ارادہ میں سچا ہے، تو آخرت کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام فرائض وشرائع کے بارے میں تو ہدایت فرمادی تھی، ان کے بعد سنن موکدات وغیرہ رہ جاتی ہیں، جن کا تقرر وتعین آپ کی زندگی کے آخری لحات تک ہوا ہے ان ہی کے بارے میں آپ نے اس کو مستثنیٰ فرمادیا، اور یہ شارع علیہ السلام کا منصب تھا، اس کے ثبوت میں بہت سے واقعات ملتے ہیں، جیسے آپ نے ایک شخص کے لیے قربانی میں ایک سال سے کم عمر کے بکرے کی اجازت دی، اور فرمادیا تمہارے بعد اور کسی کے لیے اجازت نہ ہوگی (مسند احمد صفحہ ۴/ ۲۹۸) یا ایک شخص نے روزہ رمضان کو جماع کے بغیر توڑ دیا، آپ نے غلام آزاد کرنے، پھر ساٹھ روزے رکھنے، پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا، مگر وہ عذر کرتا رہا، پھر آپ نے کفارہ کی کھجوریں دیں کہ ان کو صدقہ کرآؤ، اس نے کہا حضور! مجھ سے زیادہ مسکین مدینہ طیبہ میں نہیں ہے، آپ نے فرمایا تم ہی صرف کرلینا، مگر اس طرح کسی دوسرے کے لیے جائز نہ ہوگا وغیرہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

غرض ان واقعات کے تحت یہاں بھی ممکن ہے کہ حضور نے اس شخص کو سنن سے مستثنیٰ فرمادیا ہو، اس توجیہ کو حضرت شاہ صاحب نے اختیار فرمایا ہے اور علامہ طیبی کے کلام سے بھی اس کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے اور یہ توجیہ اس لیے زیادہ بہتر ہے کہ بعض روایات میں بجائے لا ازید ولا انقص کے لا اتطوع کہنا منقول ہے، کہ ان فرائض کے علاوہ تطوعات کی ادائیگی نہیں کروں گا۔

علامہ سیوطیؒ کے قول پر تنقید

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا:۔ اس توجیہ کے تحت یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرائض وواجبات سے کبھی کسی کو مستثنیٰ فرما سکتے تھے جیسا کہ علامہ سیوطی نے سمجھا کہ عبداللہ بن فضالہ کی حدیث[1] ابی داؤد صفحہ ۶۱ "باب المحافظۃ علی الصلوٰۃ" پر "مرقاۃ الصعود"،

---

[1] عبداللہ بن فضالہ نے اپنے والد ماجد سے روایت کیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تعلیم دی، اسی میں یہ بھی فرمایا کہ پانچ نمازوں کی حفاظت کرنا، میں نے عرض کیا کہ نماز کے اوقات میں مجھے مصروفیات رہتی ہیں، آپ مجھے ایسی کلی ہدایت دیں کہ اس کی رعایت کے ساتھ دین پر قائم رہ سکوں، آپ نے فرمایا کہ عصرین (صبح وعصر) کی نمازوں کا تو خاص اہتمام کرنا ہی ہوگا۔ (کیونکہ فجر کا وقت نوم وغفلت کا ہے اور عصر کا وقت کاروبار وغیرہ کی زیادہ مصروفیت کا) ذرا سی غفلت میں یہ دونوں نمازیں قضاء ہوسکتی ہیں، اسی لیے دوسری روایات میں بھی ان دونوں کے لیے خاص تاکیدات مروی ہیں، اس کے علاوہ ایک وجہ تخصیص واہتمام کی یہ بھی ہے کہ یہ دونوں نمازیں شب معراج سے پیشتر ہی سے فرض تھیں، شب معراج میں باقی تین نمازوں کا حکم مل کر پانچ ہوئیں (کما اشار الیہ الشیخ الانورؒ)

میں فرمادیا کہ شاید سائل کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین فرض نمازیں معاف فرمادی تھیں۔ اور عام حکم سے مستثنیٰ فرمادیا تھا' یہ بات درست نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خصوصی امتیاز کے سبب یہ تو کر سکتے تھے کہ کسی کے لیے مدار نجات وفلاح صرف اداء فرائض کو بتلادیں' اور یہی حدیث عبداللہ بن فضالہ کا محمل ہے مگر فرائض سے بھی مستثنیٰ فرمانے کا اختیار ثابت کرنا دشوار ہے۔

اہل حدیث کا غلط استدلال

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعض اہل حدیث اس حدیث سے استدلال کر کے سنن کے اہتمام میں تساہل برتتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ صرف فرائض کی اہمیت ہے' کیونکہ فلاح کے لیے صرف ان ہی کو کافی بتلایا گیا ہے' حقیقت یہ ہے کہ سنن واجبات کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور تاکیدی احکام سے ہوتا ہے' چنانچہ آپ سے اگر کسی عمل پر مواظبت کلیہ وہمیشگی اس طرح ثابت ہو کر کبھی بھی اس کو ترک نہ فرمایا ہو' مگر ترک پر وعید نہ فرمائی ہو تو محقق ابن نجیم صاحب بحر وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس سے سنت کا درجہ ثابت ہوتا ہے' شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر وغیرہ فرماتے ہیں کہ مواظبت مذکورہ سے وجوب کا حکم کردیں گے۔

اس موقع پر ایضاح البخاری میں بیان مذہب میں تسامح ہوا ہے جو مسلک ابن نجیم کا تھا وہ ابن ہمام کا ظاہر کیا گیا ہے' **فلیتنبه له** پھر اگر کسی کام کا حکم فرمایا' اور ترک پر وعید بھی فرمائی تو اس سے ابن ہمام وابن نجیم دونوں کے نزدیک وجوب کا حکم ہوگا اور اگر مواظبت کے ساتھ چند بار ترک بھی ثابت ہو تو اس سے دنوں کے یہاں سنت کا درجہ ثابت ہوتا ہے' اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الا ان تطوع فرمایا تھا' اس وقت مذکورہ قاعدہ سے نہ کسی عمل پر وجوب کا حکم ہوسکتا تھا نہ سنت کا' اس بارے میں صحیح آپ کے بعد آپ کے عمل مبارک کی نوعیت کا تعین کرنے کے بعد ہی ہوسکتا تھا' لہٰذا سنن میں تساہل کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی' اور اسی لئے صحابہ کرام سے بھی سنن کا نہایت اہتمام منقول ہے (کما حققہ الشیخ الانور)

ترک سنت کا حکم: اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کی بھی تحقیق فرمائی' کہ ترک سنت کا حکم کیا ہے؟ فرمایا کہ شیخ ابن ہمام کی رائے ہے کہ تارک سنت پر عتاب ہوگا' ابن نجیم کہتے ہیں کہ عذاب وعقاب ہوگا' میرے نزدیک یہ نزاع لفظی جیسا ہے' کیونکہ جس سنت کے ترک پر ابن نجیم عقاب فرمارہے ہیں' وہ ابن ہمام کے یہاں واجب کے درجہ میں ہے (جیسا کہ اوپر واضح ہوا' اور ظاہر ہے کہ ترک واجب بالاتفاق اثم ہے' لہٰذا اس صورت میں شیخ ابن ہمام کے نزدیک تو ترک واجب کے سبب عقاب ہوگا' اور ابن نجیم کے نزدیک ترک سنت مؤکدہ کی وجہ سے فرق اتنا ہوگا کہ ابن نجیم کے نزدیک ترک واجب کا گناہ بہ نسبت ترک موکدہ کے زیادہ ہوگا' اور میری رائے اس مسئلہ میں ابن نجیم کے ساتھ ہے۔

پھر فرمایا کہ میری رائے ابن نجیم کے ساتھ جب ہی ہے کہ سنت سے مراد وہی ہو' جس کا ذکر ہوا کہ وہ ابن ہمام کے وجوب والی سنت کے درجہ میں ہو' یعنی بجز ایک دوبار کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ترک ثابت نہ ہو اور اس میں میری رائے یہ بھی ہے کہ جس قدر ترک حضور سے ثابت ہے' صرف اسی قدر ترک میں گناہ نہیں ہے' باقی زیادہ ترک کرے گا تو گناہ ہوگا۔

سنت پر دوسری نظر: اس نقطہ نظر سے ہٹ کر اگر مطلق سنت پر نظر کریں تو میری رائے اتنی سخت نہیں ہے کیونکہ اس سے تمام امت کو گنہگار کہنا پڑے گا' جو مناسب نہیں ہے' اور اس کی دلیل بھی میرے پاس ہے کہ امام محمد نے موطا صفحہ ۳۸ میں فرمایا:۔

---

[۱] امام نووی نے شرح بخاری میں لکھا کہ لا اتطوع کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس کے ظاہری معنی ہی لیے جائیں کہ اس کا قصد یہی تھا نوافل نہیں ادا کرے گا (یعنی سنن ومستحبات) بلکہ صرف فرائض کی محافظت کرے گا' اور وہ بے شک فلاح یافتہ تھا اگرچہ ترک نوافل (سنن ومستحبات) پر مواظبت شرعاً مذموم ضرور ہے' اور اس کی وجہ سے آدمی مردود الشہادت بھی ہوجاتا ہے تاہم وہ ایسا گنہگار نہیں ہوتا کہ اس کی نجات وفلاح میں تردد کیا جائے' اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص نوافل کا پابند ہوگا وہ اس کے لحاظ سے فلاح میں زیادہ کامل ہوگا' واللہ اعلم (شروح البخاری صفحہ ۱/۲۳۳)

لیس من الامر الواجب الذی ان ترکہ تارک اثم (یہ ایسا امر واجب نہیں ہے جس کے تارک کو گناہ گار کہہ سکیں)۔ معلوم ہوا کہ کبھی ترک سنت پر گناہ نہیں ہوگا، جس طرح وضو میں تین بار دھونا سنت ہے، مگر اس سے کم میں بھی گناہ نہیں ہے۔

غرض میرے نزدیک ترک مذکور کو احیاناً یا بقدر ثبوت کے ساتھ مقید کرنا چاہئے۔ اور محقق ابن امیر الحاج (تلمیذ ابن ہمام) کا مختار بھی یہی ہے، مطلقاً ترک کو گناہ نہ سمجھنا صحیح نہیں، موصوف نے اسی لیے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جب ترک سنت کی عادت ڈال[1] لے گا تو گنہگار ہوگا۔

درجہ وجوب کا ثبوت

پھر فرمایا کہ امام محمدؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے یہاں معہود مرتبہ واجب کا ثبوت ہے، اسی لیے تو انہوں نے واجب کی تقسیم کی، اس مرتبہ کے جمہور قائل نہیں ہیں وہ امام شافعیؒ کے یہاں صرف حج میں ہے، اور ہمارے یہاں تمام عبادات مقصودہ میں ہے مبسوط میں بھی یہ درجہ موجود ہے، چونکہ امام طحاوی کی کتاب میں اس کا نام نہیں ہے حالانکہ وہ متقدمین میں سے ہیں اسی لیے میں نے امام محمدؒ کے الفاظ کو زیادہ اہمیت دی، میں نے مبسوط جوزجانی کا قلمی نسخہ سالم و مکمل دیکھا ہے

مراعات واستثناء

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حدیث الباب میں سائل کا واللہ لا اتطوع شیئا کہنا اسی لیے ہے کہ اس کو حضور نے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا، لیکن دوسرے افراد امت کو یہ مراعات حاصل نہیں ہے، جب کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مواظبت ثابت ہو جائے اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض طلباء خاص حالات و ضرورت کے تحت شعبان کے مقررہ وقت امتحان تحریری سے قبل ہی مہتمم مدرسہ سے مل کر اجازت حاصل کر لیں اور تقریری امتحان کرالیں، تو یہ ان کے لیے استثنائی صورت ہوگی، اس کی وجہ سے وہ عام قانون امتحان عام مخصوص عنہ البعض یا ظنی نہ بن جائے گا اسی طرح ہم پر ساری شریعت عائد ہے کسی طرح مراعات نہیں ہے کہ سنن و مستحبات میں تساہل کریں، علامہ قرطبی (شارح مسلم) نے بھی یہ لکھ کر کہ "یہ شخص مخصوص ہے"۔ اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

حلف غیر اللہ کی بحث

"افلح ان صدق دوسری جگہ بخاری میں اور مسلم و ابوداؤد میں بھی افلح وابیہ ان صدق اور ایک روایت میں افلح وابیہ ان صدق او دخل الجنۃ وابیہ ان صدق وارد ہوا ہے، اس میں غیر اللہ کی قسم ہے، جو ممنوع ہے، اور باپ کی قسم کھانے کا چونکہ رواج پڑ گیا تھا، اس لیے اس سے خاص طور پر بھی حدیث میں ممانعت آئی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی قسم کیوں کھائی؟ اس پر علماء نے کلام کیا ہے، علامہ شوکانی نے تو بے سوچے سمجھے حکم کر دیا کہ (العیاذ باللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سبقت لسانی ہوگئی (نیل الاوطار)

حضرت شاہ صاحب اور علامہ شوکانی

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شوکانی غیر مقلدوں کے بڑے مانے جاتے ہیں اور وہ خود بھی اپنی تقلید کو سب پر لازم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جیسے وہ ہیں ہمیں معلوم ہے، میں نے ایک مرتبہ بڑے جلسہ میں، جس میں ہزاروں غیر مقلد بھی تھے، اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند و مولانا

---

[1] راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اہل حدیث کا عدم اہتمام سنن اسی قبیل سے ہے کہ وہ قولاً و فعلاً سنن کو غیر اہم سمجھتے ہیں اور غالباً اسی طریقہ کو موجودہ وقت کے نجدی و حجازی حنبلی علماء، جو بہ نسبت حنبلیت کے غیر مقلدیت کی طرف زیادہ مائل ہیں، اختیار کئے ہوئے ہیں، مکہ معظمہ میں دیکھا کہ جمعہ کے روز زوال کے فوراً ہی بعد اذان جمعہ ہوتی ہے اور بمشکل دو رکعت پڑھی جا سکتی ہیں کہ اذان خطبہ پڑھوا کر خطبہ شروع کرا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سنن قبلیہ کا اہتمام نہ خود کرتے ہیں نہ دوسروں کو اس کا موقع دیتے ہیں، یہ سنن کے ساتھ تساہل نہیں تو اور کیا ہے۔

مرتضے حسن صاحب وغیرہ بھی وہاں موجود تھے، کہہ دیا تھا کہ کوئی مسئلہ لاؤ جس کا جواب میں بھی بغیر مراجعت کتب لکھوں اور شوکانی بھی لکھیں۔

علامہ شوکانی پر تنقید

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شوکانی کا جواب مذکور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بڑی بے جا جسارت ہے کہ آپ سے ایسی سبقت لسانی ہوگئی، جس میں شائبہ شرک تھا' اس لیے بھی غلط ہے کہ آپ سے یہ کلمہ دوسرے چار پانچ مواضع میں بھی ثابت ہے۔ پھر سبقت لسانی کی بات کیسے چل سکتی ہے؟!

علامہ زرقانی نے شرح موطا میں جواب دیا کہ حلف[1] بالآباء سے ممانعت بسبب خوف تعظیم غیر اللہ تھی' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں متہم نہیں ہو سکتے' اس لیے آپ کے وابیہ فرمانے پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ بعض نے جواب دیا کہ یہ ان کلمات کی طرح ادا ہوا جو بطریق عادت بلا قصد حلف زبان پر جاری ہو جایا کرتے ہیں اور ممانعت اس حلف کی ہے، جو قصدا اور تعظیماً غیر اللہ کے لیے ہو' بعض نے کہا کہ پہلے ایسا کہنا جائز تھا پھر منسوخ ہوا لیکن یہ جواب مہمل ہے۔ حافظ فضل اللہ تور بشتی نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا کہ:۔

بعض علماء نے یہاں نسخ کا دعویٰ کیا ہے تا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ سے جو اس قسم کے الفاظ منقول ہیں ان میں اور ممانعت حلف بغیر اللہ میں تطبیق ہو جائے' مگر یہ علماء کی لغزش ہے' کیونکہ نسخ ایسی چیزوں میں ہوا کرتا ہے جو حد جواز میں ہوں' اور روایت میں حلف غیر اللہ کو شرک قرار دیا گیا ہے' شرک ہر حالت میں اور ہمیشہ سے حرام ہے اور جو باتیں دین میں اخلاص پیدا کرنے والی اور توحید کو شوائب شرک جلی و خفی سے دور کرنے والی ہیں وہ تمام ادیان واز مان میں ضروری و واجب رہی ہیں لہٰذا نسخ والا جواب کسی طرح صحیح نہیں۔ بلکہ بہتر جواب یہ ہے کہ حدیث طلحہ بن عبید اللہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افلح الرجل و ابیہ ان صدق۔ وارد ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ حلف نہیں ہے' کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شرک سے بری تھے۔ لہٰذا آپ نے کلمہ وابیہ محض پختگی کلام کے لیے فرمایا تھا' حلف مقصود نہ تھا' رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی نسبت سے اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کہ ایسے کلمہ کا تلفظ بھی نہ فرماتے' پھر بھی آپ نے چند بار ایسے کلمات ارشاد فرمائے' تو ظاہر یہ ہے کہ یہ کلمات آپ نے ممانعت سے قبل فرمائے ہوں گے' اور اس کے بعد بالکلیہ ان سے بھی احتراز فرمالیا ہوگا' تا کہ دوسرے ناواقف لوگ ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں' واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سب سے بہتر جواب ایک حنفی عالم نے دیا ہے' یعنی[2] حسن چلپی نے حاشیہ مطول میں جس کو شامی نے بھی در المختار میں نقل کیا ہے' اس کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

قسم لغوی و شرعی

حدیث الباب میں وابیہ قسم لغوی ہے شرعی نہیں' اول سے مقصود صرف کلام کو مزین کرنا ہوتا ہے اور دوسری سے تاکید کلام مع تعظیم محلوف بہ ہوتی ہے' ممانعت اسی دوسری قسم کی ہے' اول کی نہیں' اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس قسم لغوی سے بھی اس لیے روکنے کی ضرورت ہے کہ لوگ اس معاملہ میں تساہل نہ برتیں' اس امر کی وضاحت و ثبوت کہ قسم لغو) سے محض تزئین کلام یا پختگی معاملہ کا بیان ہوتا ہے' اور تعظیم والی بات بالکل ملحوظ نہیں ہوتی' یہ ہے کہ بہت سے شعراء کے کلام میں دشمنوں' خردہ گیروں' اور مذموم لوگوں کے لیے بھی ان

---

[1] زمانہ نبوت میں بعض لوگ اپنے آباء کی قسم ا۔ ان کی تعظیم کے لئے کھاتے تھے' ۲۔ بعض عادت کے طور پر' بعض عصبیت کے سبب اور بعض پختگی کلام کے لیے' ان سب سے ممانعت کردی گئی' اگرچہ ان میں سے کسی کا گناہ کم اور کسی کا زیادہ تھا۔ [2] چلپی کے معنی رومی زبان میں مولانا کے ہیں' یہ مولانا حسن' مطول کے محشی ہیں' دوسرے اخی چلپی محشی شرح وقایہ ہیں' جو بعد کو ہوئے ہیں (کذا افادنا الشیخ الانورؒ)

کے آباء کے ساتھ حلف کا طریقہ مستعمل رہا ہے، ظاہر ہے کہ جن کی ہجو مقصود ہو یا ان کی برائیاں ذکر ہوں تو اس کے ساتھ وابیہ، وابیہم وغیرہ کلمات سے ان کی تعظیم ہرگز مقصود نہیں ہوسکتی، ہاں! تزیین کلام وغیرہ ہوسکتی ہے۔

شعراء کے کلام میں قسم لغوی

مشہور شاعر ابن میادہ کا قول ہے

اظنت سفاها من سفاهة رايها	لاهجرها لما هجتنى محارب
فلاوابيها اننى بعشيرتى	ونفسى عن ذلک المقام الراغب
بعمرابى الواشين ايام فلتقى	لما لا تلا قها من الدهر اكثر
يعدون يوم واحدان القيتها	وينسون ماكانت على النائى تهجر

نواب صاحب کی تحقیق

مولانا نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم نے حدیث الباب کے ذیل میں تطوع شروع کرنے پر اس کے لازم نہ ہونے کے دلائل پھر لازم ہونے کے حنفیہ کے دلائل ذکر کئے بلکہ بعینہ قسطلانی کی عبارت بغیر حوالے کے نقل کردی اور اپنی طرف سے صرف اتنی داد تحقیق دی کہ اول اولیٰ ہے اور اس کی کوئی وجہ و دلیل نہیں لکھی، گویا نواب صاحب کا ارشاد بے دلیل مان لینا چاہئے۔

قاضی بیضاوی کا جواب

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے جتنی قسمیں ذکر کی ہیں ظاہر ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کو ان کی تعظیم مقصود نہیں ہے بلکہ وہاں مقصد ان چیزوں کو بطور شہادت پیش کرنا ہے تاکہ بعد کو ذکر ہونے والی چیز کا ثبوت و وضاحت ان کی روشنی میں ہو جائے فقہی حلف و قسم کی صورت مقصود نہیں ہے اس کی مزید تفصیل حافظ ابن قیم کے رسالہ ''اقسام القرآن'' میں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب مذکور نقل فرما کر اپنی رائے کا اظہار فرمایا کہ قرآن مجید کی قسموں کے بارے میں یہ تحقیق بھی اچھی ہے اور اس صورت میں نحویوں سے چوک ہوئی کہ اس واؤ کو بھی واؤ قسم میں داخل کیا جس سے قسم معہود ہی کی طرف ذہن چلا جاتا ہے اگر اس کی جگہ وہ اس کو واؤ شہادت کہتے تو زیادہ اچھا ہوتا، نہ کوئی اعتراض متوجہ ہوتا، نہ اصل حقیقت سمجھنے میں کوئی الجھن پیش آتی۔

باب اتباع الجنآئز من الایمان (جنازہ کے پیچھے چلنا ایمان کی خصلتوں میں سے ہے)

۴۶- حدثنا احمد بن عبدالله بن على المنجو فى قال حدثنا روح قال حدثنا عوف عن الحسن و محمد عن ابى هريرةؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من اتبع جنازه مسلم ايمانا و احتسابا و كان معه حتىٰ يصلى عليها ويفرغ من دفها فانه يرجع من الاجر بقيراطين كل قيراط مثل احد و من صلى عليها ثم رجع قبل ان تدفن فانه يرجع من الاجر بقيراط تابعه عثمان الموذن قال حدثنا عوف عن محمد عن ابى هريره عن النبى صلى الله عليه وسم نحوه.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص ایمان اور نیت ثواب کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلے اور جب تک (اس کی) نماز پڑھی جائے اور لوگ اس کے دفن سے فارغ ہوں، وہ جنازے کے ساتھ رہے، تو وہ دو

قیراط ثواب کے ساتھ لوٹتا ہے، ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے اور جو شخص صرف (اس کی) نماز جنازہ پڑھ کر دفن کرنے سے پہلے واپس ہو جائے تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر آتا ہے۔

اس حدیث میں روح کی متابعت عثمان مؤذن نے کی ہے (یعنی انہوں نے اپنی سند سے یہ حدیث بیان کی) وہ کہتے ہیں ہم سے عوف نے محمد بن سیرین کے واسطے سے نقل کیا وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی روایت کے مطابق۔

تشریح:- ایک مسلمان کا آخری حق جو دوسرے مسلمانوں پر واجب رہ جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو اگلی منزل کے لئے نہایت اہتمام و توجہ سے رخصت کریں نہ یہ کہ جان نکلنے کے بعد اب وہ بالکل اجنبی بن جائے آخرت کے اس طویل سفر پر ہر مسلمان کو جانا ہے اس لئے اس سفر کی تیاری میں کوئی بے توجہی اور لاپرواہی نہ برتیں، پھر جب کہ خداوند کریم کی طرف سے اس خدمت پر اتنا بڑا ثواب ہے احد پہاڑ کے برابر جس کی مثال دی گئی ہے قیراط ایک اصطلاحی وزن ہے، یہاں اس کا وہ اصطلاحی مفہوم مراد نہیں، تمثیلاً اس وزن کا نام لیا گیا ہے منشا ثواب کی ایک بہت بڑی مقدار بیان کرنا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں ایمان کے ساتھ احتساب کا ذکر اسی لئے ہے کہ لوگ جنازہ کے ساتھ جانے کو محض آپس کے تعلق و مراسم کے تحت سمجھیں گے، آخرت کے اجر و ثواب سے غفلت برتیں گے، اس لئے تنبیہ فرمادی کہ اس کو بہ نیت ثواب کیا جائے گا تو اس کا بہت بڑا اجر ہے کیونکہ اس وقت مرنے والے کو پیچھے رہنے والوں کی امداد و اعانت کی شدید ضرورت ہے ان کی دعاء مغفرت و ایصال ثواب سے اس کی آخرت کی منزلیں آسانی سے طے ہو سکتی ہیں، جس طرح دنیا کی زندگی میں ضرورت مند غریبوں کو مالداروں کی امداد اور اموال زکوۃ و صدقات سے سہولتیں ملتی ہیں، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ امام بخاری نے باب الزکوۃ من الاسلام کے بعد **باب اتباع الجنائز من الایمان** کیوں ذکر کیا۔

جس طرح ایک بڑے سے بڑا نواب و رئیس بھی حالت سفر میں ہاتھ خالی اور بے یار و مددگار ہوتا ہے اور اسی لئے اس حاجات و ضروریات پوری کرانے کے لئے شریعت نے اس کے لئے زکوۃ و صدقات کو بھی جائز کر دیا اسی طرح مسافر آخرت خالی ہاتھ جا رہا ہے یا اگر کچھ اعمال و حسنات کی دولت ساتھ بھی ہے تو وہ اس کے اگلے بڑے سفر کے لئے ناکافی ہے اس لئے وہ اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے نیک اعمال کا سخت محتاج ہے اور چونکہ اس کے لئے معمولی نیکی کا ثواب بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کی چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا اجر و ثواب غیر معمولی طور پر بڑھا دیا ہے، جیسا کہ حدیث الباب سے ظاہر ہے۔ اور غالباً ایصال ثواب کے سلسلہ میں جو مثلاً کسی عمل کا ثواب تقسیم ہو کر نہیں بلکہ سب مردوں کو (جن کے لئے ایصال ثواب کیا گیا ہے) پورا پورا مل جاتا ہے اور اسی کو اکثر محققین نے راجح قرار دیا ہے وہ بھی اسی سبب سے اور حق تعالیٰ کی رحمت عامہ و خاصہ کے متوجہ ہونے کی وجہ سے ہے واللہ اعلم، اور غالباً اسی لئے شریعت مبارکہ نے مرنے کے بعد تجہیز و تکفین وغیرہ میں تاخیر کو غیر مستحب قرار دیا کہ ایک ضرورت مند کو جلد سے جلد پاک صاف کر کے نماز جنازہ اور ایصال ثواب کر کے خدا کے حضور پیش ہونے دو، تاکہ اس کے اعمال کی کمی، تم سب کی دعوات مغفرت و ایصال ثواب سے جلد پوری ہو سکے۔ اور اسی لئے شریعت نے ایصال ثواب کے لئے تیجے، دسویں، چالیسویں یا سالانہ عرس و برسی کی تعین نہیں کی، کیونکہ جس کی ضرورت فوری اور زیادہ سے زیادہ ہے اس کی امداد میں ادنی تاخیر بھی عقلاً و شرعاً گوارہ نہیں کی جاسکتی، افسوس کہ اہل بدعت نے نہ صرف ایسی بدعتوں کی ایجاد و ترویج کر کے ایک کامل و مکمل شریعت کو داغدار بنانے کی سعی کی، بلکہ مسافران آخرت کے حقوق کی ادائیگی میں بھی رخنے ڈال دیئے اور یہ سب ان علماء کی تائید سے ہوا جن کے علم حدیث یا فقہ میں کوئی نقص تھا، مثلاً ہمارے قریبی زمانہ کے مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ علم فقہ میں بڑی دست گاہ رکھتے تھے مگر علم حدیث میں کمزور تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کے فتاویٰ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے فقہ میں بڑی وسیع نظر تھی مگر حدیثی مباحث دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میدان کے شہسوار نہ تھے جس طرح حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن حجر پہاڑ ہیں، علم حدیث کے، مگر فقہ میں ورق نہیں، خدا کا شکر ہے کہ احناف میں سب سے بڑی مقدار ان

علماء ربانیین کی ہے، جو حدیث وفقہ دونوں میں کامل تھے اور جو علماء ہمارے یہاں بھی کسی ایک علم میں ناقص تھے ان سے غلطیاں ہوئی ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اپنے وسیع ترین علم ومطالعہ کی روشنی میں جو فیصلے علماء امت اور مباحث مہمہ کے بارے میں فرمائے ہیں، وہ انوار الباری کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں، حضرتؒ کے درس بخاری شریف خصوصاً آخری سالوں کے درس اور علمی مجالس کے ارشادات کی ہماری نظر میں انتہائی اہمیت ہے اور اگرچہ حضرتؒ جیسی عظیم وجامع شخصیت کی طرف ان کا انتساب بھی کافی وافی ہے، تاہم راقم الحروف نے حتی الامکان اس امر کا التزام کیا ہے کہ ان کی تائیدات بھی مستحکم مآخذ سے پیش کرے، تاکہ ناواقف یا کم علم لوگوں کے لئے غلط فہمی یا مغالطہ آمیزیوں کا موقع نہ رہے۔ **واللہ المستعان و علیہ التکلان۔**

بحث ونظر: احناف وشوافع میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ جنازہ کے ساتھ جانے والوں کو اس کے آگے چلنا بہتر ہے یا پیچھے احناف کی رائے ہے کہ جنازے کو آگے رکھا جائے اور سب لوگ پیچھے چلیں، اور حدیث میں پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد بھی اتباع کا ہے۔ یعنی پیچھے چلنا۔

شوافع کہتے ہیں کہ آگے چلنا افضل ہے، کیونکہ ساتھ جانے والے گویا سفارشی ہیں، اور سفارش کرنے والے آگے ہوا کرتے ہیں۔ ان کے پیچھے مجرم ہوا کرتا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری صفحہ ۸۱/۱ میں لکھا ابن حبان وغیرہ کی حدیث ابن عمرؓ سے بھی جنازہ کے پیچھے چلنے کا ثبوت ملتا ہے، اور حدیث الباب کے لفظ من اتبع کے جواب میں لکھا کہ اس سے پیچھے چلنے کے لئے استدلال درست نہیں کیونکہ تبعہ اور اتبعہ (باب افتعال سے) دونوں کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ پیچھے چلا، ارور یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پاس سے گزرا اور اس کے ساتھ چلا، گویا دونوں معنی میں بالاشتراک بولا جاتا ہے پھر صرف پیچھے چلنے کے معنی متعین کر کے استدلال کیسے صحیح ہوگا؟

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے عمدۃ القاری صفحہ ۲۱۵/۱ میں تبع اور اتبع کے معانی تفصیل سے بتلائے اور قرآنی آیات ولغوی محاورات سے ثابت کیا کہ اس کے معنی پیچھے چلنے ہی کے ہیں، خواہ وہ ظاہری اعتبار سے ہو یا معنوی لحاظ سے پھر علامہ نے صفحہ ۳۱۷/۱ میں حافظ پر گرفت کی اور لکھا کہ جو دو معنی بیان کئے گئے ہیں اگر اشتراک ثابت ہو جائے، تب بھی ان میں سے پہلا تو حنفیہ کی دلیل ہے اور دوسرا معنی نہ ان کے خلاف دلیل بن سکتا ہے اور نہ شوافع کے موافق۔

حنفیہ فرماتے ہیں کہ جنازہ کے آگے چلنے کا کچھ ثبوت ہے تو وہ فعلی ہے جو من اتبع کے قولی ثبوت کے مقابلہ میں راجح نہیں۔ اور شاید امام بخاری بھی پیچھے چلنے کو افضل سمجھتے ہیں اس لئے آگے چلنے کے فعلی ثبوت کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ میت کو خدا کی بارگاہ میں بطور مجرم پیش کرنے کا نظریہ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا ہوتا تو مجرم کو پھٹے پرانے کپڑوں میں، خستہ حال، پراگندہ بال لے جاتے اس کے برعکس شریعت کے حکم سے خوب نہلا دھلا کر صاف ستھرا کر کے اچھے اور نئے کپڑوں میں ملبوس کر کے خوشبو لگا کر گھر سے نہایت تعظیم وتکریم کے ساتھ لے جاتے ہیں، نماز کے وقت بھی اس کو آگے ہی رکھتے ہیں اور دعوات مغفرت وغیرہ میں اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شامل کرتے ہیں اس کو سفر آخرت پر رخصت کرتے ہیں۔

اپنے درمیان سے ایک ایماندار بندہ کو خدا کی بارگاہ میں اپنے لئے بھی توشہ آخرت سمجھ کر آگے بھیج رہے ہیں پھر اس کو پیچھے رکھنے کی بات قلب موضوع نہیں تو اور کیا ہے؟

جس کو رخصت کرتے ہیں جس کو کسی کے پاس بطور مقدمۃ الجیش بھیجتے ہیں اس کو آگے رکھتے ہیں یا پیچھے؟ اس کے علاوہ آگے رکھنے میں دوسری مصالح شرعیہ بھی ہیں وہ نگاہ کے سامنے رہے گا تو قدم قدم پر عبرت حاصل ہوگی کہ کل وہ کیسا، با اقتدار با اختیار تھا، آج مجبور ولاچار دوسروں کے سہارے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہے کل کو ہمارے لئے بھی یہ وقت آنا ہے خدا کا تقویٰ اور آخرت کی یاد کا حصول زیادہ سے زیادہ ہوگا، احوال قبر احوال قیامت اور مردہ پر آنے والی کیفیات کا تصور ہوگا اور اس کی کٹھن منزلوں کی آسانی اور گناہوں کی معافی کے لئے برابر دعائیں کرتے چلے جائیں گے، ظاہر ہے جنازہ کو پیچھے رکھنے میں اسی قدر استحضار واحساس اور اس کے فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔

علامہ عینی نے یہ بھی لکھا کہ جنازے کے پیچھے چلنے کو ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام اوزاعی نے بھی اختیار کیا ہے اور کچھ حضرات نے دونوں صورتوں کو برابر قرار دیا' مثلاً امام ثوری نے یا اصحاب امام مالک میں سے ابو مصعبؒ نے یہ اختلاف صرف فضیلت کا ہے ورنہ جواز سب کے نزدیک مسلم ہے۔

نماز جنازہ کہاں افضل ہے

نماز جنازہ کے بارے میں افضل حنفیہ کے یہاں یہ ہے کہ مسجد سے خارج ہو اور مسجد کے اندر مکروہ ہے اگرچہ جنازہ مسجد سے باہر ہی ہو' کیونکہ ابتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ مقبرہ ہی میں پڑھتے تھے' اس کے بعد مسجد نبوی کی دیوار سے متصل باہر جگہ بنوائی گئی جس کو ''مصلی الجنائز'' کہا جاتا تھا' وہاں نماز پڑھ کر پھر مقبرہ میں لے جانے لگے تھے۔ اگر مسجد کے اندر نماز درست ہوتی تو باہر اس کے لئے مخصوص جگہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بجز ایک دو مرتبہ مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنے کا ثبوت نہیں ہے اور ایک دو بار پڑھنے کو ضابطہ اور قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا' تیسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نجاشی پر نماز جنازہ غائبانہ پڑھنے کے لئے مسجد نبوی سے باہر نکلے تو ظاہر ہے کہ وہاں تو مسجد کے ملوث ہونے کا بھی احتمال نہیں تھا' اگر کراہت نہ ہوتی تو مسجد ہی میں ادا فرماتے۔

مسلک شوافعؒ

شوافع کا مسلک یہ ہے کہ نماز جنازہ اگرچہ افضل تو بیرون مسجد ہی ہے' مگر مسجد کے اندر اگر پڑھی جائے تو کسی قسم کی کراہت نہیں ہے' کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہے علامہ سرخسیؒ نے حنفیہ کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا کہ شاید آپ اس وقت مسجد میں معتکف ہوں گے' یا بارش وغیرہ کسی عذر سے مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھی ہوگی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے قاضی عیاض سے مصلی الجنائز کا ذکر کیا کہ خارج مسجد تھا۔ مگر اس کو متعین نہ کر سکے' کیونکہ انہوں نے صرف دو بار حج کیا' مکانات کی تحقیق و تشخیص کا موقع ان کو نہیں مل سکا' البتہ ان کے شاگرد سمہودی کو مدینہ منورہ میں طویل مدت تک ٹھہرنے کا موقع ملا ہے۔ جس میں انہوں نے تمام مقامات کی تحقیق کی ہے اسی لئے اسی قسم کے مسائل میں سمہودی کا قول زیادہ وقیع و معتبر ہے۔

مقصد ترجمہ:۔ امام بخاری کا مقصد باب مذکور اور حدیث الباب سے مرجئہ اہل بدعت کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ اعمال کی کوئی اہمیت نہیں' حالانکہ حدیث میں چھوٹے چھوٹے اعمال کی بھی ترغیب وارد ہے باقی اعمال کی کمی و بیشی سے ایمان میں بھی کمی و بیشی ثابت کرنا' یہ محض دل خوش کرنے کی بات ہے واللہ اعلم۔

باب خوف المؤمن من ان یحبط عملہ وھو لایعر وقال ابراھیم التیمی ماعرضت قولی علیٰ عملی الاخثیت ان اکون مکذبا وقال ابن ابی ملیکۃ ادرکت ثلثین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخاف انفاق علیٰ نفسہ مامنھم احد یقول انہ علیٰ ایمان جبریل و میکآئیل ویذکر عن الحسن ماخافہ الامؤمن ولا امنہ الا منافق وما یحذر من الاصرار علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ لقول اللہ تعالیٰ ولم یصروا علیٰ ما فعلوا وھم یعلمون.

(مومن کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں کسی وقت غفلت و بے شعوری میں اس کا کوئی عمل اکارت نہ جائے ابراہیم تیمی نے فرمایا کہ جب بھی میں اپنے قول و عمل میں موازنہ کیا تو یہ خوف ہوا کہ کہیں مجھے جھوٹا نہ سمجھا جائے' ابن ابی ملیکہ نے فرمایا کہ میری ملاقات تیس صحابہ سے ہوئی ان میں سے ہر صحابی اپنے بارے میں نفاق سے ڈرتا تھا' اور ان میں سے کوئی بھی یہ نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبرئیل و میکائیل جیسا ہے حضرت حسن بصری سے منقول ہے کہ نفاق سے مومن ہی ڈرتا ہے' منافق اس سے بے فکر رہتا ہے اور ان امور کا بیان جن سے مومن کو اجتناب کرنا چاہئے (مثلاً) باہمی جنگ وجدال

اور گناہوں پر بغیر توبہ کے اصرار کرنا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (مومنوں کی شان یہ ہے کہ) وہ لوگ جان بوجھ کر گناہوں پر اصرار نہیں کرتے ہیں)

۴۷۔ حدثنا محمد[1] بن عرعرة قال حدثنا شعبة عن زبید قال سالت ابا وآئل عن المرجئة فقال حدثنی عبد الله ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال سباب المسلم فسوق و قتاله کفر۔

ترجمہ: حضرت زبید بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابووائل سے مرجئہ کے متعلق سوال کیا، انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''مسلمان کو گالی دینا (برا کہنا) فسق ہے، اور اس سے جنگ وجدال کرنا کفر ہے''

تشریح: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ نے مرجئہ کے عقائد باطلہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ لوگ ایمان کے ساتھ کسی معصیت کو مضر نہیں سمجھتے، حالانکہ معاصی میں سے کچھ فسق کے درجہ کے ہیں اور کچھ ان سے بھی اوپر کفر کے قریب تک پہنچا دینے والے ہیں، ارشاد باری ہے ولکن اللہ حبب الیکم الایمان و زینه فی قلوبکم و کره الیکم الکفر والفسوق والعصیان۔ (الحجرات) لیکن خدا نے (محض اپنے فضل و رحمت سے) تمہارے لیے ایمان کو محبوب کر دیا اور اس کو تمہارے دلوں کی زیب و زینت بنا دیا (جس کے بعد) کفر، فسق و عصیان کی برائی تمہارے دلوں میں جاگزین ہوگئی، معلوم ہوا کہ کفر کے بعد سب سے زیادہ قبیح درجہ فسق کا اور اس کے بعد عصیان و نافرمانی کا درجہ ہے، فسق کا اطلاق کبائر معاصی کے علاوہ ان برائیوں پر ہوتا ہے، جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، مثلاً کسی مسلمان کو سب و شتم کرنا، اس کی حرمت و ناموس و مال پر حملہ کرنا، وغیرہ، عصیان ایسی نافرمانی پر بولا جاتا ہے، جس کا تعلق اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے، جدال وقتال کی حدیں چونکہ کفر کی سرحدوں ملتی ہیں اس لیے زیادہ قرب کے باعث ان کو کفر سے تعبیر فرمایا جیسے کہ حجۃ الوداع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض''۔ (بخاری) میرے بعد بے دین کافروں کے طریقے اختیار نہ کرنا کہ آپ میں ہی ایک ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو) کیونکہ مسلمانوں پر تلوار اٹھانا جب ہی ہوسکتا ہے کہ تم ان کو مسلمان نہ سمجھو، اور کسی مومن و مسلم کو کافر سمجھ لینا تب ہی ممکن ہے کہ تم کفر و اسلام میں فرق و امتیاز نہ کرو، جس سے خود تمہارے کفر کا خطرہ ہے۔

بحث ونظر: امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں ابن ابی ملیکہ کا یہ قول نقل کیا کہ ''میں نے تیس صحابہ کو پایا جو سب ہی اپنے بارے میں نفاق سے ڈرتے تھے، اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہتے نہیں سنا کہ اس کا ایمان جبرئیل و میکائیل کے ایمان پر ہے''۔

امام صاحب پر تعریض

بظاہر اس میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر تعریض ہے، کیونکہ آپ سے ایمانی کایمان جبرائیل'' کے الفاظ نقل ہوئے ہیں، تعریض اس طرح ہے کہ جب صحابہ سے ایسی بات منقول نہیں، تو امام صاحب سے بھی قابل قبول نہیں ہونی چاہئے گویا امام صاحب نے مسلک صحابہ و سلف سے ہٹ کر ایک بات کہی ہے، لیکن ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ یہ اور قسم کی دوسری تعریضات جو امام بخاری نے امام صاحب کے خلاف کی ہیں، وہ سب امام

[1] یہ محمد بن عرعرہ بصری ناجیؒ ثقہ صدوق ہیں، امام بخاری نے آپ سے بیس حدیثیں روایت کیں اور تہذیب سے معلوم ہوا کہ مسلم و ابوداؤد نے بھی آپ سے روایت کی ہے مگر تقریب میں بخاری، ابوداؤد و نسائی کا نشان ہے، حافظ ابن حجر نے مشہور حنفی ابن قانع (استاذ حدیث دارقطنی) کے حوالہ سے بھی آپ کی توثیق کی ہے۔ ۷۵ یا ۷۶ سال کی عمر میں ۲۱۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

اسماعیل بن عرعرہ غالباً آپ ہی کے بھائی ہیں جن سے صحاح ستہ یا دوسری کتب صحاح میں کوئی روایت حدیث نہیں کی گئی مگر امام بخاریؒ نے ان کے حوالہ سے امام اعظمؒ کی برائی نقل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا، اسی تقریب سے ان کے حالات کی تلاش کی گئی، مگر اب تک اس میں کامیابی نہ ہو سکی، حتیٰ کہ خود تاریخ امام بخاری سے بھی ان کی توثیق یا دوسرے حالات نہ مل سکے۔ واللہ المستعان۔

صاحب کے خلاف بے جا تشدد ہے اور بہت سی باتیں امام صاحب کی طرف مجہول متعصب اور غیر مستند رواۃ کے ذریعہ منسوب ہوگئی ہیں۔

ائمۂ حنفیہ کے عقائد

یہ ایک حقیقت ہے کہ ائمہ حنفیہ کا مسلک عقائد، کلام اور فقہی مسائل کے لحاظ سے اعدل ترین مسلک ہے جو قرآن وسنت، تعامل صحابہ و تابعین اور اجماع و قیاس کی روشنی میں سب مذاہب حقہ سے پہلے، اکابر محدثین و مجتہدین کی رہنمائی میں شورائی طرز سے مرتب و مدون ہوا۔ شرزمۂ قلیلہ نے کسی غلط فہمی، عناد و حسد کے تحت اس کی مخالفت کی، مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

محدث ایوب کی حق گوئی

بقول محدث شہیر حضرت ایوب سختیانیؒ: - یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافوھھم و یابی اللہ الایتم نورہ، ہم نے دیکھ لیا کہ جن لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ پر بے بنیاد الزامات لگائے تھے ان کے مذاہب چند روز چل کر ختم ہوگئے، یا کم حیثیت ہو کر رہ گئے امام ابوحنیفہ کا مذہب قیامت تک باقی رہے گا، ان شاءاللہ، بلکہ جس قدر پرانا ہوگا، اس کے انوار و برکات بڑھتے ہی جائیں گے۔ (عقود الجواہر صفحہ طبع قسطنطنیہ)

حافظ ابن تیمیہؒ اور عقائد حنفیہؒ

حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الایمان صفحہ ۱۶۳ و صفحہ ۱۶۴ میں لکھا کہ خدا ان نے اپنے مسلمانوں بندوں پر خاص رحمت کی نظر کی ان کو ائمہ اربعہ اور دوسرے جلیل القدر محدثین و مجتہدین کی لسان صدق سے رہنمائی عطا کی، ان سب نے قرآن، ایمان، اور صفات خداوندی کے بارے میں جہمیہ وغیرہ فرق باطلہ کے غلط عقائد پر نکیر کی، اور وہ سب سلف کے عقائد پر باہم متفق تھے اس موقع پر جن حضرات کے نام حافظ ابن تیمیہؒ نے صراحت کے ساتھ لکھے ہیں، ان میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ امام ابویوسف وامام محمد کے اسماء گرامی بھی ہیں، نیز اس عبارت سے چند نتائج واضح ہیں۔ (۱) ائمہ اربعہ کی رہنمائی خدا کا خصوصی فضل وانعام ہے۔

(۲) ائمہ اربعہ اور امام ابویوسف وامام محمد نے عقائد باطلہ کی تردید فرمائی ہے۔

(۳) ان حضرات کے عقائد حقہ وہی تھے جو ان سے پہلے سلف کے تھے۔

(۴) ان سب حضرات کا عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا (جو کچھ اختلاف تھا وہ فروعی اور اجتہادی مسائل غیر منصوصہ میں تھا۔

(۵) امام بخاریؒ وغیرہ نے جو غلط عقائد کی نسبت امام اعظم یا امام محمد کی طرف کی ہے، وہ صحیح نہیں۔

(۶) امام بخاریؒ یا بعد کے لوگوں نے جو کچھ ایمان کے مسئلہ میں امام صاحب وغیرہ پر تعریضات کی ہیں وہ حد سے تجاوز ہے جو امام بخاری جیسے القدر محقق محدث کے لیے موزوں نہ تھا۔

ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''منہاج السنۃ النبویۃ صفحہ ۱/ ۲۵۹'' میں لکھا: - امام ابوحنیفہ سے اگرچہ لوگوں نے بعض امور میں اختلاف کیا ہے، لیکن ان کے فقہ فہم اور علم میں کوئی ایک شخص بھی شک وشبہ نہیں کرسکتا، بعض لوگوں نے ان کو مطعون کرنے کے لیے، ان کی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کردی ہیں جو قطعاً جھوٹ ہیں جیسے خنزیر بری وغیرہ کے مسائل۔

امام بخاری کی جزء القراءۃ

ہم بتلا چکے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنا رسالہ جزء القراءۃ خلف الامام میں خنزیر بری کی حلت امام صاحب کی طرف منسوب کی ہے، جہاں

یہ بھی لکھا تھا کہ امام صاحب قرآن کو مخلوق کہتے ہیں، حالانکہ امام احمدؒ جو امام بخاری کے شیخ بھی ہیں اور وہ ان لوگوں کے سخت ترین مخالف تھے، جو قرآن کو مخلوق کہتے تھے، وہ بھی امام اعظم کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک یہ بات امام ابوحنیفہ کے متعلق ہرگز ثابت نہیں ہوسکی کہ وہ قرآن کو مخلوق کہتے تھے۔

امام صاحب اور امام احمدؒ

اس مقولہ کے راوی ابوبکر مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے یہ بات سن کر خدا کا شکر کیا، اور پھر امام محمد سے سوال کیا کہ امام ابوحنیفہ کا علمی مرتبہ کیا تھا؟ امام احمدؒ نے فرمایا "سبحان اللہ! ان کے علم، ورع، زہد اور ایثار دار آخرت کا تو وہ درجہ ہے کہ کوئی دوسرا اس درجہ پر پہنچ بھی نہیں سکتا، انہوں نے تو عہدہ قضاء قبول نہ کرنے کی وجہ سے کوڑوں کی سخت مار برداشت کی، مگر اس کو کس طرح قبول نہ کیا، ان پر خدا کی رحمت و رضوان"۔ (عقود الجواہر)

حافظ ابن تیمیہؒ کے علم و فضل اور جلالت قدر پر غیر مقلدین زمانہ بھی پورا اعتماد کرتے ہیں، امام احمدؒ تو چار جلیل القدر ائمہ مجتہدین میں سے ایک ہیں۔

علامہ طوفی حنبلی کا دفاع عن الامام

اسی طرح علامہ سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی نے "شرح مختصر الروضہ" میں لکھا جو اصول حنابلہ میں بلند پایہ کتاب ہے۔

"واللہ! میں تو امام ابوحنیفہ کو ان سب باتوں سے معصوم و بری ہی سمجھتا ہوں، جو ان کے بارے میں لوگوں نے نقل کی ہیں، اور ان چیزوں سے منزہ جانتا ہوں جو ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں اور امام صاحب کے بارے میں میری رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے کسی مسئلہ میں بھی سنت رسول کی مخالفت عناداً ہرگز نہیں کی، اگر کہیں خلاف کیا ہے تو اجتہاداً کیا ہے، جس کے لیے ان کے پاس واضح حجتیں، صالح و روشن دلائل ہیں، اور ان کے دلائل لوگوں کے سامنے موجود ہیں، جن سے مخالفوں کو حق و انصاف کی رو سے بازی لینا آسان نہیں، اور امام صاحب کے لیے بصورت خطا بھی ایک اجر ہے، اور بصورت صواب تو دو اجر ہیں، ان پر طعن و اعتراض کرنے والے یا تو حاسد ہیں، یا ان کے مواقع اجتہاد سے جاہل ہیں، ان کے بارے میں امام احمدؒ سے بھی آخری بات جو ثابت ہوئی ہے وہ ان کی مدح و ثنا ہی ہے، جس کو ہمارے اصحاب میں سے ابوالورد نے کتاب "اصول الدین" میں ذکر کیا ہے"۔ (تانیب الخطیب صفحہ ۱۴۴)

مولانا عبیداللہ مبارکپوریؒ کا تعصب

افسوس ہے کہ اس دور میں بھی کہ علمی نوادر و ذخائر گھر گھر پہنچ رہے ہیں، اور علم کی روشنی برابر پھیلتی جا رہی ہے، ہمارے زمانہ کے فاضل محدث مولانا عبیداللہ مبارکپوری نے اپنی تازہ تالیف شرح مشکوٰۃ مرعاۃ المصابیح میں ائمہ حنفیہ پر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض وعناد رکھنے کی تہمت داغ دی، ان کو خاص طور سے علامہ طوفی حنبلی کی مذکورہ بالا عبارت پڑھ کر اپنی بے جا و بے محل جسارتوں سے توبہ کرنی چاہئے۔ واللہ یوفقنا وایاھم لما یحب و یرضی۔

علامہ زبیدی کا ارشاد

علامہ زبیدی نے اپنی کتاب "اتحاف السادۃ المتقین "صفحہ ۲۴۲ میں لکھا۔ (امام ابوحنیفہؒ پر (بعد کے) لوگوں کا طعن کس طرح جائز ہوسکتا ہے، جب کہ آپ کے معاصرین وغیرہم سے ائمہ کبار مثلاً، امام مالک سفیان، امام شافعیؒ امام احمد، اوزاعی و ابراہیم بن ادہم جیسوں نے امام صاحب کی مدح و ثنا کی، ان کے عقائد، فقہ، ورع عبادت و امور دین میں احتیاط کی تعریف کی، ان کے اجتہاد اور علوم شریعت میں کامل مکمل ہونے کی داد دی، جو بڑی کتابوں میں مذکور ہے، ان کا مناظرہ بھی جہم بن صفوان رئیس فرقہ جہمیہ سے مشہور ہے، وہ ایمان کو صرف تصدیق

قلبی کہتا تھا' آپ نے اس کو دلائل و براہین سے سمجھایا کہ ایمان تصدیق قلبی و اقرار لسانی دونوں کا مجموعہ ہے اور اس کو لا جواب کر دیا۔

کعبی نے اپنے ''مقالات' میں اور محمد بن شبیب نے ایمان کے بارے میں امام اعظمؒ کی طرف ایسی جھوٹی بات منسوب کر دی ہے۔ جس سے وہ بری ہیں' اسی طرح مکہ معظمہ میں امام صاحب کا عمر بن عثمان شمزی (راس المعتزلہ) کے ساتھ جمع ہونا اور ایمان کے مسئلہ پر مناظرہ کرنے کا افسانہ بھی معتزلہ کے بہتانوں میں سے ہے۔

معتزلہ اور امام صاحب

امام صاحب سے معتزلہ کو بھی سخت جلن اور عداوت تھی' کیونکہ آپ ان کے اصول و تاباب پر نکیر کرتے تھے' اور ان کو اہل ہوا میں سے قرار دیتے تھے' لیکن حق تعالےٰ نے امام صاحب کو ان کے سب افتراءات سے بری فرما دیا۔

عمرو بن عبید اور امام صاحب

یہ شمزی عمرو بن عبید معتزلی کا تلمیذ خاص تھا' جس کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت حسن بصری کی مجلس میں بیٹھتا تھا' ان سے احادیث سنیں' روایت کیں' بڑی شہرت پائی' پھر واصل بن عطا معتزلی نے اس کو مذہب اہل سنت سے منحرف کر دیا' تو قدری بن گیا' بہت بڑا زاہد و عبادت گزار تھا' اور ظاہری اخلاق میں بہت اچھا تھا لیکن بدعت و اعتزال و قدریت کی وجہ سے اہل نقل نے اس کو نظر انداز کر دیا' آجری نے امام ابو داؤد کا قول نقل کیا کہ ''ابوحنیفہ عمرو بن عبید جیسے ہزار سے بہتر ہیں'' (تہذیب صفحہ ۸/۷۰)

امام بخاریؒ کی کتاب الایمان

اب امام بخاریؒ کی کتاب الایمان کی طرف آجایئے! خاتمۃ المحدثین علامہ زبیدی نے عقود الجواہر میں لکھا کہ:۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں جس طرح ابواب و تراجم باندھے ہیں ان کے ظاہر سے اس امر کا دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ اہل اعتزال سے تھے' لیکن یہ بات چونکہ خلاف تحقیق ہے اس لیے ان کے ظاہر سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔امام بخاری اہل اعتزال اور ان کے مذاہب سے بری ہیں' اور انہوں نے ایمان کے مسئلہ میں بھی معتزلہ کا مسلک اختیار نہیں کیا' اسی طرح اکثر اصحاب اہلسنت والجماعت کے سردار امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بھی خیال کرنا چاہئے کہ وہ اہل ارجاء اور ان کے مذہب سے بری ہیں اور جس کسی نے ان کے کسی کلام سے غلط فہمی یا قلت تدبر کے سبب ان کو اہل ارجاء میں سے سمجھا اس نے غلطی کی۔

امام بخاری اور امام اعظم

ہمارے نزدیک جس طرح امام ابوحنیفہ سادات اہل سنت والجماعت اور عرفاء کاملین و کبار اہل کشف میں سے ہیں' اسی طرح امام بخاری وغیرہ بھی عرفاء' محدثین و فقہاء میں سے ہیں' رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ'

چونکہ امام بخاری نے کتاب الایمان میں لہجہ ضرورت سے زیادہ تیز کر دیا ہے' اور نہ صرف معتزلہ' خوارج' مرجئہ' کرامیہ وغیرہ کا رد کیا' بلکہ امام اعظم رحمہ اللہ پر بھی تعریضات کی ہیں اور زیر بحث ترجمۃ الباب میں ابن ابی ملیکہ کا قول بھی ظاہر امام صاحب پر تعریض معلوم ہوتا ہے' اس لیے' ہم نے یہاں چند ضروری اشارات کیے ہیں جن سے واضح ہوا کہ ائمہ حنفیہ کی طرف عقائد و ایمان کے بارے میں کسی غلط بات کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔

امام بخاریؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ

اگر حنفی قضاۃ کے بیجا تشدد کی وجہ سے امام بخاری ائمہ حنفیہ سے ناراض ہو گئے تھے' اور آخر تک ناراض ہی رہے' تو ابن تیمیہ کو بھی تو حنفی مناظرین

وحکام سے تکلیفیں پہنچی تھیں، پھر دونوں کی کتاب الایمان میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کہ ایک قدم قدم پر تعریض واعتراض کا موقع ڈھونڈ رہا ہے اور دوسرا امام صاحب سے صفائی ومدافعت کا حق ادا کردیتا ہے اور نہ صرف امام صاحب کی بلکہ دوسرے ائمہ حنفیہ کی بھی مدح وثنا میں رطب اللسان ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ

ہمارے نزدیک بات صرف اتنی ہی ہے کہ امام بخاریؒ میں تاثر کا مادہ زیادہ تھا' وہ اپنے اساتذہ حمیدی، نعیم بن حماد خزاعی' اسحق بن راہویہ' اسماعیل بن عرعرہ سے زیادہ متاثر ہوگئے' جن کو امام صاحب وغیرہ سے للّٰہی بغض تھا۔

دوسرے وہ زود رنج تھے' فن حدیث کے امام بے مثال تھے' مگر فقہ میں وہ پایہ نہ تھا' اسی لیے ان کا کوئی مذہب نہ بن سکا' بلکہ ان کے تلمیذ رشید ترمذی جیسے ان کے مذہب کی نقل بھی نہیں کرتے' امام اعظمؒ کی فقہی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ اونچے درجہ کے تفقہ کی ضرورت تھی' جو نہ سمجھا وہ ان کا مخالف ہوگیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ

امام صاحب خود بلند پایہ محدث اور عالم رجال تھے' ناسخ ومنسوخ کے بہت بڑے مسلم عالم تھے' صحابہ وتابعین کے آثار وتعامل پر ان کی پوری نظر تھی' بعد کے محدثین نے سارا مدار رواۃ کے مدارج پر رکھا' اس لئے ان کے اور پہلوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگئی اور اس کی وجہ سے اختلاف بڑھتا چلا گیا اور اس کے نتائج سامنے ہیں۔

ایمان کے بارے میں مزید تحقیق

اس کے بعد ایمانی کایمان جبرئیل کی کچھ تحقیق درج کی جاتی ہے' واللہ الموفق۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک زیادہ قوی صحیح روایت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ سے قول مذکور کی نہیں ہے اور امام ابو یوسف وامام محمد دونوں سے انکار ثابت ہے' امام ابو یوسف نے تو فرمایا کہ ''جو شخص ایمانی کایمانی جبرئیل'' کہے وہ صاحب بدعت ہے۔'' (تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱/۲۹۲) امام محمدؒ کا قول شرح فقہ اکبر میں اس طرح نقل ہے اسی باعث امام محمدؒ نے حسب روایت خلاصہ کہا کہ میرے نزدیک یہ کہنا مکروہ ہے کہ میرا ایمان جبرائیل جیسا ایمان ہے' ہاں! یہ کہہ سکتا ہے کہ جن جن چیزوں پر حضرت جبرئیل ایمان لائے میں بھی ان سب پر ایمان رکھتا ہوں' اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ کوئی کہے' میرا ایمان انبیاء علیہم السلام جیسا ہے بلکہ یہ بھی مناسب نہیں کہ اپنے ایمان کو حضرت ابوبکر وعمر وغیرہ کے ایمان جیسا کہے۔

مراتب ایمان کا تفاوت

گویا مراتب ایمان کا تفاوت ائمہ حنفیہ کے یہاں بھی تسلیم ہے لیکن مؤمن بہ کے لحاظ سے جملہ مومنین کے ایمان مساوی درجہ کے ہیں تو اگر امام صاحب سے ''ایمانی کایمان جبرئیل'' کہنے کی اجازت بھی ثابت ہوجائے' تب بھی اس کی مراد ظاہر ہے' یعنی مشابہت مومن بہ کے لحاظ سے ہوگی جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا اور چونکہ مثلیت میں تساوی یا مساوات علی الاطلاق کے ائمہ حنفیہ بھی قائل نہیں اس لئے امام صاحب سے بھی ''ایمانی مثل ایمان جبرئیل'' کہنے کی ممانعت ہے۔

غرض نفس تصدیق بما جاء به الرسل' اور مؤمن بہ کے لحاظ سے چونکہ تمامی اہل ایمان عوام وخواص برابر ہیں۔ اس لئے ایمانی کایمان جبرئیل کہا جاسکتا ہے بلکہ تفصیل مذکور کے لحاظ سے مثل کا لفظ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امام صاحب سے کتاب العالم والمتعلم میں مثل کا لفظ منقول بھی ہوا ہے اس طرح امام صاحب کا ارشاد اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور واقع کے مطابق تھا اور متکلمین وماتریدیہ بھی

اسی کے قائل ہیں، مگر امام محمدؒ نے دیکھا کہ اس سے کم فہم یا بے علم لوگ مغالطے میں پڑ سکتے ہیں اس لئے انہوں نے اس تعبیر کو ناپسند قرار دیا بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ خود امام صاحب نے بھی جواز کے بعد عدم جواز کا ہی فیصلہ فرمایا ہے چنانچہ ابن عابد بن شامی نے امام صاحب سے کاف اور مثل دونوں ہی کا عدم جواز نقل کیا ہے (جب کہ درمختار میں امام صاحب اور امام محمد دونوں سے جواز کاف (اور عدم جواز مثل ایک روایت میں اور دونوں کا مطلقاً جواز دوسری روایت میں نقل ہوا تھا) بظاہر امام صاحب نے جواز سے رجوع فرمایا ہوگا تو پھر امام ابو یوسف و امام محمد نے بھی کراہت و ناپسندیدگی کا فیصلہ فرمادیا۔ **واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔**

ومایحذر من الاصرار علی التقاتل الخ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں بدکرداروں کے خوف کا ذکر ہے جو نفاق معصیت و بدکرداری میں مبتلا ہیں اور ڈر ہے کہ اس سے نفاق کفر تک نہ پہنچ جائیں، اور پہلے خوف صالحین کا ذکر ہوا تھا، جو باوجود صلاح و نکوکاری کے نفاق عملی سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ لوگ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ خوف و خشیت والے تھے، پس ان کا خوف بھی غایت احتیاط و تقوی کے سبب تھا۔

وقتالہ کفر، کوئی کہہ سکتا ہے کہ فسوق کے مقابلہ میں یہاں کفر سے مراد وہی کفر ہو سکتا ہے جو ملت سے خارج کر دے، حالانکہ یہ مذہب اہل حق کا نہیں بلکہ خوارج و معتزلہ کا ہے جواب یہ ہے کہ کفر سے مراد فسوق ہی کا آخری درجہ ہے جس کی سرحد کفر سے ملتی ہے اس کی شناعت و برائی کو تغلیظاً کفر سے تعبیر کیا گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک بہتر جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور میں قرآن مجید کا اتباع کیا گیا ہے حق تعالیٰ نے عمداً قتل مومن کی سزا خلود نار فرمائی تھی، جو جزاء کفر ہے اس لئے حدیث میں بھی قتال مومن کو کفر فرمایا گیا، یہ بحث الگ ہے کہ خلود نار سے مراد آیت میں کیا ہے اور یہ امر بھی جدا ہے کہ فقہا ایسے شخص پر دنیا میں کفر کے احکام نافذ نہیں کرتے، دوسرے حدیث میں وہ تعبیرات اختیار کی گئی ہیں جو زیادہ سے زیادہ عمل پر اکسانے والی ہیں اس لئے بھی ان میں تشدد سے چارہ نہیں۔

بحث رجال: ابتداء میں ہم لکھ آئے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے تہذیب میں محمد بن عرعرہ راوی حدیث الباب کے لئے بخاری، مسلم اور ابوداؤد کا نشان لگایا، اور تقریب میں بخاری، ابوداؤد و نسائی کا، مسلم کا نہیں، اس وقت اس کے بارے میں خلجان ہی رہا، پھر یہی سوچا کہ تقریب میں طباعت کی غلطی ہوگئی ہے مگر پھر حافظ عینی کا کلام پڑھ کر وجہ مغالط سمجھ میں آئی جو ذکر کی جاتی ہے لکھا کہ شیخ قطب الدین نے اس کو بخاری کے منفردات میں سے قرار دیا (یعنی یہ کہ محمد بن عرعرہ سے صرف بخاری نے روایت لی ہے مسلم نے نہیں لی) مگر میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ مسلم نے بھی اس سے روایت کی ہے، حافظ مزی نے اس پر تنبیہ کی ہے۔ البتہ صاحب کمال نے ابوداؤد پر اختصار کیا تھا، اس لئے ممکن ہے حافظ نے تقریب کی ترتیب و تالیف کے وقت اسی کا لحاظ کیا ہو یا اسی کو ترجیح دی ہو، واللہ اعلم۔

اہم افادہ علمیہ: حدیث عبداللہ بن مسعودؓ "**لما نزلت الذین اٰمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم**" کے تحت امام نووی نے شرح بخاری میں فرمایا۔ "اس حدیث سے مذہب اہل حق کا ثبوت ہوتا ہے کہ معاصی کے ارتکاب سے کفر عائد نہیں ہوگا" اور خود امام بخاریؒ نے بقول حضرت شاہ صاحبؒ کتاب الایمان کے اندر تو اعمال کو ایمان و عقائد میں داخل کیا اور ایک باب کفر دون کفر کا بھی قائم کر دیا اور بتلایا کہ عمل ذرا بھی کم ہوا تو کفر ہو گیا، مگر خود ہی ستائیسویں پارہ میں باب **مایکرہ من لعن شارب الخمر** ذکر کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ عقیدہ درست ہونے پر کبیرہ گناہوں کے سبب بھی ملت سے خارج نہ ہوگا، پھر امام اعظم اور امام بخاری کے مسلک میں کیا فرق رہ گیا؟ اور آپ نے دیکھا کہ علامہ نووی نے بھی مذہب اہل حق وہی بتلایا جو امام صاحب وغیرہ سب کا مذہب ہے معلوم ہوا کہ ایسے مسائل میں بھی جہاں کہ بظاہر امام بخاری کا رویہ ائمہ حنفیہ کے بارے میں سخت سے سخت ہو گیا ہے کھود کرید کر دیکھا جائے گا تو خلاف بہت معمولی درجہ کا نکلے گا اس درجہ کا نہیں کہ اہل زیغ کو خواہ مخواہ زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع ملے، واللہ المستعان۔

۴۸-حدثنا قتيبة بن سعيد حدثنا اسمعيل بن جعفر عن حميد عن انسؓ قال اخبرنی عبادة بن الصامتؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج يخبر بليلة القدر فتلاحیٰ رجلان من المسلمين فقال انی خرجت لاخبركم بليلة القدر وانه تلاحیٰ فلان وفلان فرفعت وعسےٰ ان يكون خيراً لكم فالتمسوها فی السبع والتسع والخمس.

ترجمہ:۔ حضرت انسؓ نے فرمایا' مجھے حضرت عبادہ ابن صامتؓ نے بتلایا کہ (ایک بار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب قدر بتانے کے لئے باہر تشریف لائے' اتنے میں (آپ نے دیکھا) کہ دو مسلمان آپس میں جھگڑ رہے ہیں' تو آپ نے فرمایا۔ میں اس لئے نکلا تھا کہ تمہیں شب قدر بتلاؤں' لیکن فلاں فلاں شخص جھگڑنے لگے' اس لئے (اس کی خبر اٹھالی گئی' اور شاید تمہارے لئے بہتر ہو اب اسے (رمضان کی) ستائیسویں' انتیسویں اور پچیسویں شب میں تلاش کرو۔

تشریح:۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب قدر کی تعیین کا علم دیا گیا' اور اس کی اطلاع صحابہ کو مدینے کے لئے دولت کدہ سے باہر تشریف لائے' مگر دیکھا کہ مسجد نبوی میں دو مسلمان کسی معاملہ میں جھگڑ رہے ہیں' آپ نے اس کا جھگڑا ختم فرمانے کی سعی کی' اتنے میں وہ بات آپ کے ذہن مبارک سے نکل گئی جوان دونوں کے جھگڑنے کی قباحت کے سبب ہوئی' معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا خدا کو سخت ناپسند ہے اور اس کی وجہ سے خدا کی بہت سی نعمتوں اور رحمتوں سے محرومی ہوتی رہے گی' اس لئے اس سے بہت ڈرنا چاہئے' تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس علم کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں بھی دوسری وجہ خیر کی پیدا ہوگئی' جس کا ذکر آپ نے فرمایا کہ شب قدر کی تلاش وجستجو سے امت کے لئے دوسری جہات خیر وفلاح کھل گئیں' اور اس کی فکر وطلب والوں کو حق تعالیٰ دوسرے انواع واقسام کے انعامات سے نوازیں گے' کیونکہ ان سب راتوں میں شب قدر کی طلب وتلاش بھی مستقل عبادت بن گئی' جو تعیین کی صورت میں نہ ہوتی۔

شب قدر باقی ہے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فرفعت سے مراد یہ نہیں کہ اصل شب قدر ہی اٹھالی گئی' جیسا کہ شیعی کہتے ہیں بلکہ اس کا علم تعیین اٹھالیا گیا' اگر شب قدر ہی باقی نہ رہتی تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جواس کو تلاش کرنے کا حکم فرمارہے ہیں اس کا کیا فائدہ رہا۔

حدیث کا ربط ترجمہ سے

اسی سے ترجمہ کے ساتھ حدیث کے ربط کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی' کہ جس طرح باہمی نزاع شب قدر کے علم تعینی کے رفع کا سبب بن گیا' اسی طرح معاصی بھی حبط اعمال کا سبب بن جاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی تحقیق

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ عام شارحین نے اس حدیث سے یہ سمجھا کہ صرف ۲۵ ویں' ۲۷ ویں اور ۲۹ ویں شب میں تلاش کرو' مگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے طریق وتعامل سے یہ سمجھا ہوں کہ پورے آخری عشرہ یا آخری ہفتہ یا آخری پانچ دنوں کی راتوں میں تلاش کرو (آخری عشرہ چونکہ ۲۹ دن کے لحاظ سے ۹ دن کا ہوگا' اس لئے اس کو تسع سے تعبیر فرمایا۔ جو یقینی ہے) مطلب یہ ہے کہ گویا شب قدر ان ہی راتوں میں سے ایک رات میں ہوگی مگر قیام شب اور عبادت ان سب راتوں میں اہتمام سے ہونی چاہئے' فرمایا مجھے تو یہی بات محقق ہوئی ہے' واللہ اعلم۔

بحث ونظر.... ترجمہ حدیث کی مطابقت حافظ عینیؒ کی نظر میں

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے فرمایا کہ یہ شب قدر والی حدیث امام بخاری کے پہلے ترجمہ سے متعلق ہے آخری ترجمہ سے نہیں' اور وجہ مطابقت یہ ہے کہ اس میں باہمی جھگڑوں کی مذمت و برائی دکھلائی گئی ہے' اور یہ بتلایا ہے کہ جھگڑالو آدمی ناقص رہ جاتا ہے' درجہ' کمال کو نہیں پہنچتا' کیونکہ جھگڑوں میں وقت ضائع کرنے کے باعث بہت سی خیر وفلاح کی باتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔

حضوصا جب کہ جھگڑے بھی مسجد جیسی مقدس جگہ میں کرے' اور بلند آواز سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے وقت میں کرے کہ اس میں زیادہ امکان اس کا بھی ہے کہ اس کے نیک اعمال اکارت ہوجائیں' اور اس کو اس بدبختی کا شعور واحساس بھی نہ ہو' حق تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ **ولا تجھر والہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم و انتم لا تشعرون** (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپس کی بے باکانہ گفتگو کی طرح زور زور سے حلق پھاڑ کر باتیں نہ کرو' کہیں ایسی بے ادبی سے تمہارے اعمال ضائع نہ ہوجائیں' اور اس کا احساس بھی نہ ہو)

حافظ ابن حجر پر تنقید

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہ توجیہ (جھگڑے میں آواز کا عموماً وعادةً بلند ہونا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باعث اس سے حبط اعمال کا ڈر) کرمانی سے ماخوذ ہے' مگر اس کو آخری ترجمہ سے مطابق کرنا آلہ جرثقیل کا محتاج ہے' یعنی بڑے تکلف کی چیز ہے' ہاں! جیسا کہ ہم نے وضاحت کی ہے' اس کی مطابقت ترجمہ اول سے بخوبی ہوسکتی ہے' مگر بعض شارحین بخاری نے (اشارہ حافظ ابن حجر کی طرف ہے) بڑی عجیب بات کی کہ کرمانی کی توجیہ کو اپنی تحقیق بنا کر لکھ دیا کہ ''اس توجیہ سے حدیث کی مناسبت ومطابقت بھی ترجمہ سے واضح ہوگئی' جو بہت سے شارحین بخاری سے مخفی ہوگئی ہے'' (فتح الباری صفحہ ۸۴/۱)

ایک تو دوسرے کی تحقیق ظاہر کرنا' پھر یہ بھی دعویٰ کرنا کہ یہ توجیہ وتحقیق دوسروں سے مخفی رہی ہے پھر اس کے ساتھ یہ بھی غلط فہمی کہ اس حدیث کو یہاں ترجمہ کے مطابق قرار دینا' حالانکہ صحیح مناسبت حدیث کے قریبی ترجمہ سے نہیں بلکہ سابق وبعید ترجمہ (ان یحبط عملہ) کے ساتھ ہے (عمدۃ القاری صفحہ ۳۲۴/۱)

دو ترجمے اور دو حدیث

واضح ہو کہ امام بخاری نے اس باب میں دو ترجمے قائم کئے' اور پھر دو حدیث لائے ہیں ترجمہ اول **خوف المومن ان یحبط عملہ** سے مطابقت بعد والی حدیث کو ہے اور ترجمہ ثانی **و ما یحذر من الاصرار** کی مطابقت اول الذکر حدیث سے ہے گویا لف ونشر غیر مرتب کی صورت اختیار کی گئی ہے' واللہ اعلم۔

قاضی عیاض کی تحقیق اور سوال وجواب

قاضی عیاض نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا مخاصمت اور باہمی جھگڑے نظر شارع میں نہایت مذموم اور بطور عقوبت معنویہ ہیں' یعنی باطنی ومعنوی طور پر ان کو دنیا کا عذاب سمجھنا چاہئے' خدا ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ دوسرے یہ کہ جن مواقع پر شیطان کا دخل وموجودگی ہو (جیسے مواقع خصومت) وہاں سے خیر وبرکت اٹھ جاتی ہے اس تحقیق پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ طلب حق کے لیے جھگڑے کو کس طرح مذموم قرار دیا گیا؟ حافظ ابن حجر نے اس کا جواب یہ دیا کہ چونکہ وہ جھگڑا مسجد میں ہوا تھا (جو ذکر الٰہی کی جگہ ہے' لغو باتوں کی نہیں) اور وہ بھی ایسے وقت میں ہوا جو ذکر کا مخصوص زمانہ تھا' یعنی ماہ رمضان' اس لیے وہ مذموم قرار پایا۔

علامہ عینی نے حافظ کے اس جواب کو ناپسند کیا' اور فرمایا کہ طلب حق کو یا اس کے لیے بقدر ضرورت جھگڑے کو کسی مقدس سے مقدس مقام و وقت میں بھی مذموم نہیں کہا جا سکتا' لہٰذا جواب یہ ہے کہ یہاں مذمت کی وجہ محض طلب حق کے لیے جھگڑنا نہیں ہے بلکہ جھگڑنے کی وہ خاص صورت ہے' جو قدر ضرورت سے زیادہ پیش آئی' اور اس زیادتی کو لغو کہا جائے گا' جو مسجد کے اندر اور بلند آواز کے ساتھ ہو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں مزید قباحتوں کا مجموعہ بن گئی' اس کو خوب سمجھ لو (عمدۃ القاری صفحہ ۱/ ۳۲۷)

ہم نے مقدمہ انوار الباری میں حافظ عینی اور حافظ ابن حجر کے موازنہ میں کچھ باتیں لکھی تھیں' اب ناظرین کو ان کی صحت کے بارے حق الیقین بھی ہوتا جائے گا' اور وہ اچھی طرح جان لیں گے کہ علامہ عینی کا مرتبہ علم معانی حدیث و رجال میں کتنا اونچا ہے' اور فقہ اصول فقہ' تاریخ' نحو و معانی وغیرہ علوم میں تو انکی سیادت مسلم ہے' جب کہ فقہ وغیرہ میں حافظ ابن حجر کی کمزوریاں نا قابل انکار ہیں' افسوس کہ عمدۃ القاری سے ہمارے حنفی علماء و اساتذہ بھی بہت کم استفادہ کرتے ہیں۔

امام بخاریؒ کے نہایت ہی ممدوح و مقتدا بزرگ امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''امام ابو حنیفہ کے کسی استنباط کئے ہوئے مسئلہ کے متعلق یہ مت کہو کہ یہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے بلکہ اس کو شرح معانی حدیث سمجھو'' یہ تو ان کی رائے تھی' اور حقیقۃ'' امام صاحب کے تمام مسائل بالواسطہ معانی حدیث کی شروح ہی ہیں۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ امام طحاوی اور حافظ عینی کی حدیثی تالیفات بلاواسطہ شروح معانی حدیث کے بے نظیر ذخیرے ہیں' ایک کام جو نہایت دشوار تھا' امام صاحب نے اپنے دور کے محدثین و فقہا کی مدد سے انجام دیا' اور دوسرے کام کی تکمیل بعد کے احناف محدثین کے ذریعہ عمل میں آئی۔ وللہ الحمد اولاً و آخراً۔

افادات انور رحمہ اللہ

حضرت اقدس شاہ صاحب قدس سرہ نے اس باب کے تحت جو ارشادات فرمائے بنظر افادہ ان کا ذکر مستقل طور سے کیا جاتا ہے۔ فرمایا مقصد ترجمہ یہ ہے کہ قتال و جدال باہمی وغیرہ کے نتیجہ میں تکوینی طور پر کفر سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں ایمان سلب نہ کر لیا جائے' تشریعی تخویف مقصود نہیں ہے کیونکہ فقہ و شریعت کی رو سے تو اس کو کفر نہیں کہہ سکتے ہیں' لہٰذا اس کو احادیث کا محمل بھی نہیں بنانا چاہئے' جب کہ مقصود صرف تعزیر و تنبیہ ہی ہے۔

امام غزالی نے سوءِ خاتمہ کے دو بڑے سبب بتلائے ہیں۔

(۱) ایک شخص کے عقائد و اعمال غلط ہوں' مثلاً بدعتی ہے' شریعت کو صحیح طور سے نہیں سمجھا ہے' مرتے وقت اس کو منکشف ہوگا کہ جس کو وہ صواب و صحیح سمجھا تھا' غلط نکلا' اس پر اسے توحید و نبوت ایسے بنیادی عقائد میں بھی شک ہو جاتا ہے کہ شاید اس میں بھی غلطی ہوئی ہو' پس بدعات کی غلطی منکشف ہونے پر اس کو ایمانیات کی طرف سے بھی بے اعتمادی ہو جاتی ہے' جس سے ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

(۲) گناہ گار فاسق' مومن کا جب وقت موت قریب آ جاتا ہے' اور پردہ اٹھتا ہے' سارے معاصی سامنے ہو جاتے ہیں' عذاب کا مشاہدہ ہوتا ہے تو خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر اس کو خدا سے بغض ہو جاتا ہے' جس کے بعد ایمان سلب ہو جاتا ہے (العیاذ باللہ)

ہم نے دنیا ہی میں دیکھا کہ ایک شخص کا بیٹا مرا تو کہنے لگا اے خدا تیرا بھی بیٹا ہوتا اور مرتا تو تجھے پتہ چلتا' (نعوذ باللہ من ذلک) اسی طرح جب ہم دنیاوی مصائب کی طرف دیکھتے ہیں کہ عاصی کچھ کا کچھ کہہ بیٹھتا ہے۔ اور خدا سے اس کو سخط و بغض ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے معاصی کے ساتھ بغیر توبہ کے مرے گا' اور مرتے وقت عذاب کا مشاہدہ کرے گا تو اس وقت اس کو خدا سے کتنا کچھ بغض نہ ہو جائے گا۔''

کلھم یخاف النفاق علی نفسہ پر فرمایا کہ یہ ''نزدیکاں را بیش بود حیرانی'' والا معاملہ ہے' یہ تیس صحابہ سب کے سب اسی شان کے تھے' ایمان کو خوف و رجاء کے درمیان ہونا چاہئے' ان حضرات کی نظر ہر وقت خدا کی قدرت پر تھی' درحقیقت سارا عالم سمندر کی طرح ہے' جس

میں موجیں اور طوفان ہیں، ہم سب اس کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں اور مآل کار یعنی آئندہ کی نجات و ہلاکت ہم سے غائب ہے۔

لہٰذا خوف و رجاء دونوں ہی کا وجود صحیح معنی میں ہونا چاہئے، حضرت فاروق اعظمؓ کا مقولہ ہے کہ اگر محشر میں یہ ندا ہو جائے کہ سب دوزخ میں جائیں گے، صرف ایک جنت میں جائے گا تو میں سمجھوں گا کہ وہ میں ہی ہوں (یہ رجاء کا کمال ہے) اور اگر برعکس اعلان ہو کہ سب جنت میں جائیں گے، صرف ایک دوزخ میں جائے گا، تب بھی میں یہی سمجھوں گا کہ وہ میں ہوں (یہ خوف کا کمال ہے) یہ اس مقدس ذات کا مقولہ ہے، جس کا مرتبہ امت محمدیہ میں دوسرے نمبر پر ہے، اور یہ ہے صحیح سمجھ و درایت دین کی، اس سے ہٹ کر جو کچھ ہے وہ ابلیس کا فلسفہ ہے، جس کو میں معجون فلاسفہ کہا کرتا ہوں۔

ولم یصروا علیٰ مافعلوا وھم یعلمون پر فرمایا کہ یہ **و ھم یعلمون** کی قید احترازی نہیں ہے بلکہ مزید تقبیح کے لیے ہے، علامہ ابن منیر نے قرآن مجید کی تمام قیود کا بیان مفصل کیا ہے کہ کہاں کیسی ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء اصرار سے اشارہ اس اثر کی طرف ہے، جو ترمذی شریف میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔ **ما اصر من استغفرو ان عاد فی الیوم سبعین مرة** (جو گناہوں سے توبہ و استغفار کرتا رہے، اگرچہ دن میں ستر بار بھی گناہ کرے، تو وہ اصرار معصیت کا مرتکب نہیں ہے، حافظ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اصرار کے بارے میں علماء نے فیصلہ کیا ہے کہ اصرار کے ساتھ صغیرہ صغیرہ نہیں اور بغیر اصرار کے کبیرہ کبیرہ نہیں ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اصرار کے ساتھ یعنی بغیر توبہ و استغفار کے اگر صغیرہ گناہ بھی ہوتے رہیں گے تو وہ کبیرہ بن جائیں گے (اور بغیر اصرار کے کبیرہ بھی کبیرہ نہیں رہتے، اور اگر اصرار کے ساتھ کبیرہ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ وہ کفر کی سرحدوں سے قریب کرتے جائیں گے، صرف کبیرہ کی حد میں نہ رہیں گے۔ **وفقنا اللہ کلنا لما یحب و یرضیٰ**. آمین.

"**لا خبو کم**"، پر فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی سال کی شب قدر بتلانا چاہتے تھے۔

باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام اولا حسان وعلم الساعةو بیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ ثم قال جآء جبریل علیہ السلام یعلمکم دینکم فجعل ذالک کلہ دینا وما بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم لوفد عبد القیس من الایمان و قولہ تعالیٰ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ

حضرت جبریل علیہ السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے علم کے بارے میں سوال اور (اور اس کے جواب میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، پھر (اسی روایت میں) رسول اللہ نے فرمایا، کہ جبریل تمہیں (یعنی صحابہؓ کو) تمہارا دین سکھلانے کے لیے آئے تھے، یہاں آپ نے ان تمام باتوں کو دین ہی قرار دیا، اور جو باتیں ایمان کی آپ نے عبدالقیس کے وفد سے بیان فرمائیں، اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا تو وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔

۴۹...... حدثنا مسدد قال حدثنا اسمعیل بن ابراھیم اخبر نا ابو حیان التیمی عن ابی زرعة عن ابی ھریرة قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بارزاً یوما للناس فاتاہ رجل فقال ما الایمان قال ان تومن باللہ و ملئکتہ و بلقائہ و رسلہ وتومن بالبعث قال ما الا سلام قال الاسلام ان تعبد اللہ و لا تشرک بہ و تقیم الصلوٰة و تؤدی الزکوٰة المفروضة و تصوم رمضان قال ما الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک قال متی الساعة قال ما المسئول عنھا باعلم من السائل و لا اخبر ک عن اشرا طھا اذا و لدت الا مة ربھا واذا تطاول رعاة الابل ابھم فی البنیان فی خمس لا یعلمھن الا اللہ ثم تلا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ عندہ علم الساعة الایة ثم ادبر فقال ردوہ فلم یرو شیئاً فقال ھذا جبریل جآ ء یعلم الناس دینھم قال ابو عبد اللہ جعل ذلک کلہ من الایمان.

ترجمہ:۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں تشریف رکھتے تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا، اور کہنے لگا' ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اور (آخرت میں) اللہ سے ملنے پر اور اللہ کے رسولوں پر اور (دوبارہ) جی اٹھنے پر یقین رکھو (اس کے بعد) اس نے پوچھا' اسلام کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تم (خالص) اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کے شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ کو ادا کرو، جو فرض ہے، اور رمضان کے روزے رکھو۔(پھر) اس نے پوچھا' کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو، جیسے کہ اسے تم دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ تصور نہ ہو سکے کہ اسے دیکھ رہے ہو، تو پھر (یہ سمجھو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔(پھر) اس نے پوچھا' قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے بارے) میں جواب دینے والا، پوچھنے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔(البتہ) تمہیں میں قیامت کی علامتیں بتلا دوں گا (وہ یہ ہیں) کہ جب لونڈی آپنے آقا کو جنے گی، اور جب سیاہ اونٹوں کے چرواہے مکانات کی تعمیر میں باہم ایک دوسرے سے بازی لے جائیں گے (ان علامتوں کے علاوہ قیامت کا علم) ان پانچ چیزوں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی'' **ان اللہ عندہ علم الساعۃ**''اس کے بعد وہ شخص لوٹ گیا تو آپ نے فرمایا کہ اسے واپس لاؤ (صحابہؓ نے اسے لوٹانا چاہا، وہاں انہوں نے کسی کو بھی نہ پایا تب آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل تھے، جو لوگوں کو ان کا دین سکھلانے آئے تھے، ابوعبداللہ بخاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کو ایمان ہی کا جز قرار دیا۔

تشریح:۔ایمان، اسلام اور دین، یہ تین بنیادی لفظ ہیں جن سے ان اصولوں کی تعبیر کی جاتی ہے جن پر ایک مسلمان یقین رکھتا ہے، یہ بات کہ یہ تینوں لفظ ہم معنی ہیں یا الگ الگ معنی رکھتے ہیں، اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ایمان کہتے ہیں یقین کو، اسلام کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں، اور دین ایسے متعدد معنی اپنے اندر رکھتا ہے، جس سے ایک مخصوص طرز زندگی مراد لیا جاتا ہے، جسے عام اصطلاح میں ملت اور مذہب بھی کہتے ہیں، اسی ترتیب کے لحاظ سے اول یقین یعنی ایمان کا درجہ ہے، پھر اطاعت یعنی اسلام کا، اس یقین واطاعت کے لیے جن مراسم اور قوانین کی ضرورت ہوتی ہے وہ دین کہلاتے ہیں، مگر کبھی کبھی ایک لفظ دوسرے لفظ کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے، جس کی متعدد مثالیں قرآن مجید اور احادیث میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کے ساتھ اپنے مخصوص فرشتہ کے ذریعہ صحابہ کرام کو تعلیم فرمائی، پہلے ایمان یعنی عقائد کی تعلیم دی پھر اسلام یعنی اطاعت کے طریقے بتلائے، اور اس کے بعد احسان کی حقیقت ظاہر کی، کہ یقین واطاعت کے بعد جو کیفیت آدمی کی عملی زندگی میں پیدا ہو، وہ یہ کہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا تصور پیش نظر رہے، اول تو یہ تصور کہ وہ ذات جو پوری کائنات کو محیط ہے میرے سامنے ہے، لیکن چونکہ ایسی ذات کا تصور آسان نہیں ہے، جس کی کوئی مثال نہیں، اس لیے کم از کم یہ خیال تو ضرور رہنا چاہئے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستی میرے احوال کی نگراں ہے، پھر چونکہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست کوئی ربط آدمی کا قائم ہوتا ہے تو عبادت ہی میں ہوتا ہے، اسی لیے خصوصیت کے ساتھ عبادت کو اس طرح ادا کرنے کی تاکید کی گئی، تاکہ عبادت صحیح طور پر ادا ہو سکے، اور اس عبادت کی برکت سے آدمی کی خارجی زندگی میں بھی اللہ کی ربوبیت ومالکیت اور اپنی عبدیت کا احساس پیدا ہو۔

قیامت کی جن دو نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے پہلی نشانی کا مطلب یہ ہے کہ اولاد اپنی ماں سے ایسا برتاؤ کرے گی، جیسا کہ کنیزوں اور باندیوں سے کیا جاتا ہے، یعنی ماں باپ کی نافرمانی عام ہو جائے گی، دوسری نشانی کا مطلب یہ ہے کہ کم حیثیت اور کم مرتبہ کے لوگ اونچے عہدوں پر قابض ہوں گے، اونچی اونچی بلڈنگیں بنائیں گے، اور اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گے باقی قیامت کا اصل وقت خدا ہی کو معلوم ہے، وہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے، جن کے بارے میں صحیح صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیب کا صحیح حال معلوم نہیں ہوتا، خواہ وہ رسول ہو یا فرشتہ۔

بحث ونظر: حدیث الباب مشہور ومعروف حدیث جبریل ہے' جواعمال کوایمان سے زائداوراس کے مکملات ماننے والوں کی بڑی واضح دلیل ہے' کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اول ایمان کے بارے میں سوال کیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب مرحمت فرمایا' پھراسلام کے بارے میں سوال کیا تواس کا دوسرا جواب ارشادفرمایا' معلوم ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے متغائر ہیں' حالانکہ امام بخاریؒ نے دونوں کومتحد سمجھتے ہیں اوراسی کو پوری کتاب الایمان میں ثابت کررہے ہیں' اسی اعتراض کورفع کرنے کے لیے امام بخاری نے اس حدیث کا ایک بڑاعنوان قائم کیا' جس کے تین حصے کئے' ایک میں اشارہ سوال جبرئیل علیہ اسلام کی طرف کیا کہ ان کے جواب میں آپ نے جتنی چیزیں بیان فرمائیں وہ سب دین کا مصداق ہیں' دوسرااشارہ اس جواب کی طرف کیا جونبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفدعبدالقیس کے سوال پرارشادفرمایا تھا' جس میں ایمان کا مصداق اسلام اوراعمال ہیں' تیسرااشارہ آیت قرآنی کی طرف کیا کہ اسلام کے سواکوئی دین خدا کے یہاں قبول نہ ہوگا جس سے معلوم ہوا کہ اسلام اوردین ایک ہی ہیں' غرض امام بخاری نے پہلے توابواب کی بڑی تعداد ایسی قائم کی' جس سے ان کا مقصد ایک حدتک حاصل ہوا تھا' اوراب حدیث جبرئیل آئی جودوسرے نقطہ نظر کی تائید میں اہم درجہ رکھتی ہے تواس پراس طرح ترجمہ وعنوان لگایا کہ کم ازکم خلاف مقصد ہوسکے' اصل حدیث الباب میں گنجائش حصول مقصد کی کمی کوایک دوسری حدیث وفدعبدالقیس والی سے پورا کیا۔ جو۵۳ پر باب اداء الخمس من الایمان کےتحت آگے آرہی ہے' اورمزید کمی کی تلافی ایک آیت قرآنی کے ذکرسے کی۔

حافظ ابن حجر کی تصریحات

اس موقع پرحافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری صفحہ ۱/ ۸۴' ۸۵ میں جوکچھ لکھا وہ چونکہ نہایت مفیداورمناسب مقام ہے' لہٰذااس کوذکرکرکے پھر حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے عالی لکھی جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حافظؒ نے لکھا۔

''یہ بات پہلے معلوم ہوچکی ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک ایمان واسلام دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور حدیث جبرئیل کے سوال وجواب کا مقتضیٰ دونوں میں تغایر ہے' ایمان مخصوص امور کی تصدیق کا نام ہے اوراسلام مخصوص اعمال کے اظہار کا' اس لئے امام بخاری نے اس کارخ' تاویل[1] کے ذریعہ اپنی رائے اورطریقہ کی طرف لوٹانا چاہاہے۔

حافظ کے نزدیک ماحصل کلام بخاریؒ

پھرآگے ومابین لوفد عبد القیس پرلکھا:۔ کہ وہاں سے معلوم ہوا' ایمان واسلام ایک ہی چیز ہے کیونکہ یہاں حدیث جبرائیل میں جن امورکوایمان فرمایا' وہاں ان کواسلام فرمایا ہے' آیت قرآنی سے بھی معلوم ہوا کہ اسلام دین ہے اورخبرابی سفیان[2] سے معلوم ہوا کہ ایمان دین ہے ان امورکا اقتضاء یہی ہے کہ ایمان واسلام امرواحد ہے یہ امام بخاری کے کلام کا ماحصل ہوا۔

دورائیں:۔ ابوعوانہ اسفرائنی نے اپنی صحیح میں مزنی (صاحب امام شافعیؒ) سے بھی دونوں کےایک معنی میں ہونے کا جزم ویقین نقل کیااورفرمایا کہ

---

[1] بظاہر حافظ کے لفظ تاویل (گھماؤ) کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حدیث جبریل میں اسلام وایمان کے متحد المعنی ہونے کی صورت دشوارتھی' اس لئے حدیث وفد عبدالقیس کی طرف ذہن کومنتقل کیا گیااورایک آیت بھی تائید مقصد کے لئے پیش کی گئی' حالانکہ یہاں مناسب یہی تھا کہ صرف وہ عنوان وترجمۃ الباب ذکرکیا جاتا جو حدیث جبرئیل کا مقتضیٰ ہے' اس کیلئے باب سوال جبریل عن الایمان والاسلام والاحسان و علم الساعۃ الخ بہت کافی تھا' حدیث وفدعبدالقیس کے سوال وجواب وغیرہ کویہاں ترجمہ میں زائد کرنے کا بجزاس کے کیا فائدہ نکلا کہ ذہن مخاطب کوحدیث الباب سے ہٹاکردوسری طرف متوجہ کردیا گیا' تاکہ حدیث الباب کی وجہ سے امام بخاری کی رائے کوضعیف نہ سمجھا جائے' واللہ اعلم۔ [2] امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب میں خبرابی سفیان کا ذکرنہیں ہے مگرحافظؒ نے یہاں اس کا بھی اضافہ کیا' شایداس خیال سے کہ اگلے باب بلاترجمہ میں امام بخاری نے اس کاذکرکیا ہے' اورچونکہ وہ باب بلاترجمہ ہے بلکہ بعض نسخوں میں باب کالفظ بھی نہیں ہے اس لئے اس حدیث کوبھی اسی کے تحت داخل سمجھنا چاہئے اورگویاامام بخاری اپنی زبان حال سے اس کی تائید بھی لینا چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

میں نے خود ان سے ایسا سنا ہے لیکن امام احمدؒ[1] سے اس امر کا جزم و یقین نقل کیا کہ دونوں متغائر اور الگ الگ ہیں اور دونوں اقوال کے متعارض دلائل ہیں۔

علامہ خطابی نے کہا کہ "مسئلہ مذکورہ میں دو بڑے اماموں نے جدا جدا تصانیف کیں، اور دونوں نے اپنی اپنی تائید میں بہ کثرت دلائل ذکر کئے، جو ایک دوسرے سے متباین و متضاد ہیں اور حق یہ ہے کہ ایمان و اسلام میں باہم عموم و خصوص کی نسبت ہے کیونکہ ہر مومن مسلم ضرور ہوتا ہے اور ہر مسلم کا مومن ہونا ضروری نہیں، انتھیٰ کلامہ ملخصاً۔

امر مذکور کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسلام کا اطلاق ایک ساتھ اعتقاد و عمل دونوں پر نہیں ہوگا، بخلاف ایمان کے کہ اس کا اطلاق ان دونوں پر ہوگا، اس پر اعتراض ہوگا کہ آیت و رضیت لکم الاسلام دینا میں تو اسلام عمل و اعتقاد دونوں کو شامل ہے کیونکہ بد اعتقاد حامل کا دین خدا کو پسند نہیں ہوسکتا اور اسی سے مزنی اور ابو محمد بغوی نے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے حدیث جبرئیل ہذا پر کلام کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اسلام کو ظاہر اعمال سے متعلق کیا ہے اور ایمان کو باطنی اعتقاد سے، مگر ایسا کرنا اس لئے نہیں ہے کہ اعمال ایمان سے نہیں ہیں یا تصدیق اسلام سے نہیں ہے، بلکہ وہ سب ایک مجموعہ کی تفصیل ہے جو سب کے سب ایک ہی ہیں، اور ان کے مجموعہ کو دین کہا جاتا ہے، چنانچہ اسی لئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبریل علیہ السلام تمہیں دین سکھانے آئے تھے اور حق تعالیٰ نے فرمایا، ورضیت لکم الاسلام دینا، اور فرمایا ومن یتبغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ ظاہر ہے کہ دین صرف اسی وقت رضا و قبول کا درجہ حاصل کرسکتا ہے، جبکہ اس میں تصدیق موجود ہو"۔

حافظ کا فیصلہ

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد حافظؒ نے جو فیصلہ دیا وہ بھی ملاحظہ ہو۔ تمام دلائل پر نظر کرنے کے بعد کچھ منقح ہوا وہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام دونوں کی الگ الگ حقیقت شرعیہ ہیں، جس طرح کہ ان کی الگ الگ ہی حقیقت لغویہ بھی ہیں، لیکن ہر ایک دوسرے کو مستلزم ہے، اس لحاظ سے کہ ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہے، پس جس طرح ایک عامل بغیر صحت عقائد کے کامل مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی ایک خوش اعتقاد شخص بغیر عمل کے کامل مومن نہیں ہوسکتا، اور جہاں کہیں اسلام کی جگہ پر ایمان کا یا ایمان کی جگہ اسلام کا اطلاق ہوتا ہے، یا ایک کو بول کر دونوں کا مجموعہ مراد ہوتا ہے وہ بطریق مجاز ہے، اور موقع و محل سے مراد کا تعین ہوجایا کرتا ہے مثلاً اگر دونوں ایک ساتھ مقام سوال میں جمع ہو جائیں تو دونوں کے حقیقی معنی مراد ہوں گے اور اگر دونوں ساتھ نہ ہوں، یا سوال کا موقع نہ ہو تو مقامی قرائن کے لحاظ و اعتبار سے حقیقت یا مجاز پر محمول کریں گی یہی بات محدث اسماعیلی نے اہل سنت والجماعت سے نقل کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایمان و اسلام دونوں کا مدلول و مصداق ایک جگہ ذکر ہونے کی صورت میں مختلف اور الگ الگ ہوا کرتا ہے، اور الگ الگ ذکر ہوں تو ایک دوسرے کے ضمن میں شامل ہوا کرتا ہے، اسی تفصیل کی روشنی میں محمد بن نصر کے کلام کا محمل مدلول حدیث عبدالقیس کو سمجھنا چاہئے جس نے اکثر حضرات سے ایمان و اسلام میں اتحاد و مساوات نقل کی ہے، اور ان کے اتباع میں ابن عبدالبر نے بھی اس کو نقل کیا ہے، اور لالکائی و ابن سمعانی کے کلام کا محمل، مدلول حدیث جبریل قرار دینا چاہئے، جنہوں نے اہل سنت سے یہ بات نقل کی کہ وہ ایمان و اسلام میں تفریق کرتے تھے۔ واللہ الموفق،

فیصلہ حافظ کے نتائج

حافظ ابن حجرؒ کی مذکورہ بالا تصریحات سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے

(۱) امام بخاریؒ کی رائے ایمان و اسلام کے اتحاد کے بارے میں حدیث جبرئیل سے مطابق نہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی رائے

---

[1] ظاہر ہے کہ مزنی سے امام احمدؒ کی شخصیت اور رائے بہت بلند و برتر ہے۔

کی تائید کے لیے دوسرے راستے تاویل کے اختیار کیے۔

(۲) امام بخاری نے جس قدر زور اعمال کو اجزاء ایمان ثابت کرنے کے لیے صرف کیا تھا' وہ حدیث جبریل میں پہنچ کر بے اثر ہو گیا' کیونکہ حافظ ابن حجرؒ ہی کے فیصلہ سے حدیث جبریل اس مدعا کے خلاف ہے۔

(۳) امام بخاریؒ نے جو بہت بڑا دعویٰ کیا تھا کہ سلف سے ایمان کے معنی قول وعمل ہی ثابت ہے' اور اسی وجہ سے امام بخاری نے بڑی ناراضگی کا اظہار کر کے ایسے لوگوں سے صحیح بخاری میں روایت نہیں کی' جنھوں نے ایمان کا رکن وجز وعمل کو نہیں سمجھا وغیرہ' علاوہ اس کے کہ ان کا ایسا تشدد ہماری سابقہ معروضات سے بے محل ثابت ہو چکا ہے' یہاں حافظ کے فیصلہ سے بھی حق وانصاف نہیں ٹھیرتا' کیونکہ حافظ لا لکائی وابن سمعانی جیسے محققین نے اہل سنت کا وہی مسلک قرار دیا ہے جو امام ابوحنیفہ وغیرہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے قابل رد قرار دیا گیا تھا۔

لیکن خدا کی تقدیر میں ایسا بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا' وہی پتھر ساری عمارت کی زینت و استحکام کا بڑا سبب بنا' امام صاحب کے بارے میں امام بخاری نے بے علمی کی تعریض کی جو نہ چاہئے تھی' مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ ایسے بے علم لوگوں کی تقلید کرنے والے ہر زمانے میں امت محمدیہ کے دو تہائی افراد ہوں گے' اور حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے ہزار ہا اہل علم امام صاحب کی شاگردی پر فخر کریں گے بلکہ خود عبداللہ بن مبارک بھی فخر کرتے تھے جس کا علم شاید امام بخاری کو نہ ہو سکا۔

ناظرین بخوبی واقف ہیں کہ ہم امام بخاری قدس سرہ کی جلالت قدر سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہیں اور ہم نے ان کی طرف سے دفاع کا حق بھی ادا کیا ہے' ان کی علمی وحدیثی بلند پایہ خدمات واحسانات سے بھی ہماری سب کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں مگر جہاں حق و انصاف کی بات کہنے کی ضرورت پیش آئے گی' اس کا مقام ومرتبہ ہر شخصیت سے معمولی نہیں بلکہ نہایت ہی بلند وبرتر ہے' ہمارے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی معصوم نہیں اور صحابہ کرام کے سوا کوئی شخصیت تنقید سے بالاتر نہیں ہے' ہم اپنے نہایت ہی محترم ومقلد پیشوا امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بھی معصوم نہیں سمجھتے' اور ان کی بھی جو بات قرآن وحدیث کے معیار پر پوری نہ اترے گی' اس کو ترک کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں' ایک جاہل عالم نے ہمیں لکھا کہ اگر امام بخاری پر تنقید کرنی تھی۔

تو شرح حدیث کے لیے کسی اور کتاب حدیث کو اختیار کرنا تھا۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ ایسے شخص کو جاہل عالم کا خطاب دیا کرتے تھے۔ جو بظاہر لکھا پڑھا ہونے کے باوجود کسی علمی بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو' یا اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے' احادیث بخاری کی اصحیت واہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے' لیکن اس کے ساتھ فقہ البخاری تو واجب التسلیم نہیں نہ اس کو تنقید سے بالا کہہ سکتے ہیں۔

امام بخاری کی صحیح اس لحاظ سے دوسری کتب حدیث سے نہایت ممتاز ہے کہ اس میں انہوں نے صرف اپنے اجتہاد کے موافق احادیث جمع کی ہیں' اور تراجم ابواب میں بھی اپنے ذاتی مسائل اجتہادیہ ہی کی تائید بڑے زور شور سے کرتے ہیں اسی لیے بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ صحیح بخاری حدیث سے زیادہ فقہ کی کتاب کہلانے کی مستحق ہے' چنانچہ اس میں یک طرفہ مواد زیادہ ہوتا ہے' اور اس کی شرح بھی کئی وجوہ سے دشوار ہے' اول تو صحیح بخاری کے درجہ کی جوابی احادیث کی تلاش وتعیین رجال کی بحثوں پر نظر' پھر فقہ البخاری سے عہدہ برآ ہونا' ان حالات میں سب سے زیادہ مشکل کام شرح بخاری ہی کا ہے' تاہم خدا کے فضل وتائید پر بھروسہ کر کے اس کام میں سر کھپانے کا عزم کر لیا گیا ہے یہ دوسری جلد ختم پر ہے' اور ناظرین اندازہ کریں گے کہ علوم نبوت کی تمام سابقہ تشریحات کا بہترین نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور اس سلسلہ کا موجودہ نوعیت کا کام کرنے کا حوصلہ محض حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے درسی ومجلسی ارشادات کے سبب سے ہو سکا ہے۔ واللہ الموفق والمیسر۔

حدیث جبریل کی اہمیت

بات لمبی ہو گئی' یہاں ضروری بات یہی کہنی ہے کہ امام بخاری نے حدیث جبریل پر جو ترجمۃ الباب باندھا ہے وہ بات کو گول مول بنا دینے کی

ایک سعی ہے اور حافظ نے اس موقع پر جونکھری ہوئی بات اور حق لگتی وضاحت کی ہے وہ بڑی قابل قدر ہے کہ ایمان واسلام کی جس طرح الگ الگ لغوی حقیقت ہے شرعی حقیقت بھی یقیناً وقطعاً الگ الگ ہے ان دونوں کوایک قرار دینا صحیح نہیں اور حدیث جبریل اس کی بڑی دلیل ہے۔

حدیث جبریل میں قواعد واصول کی بہت سی انواع اور بہت سے مہم فوائد بیان ہوئے ہیں جن میں سے کچھ تشریح و بحث کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں اسی لیے علامہ قرطبی نے اس کو"ام السنۃ" کا لقب دیا ہے کیونکہ پوری سنت کا اجمالی علم اس میں سمودیا گیا ہے۔

قاضی عیاض نے فرمایا کہ تمام وظائف عبادات ظاہری و باطنی بھی اس میں ہیں اور اعمال جوارح بھی اخلاص نیات وسرائر بھی اس میں ہے۔اور آفات اعمال سے تحفظ بھی غرض تمام شریعت کی اصل ہے (شرح البخاری صفحہ ۱/۲۵۳)

علامہ نووی نے خطابی سے نقل کیا کہ صحیح یہی ہے کہ ایمان واسلام میں عموم وخصوص ہے ہر مومن مسلم ہے لیکن ہر مسلم کا مومن بھی ہونا ضروری نہیں اور جب یہ بات ثابت ومحقق ہوگئی تو تمام آیات کی تفسیر صحیح ہوگئی اور اعتدال کی صورت پیدا ہوگئی پھر فرمایا کہ ایمان کی اصل تصدیق ہے اور اسلام کی اصل استسلام وانقیاد ہے۔ (شرح البخاری صفحہ ۱/۲۵۱)

حضرت شاہ صاحب کی مزید تحقیق

اب اس تحقیق انیق سے ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لیے ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی مزید تحقیق سنیے! فرمایا امام بخاریؒ کی طرف سے اس موقع پر ان کے جواب کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ حافظؒ کی وضاحت کے مطابق چونکہ کسی مقام پر دونوں الفاظ کے ایک جگہ یا ایک سوال میں جمع ہوجانے پر ان کی تشریح الگ الگ ہوسکتی ہے ایسے ہی یہاں حدیث جبریل میں بھی ہوا ہے اگرچہ امام بخاریؒ اس تغایر کی صورت کو مجاز مانیں گے اور اتحاد والی صورت کو حقیقت پر رکھیں گے جیسا کہ مترادفات میں ہوا کرتا ہے کہ مقامی طور سے جب دو مترادف الفاظ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ان کے معانی میں فرق کردیا جاتا ہے الگ الگ استعمال ہوں تو ایک ہی معنی لیے جاتے ہیں اور اس کی تائید میں امام بخاری نے دوسری حدیث عبدالقیس والی اور آیت پیش کردی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دین واسلام کا اتحاد تو آیت سے اور اسلام وایمان کا اتحاد حدیث عبدالقیس سے ہی پہلے ثابت شدہ مان کر حدیث جبریل کے تغایر کو مقامی وعارضی تغایر محمول کریں۔

امام بخاری کا جواب محل نظر ہے

لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کے جواب کی یہ دونوں صورتیں محل نظر ہیں کیونکہ مقامی تغایر کی بات جب چل سکتی ہے کہ دونوں لفظ ایک ہی عبارت میں دفعۃً واحدۃً سامنے آجاتے تا کہ یہ کہنا درست ہوسکتا کہ مجیب نے مترادفات کی طرح رعایت کر کے الگ الگ وضاحت کردی یہاں تو یہ صورت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایمان کے بارے میں سوال کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس امر سے بالکل خالی الذہن ہیں کہ سائل کچھ دیر کے بعد اسلام کے بارے میں سوال کرے گا اس لیے آپ کے نزدیک ایمان کی جو کچھ بھی حقیقت تھی وہ بے کم وکاست بیان فرمادی قطع نظر اس سے کہ اسلام کا مفہوم کیا ہے پھر جب اسلام سے سوال کیا گیا تو اس پر بھی آپ نے اسی نوعیت سے صرف اس کی حقیقت واضح فرمادی لہٰذا فرق مقامی کے اعتبار سے جواب یہاں نہیں چل سکتا ہاں! اگر تمام سوالات ایک مرتبہ ایک عبارت میں آچکے ہوتے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جواب ارشاد فرماتے تو اس جواب کی گنجائش ہوتی۔

دونوں حدیث میں فرق جواب کی وجہ

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک دونوں حدیثوں میں جواب کے فرق کی وجہ یہ ہے کہ جواب سائل کے علم و

استعداد کے مطابق ہوا کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کے سوال اور ان کے حال سے ان کے علمی کمال و فطانت کا اندازہ فرما لیا تھا، لہٰذا جواب بھی ان کے حسب حال دیا کہ تفصیل فرما کر تحقیقات علمیہ بیان فرمائیں اور ایمان و اسلام کی حقیقت الگ الگ کھول دی، اور ضمام بن ثعلبہ کو آپ جانتے تھے کہ ابھی نئے اسلام لائے ہیں، ان کو اجمالی طور سے جواب دینا کافی سمجھا، حقائق بیان کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اس طرح دوسرے مواقع پر بھی موٹا موٹا اسلام و ایمان تشہد و عبادات وغیرہ بتلا دیں۔

واعظ و معلم کی مثال

غرض دونوں حدیثوں میں الگ الگ جواب مخاطبین کی رعایت سے ہے، جس طرح ایک واعظ، اپنے وعظ میں عوام کو ترغیب و ترہیب کے لیے ضعیف احادیث بھی سناتا ہے اور ان کا تفصیلی حال بیان نہیں کرتا کہ کون سی احادیث کس درجہ کی ہے۔ تارک صلوٰۃ کو کافر کہہ دیتا ہے، اور کفر دون کفر کی بحث ان کے سامنے نہیں کرتا، کیونکہ وہ ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن ایک معلم و مدرس کے لیے اس سے چارہ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ کی حقیقت بتلائے، اس کے بارے میں جو کچھ مسامحات ہوئے ہیں، ان پر تنبیہ کرے، مسئلہ کے متعلقات اور مالہ و ماعلیہ کی تفصیل کرے، کیونکہ وہ اپنے مخاطبین کے لحاظ سے اظہار حقائق کے منصب پر فائز ہے۔ غرض درس میں اعطاء علم ہوتا ہے اور وعظ میں اعطاء عمل خوب سمجھ لو۔ اسی طرح حدیث جبریل کا حاصل افاضۂ علم و بیان حقیقت ہے، بخلاف حدیث وفد عبدالقیس کے کہ اس کا مقصد صرف اعمال کی ترغیب ہے، جس میں اجمال و تسامح چل سکتا ہے اور شریعت نے بھی ترغیب و ترہیب میں تفصیل کو ترک کیا ہے۔

ایمان کا تعلق مغیبات سے ہے

الایمان ان تومن باللہ الخ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے سلسلہ میں اشیاء خائبہ کا ذکر فرمایا، جیسا حافظ ابن تیمیہؒ کی تحقیق ہے کہ ایمان کا تعلق صرف مغیبات سے ہوتا ہے، اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعمال کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ اعمال کے اجزاء نہیں ہیں۔ جو امام اعظم و دیگر اکابر و سلف کا مسلک ہے۔

لقاء اللہ کا مطلب

ایمان کے تحت، ایک جز و ایمان بلقاء اللہ بھی فرمایا ہے، علامہ خطابی نے فرمایا کہ اس سے مراد آخرت[1] میں حق تعالےٰ کا دیدار ہے، لیکن امام نووی نے اس کے خلاف کہا کہ لقا سے رؤیت مراد نہیں، اس لیے کہ کوئی شخص اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کو رویت حاصل ہوگی، رویت کا مدار بحالت ایمان مرنے پر ہے اور کسی کو اپنے خاتمہ کا علم نہیں ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مراد صرف اتنی بات پر ایمان لانا ہے کہ حق تعالیٰ کی رویت امر واقعی اور حق ہے، اور آخرت میں حاصل ہو سکتی ہے، یا مراد یہ ہے۔ کہ اس دنیا سے دار آخرت کی طرف انتقال ضروری ہے جہاں لقاء خداوندی ہوگا، پھر یہ کہ کس کو ہوگا اور کس کو نہ ہوگا، اس سے یہاں بحث نہیں ہے (شروح البخاری صفحہ ۱/۲۴۵)

حضرت شاہ صاحب کی تحقیق

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ لقاء خداوندی ہی کا وہ عقیدہ ہے، جس سے مذہب اسلام کو دوسرے باطل مذاہب عالم سے بڑا امتیاز حاصل ہوتا ہے، کیونکہ یہ عقیدہ دین سماوی کا ہے، اہل یونان کا عقیدہ یہ تھا کہ جتنے علوم حقہ ہیں وہ ارواح کو ابدان سے جدا ہونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں، اور

[1] اگر کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہاں بھی رویت باری کا شرف حاصل ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو دیدار کا شرف اس دار دنیا میں حاصل نہیں ہوا، بلکہ ملکوت علیا میں ہوا ہے، جس پر دنیا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۳۳۸)

تمام چیزیں ان کے سامنے ہو جاتی ہیں، جن سے ارواح کو بڑا سرور وابتہاج حاصل ہوتا ہے اور یہی ان کی جنت و نعیم جنت ہے۔ اور اگر وہ علوم حاصل نہ ہوں یا خلاف واقع حاصل ہوں تو وہ ان ارواح کے لیے ابدی غم والم کا موجب ہوں گے، اور وہی ان کے لیے بطور عذاب و جحیم ہوں گے۔

فلسفہ یونان اور عقول

ان کے یہاں ملائکہ کی جگہ عقول ہیں، اور فلسفہ یونان کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک سیر ہے، عقل اول تین پاؤ عقل ثانی آدھ سیر، اور عقل ثالث پاؤ بھر ہے اور اسی طرح دوسری عقول درجہ بدرجہ ہیں، انہوں نے عقول کے لیے بھی علم محیط وغیرہ مانا ہے، جو شرک ہے، اور لقاء خداوندی ان کے یہاں محال ہے۔

دیوتا و اوتار

ہندوستان کے ہندو مذہب والے، اجسام میں حلول الوہیت کے قائل ہیں، اور ان کو دیوتا، اوتار وغیرہ کہتے ہیں ان کی عبادت بھی کرتے ہیں، اور تناسخ مانتے ہیں، وہ بھی دین سماوی کے طریقہ پر لقاء خداوندی کے قائل نہیں۔

اسلام میں لقاء اللہ کا عقیدہ

ہمارے یہاں لقاء خداوندی کا کھلا عقیدہ ہے، **فمن کان یرجو القاء ربه فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادة ربه احدا** (کہف) "پس جس کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق ہو۔ (یا اس کے سامنے حاضر کیے جانے کا خوف ہو۔) اسے چاہئے کہ کچھ بھلے کام شریعت کے موافق کر جائے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ظاہر و باطن کسی کو بھی کسی درجہ میں شریک نہ کرے، یعنی شرک جلی کی طرح شرک خفی سے بھی بچتا رہے"۔ اللهم اجعلنا كلنا ممن يرجو لقاء ک یارب۔

مسافتہ درمیان دنیا و آخرت

حضرت شاہ صاحبؒ نے مناسبت مقام سے بھی افادہ فرمایا کہ اس دنیا اور دار آخرت کے درمیان کوئی مسافت نہیں ہے۔ جس کو قطع کر کے وہاں پہنچیں گے بلکہ اس دنیا کے درہم برہم ہونے پر، اسی میں سے پھوٹ کر آخرت نمودار ہو جائے گی، اور یہی اس کا مقام ہوگا، جس طرح کہ زمین کے اندر دبی ہوئی گٹھلی کے پھول پھٹنے کے بعد درخت نکل آتا ہے، میں نے اپنے ایک فارسی قصیدہ میں برزخ، حشر و نشر اور اس کے واقعات کی تمثیل پیش کی ہے۔

احسان کی حقیقت

شارحین حدیث سے احسان کی دو شرحیں منقول ہیں، ایک کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے اختیار کیا، دوسری کو علامہ نووی نے، پہلی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی حقیقت سمجھانے کے لیے دو حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا ان میں سے اونچے درجہ کی حالت یہ ہے کہ انسان اپنے قلب سے مشاہدہ حق اس طرح کرنے لگے کہ گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اور اسی کی طرف آپ نے کانک تراہ سے اشارہ فرمایا ہے، دوسری حالت یہ ہے کہ اس کے قلب پر مشاہدہ حق کا غلبہ تو نہیں ہوا، مگر اس کے قلب میں اتنی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ اس امر کا استحضار ضرور کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ہر حال سے مطلع ہیں، اور اس کے ہر عمل کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کی طرف آپ نے فانه یراک سے اشارہ فرمایا، گویا احسان کے دو حال ہیں، ایک وہ جو انسان کے لیے بطور حال، وصف و صفت نفس بن جاتا ہے، اسی لیے اس کو مشاہدہ حق کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ حال و وصف اس پر غالب و راسخ ہو جاتا ہے، دوسرا درجہ علم و عقیدہ کا ہے، کہ حق تعالیٰ تو اس کو ہر حال میں دیکھ ہی رہے ہیں، یہ استحضار کی کیفیت بھی کچھ وقت قائم رہنے کے بعد حال بن جاتی ہے تاہم یہ علم سے زیادہ قریب رہتی ہے، مشاہدہ والی کیفیت کی طرح صفت نفس نہیں بنتی۔

غرض شارع یہ ہے کہ اگر پہلی حالت کسی کو حاصل نہ ہوتو دوسری کم درجہ والی تو ضرور ہی حاصل ہونی چاہئے' گویا مطلوب دونوں ہی ہیں' اول اس لیے ارفع و اعلیٰ ہے کہ وہ کمال استغراق کی صورت اور حال وصفت نفس ہے اور دوسری صرف علم کے درجہ کی چیز ہے' جس کا مرتبہ حال سے کم ہے' کیونکہ علم کی کیفیت ہی رسوخ کے بعد صفت نفس بن جانے پر حال ہو جاتی ہے۔

دو مطلوب حالتیں اور ان کے ثمرات

یہ دونوں حالتیں معرفت خداوندی اور حق تعالےٰ کے خوف وخشیت سے پیدا ہوتی ہیں' چنانچہ روایت عمارۃ بن القعقاع میں اور حدیث انسؓ میں بھی ان **تخشی اللہ کانک تراہ** وارد ہوا ہے' حافظ عینی نے اس مقام پر نہایت اعلیٰ تحقیق فرمائی ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا تعلق ترک معاصی' التزام طاعات' اور مباحات میں ترک لایعنی سے ہے' اگر حق تعالےٰ کی معرفت پوری طرح حاصل ہو کہ وہ ہماری ہر حرکت وسکون اور تمام جا و بے جا اعمال پر مطلع ہے' ظواہر وسرائر سب اس پر روشن ہیں تو وہ ہر وقت اور ہر جگہ حق تعالےٰ کی ذات یا اس کے برہان کا مشاہدہ کرتا ہے' حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی طرح برہان رب کا مشاہدہ فرمایا تھا۔

جب حق تعالےٰ کی معرفت وخشیت دل میں جاگزین ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے نہ صرف معاصی سے بچنے کی توفیق ملتی ہے اور طاعات میں پوری حلاوت حاصل ہوتی ہے' بلکہ لایعنی باتوں اور بے سود مشاغل سے بھی اس کو رستگاری مل جاتی ہے'

غافل تو بیک لحظ ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ (کسی شخص کے اچھے اسلام کی یہ بھی بڑی علامت ہے کہ وہ لایعنی باتوں کے پاس نہیں پھٹکتا) چونکہ دنیا میں اور دنیا کی ان آنکھوں سے ہم حق تعالےٰ کو نہیں دیکھ سکتے' اس لیے حق تعالےٰ کی جناب میں استغراق اور قلبی مشاہدہ کو کانک تراہ سے تعبیر فرمایا' جس طرح خانہ کعبہ نگاہوں کے سامنے ہونے کے وقت حق تعالےٰ کی اس تجلی گاہ کی وجہ سے ہر شخص کو بقدر معرفت وخشیہ مشاہدہ حق کی کیفیت کا کچھ نہ کچھ حصول ہو جاتا ہے اسی طرح قلبی مشاہدہ ومراقبہ کی کیفیات دوسری جگہوں کی عبادات وطاعات میں بھی حاصل ہو سکتی ہیں' اور اس حالت کی تحصیل مطلوب ہے' اگر کسی پر غفلت وانہماک دنیوی ہی طاری رہتا ہے' اور وہ اس حالت کو حاصل نہیں کر سکتا تو دوسرے درجہ میں دوسری حالت کی تحصیل مطلوب ہے' کہ کم از کم اپنے قلب میں اسی کا استحضار کرے کہ حق تعالےٰ میری طاعات وعبادت کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ وہ شرح ہے' جس کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے اختیار کیا اور اس صورت میں فان لم تکن تراہ میں ان شرطیہ رہتا ہے جو اس کا عام اور کثیر استعمال ہے' اور یہ بہت اونچی شرح وتحقیق ہے۔

علامہ نووی کی شرح

دوسری شرح وہ ہے' جس کو علامہ نووی نے اختیار کیا کہ مقصد شارع عبادات وطاعات میں خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا کرنا ہے' یعنی اس طرح عبادت وبندگی کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے' کیونکہ اس صورت میں بھی خدا اس کو دیکھ رہا ہے' اس لیے اگرچہ ہم خدا کو نہیں دیکھتے مگر وہ تو ہمیں ضرور دیکھ رہا ہے' یعنی سارا زور اس امر پر دیا جا رہا ہے کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے'

اس لیے عبادت کو بہتر سے بہتر بنانے کی تدبیر یہی ہے کہ ہم اس تصور کو قوی کریں کہ وہ ہمیں' ہماری طاعات ونیات سب کو دیکھ رہا ہے اور قاعدہ ہے کہ جس کی خدمت واطاعت کی جائے' اگر وہ خادم ومطیع کو اس حالت میں دیکھتا ہے تو یہ زیادہ خوبی سے اس خدمت واطاعت کو انجام دیا کرتا ہے' اس صورت میں **فان لم تکن تراہ** میں ان شرطیہ نہیں بلکہ وصلیہ ہوگا' جو اس کا عام وکثیر استعمال نہیں ہے' بلکہ اس کی مثالیں شاذ ونادر ہی ملیں گی۔

کون سی شرح راجح ہے

بظاہر پہلی شرح کوترجیح حاصل ہے اور حافظ ابن حجر کا پایہ تحقیق بھی بہ نسبت علامہ نووی کے بہت بلند ہے مگر ایک مطبوعہ تقریر درس بخاری میں نظر سے گزرا کہ "یہاں ان وصلیہ ہے اوران شرطیہ کہنا درست نہیں، بعض لوگوں نے ان کو شرطیہ مان کر دو درجے تسلیم کئے ہیں، پہلا درجہ مشاہدہ کا ہے جو بلند ہے اور دوسرا درجہ اس سے کم اور نیچا ہے، مقصد یہ ہے کہ پہلا مقام اگر تم کو حاصل نہ ہو سکے تو دوسرا مرتبہ حاصل کرنا چاہئے، لیکن کلام اس توجیہ سے ابا کرتا ہے، پہلی توجیہ زیادہ مناسب ہے" اگر ان شرطیہ کہنا نا درست ہے اور کلام بھی اس توجیہ سے ابا کرتا ہے تو اس توجیہ کو بھی نا درست ہونا چاہئے تھا، پھر صرف کم مناسب اور زیادہ مناسب کا فیصلہ کیا؟ اس لیے بظاہر اس رائے کی نسبت حضرت شیخ کی طرف درست نہیں معلوم ہوتی، واللہ اعلم۔

علامہ عثمانی کے ارشادات

حضرت علامہ عثمانی قدس سرہ نے فتح الملہم صفحہ ۱/۱۶۸ میں تحریر فرمایا کہ حدیث الباب (حدیث جبریل) کے یہ جملے **ان تعبد الله کانک تراہ الخ** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم سے ہیں، جن کے الفاظ کم اور معانی بہت زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ ان سے مقام مشاہدہ، مقام مراقبہ وغیرہ بیان ہوئے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خود عبادت کے بھی تین مراتب و مقامات ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی ادائیگی ایسے طریقہ پر کر دی جائے کہ ظاہری ارکان و شرائط پورے ہو کر وظیفہ تکلیف ساقط ہو جائے دوسری صورت اس طرح ادا کرنے کی ہے کہ اپنے قلب میں پورا استحضار اس امر کا کرے کہ حق تعالیٰ اس کی بندگی و اطاعت کو مشاہدہ و معائنہ فرما رہے ہیں جو مقام مراقبہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ صورت اول سے بہتر ہے۔

تیسری صورت سب سے اعلیٰ و ارفع یہ ہے کہ مکاشفہ کے دریاؤں میں غوطہ زنی کرے، حق تعالیٰ کے ہمہ وقت دھیان و استغراق سے اپنے قلب کو مشغول کرے، اور حضور دوام کی دولت سے مالا مال ہو، جس کا ثمرہ دوام ذکر ہے، یعنی حق تعالیٰ کو ہر آن حاضر و ناظر سمجھے گا تو اس کی یاد سے بھی دل غافل نہیں ہو سکتا، جب یہ صورت حاصل ہو جاتی ہے تو گویا اس کو حق تعالیٰ کی رویت و مشاہدہ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، یہی مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (ارواحنا فداہ) کو حاصل تھا اور اسی لیے...... آپ نے فرمایا **جعلت قرة عینی فی الصلوٰة**۔ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، کیونکہ طاعت میں آپ کو لذت اور عبادت میں راحت ملتی تھی، اور چونکہ آپ کے قلب انور کو انوار کشفیہ الٰہیہ محیط ہو چکے تھے اس لیے غیر اللہ کی طرف توجہ و التفات کے تمام دروازے اور دریچیاں بند ہو چکی تھیں۔

استغراق و محویت کے کرشمے

یہ جب ہی ہوتا ہے کہ قلب کے تمام گوشے محبوب کے ذکر و تصور سے معمور ہو جاتے ہیں اندرونی حواس کی نس نس میں اسی کی یاد و خیال سما جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ بھی وہ دنیا کے ظواہر و رسوم سے دیکھتا ہے، وہ سب بے خیالی بے دھیانی کی نظر ہوتی رہتی ہیں، اس کے بعد اس کے ظاہری حواس کان، آنکھ وغیرہ بھی وہی کچھ سنتے دیکھتے ہیں، جو اس کے محبوب حقیقی کی محبوب و مرضی ہوتی ہے اب وہ ظاہری کان، آنکھ سے سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، مگر کچھ نہیں سنتا دیکھتا، اور اندرونی حواس اس قدر بیدار و کارگزار ہو جاتے ہیں کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، جو ہم ظاہری حواس سے کبھی بھی دیکھ اور سن نہیں سکتے۔

حدیث میں ہے کہ ایک بندہ مجھ سے قریب ہوتے ہوتے اتنا قریب بھی ہو جاتا ہے کہ پھر میں ہی اس کی سمع و بصر بن جاتا ہوں، جن سے وہ سنتا اور دیکھتا ہے، حق تعالیٰ اپنے حبیب و محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقہ میں ہمیں بھی ان سعادتوں میں سے کوئی حصہ نصیب فرمائے۔ **وما ذالک علی الله بعزیز**۔

مذکورہ بالا دومشہور شرحوں کے علاوہ ایک شرح اور بھی ہے جو صوفیہ کی طرف منسوب ہے اور اس کو محدثین میں سے حافظ ابن حجر وغیرہ شارحین بخاری نے رد کیا ہے اور ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں اس کی کچھ توجیہ بھی کی ہے وہ یہ کہ فان لم تکن میں کان تامہ ہے ناقصہ نہیں مطلب یہ کہ اگر تمہارا وجود فنا ہو جائے جو حق تعالیٰ کی رویت ومشاہدہ سے بڑا حاجب و مانع ہے تو تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ لوگے غرض فنا یا فناء الفنا کا درجہ اگر حاصل ہو جائے تو قلب خدا کی رویت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور وہی یہاں مراد ہے یہ درجہ صوفیا کے یہاں کثرت ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔

افادات انور

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احسان اچھے طریقہ پر کیے جانے والے تمام انواع اذکار واشغال وغیرہ کو شامل ہے پھر اذکار کا اطلاق صرف اوراد مسنونہ پر ہوتا ہے اشغال سے وہ طریقے مراد ہوتے ہیں جو مشائخ طریقت وصوفیہ کے معمول ہیں نسبت ان کی اصطلاح میں اس ربط خاص کو کہتے ہیں جو عام ربط خالقیت ومخلوقیت کے سوا حاصل ہوتا ہے جس کو یہ ربط خاص حاصل ہو جاتا ہے وہ صاحب نسبت کہلاتا ہے۔

تصوف کے مشہور سلسلے چار ہیں سہروردی قادری چشتی ونقشبندی اور ہمارے اجداد میں سہروردی سلسلہ ہی نسلاً بعد نسل دس پشتوں تک متصل رہا ہے۔

شریعت طریقت وحقیقت

خدا کے جو اوامر نواہی وعد ووعید وغیرہ ہم تک پہنچے ہیں ان کو شریعت کہتے ہیں شریعت کے سب احکام وہدایات کو بطور عادت ثانیہ پابندی ودوام کے ساتھ معمول بہ بنالینا طریقت ہے اس طرح زندگی گزارنے والے کے تمام اعمال پر ایمان کی نورانیت چھا جاتی ہے اور یہی حال سلف کے اعمال کا تھا مگر اب وہ وقت آ گیا کہ علم ہے تو عمل ندارد ایمان ہے مگر تصدیق جوارح مفقود ظاہر میں کتنے ہی قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے بھی ایسے اہل زیغ ملیں گے کہ ان کے زیغ باطن کے سبب قرآن مجید ان پر لعنت کرتا ہوگا اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین۔

شریعت وطریقت کی مندرجہ بالا تشریح کے بعد فرمایا کہ دینی زندگی کے سب سے بلند مقصد میں کامیابی اور اعلیٰ وارفع مطلوب کے حصول کو حقیقت کہا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ طریقت وشریعت میں کوئی اختلاف ومغایرت نہیں ہے حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت طریقت وحقیقت کی تفصیل فرمائی ہے یعنی اس حدیث میں سب مرحلے مذکور ہیں شریعت حقیقت سب پر حاوی ہے اور طریقت اس سے جدا نہیں ہے صاحب تصرفات غیر متشرع بھی ہو سکتا ہے کیونکہ تصرف کی قوت مجاہدہ وریاضت سے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔

جاہل صوفی شریعت طریقت وحقیقت کو سمجھانے کے لیے جاہلانہ تعبیرات اختیار کیا کرتے ہیں میں نے کہا کہ طریقت مثل مشعل کے ہے جس سے شریعت کا راستہ طے کریں گے اور منزل مقصود پر پہنچیں گے تو وہی حقیقت ہے۔

ایک جاہل پیر اپنے مریدوں کو سمجھایا کرتا تھا کہ اللہ کوئی شیر یا ہوا ہے کہ اس سے ڈریں؟ اس لیے ایمان بین الخوف والرجاء کا مطلب بتلاتا تھا کہ خوف کو ایک طرف پھینک دو اور رجاء کو دوسری طرف پھینک دو (ہاتھ کے اشارہ سے بتلاتا تھا) پھر کہتا کہ بیچ میں سے چلے جاؤ۔

میں نے کہا خوف کو ادھر سے لاؤ اور رجاء کو ادھر سے لاؤ (ہاتھ کے اشارہ سے ہی فرمایا) پھر بیچ میں لا کر ایک پاؤں ایک پر رکھو اور دوسرا دوسرے پر اور سوار ہو کر چلے جاؤ۔

امام غزالی کا ارشاد

امام غزالیؒ نے لکھا کہ ایک علم وہ ہوتا ہے جو صاحب علم کو عمل پر مجبور نہیں کرتا دوسرا وہ ہے جو عمل پر مجبور ومضطر بنا دیتا ہے اس لیے اس کے جوارح واعضاء طاعات میں بسہولت مشغول ہو جاتے ہیں اور یہی علم کی قسم درحقیقت سلف کے یہاں ایمان کی حقیقت تھی اور اسی کو میں کہا کرتا ہوں کہ۔

ایمان واسلام کا باہمی تعلق

ایمان باطن سے پھیل کر جوارح تک آتا ہے اور اسلام کے اثرات ظاہر کی طرف سے باطن میں داخل ہوتے ہیں، گویا تصدیق باطن جب غلبہ پاکر اعضاء و جوارح کو طاعت میں مصروف کردے تو وہ اسلام بن جاتی ہے اور اس وقت ایمان و اسلام متحد ہو جاتے ہیں، یہی مطلب ہے اتحاد مسافتین کا، اور اسی کی طرف حدیث الباب میں ان تعبد اللہ کانک تراہ الخ سے اشارہ کیا گیا ہے، کیونکہ جو عبادات جوارح سے متعلق ہیں اور وہ خشوع وخضوع کے ساتھ ادا ہوں تو گویا ایمان اعضاء کی طرف آیا، اور اسلام قلب کی طرف پہنچا، اور اس طرح دونوں طرف کی مسافتیں ایک مرکز پر جمع ہوگئیں، پس ایمان واسلام کو بھی اس صورت میں ہم شئی واحد کہہ سکتے ہیں، اور اگر تصدیق قلب تک ہی رہی، اعضاء پر اس کے آثار ظاہر نہ ہوئے، یا اسلام وظاہری طاعت صرف اعضاء تک رہی، اور درجہ احسان حاصل نہ ہوا، تو اسلام کو بھی اعضاء کا ہی اسلام کہیں گے جس کا تعلق دل سے کچھ نہ ہوگا، اور اس صورت میں ایمان واسلام الگ الگ ہی ماننے پڑیں گے۔

قرب قیامت اور انقلاب احوال

اذا ولدت الامة ربها پر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ فروع اصول کا درجہ حاصل کرلیں اور اصول فروع کے درجہ میں اتر آئیں یعنی قرب قیامت میں سب باتوں کے اندر انقلاب ہو جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعة (جب نااہل لوگوں کو منصب ملنے لگیں گے تو قیامت کا انتظار کرو) اسی ارشاد کی روشنی میں تمام احادیث اشراط قیامت کو سمجھنا چاہئے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی شرحیں اس جملہ کی شارحین نے کی ہیں، مگر ان میں سے اکثر میرے نزدیک مرجوح ہیں نیز اس جملہ سے امہات الاولاد کی بیع کا جواز وعدم جواز نکالنا تو بالکل ہی بے محل بات ہے۔

فی خمس اور علم غیب

فرمایا۔ مراد یہ ہے کہ وقت قیامت کا علم بھی ان ہی پانچ میں داخل ہے، پھر فرمایا کہ یہ پانچ چیزیں چونکہ امور تکوین سے متعلق ہیں امور تشریع سے ان کا کوئی تعلق نہیں، اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو ان کا علم نہیں دیا گیا، الا ماشاء اللہ اور یہ بھی فرمایا:۔ و عندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو۔ (اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، جن کو ان کے سوا کوئی نہیں جانتا) کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد تشریع ہی ہے، جس کے لیے علوم شریعت موزوں ہیں، علوم تکوین نہیں،

علم غیب سے مراد

پھر علم غیب سے مراد اصول کا علم ہے، علم جزئیات نہیں ہے، جو اولیاء کرام کو بھی عطا ہوا ہے، کیونکہ علم جزئیات حقیقت میں علم ہی نہیں ہے، علم تو حقیقت میں وہی ہے، جس سے ایک نوع کے تمام افراد کا علم حاصل ہو جائے، اور وہ علم اصول شیء ہی ہوسکتا ہے۔

اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ہزاروں چیزیں یورپ سے بن کر آرہی ہیں، ان کو ہم دیکھتے ہیں، پہچانتے ہیں، لیکن ہم ان کے اصول سے ناواقف ہیں، تو علم جزئیات بغیر علم کلی کے علم ہی کہلانے کا مستحق نہیں ہے، کسی چیز کا علم کلی اگر ہمیں حاصل ہو جائے تو ہم اس نوع کی تمام جزئیات پر مطلع اور ان کے حقائق سے باخبر ہو سکتے ہیں، اسی کو حضرت حق جل مجدہ نے مفاتیح سے تعبیر کیا ہے۔

کون سا علم خدا کی صفت ہے

غرض جو علم بطور مفتاح ہے، وہ صرف خدا کی صفت ہے، اس لیے لا یعلمھا الا ھو کی تفسیر بلا کسی تاویل کے سمجھ میں آجائے گی۔

پانچ کا عدد کس لیے

باقی رہا یہ کہ صرف پانچ کی کیوں تخصیص فرمائی؟ حالانکہ اور ہزاروں چیزوں کے اصول بھی صرف خدا ہی کو معلوم ہیں؛ جواب دیا گیا کہ یہاں ایسی انواع ذکر کر دی گئیں جو سب کا مرجع واصل ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہاں سائل کا سوال صرف ان ہی پانچ سے متعلق تھا، جس کی تفصیل حافظ سیوطیؒ نے اس آیت کے شان نزول میں کی ہے اور جو عدد کسی سوال کی موافقت کے سبب ذکر ہوتا ہے وہ باتفاق علماء اصول تحدید کے لیے نہیں ہوا کرتا۔ میرے نزدیک یہی جواب سب سے بہتر ہے (دیکھو لباب النقول فی اسباب النزول اور الدر المنثور)

باب. ۵۰ ...... حدثنا ابراهیم بن حمزة قال حدثنا ابراهیم بن سعد عن صالح عن ابن شهاب عن عبید الله بن عبد الله ان عبد الله بن عباس اخبره قال اخبرنی ابو سفیان بن حرب ان هر قل قال له سالتک هل یزیدون ام ینقصون ؟ فزعمت انهم یزیدون و کذلک الا یمان حتیٰ یتم و سئالتک هل یرتد احد سخطة لدینه بعد ان ید خل فیه فزعمت ان لا و کذلک الایمان حین تخالط بشاشته القلوب لا یسخطه احد.

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے خبر دی کہ انہیں ابوسفیان بن حرب نے بتایا کہ جب ان سے ہرقل (شاہ روم) نے کہا کہ میں نے تم سے پوچھا کہ وہ لوگ (رسولؐ کے پیرو) کم ہو رہے ہیں یا زیادہ؟ تو تم نے کہا، وہ بڑھ رہے ہیں، اور یہی حالت ایمان کی ہوتی ہے، جب تک وہ مکمل ہو، اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا ان میں سے کوئی اس دین کو قبول کر کے پھر اسے برا سمجھ کر ترک بھی کر دیتا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں اور یہی کیفیت ایمان کی ہوتی ہے جب اس کی بشاشت دلوں میں اتر جاتی ہے تو پھر اس سے کوئی ناخوش نہیں ہو سکتا۔

تشریح:۔ سابق الذکر حدیث جبریل علیہ السلام کے تحت ہم بتلا چکے ہیں کہ وہ پوری حدیث ان حضرات کی تائید میں ہے جو ایمان و اسلام کی حقیقت الگ الگ سمجھتے ہیں، اور آخر میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یہ جبریل تھے جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے" اس سے اتنی بات ثابت ہوئی تھی کہ دین کا اطلاق مجموعہ ایمان و اسلام و احسان پر ہوتا ہے، اور اس بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے، ائمہ احناف اور دوسرے محدثین و متکلمین بھی مانتے ہیں کہ مجموعہ دین ہے، یہاں امام بخاریؒ نے باب بلاترجمہ قائم کر کے غالباً باب سابق کی اس کمی ہی کو پورا کرنے کی سعی فرمائی ہے، اور یہاں حدیث ہرقل کا ایک ٹکڑا نقل فرما کر اپنے مقصد کی تائید فرمائی کہ دین و ایمان میں اتحاد ہے، ہم پہلے پوری تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں کہ دین و ایمان کو متحد یا ایک قرار دینا خلاف تحقیق ہے، دین کا اطلاق اسلام پر بھی ہونا ہے اور ایمان و اسلام دونوں کی حقیقتیں الگ الگ ہیں، رہا امام بخاری کا ہرقل کے قول سے استدلال کرنا، اس کے بارے میں چند امور بحث طلب ہیں۔

بحث ونظر ایک اشکال یہ ہے کہ ہرقل غیر مومن ہے، اس کے قول سے استدلال کیسے ہو سکتا ہے؟ جواب یہ دیا گیا ہے کہ وہ علماء اہل کتاب میں سے ہے اور جو کچھ اس نے سوالات کئے اور جوابات پر تبصرے کئے، ان کا تعلق کتب سماویہ سابقہ میں بیان کردہ نشانیوں سے ہے، اس لیے اس کی رائے کو تائید میں پیش کیا گیا۔

دوسرے یہ کہ کتب سابقہ میں بھی جو باتیں ایسی ہیں کہ وہ ہمارے دین و شریعت کے خلاف نہیں، یا جن سے ہمیں تائید ملتی ہے تو ان کو قبول کر سکتے ہیں، اور یہی امام بخاری کا مسلک بھی ہے، اس لیے اس سے تائید حاصل کی ہے۔

امام بخاریؒ کے وجوہ استدلال پر نظر

مگر ان وجوہ استدلال میں کلام ہو سکتا ہے، اول یہ کہ ہرقل کے قول میں کوئی حوالہ کتب سابقہ کا نہیں ہے، اور بغیر حوالہ و تحقیق کے ہم کس طرح ایک غیر مومن کی شہادت کو قبول کر لیں؟ دوسرے یہ کہ جو بات ہمارے یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں قطعی طور سے طے شدہ نہیں ہے (مثلاً اسلام

وایمان کا یا ایمان ودین کا ایک ہونا یا ان کا الگ الگ حقیقتیں ہونا' امام بخاری پہلی بات مانتے ہیں' اور دوسرے محققین دوسری) تو ایسی مختلف فیہ چیز کے لیے کتب سابقہ سے تائید وعدم تائید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ان کتابوں کی وہی باتیں تو ہم قبول کر سکتے ہیں جن کی صحت پر ہم قرآن وحدیث کے فیصلوں کی روشنی میں اطمینان کر سکیں' اور جو امر فیصلہ شدہ نہیں ہے اس کی ایک جانب کو کتب سابقہ یا کسی غیر مومن کتابی کے قول سے ترجیح کس طرح دی جا سکتی ہے؟ غرض امام بخاریؒ کے یک طرفہ رجحان کا غلو ہے کہ اس کے لیے اس قسم کی کمزور وجوہ بھی استدلال میں پیش فرما دیں۔

''زبردست شہادت'' پر نقد ونظر

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مطبوعہ اردو تقاریر درس بخاری شریف میں لکھا گیا ہے کہ امام بخاری نے دین واسلام وایمان تینوں کے اتحاد پر زبردست شہادتیں پیش کر دیں' ایک جبریل کے بیان سے' دوسرے اہل کتاب کے عالم ہرقل کے بیان سے'' دوسری جگہ لکھا گیا کہ ''امام بخاری نے دونوں باب سے ایمان ودین کی ایک ہی حقیقت ثابت کی' اولاً ثبوت شریعت محمدیہ کے اعتبار سے تھا' اور ثانیاً شریعت سابقہ سے''

یہ دونوں عبارتیں اس موقع کے لیے مناسب نہ تھیں' کیونکہ ہم نے واضح کر دیا ہے کہ امام بخاری کا استدلال حدیث جبریل سے نہایت کمزور ہے جیسا کہ حضرت شاہ صاحب نے بھی فرمایا کہ حدیث جبریل میں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں کے مجموعہ کو دین فرمایا تھا' جس میں سرے سے کوئی نزاع ہی نہیں ہے' اس لیے اس سے دین واسلام وایمان کے اتحاد پر زبردست شہادت کس طرح پیش ہوگئی؟ کیا مجموعہ اور اس کے ہر ہر فرد کا حکم ایک ہی ہوا کرتا ہے' امام بخاری کو خود بھی احساس ہے کہ حدیث جبرائیل میں ان کے استدلال کے لیے کوئی بہتر موقع نہیں' اور اسی لیے ایسا گول مول سا ترجمہ قائم کیا' جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں' مگر ہماری خوش فہمی کہ اس پر بھی ہم ان کی کمزوری کو زبردست شہادت کہیں یا سمجھیں' دوسری عبارت میں ثبوت کا دعوے اور وہ بھی شریعت محمدیہ سے بے محل ہے جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے' اور دوسرا ثبوت شریعت سابقہ سے بھی محل کلام ہے' جس کی وضاحت اوپر ہو چکی یہ ضرور ہے کہ امام بخاریؒ اپنے نظریات کی تائید کے لیے ہر قریب وبعید' قوی وکمزور لیل سے استفادہ کرتے ہیں' مگر یہ سمجھنا ہمارا کام ہے کہ کس موقع پر انہوں نے زبردست دلیل پیش کی اور کس موقع پر زبردستی کا استدلال کیا' جیسا کہ یہاں زیر بحث موقع میں ہے۔

خرم کا جواز وعدم جواز

امام بخاری نے یہاں اپنے نظریہ کی تائید کے لیے حدیث کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے' جس کو محدثین کی اصطلاح میں خرم کہتے ہیں' اور صحیح بخاری میں انہوں نے بکثرت ایسا کیا ہے' کیونکہ اسی طریقہ سے انہوں نے اپنے خاص اجتہادی مسائل کے لیے تائیدی اشارات پیش کیے ہیں۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ خرم جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات محدثین اس کو مطلقاً جائز کہتے ہیں اور بعض حضرات نے اس کو بالاطلاق ناجائز قرار دیا ہے' لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اگر مخروم (حدیث کا ٹکڑا) پورے معنے ظاہر کرتا ہے تو ایسا خرم (یا قطع وبرید) جائز ہے' اور اگر اس کے معنی اتنے ٹکڑے سے پورے ادا نہیں ہوتے' یا اس سے معنے میں کوئی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے تو ایسا خرم جائز نہیں' امام بخاری کا خرم بھی حدود جواز ہی میں ہوتا ہے' واللہ اعلم۔

علمی تحقیق

یہاں ایک بحث یہ بھی ہے کہ اس حدیث میں خرم امام بخاری کی طرف سے ہے یا اوپر سے ہے؟ علامہ کرمانی شارح بخاری کی رائے ہے کہ یہ امام بخاری سے نہیں بلکہ امام زہری سے ہوا ہے' نیچے کے رواۃ میں سے غالباً شیخ ابراہیم بن حمزہ نے ایمان کے دین ہونے پر استدلال کرنے کے لیے صرف اسی قدر ٹکڑا روایت کیا ہوگا۔ حافظ عینی نے فرمایا کے کرمانی کی رائے صحیح نہیں کیونکہ امام بخاری نے اسی سند سے یہی

حدیث مکمل طور سے کتاب الجہاد (باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الا سلام و النبوۃ صفحہ۴۱۲ میں ذکر کی ہے' اس لیے خرم امام بخاری ہی کی طرف سے ہے' جو امام بخاری نے اپنے نظریہ پر استدلال کے لیے کیا ہے۔ (عمدۃ القاری صفحہ۱/۳۴۲)

باب فضل من استبراء لدینہ۔ (اس شخص کی فضیلت جس نے اپنے دین کی صفائی پیش کی)

(۵۱) حدثنا ابو نعیم[1] حدثنا زکریا عن[2] عامر قال سمعت النعمان بن بشیر یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الحلال بین و الحرام بین و بینھما مشتبھات لا یعلمھا کثیر من الناس فمن اتقیٰ المشتبھات استبراء لدینہ و عرضہ و من وقع فی الشبھات کراع یراعی حول الحمیٰ یوشک ان یواقعہ الا و ان لکل ملک حمی الا ان حمی اللہ فی ارضہ محارمہ الا و ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب.

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے' اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں' جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے' تو جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچے تو گویا اس نے اپنے دین اور آبرو کو سلامت رکھا' اور جو ان شبہات (کی دلدل) میں پھنس گیا' وہ اس چرواہے کی طرح ہے جو (اپنے جانوروں کو) سرکاری چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے' ڈر ہے کہ وہ اپنے دھن کو اس چراگاہ میں جا گھسائے گا اچھی طرح سن لو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے' یاد رکھو کہ اللہ کی زمین میں اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ اور سن لو کہ جسم کے اندر ایک گوشت کا ٹکڑا ہے' جب وہ سنور جاتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے' سن لو کہ یہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے۔

تشریح: حدیث میں کتنا پر حکمت اور قیمتی جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ انسانی جسم کا اصل تعلق دل سے ہے' جب تک وہ کام کرتا ہے انسان کا سارا جسم متحرک ہے' اور جس دن اس نے کام چھوڑ دیا' اسی وقت زندگی کا سلسلہ ختم ہے' یہی دل انسانی اعضاء کی طرح انسانی اخلاق کے لیے بھی کنجی کی حیثیت رکھتا ہے' اگر دل ان تمام بداخلاقیوں بے حیائیوں اور خباثتوں سے پاک ہے' جن سے بچنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو انسان کی ساری زندگی پاک وصاف ہوگی اور اگر دل ہی میں فساد بھر گیا تو پھر آدمی کا ہر فعل فتنہ انگیز اور فساد پرور بن جاتا ہے' اس لیے سب سے پہلے قلب کی اصلاح ضروری ہے' اسی لیے احکام سے پہلے عقائد کی درستگی پر زور دیا جاتا ہے' اگر دل سنور گیا تو آدمی کے جسم وروح دونوں کی اصلاح ممکن ہوگی۔

---

[1] یہ ابونعیم فضل بن دکین عمرو بن خالد بن زہیر قرشی (م ۲۱۹ھ) امام بخاریؒ کے بڑے شیخ ہیں' جن سے امام بخاری بلا واسطہ روایت کرتے ہیں اور دوسرے ارباب صحاح نے بالواسطہ روایت کی ہے نہایت جلیل القدر محدث تھے بلکہ یہ بھی تذکروں میں لکھا ہے کہ کثرۃ شیوخ میں ان جیسے کم ہیں' امام احمد وغیرہ نے آپ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا' تمام ائمہ محدثین نے آپ کی مدح کی ہے آپ سے دوسرے بھی بڑے ائمہ واعلام کبار' حفاظ حدیث نے روایت حدیث کی ہے' مثلاً ابن مبارک' امام احمد' ابن ابی شیبہ' ابن ابی خیثمہ' ابن راہویہ' امام ذہلی' ابوزرعہ' ابوحاتم وغیرہ آپ کو اتقن اہل زمانہ کہا گیا ہے' آپ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ میں اٹھ سو شیوخ سے ملا میں نے کسی کو نہیں پایا جو خلق قرآن کا قائل ہوا ہو' بلکہ یہ بھی دیکھا کہ جس پر اس کی تہمت لگی' وہ زندیق قرار پاتا ہے۔

ہم نے مقدمہ انوار الباری صفحہ۱/۹۷ میں تہذیب الکمال اور تبیض الصحیفہ کے حوالہ سے نقل کیا تھا کہ آپ بھی امام اعظم ابوحنیفہ کے تلامذہ حدیث میں سے ہیں' اگرچہ تہذیب نے اس نسبت کو حذف کر دیا ہے۔

یہاں اتنی بات اور لکھنی ہے کہ امام بخاری نے امام صاحب کی طرف بھی خلق قرآن کی نسبت کر دی ہے۔ جس کی صفائی خود امام احمد وغیرہ سے ہم نے ذکر کی تھی' یہاں ابو نعیم موصوف بھی اپنے شیوخ کو اس الزام سے بری کر رہے ہیں اور اگر آپ کے شیوخ میں سے امام صاحب ایسے مشہور ومعروف شیخ اس کے قائل ہوئے ہوتے' تو ابو نعیم ان کا ضرور ذکر کرتے' بلکہ ممکن ہے کہ کچھ بڑوں کی طرف اس قسم کی غلط نسبتوں ہی کی صفائی کے لیے ایسا جملہ ارشاد فرمایا' واللہ اعلم'

[2] یہ زکریا بن ابی زائدہ خالد بن میمون الہمدانی کوفی (م ۱۴۹ھ) ارباب صحاح ستہ کے شیوخ میں ہیں اور امام اعظمؒ کے تلمیذ حدیث ہیں اور امام صاحب سے مسانید میں روایت کی ہے' اور آپ کے صاحبزادے یحییٰ بن زکریا بھی بڑے جلیل القدر محدث تھے' جو امام صاحب کے اصحاب میں اور شرکاء تدوین فقہ سے تھے۔ (دیکھو مقدمہ صفحہ۱/۸۴ و صفحہ۱/۱۸۶)

حضرت شاہ صاحب کے تشریحی ارشادات

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ استبراء سے مراد احتیاط فی الدین ہے اور یہ اگرچہ بعض اعتبارات سے دین سے خارج چیز ہے۔ مگر امام بخاری نے اس کو بھی دین میں داخل کیا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص اپنے دین پر بقدر ضرورت عامل ہو اور اس کے بعد محتاط زندگی گزارے تو اس کی اس احتیاط کو بھی دین کا جزو سمجھا جائے گا یا نہیں؟ حدیث الباب سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ بھی دین ہی سے ہے' اگرچہ دین کے اعتبار سے وہ دین سے زائد ہی چیز ہے' گویا امام بخاریؒ نے یہ دوسری تقسیم دین وایمان کی بتلائی کہ بعض لوگ محتاط زندگی گزارتے ہیں' بعض نہیں' اور احتیاط والوں کو دوسروں پر زیادہ فضیلت حاصل ہے' لہٰذا معلوم ہوا کہ ایمان کے بھی مراتب ہیں۔ **وھو المقصود۔**

پھر فرمایا کہ یہ حدیث نہایت مہم ومشکل اور کثیر المعانی احادیث میں سے ہے' بہت سے علماء وفضلاء نے اسکی شرح میں مستقل تصانیف لکھی ہیں۔

حافظ تقی الدین وعلامہ شوکانی کا ذکر

حافظ تقی الدین بن دقیق العید بھی عمدۃ الاحکام میں اس حدیث پر گزرے ہیں اور ان سے بہتر کسی نے نہیں لکھا' مگر وہ بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں۔

علامہ شوکانی نے بھی رسالہ لکھا مگر اس میں کچھ مغز نہیں ہے' پیاز کی طرح چھلکے اتارتے چلے گئے ہیں' حاصل کچھ نہیں ہے بلکہ اس سے اچھا تو میں لکھ سکتا ہوں' گو میں بھی اس کو تمام نہیں سکتا' آگے امام بخاری اس حدیث کو کتاب البیوع میں بھی لائیں گے' اور اس وقت میں بتلاؤں گا کہ اس کے تمام جوانب کا بھی احاطہ نہیں کر سکے ہیں' اگر حدیث مذکور کی پوری حقیقت منکشف ہو جاتی تو ہمیں صاحب شریعت سے ایک مکمل ضابطہ وقاعدہ کلیہ حلال وحرام کا مل جاتا اب مشتبہات کے ابہام کی وجہ سے ہم اس سے محروم ہو گئے' اور اب صرف جزئیات نکالے جا سکتے ہیں' ضوابط وکلیات نہیں' تاہم اس حدیث سے ایک نہایت اہم اشارہ اس امر کی طرف ملتا ہے کہ نجات کے طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ افعال کو چھوڑ کر ترک کو اختیار کیا جائے' پھر فرمایا کہ عبادت وجودی چیز ہے کہ اس میں زیادتی مطلوب ہے' زیادہ دنیا کی لذتوں سے بے رغبتی کا نام ہے' اور خدا کے یہاں زیادہ قدر زہد ہی کی ہے گو لوگوں کے یہاں زیادہ قدر عبادت کی ہے' ورع یہ ہے کہ شکوک وشبہات سے بچے' علامہ سیوطی نے حدیث ذکر کی ہے کہ "ورع" سے زیادہ کچھ نہیں ہے"۔ غرض زہد وورع سب عدمی ہیں' عبادت کی طرح سے وجودی نہیں۔

حدیث الباب کا مقصد: حدیث کے پہلے حصہ میں احکام ومسائل کی طرف اشارہ ہے کہ حلال وحرام سب شریعت نے واضح کر دیے ہیں' اور دوسرے حصہ میں حوادث ووقائع کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کے لیے ایک عرفی ضابطہ ذکر فرمایا کہ جو شخص شبہات اور تہمت کے مواقع سے بچے گا وہ اپنے دین کو ضائع ہونے سے اور آبرو کو مطعون ہونے سے محفوظ کرے گا' جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ تم ایسے کاموں سے بھی بچو' جن کو عام لوگوں کے دل ناپسند کریں' اگرچہ تمہارے پاس ان کا عذر ہو کیونکہ بہت سے لوگ جو بری بات کو دیکھتے اور سنتے ہیں' تمہارے عذر کو سننے اور قبول کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔

اس وضاحت سے وہ مشبہ بھی دفعہ ہو گیا کہ حلال وحرام کے ذکر میں آبرو کی حفاظت کس مناسبت سے ذکر ہوئی پس حدیث بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول مذکور کی طرح صرف مسائل کے بیان میں نہیں ہے' بلکہ ان کے علاوہ دوسرے حالات وحوادث بھی مراد ہیں۔ اور استبراء کی صورت یہاں میرے نزدیک ایسی ہے کہ جس طرح مدعی علیہ عدالت میں عائد شدہ الزامات کی طرف سے صفائی پیش کیا کرتا ہے' جو شخص مشتبہ امور اور مواضع تہمت سے بچے گا' وہ بھی اپنے دین وآبرو دونوں کی طرف سے صفائی پیش کر دے گا۔

امام محمد وامام شافعیؒ: حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس حدیث کی شرح اگر امام محمد یا امام شافعیؒ ایسے دقیق النظر حضرات کرتے تو حق ادا ہوتا۔ امام شافعیؒ چونکہ خود فقیہ النفس تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے استاذ امام محمدؒ سے پورا استفادہ فرمایا' اور ہمیشہ امام کی تعریف فرماتے تھے' کبھی فرماتے کہ امام محمدؒ آنکھوں اور دلوں دونوں کو سیراب کرتے تھے (کیونکہ حسین وجمیل بھی تھے اور ذی علم وحکمت بھی' کبھی فرماتے کہ امام محمدؒ جب کسی

مسئلہ پر کلام کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان پر وحی اتر رہی ہے، کبھی فرماتے کہ میں نے امام محمد سے دو اونٹ کے بوجھ کی برابر علم حاصل کیا لیکن جو صرف محدث تھے انہوں نے نہ امام محمد کے علم و مرتبہ کو پہچانا نہ ان کی تعریف کی، بلکہ ایسے محدثین کے لیے مزید ایک وجہ ان سے توحش کی پیدا ہو گئی وہ یہ کہ امام محمد نے سب سے پہلے فقہ وحدیث کو الگ الگ مدون کیا، جب ان سے پہلے تالیف وتصنیف کا طرز آثار وفقہ کو ملا کر جمع کرنے کا تھا، پس یہ طریقہ کا اختلاف بھی وجہ طعن بن گیا، حالانکہ پھر تمام ہی مذاہب اربعہ والوں نے اسی امام محمد والے طریقہ کو اختیار کیا، مگر انصاف دنیا میں کہاں ہے؟

حدیث الباب اور علامہ نوویؒ

امام نوویؒ نے شرح بخاری میں لکھا کہ "حدیث الحلال بین الخ نہایت عظیم القدر حدیث ہے، وہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے اور ان احادیث میں سے ہے جن پر اسلام کا مدار ہے، اس کی شرح کے لیے بہت سے اوارق بلکہ بہت سے دفتر چاہئیں، بہت سے علماء نے اس کو تمام اصول اسلام کا ایک تہائی اور بعض نے چوتھائی قرار دیا ہے۔ اس کی مختصر شرح یہ ہے کہ کچھ اشیاء حلال ہیں، جن کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کچھ حرام ہیں جن کی حرمت بے شک وشبہ ہے اور ایک تیسری قسم ان کی ہے جن کا حکم مشتبہ ہے، جو شخص ایسی مشکوک ومشتبہ چیزوں سے پرہیز کرے گا، اس نے اپنے کو معصیت سے بچالیا، اور ایسی مشکوک چیزوں کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔

مشتبہات اور خطابی

قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "وبینهما مشتبهات لا يعلمها كثير من الناس" خطابی وغیرہ علماء نے فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں پر مشتبہ ہوتی ہیں کچھ پر نہیں، کیونکہ ان کے اندر ذاتی اشتباہ وابہام نہیں ہوتا ہے، ورنہ وہ سب ہی مشتبہ ہو جائیں، چنانچہ اہل علم ان کو جانتے پہچانتے ہیں، ان پر کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔

علامہ قسطلانی کی رائے

علامہ قسطلانی نے لکھا کہ کثیر کی قید سے معلوم ہوا کہ قلیل افراد اس سے مستثنیٰ ہیں یعنی مجتہدین وعلماء جو ذریعہ نص یا قیاس کے یا استصحاب وغیرہ سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

نواب صاحب کی رائے

نواب صاحب نے بھی عون الباری میں ان حضرات مجتہدین وعلماء کے استثناء کو صحیح قرار دیا ہے، اور جب یہ امر تسلیم ہو گیا کہ کثرت غیر مجتہدین وغیرہ علماء کی ہے تو اگر نہ جاننے والے، جاننے والوں کے علم پر اطمینان کر کے ان کی تقلید نہ کریں گے تو اور کیا صورت ان کے عمل کی ممکن ہو سکتی ہے اور تقلید ائمہ مجتہدین کو شرک یا غیر شرعی امر قرار دینا کیونکر صحیح ہو گا؟ البتہ اگر علماء مجتہدین کے فیصلہ کے بعد بھی کسی پر وہ امر بدستور مشتبہ ومشکوک رہے تو اس کے لیے ضرور بجائے عمل کے صورت ترک واجتناب ہی متعین ہو گی۔

بحث ونظر .... تحقیق مشتبہات

حافظ عینیؒ نے شرح بخاری شریف میں لکھا کہ اس میں پانچ روایات ہیں۔

(۱) مشتبہات:۔ یہ روایت اصیلی کی ہے، اور ابن ماجہ میں بھی یہی روایت ہے۔ (۲) متشتبہات:۔ یہ روایت طبری کی ہے۔

(۳) مشبہات:۔ یہ روایت سمرقندی کی ہے اور مسلم میں بھی اسی طرح ہے۔ (۴) مشبہات:۔ (۵) مشبہات۔

پھر لکھا کہ ہر ایک اشتبہ الامر سے ماخوذ ہے، اس وقت بولتے ہیں جب کہ کوئی امر واضح نہ ہو اول کے معنی مشکلات امور ہیں کیونکہ ان

میں دو متضاد و متقابل جانبوں کا احتمال ہوتا ہے اس سے بھی پوری مشابہت اس سے بھی مماثلت' فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کس کے ساتھ رکھیں' دوسرے کا مطلب بھی ایسا ہی ہے مگر اس میں تکلف بھی معلوم ہوتا ہے' جو باب تفعل کا خاصہ ہے' تیسرے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ وہ دوسری چیزوں سے مشابہت رکھتی ہیں' جس کی وجہ سے کوئی متعین حکم نہیں لگا سکتے' بعض نے یہ معنی لیے کہ وہ حلال سے مشابہت رکھتی ہیں' چوتھے کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے کو حلال سے مشابہ کرنے والی ہیں' پانچویں کا معنی بھی یہی ہے' صرف باب تفعیل و افعال کا فرق ہے' قاضی کا فیصلہ یہ ہے کہ پہلی تینوں صورتیں بمعنی مشکلات ہیں' یشتبہ یشکل ہے اور اسی سے 'ان البقر تشابه علینا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مشتبہات وہ ہیں جن کا حکم معلوم نہ ہو اور ایسی ہی قرآن مجید کی متشابہات بھی ہیں' جن کی مراد معلوم نہیں' مشبہات سے اصولیوں کے قیاس کی طرف اشارہ ہے کہ وہ علت جامعہ کے ذریعہ کھینچتے ہیں' مشبہات بھی اصولیوں کے موافق ہے' میرے نزدیک حدیث کا اصل لفظ مشتبہات ہی ہوگا' جو راویوں کی تعبیرات میں بدل گیا۔

اشکال: ایک اشکال یہاں یہ ہے کہ آیت قرآنی **منه آیات محکمات هن ام الکتاب و اخر متشبهات** میں بھی متشابہات کا لفظ وارد ہوا ہے' اس سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے ملتبسات کے معنی میں لیا ہے' جس پر اعتراض ہوا کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ پورے قرآن مجید کو کتاب متشابہ فرمایا ہے' یعنی ایسی کتاب جس کا بعض حصہ دوسرے بعض کی تصدیق کرتا ہے اور یہ اس کی مدح ہے' نہ ایسی کتاب کہ اس کے بعض حصے دوسرے بعض سے ملتبس ہو جائیں کہ صورت التباس و اشتباہ کلام خداوندی کے شایان شان نہیں' اسی لیے دوسرے مفسرین نے واخر متشابہات میں بھی تصدیق ہی کے معنی لیے ہیں اور یہی معنی حضرت مجاہد سے بھی مروی ہے (ملاحظہ ہو باب التفسیر بخاری)

جواب میری رائے یہ ہے کہ لفظ متشابہ بمعنی تصدیق کرنے والا محکم ہی کا ہم معنی ہے' دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے' حالانکہ حق تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں دونوں کو مقابل قرار دیا ہے اور متشابہات کا اتباع کرنے والے کو اہل زیغ قرار دیا ہے' اس لیے مجاہد کی تفسیر مرجوح ہے' مناسب تھا کہ اس کو امام بخاری ذکر نہ کرتے اگرچہ ان کی طرف سے عذر ممکن ہے' جس کو اپنے موقع پر بیان کیا جائے گا' لہٰذا متشابہات سے مراد ملتبسات ہی ہیں۔ البتہ کتاباً متشابہاً میں تصدیق ہی کے معنی مراد ہیں۔

دوسرا اشکال و جواب

اگر یہ خلجان ہو کہ اس سے مطالب قرآن میں انتشار ہوگا کہ ایک لفظ کے معنی ایک جگہ کچھ ہیں اور دوسری جگہ کچھ اور تو اس کا جواب یہ ہے کہ انتشار اس لیے نہیں ہوگا کہ صلات کے اختلاف سے معانی میں اختلاف ناگزیر ہے' یہاں بھی لفظ تشابہ کا صلہ جب علیٰ ہوتی ہے تو اس کے معنی التباس کے متعین ہیں' جیسے **ان البقر تشابه علینا** میں ہے' اور اسی طرح واخر متشابہات میں بھی صلہ علےٰ ہی ہے' جو محذوف معنوی ہے اور جب اس کا صلہ لام ہوگا تو بمعنی تصدیق ہوگا' جیسے کتاباً متشابہا میں کہ لکم یہاں محذوف ہے' جس لفظ کے معنی اختلاف و تغایر صلہ کے سبب مختلف ہوتے ہیں' وہ متشرک معنوی ہوتا ہے۔

اہم علمی افادہ: **لكل ملك حمى** "پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں بادشاہوں کا اپنے لیے چراگاہیں مخصوص کرنا جائز نہیں' البتہ امام و امیر وقت مصالح شرعیہ کے لیے ایسا کرے تو جائز ہے' جس طرح حضرت عمرؓ نے جہاد کے گھوڑوں کے لیے رکھنہ بنایا تھا' تو اس تشبیہ سے مغالطہ نہ ہونا چاہئے کہ اس سے جواز سمجھ لیا جائے' یہاں تشبیہ محمود بہ شئی مذموم کی صورت ہے' مسائل و احکام کو تشبیہات سے نہیں نکال سکتے' تشبیہ کا

مقصد صرف یہ ہے کہ عام لوگ' عرف عام سے ایک بات کو اچھی طرح سمجھ لیں گے' کیونکہ بادشاہوں کے طریقے اسی طرح' اس سے یہاں بحث نہیں کہ وہ جائز تھے یا ناجائز' گویا وجہ شبہ یہاں فقط اس قدر ہے کہ جس قدر دنیا کے بادشاہ ایک حصہ کو اپنے لیے مخصوص کر کے اس کی حرمت سب پر لازم کر دیتے ہیں اور باقی حصے مباح رہتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے بھی محرمات کی ایک باؤنڈری بنی ہوئی ہے' اس کے آس پاس بھی نہ جانا چاہئے ورنہ خطرہ ہے کہ اس کے قریب ہوتے ہوتے کسی وقت اس کے اندر ہی داخل ہو جائیں' جو اللہ تعالیٰ کے عذاب و غضب کا سبب بن جائے۔

یہ مقصد نہیں ہے کہ خدا کے یہاں ان دنیا کے شاہوں کی حماؤں (رکھوں' چراگاہوں) کی کوئی قدر ہے یا ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

شاہان عرب میں دستور تھا کہ بے نفع بھی اپنی بڑائی کے اظہار کے لیے حمی کر دیتے تھے' اور انگریزوں نے بھی ہندوستان میں بہت سے جنگل' بن اور شکار گاہیں خاص کر دی تھیں' جن میں خاص لوگ بھی بغیر اجازت نہ جا سکتے تھے۔ اس لحاظ سے حدیث الباب کی تشبیہ اور بھی اعلیٰ ہو گی۔ (کذا افادنا الشیخ الانور اللہ مرقدہ المنور)

قلب کے خصائص و کمالات

قولہ صلی اللہ علیہ وسلم الا وھی القلب'' پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قلب کی نسبت جسم کے ساتھ ایسی ہی ہے' جیسی امیر کی مامور کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ اصل ہے اور سب جسم و اعضاء بطور اس کی فرع کے ہیں۔ قلب ہی علوم و معارف کا معدن اور اخلاق و ملکات کا مخزن ہے' جامع صغیر سیوطی میں یہ روایت بھی ہے کہ قلب بادشاہ ہے اور بیہقی میں ہے کہ کان قلب کے لیے بطور قیف کے ہیں' جس کے ذریعہ خارجی مسموعات اس کے پاس جمع ہوتی رہتی ہیں' دونوں آنکھیں بطور ہتھیار ہیں جن سے حجر و شجر کی ٹکر بچائی جاتی ہے' دونوں ہاتھ بازو' دونوں پاؤں سواری' جگر رحمت' تلی ضحک' پھیپھڑے سانس لینے کا سامان ہیں' اگر یہ اثر صحیح ہے تو ضحک کا تعلق تلی سے ثابت ہو گا' لیکن اطباء نے اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی' میرے نزدیک ضحک کا سبب پھیپھڑوں کا انقباض و انبساط (سمٹنا پھیلنا) ہے قلب ہی تمام لطائف کی اصل ہے۔ بجز روح کے کہ وہ خارج سے ہے اور نفس کا معدن جگر ہے' جو لذات و شہوات کی طلب کرتا ہے' اور قلب کو بھی نفس کہا جاتا ہے' جب کہ وہ لذات و خواہشات نفسانی میں محو و مستغرق ہو جاتا ہے جو فنائیت کا درجہ ہے' قلب ہی پر مدار صلاح و فلاح ہے' وہی انوار الٰہیہ کا مہبط و مورد اور اسرار خداوندی کا منبع و مخزن ہے' اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا پتلا بنایا اور شیطان نے اس کے اندر گھس کر دیکھا کہ اس کے اندر کئی منافذ (سوراخ) بھی ہیں۔ تو کہا کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو اپنے پر قابو نہ رکھ سکے گی پھر ایک گوشہ میں ایک چھوٹی کوٹھری بند (قلب کی) دیکھی تو کہنے لگا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا ہے؟

میں نے اس سے سمجھا کہ قلب چونکہ تجلیات صمدیہ کا مظہر ہے' اس لیے حق تعالیٰ نے اس کو ٹھوس کر دیا' اور اس میں کوئی منفذ (سوراخ) بھی نہیں رکھا' اب اس کو ایک بلند قبہ و گنبد کی طرح سمجھو جس کی سب جوانب بند ہوں' سب دروازے و کھڑکیاں مقفل ہوں' پھر ظاہر ہے کہ ایسی بند اور محفوظ چیز کے بھید کو خدائے علیم و خبیر کے سوا کون جان سکتا ہے؟!

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ در حقیقت انسان مضغۂ قلب ہی ہے' اور تمام بدن بمنزلہ انجمن و بھاپ کے ہے کہ جزوی جزوی کام دیتا ہے' لطیفہ قلب صوفیاء کے یہاں ایک وسیع مقام ہے' میرے نزدیک یہی سب سے اعلیٰ لطیفہ ہے' اور اس کو کوئی بیں[1]

[1] معلوم ہوا کہ صوفیہ کا سلوک طے کرنا معمولی چیز نہیں ہے مگر اس دور جہالت و بے دینی میں کس کو سمجھایا جائے کہ قدم قدم پر پیشہ ور جاہل یا کم علم صوفی اور پیر بیعت سلوک کے جال پھیلا رہے ہیں اور ہر کہ دمہ کو خلافت سے بھی نواز رہے ہیں۔

''جیسی اب ہے تری محفل' کبھی ایسی تو نہ تھی''

سال میں بھی طے کر لے تو وہ میرے نزدیک ناکام نہیں ہے۔

تحقیق لطائف

فرمایا:۔ میرے نزدیک حقیقی واصلی لطائف تین ہی ہیں، روح، قلب، نفس جن کا منبع کبد ہے، اور باقی لطائف، سر، خفی، اخفی (جو مجدد صاحب وغیرہ نے بتلائے ہیں) وہ سب اعتباری ہیں۔ قلب برزخ ہے درمیان مادی وروحانی کے، اور یہی میرے نزدیک مقصد ہے حدیث الباب کا، اور حدیث وقرآن اسی چیز کو لیتے ہیں، جو لوگوں کو معلوم نہ ہو، قلب کی خاص حالت سے پتہ چلا کہ وہ علوی چیز ہے، اس لیے کہ نباتات کو دیکھا تو وہ سب نیچے سے اوپر کو جارہی ہیں، حیوانات سب مستوی ہیں، ان کا رخ نہ اوپر کو ہے نہ نیچے کی طرف ہے۔ لیکن انسان کی تمام ساخت انحدار کی حالت میں ہے، سر بھی اوپر سے نیچے کی طرف کو منحدر ہے، چہرہ بھی، داڑھی بھی، ہاتھ پاؤں اور بال بھی اور اسی طرح مضغہ قلب بھی (جو گویا انسان کبیر کے اندر ایک انسان صغیر ہے) یہ انحدار (اوپر سے نیچے کی طرف میلان) بتلا رہا ہے کہ انسان علوی مخلوق ہے، جو اوپر سے نیچے کو آیا ہے، اس کا برعکس نہیں ہے اور قلب کو بائیں جانب اس لیے رکھا تا کہ اس کی بادشاہت داہنی جانب رہے۔

عقل کا محل کیا ہے

اس کے بعد ایک اہم بحث یہ ہے کہ عقل کا محل قلب ہے یا دماغ؟ شافعیہ اکثر متکلمین وفلاسفہ کی رائے یہ ہے کہ وہ قلب ہے، اور امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی رائے یہ ہے کہ دماغ ہے اور یہی رائے اطباء کی بھی ہے۔

ابن بطال نے کہا کہ حدیث الباب سے عقل کا قلب میں ہونا معلوم ہوتا ہے اور جو کچھ سر میں ہے اس کا تعلق بھی قلب ہی سے ہے یعنی اسی کے سبب ہے، حافظ ابن حجرؒ نے بھی استدلال مذکور کو صحیح سمجھا ہے۔

علامہ قسطلانی نے لکھا کہ اطباء کی دلیل یہ ہے کہ جب دماغ خراب ہو جاتا ہے تو عقل بھی خراب ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عقل کا محل دماغ ہے، اس کا جواب دیا گیا کہ دماغ ان کے نزدیک بطور آلہ استعمال عقل ہے، اس لیے محض آلہ کے خراب ہونے فساد عقل کا حکم نہیں کیا جاتا۔ (شروح صفحہ ۲۵۹/۱)

مگر امام نووی نے شرح بخاری میں لکھا کہ حدیث الباب سے استدلال مذکور صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جانبین کے لیے کوئی حجت نہیں ہے (عمدۃ القاری صفحہ ۳۵۲/۱ وشروح البخاری صفحہ ۲۵۶/۱)

طرفین کے مفصل عقلی ونقلی دلائل اور مکمل تحقیق ہم آئندہ کسی موقع پر ذکر کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ و منه التوفیق۔

آخر میں گزارش ہے کہ ہم نے جو کچھ وجہ مناسبت حدیث الباب کو یہاں ذکر کرنے کی ابتداء میں ذکر کی، یا جو کچھ شارحین بخاری یا مدرسین ذکر کرتے ہیں وہ سب دور کی مناسبتیں ہیں۔ اور امام بخاریؒ کے اپنے نظریہ خاص کے تحت ہیں، ورنہ فی نفسہ اس حدیث کو کتاب الایمان ہی میں لانے کی توجیہ دشوار ہے، یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اس حدیث کو کتاب الایمان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ وہ اس کو کتاب البیوع میں لائے ہیں۔ اسی طرح امام ترمذی وامام ابوداؤد، امام نسائی بھی بیوع ہی میں لائے ہیں۔ اور امام ابن ماجہ نے اس کو کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر فروع اعمال یا معاملات وغیرہ سے ہے، جن میں ورع وتقویٰ کی ضرورت اور مشتبہات سے احتراز کی حاجت ہے، تا کہ دین وآبرو پر حرف نہ آئے۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمه اتم واحکم